

تحریر

علمی مجلسِ دینی کا تہماہی رسالہ

شمارہ ۱

۱۹۷۲ء

جلد ۶

۲	ملاحظات محکمہ آثارِ قدیمہ	ملک لاکھ منیا والدین دیبائی
۳	تاریخ تہذیب و تمدن کا آغاز تذکرہ عثمانیہ جاسوزیں	حکم چند نیر
۴۱	غالب اداس کے معاصرین	سید اکبر علی نرغزی
۵۷	غالب اور سفیرِ ہرات	ملک لاکھ
۶۱	دنیات	

دہ سالانہ (مع محصولِ جبری ٹوٹ) ۱۵ روپے
غیر ملک: ۲۶ پونڈ انگریزی یا ۷ ٹوال امریکی
اس شمارے کی قیمت ۵ روپے

پرنٹر و پبلشر: مجلسِ عباسی نے کہ نائب رئیسِ ہلالِ کنواں دہلی سے چھپوا کر دفترِ علمی مجلس
۱۳۲۹ ہجرتہ قمریہ صاحبِ نواخذہ دہلی سے شائع کیا۔

غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب

نا کردہ گنا ہی بھی پوئی کردہ گنا ہی
عشر میں تھیں جو رکی پوش کا ہو کیا تو
یہ حال ہے دنیا کا تو جاقظ ہو خدا ہی
تم کو تو بپائیگی یہ معصوم گنا ہی

اہل دنیا سے ہوا بطلب دنیا سے غرض
تم نہیں نشین نہیں پھر بھی پئے جاتا ہو میں
اپنے ہی دل میں بسائی ہم نے اک دنیا
میرے سارے نہیں ہوتی کبھی صبا تک

سارے کو تو دنیا کی گناہوں سے چھالو
ہم جلوہ گر ناز کے پردے تو اٹھا دیں
ماں کے جو بٹے ہیں پھیلے نہیں جاتے
انکھوں کے جو پردے ہیں اٹھائے نہیں جاتے

ابھی تو شک ہی ٹپکے ہیں دیدہ تر سے
عجب نہیں کہ جنوں ادھی کو سے چپک
رگ جیات سے ٹپکا ہوا تو کیا ہوگا!
ہمارے صبر کا دامن روتو کیا ہوگا!

موت کی روک تھام کر یا رہو
نارے گئے سے تو خ کیا ہوگا!
یہ تو ہر ایک پر چھپتی ہے
کٹے کٹے ہی رات کٹتی ہے

اللہ کی تو کیا بات پر حرف آ نہیں سکتا
اسرارِ حقیقت کوئی جانے بھی تو کیوں کر
بس وعدہ باطل کو بھی جھٹلا نہیں سکتا
جو اب کو سمجھتا ہے وہ نہیں سکتا

ملاحظات

سش شمار سے کے ساتھ تحریر اپنی زندگی کے چھ برس میں داخل ہو رہا ہے۔ مجھے خود حیرت ہے کہ ایسا ثقہ مزاج کا پرچہ اتنی مدت زندہ کیسے رہ گیا! یہ تو ظاہر ہے کہ تحریر عام روش کا رسالہ نہیں ہے، اس کے مضامین بھی متوسط سطح سے بلند تر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر یہ آج تک جاری ہے، تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس کا خریداروں کا حلقہ وسیع ہے، یا ہم اس کے مالی پہلو سے مطمئن ہیں۔ بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خریدار بھی کافی نہیں؛ اور ہر پرچہ جو شائع ہوتا ہے، وہ ہمارے خزانہ میں اضافے کا بھی باعث ہوتا ہے۔ ہر حال میں یہ دیکھنا ہے کہ کب تک ہمارے قدر دانوں کو اپنے فرض کا احساس نہیں ہوتا، اور وہ ہمیں اپنے تعاون سے محروم رکھتے ہیں۔ یا پھر ہماری مالی حالت کب اتنی سقیم ہو جاتی ہے کہ ہم اس ذہنی عیاشی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ اس پرچے کے ساتھ ہم ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں۔

اردو کے علمی پے چوں میں (اور بد قسمتی سے ان کی تعداد ہی کتنی ہے؟) بالعموم ان موضوعات سے سروکار نہیں رکھا جاتا جن کا براہ راست اردو سے تعلق نہیں۔ میرے نزدیک یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جب تک ہماری زبان میں مختلف موضوعات پر وافر مواد مہیا نہیں ہو جاتا، جس سے ہر طرح کے قاری کو اپنی ضرورت کی چیز دستیاب ہو سکے، ہم کسی عنوان اردو کو ترقی یافتہ زبانوں میں شمار نہیں کر سکتے۔ اشارہ قدیمہ پر مضمون اسی مقصد کے پیش نظر شائع کیا جا رہا ہے۔ اسے ٹاکٹر ضیا الدین ڈیساٹی نے ہماری درخواست پر قلمبند کیا ہے۔ چونکہ ان کی پوری عمر اسی دشت کی بیابانی میں گزری ہے، اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، آپ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی کمی یا خامی نہیں رہ گئی ہے۔ خدا کرے، یہ قارئین کے بھی پسندیدہ موضوعات ہوں!

اگر احباب نے یہ اقدام پسند کیا، تو یہاں بعض اردو عنوانات پر بھی خاص مضمون لکھوانے اور شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

مالک رام

بے ہوشی کی شکایت کیا کریں
 اب وفا داری بھی اک الوام ہے
 تو بہ کر سکتا ہوں، لیکن کیا کروں
 پارہ سائی بھی بہت بدنام ہے

جلائے اسے فلک، تو نے چھانچا، وہ اب جسم بھی
 بلا کا ہے اندھیرا پھر بھی تیرے شامیے میں
 اٹھیں گی انگلیاں اے جوشش! ہر اک نرم میں تیرے
 چلیں گا پارہ سائی کا نہ سگداس زمانے میں
 ہم ماہِ شرم میں چل نہیں سکتے کسی کے ساتھ
 رہتے ہیں آدمی کی طرح آدمی کے ساتھ
 بے دریا کس قدر ہیں محبت کے سلسلے
 دو روز بھی نہیں نہ کسی کی کسی کے ساتھ

تھوڑی قسم میں، تھوڑی قسم
 صداقت تو یہ ہے، صداقت نہیں
 بہت ہیں چمن آشیاں کے پے
 خدائی کسی کی وراثت نہیں

بتا سکا کوئی بسحق کا مدعا نہ مجھے
 خدا پرست بھی کہنے لگے، خدا معلوم
 فلسفے کے مسائل، چھیر، اے غفلت!
 مری نظریں تو معلوم بھی ہے نامعلوم
 دو درخشاں تو دو درخشاں تھا، لیکن ہم محفوظ آتے تھے
 موسم گل کے آتے ہی پر لوٹ بھی گلزاروں میں
 پھول گولے فصل بہاری! کھلتے ہیں تو کھلتے دے
 لیکن یہ تاکید ہے تجھ کو گل نہ کھلیں گلزاروں میں
 وہ مجھ کو آج بھی ہے، کل جو تھا سٹخو درہن میں

قتنے رات دن بیدار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
 میسا ہے تھوڑی آنکھ ہر میا کے حق میں
 مگر یہ آنکھ خود دیوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

محکمہ آثار قدیمہ تاریخ تہذیب تمدن کا ماخذ

تمہید

ہر مسکنِ خاکی کے وجود اور اس میں انسان کے ورود کی تاریخ کا قطعی تعین کم از کم موجودہ معلومات کی روشنی میں تقریباً ناممکنات میں شمار کرنا چاہیے۔ تاہم ماہرینِ اثاریات نے مختلف شواہد کی بنا پر انسان کی زندگی تقریباً پانچ لاکھ سال کی متعین کی ہے۔ نبیِ آدم کی اتنی طویل عمر کے جن حصوں کی تاریخ تو کیا، ان کی معمولی شناسائی تک نوبت آئی ہو، وہ بہت ہی قلیل ہے۔ محققینِ اثاریات کی کاوشیں اور کوششیں انسانی زندگی کے اس زمانہ و راز کی شکل پانچ ہزار سال یا اس سے کچھ ہی زیادہ کی کرٹیل طائفے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

خود تحریر اور کتابت کی عمر جو پچھلے ڈیڑھ سو سال کی تحقیقات کے نتیجے کے طور پر متعین ہوئی ہے، ساڑھے تین ہزار سال کے اندر تہائی جاتی ہے۔ فنیقی حروف کی ابتدا کا سراغ تیرہ صدی قبل از مسیح سے کچھ ہی پہلے تک لگایا جاسکا ہے؛ اس سے قدیم تر مصر کی تصویری تحریر کا وجود زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سال کا طے ہوا ہے اور تقریباً یہی زمانہ وادیِ سندھ میں دریافت شدہ ہڑپا کی تحریروں کا ہے، جو آج تک حل طلب معما بنی ہوئی ہیں۔

اس سے ثابت ہے کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کا بہت تقوڑا حصہ ہمارے علم میں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ محدود علم بھی آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے کا عدم تھا؛ اور ہماری واقفیت جو کچھ بھی تھی، وہ اساطیر سمجھی جاتی تھی۔ علمِ اثاریات اس فراموش شدہ ورثے کو پہچاننے اور معلوم کرنے میں

تباہی خیروں تو سیکڑوں طوفان مارتے ہیں
 لنگوہ قصور خاقان کی عظمت ہم نہ مانینگے
 انتخاب کیا کسی مظلوم کا آنسو سجا ان سے کہ نہیں
 کبھی ایسوں کے وار پر سرباز اتم نہیں

عیاں ہو کر کبھی وہ مستور کیوں ہو ہم نہیں سمجھے
 سر منزل بھی وہی دور ہے کیوں ہم نہیں سمجھے
 جگر کے داغ ڈال کے داغ عیب دشمن میں سینے میں

چراغ زندگی بے نور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
 لڑوں اپنے دل سے کہ اس کی نظر سے
 ہمارے نہ سننے سے ہوتا ہی کیا ہے
 زما دے گا، ہماری کہانی

خستگی میں بھی جو گر گر کے سنھلتے دیکھا
 آفریں کہنے لگی مدد ہی منزل مجھ آ
 کل کی ہے بات کہ خود دل کو میں سمجھا آ تھا
 آج یہ کیا ہو کہ سمجھانے لگا دل مجھ کو

جس زہد پہ زہاد کو ہو رحمت کی توقع
 کچھ کم تو نہیں اس سے مراد امن تر
 نادار کی توقیر نہ ہوگی نہ ہوتی ہے
 دنیا میں تو ہے عیب غریبوں کا ہر جگہ

صل و گہر ہیں دردِ سُرصل و گہر کو کیا کروں
 نے تو نہیں ہو بوند بھر ساغر زہر کو کیا کروں
 دغا تو میں نے سن لیا اب یہ مجھے بتائیے
 آئیں اگر وہ سامنے، وہی نظر کو کیا کروں

بڑا کہہ دیا، یا بھلا کر دیا
 بڑی چیز ہے، جو خوشی یہ زندگی
 دیکھ دغم، درد، آرد و حیرت
 حسن ہو ہر راں یہ ممکن ہے
 بس اب ہم نے جو کہ دیا کھیا
 جسے آپ نے اک سزا کہ دیا
 یہ نہیں بوجہ قضا کہ نہیں
 مگر ایسا کبھی ہوا تو نہیں

انسان کے آڑے آیا۔ البتہ اثریات کا موجودہ انسان ہی تھا، جس نے یہ ذریعہ اپنے ماضی کی دنیا کے لیے پیدا کیا۔ دراصل قدرت الہی نے انسان کے غیر میں شعور کے ساتھ ساتھ تجسس اور تحقیق کا جو مادہ ودیعت کیا ہے، اسی نے ہر دور میں اسے اپنی پیدائش کے اسرار کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ آفرینش سے لے کر آج تک انسان اپنے آغاز اور نشوونما کی ارتقائی صورتوں بذمالتوں کا پتہ لگانے میں تنگ و دو کر رہا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر مختلف لوگوں نے اس سلسلے میں اپنے اپنے نظریے پیش کیے ہیں لیکن ایک عرصے تک اس کا یہ خواب پریشان ہی رہا۔ تاریخی دور کے انسانی معاشرے کے جزئیات کا تو کیا ذکر، بنیادی پہلوؤں سے متعلق بھی ہماری معلومات محدود ہیں؛ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا خود ان ادوار کے بارے میں بھی جن کا قدرے مفصل حال کتب تواریخ یا اس قسم کے دیگر ذرائع میں قلمبند ہوا ہے، ہماری معلومات تشنہ ہیں۔ زمانے کی گردش نے کچھ تو شواہد کو مٹا دیا، کچھ اس دور کے مؤرخین کے نظریات تاریخ نے بھی معاشرے کے صرف انہیں گوشوں کو اجاگر کیا، جو اسے انہیں لکھی تھی اور اپنے زعم میں انہوں نے باقی غیر ضروری پہلوؤں کو رد و شناس کرالے کی کوشش کی۔ ان حالات میں ہم یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ دو چار سوسال کی انسانی زندگی اور معاشرے ہی کے سبھی پہلو ہمارے علم میں پورے اور صحیح طور پر آچکے ہیں۔

بہر حال انسان کی اس سلسلے میں انتہک کوششوں کا نتیجہ علم اثریات ہے۔ علم اثریات کو اکیلی ہی کہتے ہیں۔ آرکیولوجی کے لغوی معنی ہیں: آثار قدیمہ یا قدیم باقیات کی صحیح واقفیت اور علم؛ اس علم کے ذریعے حضرات (کھدائی) یا اس قسم کے دوسرے طریقوں سے دریافت یا حاصل شدہ مختلف النوع قدیم اشیاء، آثار اور باقیات کی تقیث اور ان کے باقاعدہ مشاہدے اور مطالعے سے بنی نوع انسان اور اس کی زندگی اور تاریخ کے مختلف شعبوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس علم کا واحد مقصد انسانی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے ارتقائی مدارج کی تعین میں تقیث اور تحقیق کرنا اور اپنے تحقیقی نتائج کو باثبوت، منظم، مستند اور مرتب طریقہ پر محققین اور عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے انسانی زندگی اور اس کے معاشرے کی تاریخ سے ان کو روشناس کرنا ہے۔ اس علم کے ذریعے سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہماری

انتخابِ کلام

ہوئے بھی ہوں ساقی بھی ہوں ساغر بھی ہو صبا بھی ہو

چاروں کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی ہو
حُسن کا جو ہر تو ہے اس کی اداسے دلکشی

اس کے کیا معنی کہ وہ آفت کا پرکالا بھی ہو
اُن کی باتوں میں اب وہ بات کہاں — اب وہ پہلا سا اشفاق کہاں

جوشِ بزمِ غمزدوں کی قسمت میں — عیشِ لادُنِ خوشی کی رات کہاں
ختم ہو اضطراب، ناممکن — عیش ہو کامیاب، ناممکن

لاکھ جھکا کرے سرِ کمال — اُن کے رُخ کا جواب ناممکن
ے دیا دردِ لا دوا — میسرے خالق یہ کیا دیا مجھ کو

ہوت نے آگے کھول دیں آنکھیں — نظر آنے لگا خدا مجھ کو
اُطل ہے یہ تظارہٴ دنیا مرے آگے — آتا ہو چین بن کے چھلدا مرے آگے

بے غرض سے بھی دردِ تخیل کی رسانی — چلتا نہیں جبریل کا دُعا مرے آگے

مجموعے سے یاد آتا ہو گا نامِ خدا کا لوگوں کو

ان کو دیکھ کے ساری دنیا کا فرہوتی جاتی ہو

دن پڑھیں گے، کون سینگے، اس مکتوبِ محبت کو

جوشِ تمہاری عرضِ تمنا و فتنہ ہوتی جاتی ہو

رباعیات

جب غلام کا سیلاب رواں ہوتا ہے جب کوئی غریب فوجِ خواں ہوتا ہے
ظلم کی محوِ دن پہ پھر ہی پلٹتی ہو جب یارب! اس دقتِ توہماں ہوتا ہے

محکمہ آثار و عہدہ

گزشتہ علمی اور تمدنی کارناموں اور صنعت کاریوں کی عہدہ بندی اور ترقی کی سلسلہ و تاریخ مرتب کی جائے؛ اور دیکھا جائے کہ مختلف ادوار میں انسان مختلف حالات اور حواض میں کیسی زندگی بسر کرتا رہا، زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی موجودہ حالت تک پہنچنے میں وہ کن ارتقائی مدارج سے گزرا؛ وہ کس دور میں کس نوعیت کی زندگی گزارتا رہا؛ اس کے معاشرے کا کیا حال تھا؛ اس کا مذہب کیا تھا؛ اور عقائد کیا تھے؛ وہ کن رسوم کا پابند تھا؛ اس کے ناؤ و زین کا کیا سامان تھا؛ اس کا لباس کیا تھا؛ وہ کن اوزار کا استعمال کرتا تھا؛ اس کی وجہ معاش کیا تھی؛ دیگر اشغال کیا تھے؛ اس نے کیا کیا کام انجام دیے؛ اس کا فکری شعور اور مادی کیفیات کیا تھیں؛ اس کے ذہنی تصورات اور دینی فنون اور ہنر کس پایے کے تھے۔ غرض وہ تہذیب و تمدن کے کن مدارج پر پہنچ چکا تھا، یہ معلوم کرنا ہے۔ اثریات کے محقق کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ بدو خلق سے لے کر تاریخی عہد تک بلکہ اس کے بعد تک کرۂ ارض کے مختلف مقامات پر قائم انسانی نے جو سفر ہائے گوناگوں طے کیے ہیں، ان کی حقیقی الامکان تفصیلی تاریخ مرتب کرے۔

علم اثریات جو کبھی محض کھدائی کا مترادف سمجھا جاتا تھا، اب ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ دنیا کی قدیم تہذیبوں کے ظہور اور ان کی ترقی اور پھیلاؤ کے بارے میں آج ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں، بیشتر اسی علم کی بدولت ہے۔ دنیا کے قدیم خطوں مثلاً افریقہ، مصر، بابل، عراق، ایران، ہندستان وغیرہ کی ماقبل تاریخ یا ابتدائی تاریخ کے ادوار سے مختلف معلومات کے حصول کا واحد ذریعہ یہی علم ہے۔ وجہ اہد فرات، نیل اور سندھ کی دایلوں میں جو مہذب اور مستقر معاشرے وجود میں آئے، اور پردان چڑھے، ان کا حال کچھ وقت پہلے تک پردہ خفا میں پوشیدہ تھا؛ آج اثریاتی تحقیقات نے ان معاشروں کو بینظاہ کر دیا ہے۔

بن جانے، دین کی سطح پر کتنی بستیوں بسیں، اور آجڑیں اور ڈھیر ہو گئیں۔ بنی نوع انسان کے کتنے قافلے یہاں سے گزرے اور گوشہٴ گمنامی میں دفن ہو گئے۔ آفریش سے لے کر آج تک زمین کے ہم آغوش ادبی عیندہ سونے والے یہ انسان اور ان کی بستیاں کب اور کہاں اور کیسے آجڑیں، ان کا حال تو کیا، اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا، اور صدیوں بلکہ ہزاروں سال کے لیل و نہار

کی گردش نے ان خاک نشینوں کے آثار کو بھی تڑان کی، اصلی حالت میں کہاں رکھا ہوگا۔ نیز بھی وقتاً فوقتاً ہزاروں سال کے بارودوش کو ہلکا کرنے کے لیے جو بے انتہا کوششیں کی ہوگی پہلو بے پہلو ہو گئے، ان میں بھی ان زمیں دوزبستیوں اور آبادیوں کے آثار کی حالت کا دگر ہونا ظاہری بات ہے۔

بہر حال یہی آثار ہیں، جو انسان کی تاریخ کی ترتیب کا واحد ماخذ ہیں۔ انسان نے وہ جو بھی اور جس حالت میں بھی رہا ہوگا، زندگی کے لوازم مشابہ و باش، خورد و نوش اور کپڑوں کا انتظام کیا ہوگا۔ ابتدائی دور میں وہ ایسے مقامات پر آباد ہوا ہوگا، جہاں یہ لوازم حیات اسے آسانی مہیا ہو سکیں، اسی لیے عموماً وہ دنیا کے بڑے بڑے دریاؤں — فرات، دجلہ، نیل، سندھ وغیرہ کی وادیوں میں اپنا مسکن بناتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اپنی سست یا غیر مستقل چیزوں کو وہ بدلتا رہا، یا کھوتا رہا۔ یہ چیزیں حوادث اور حالات کے پیش نظر یا رسم و رواج کی تبدیلی کی وجہ سے ناکارہ بن کر بھی پھینک دی جاتی رہیں یا ایک طرف پڑا رہیں۔ جب اس نے تبدیلی مکان کی، تو بھی کئی چیزوں کو وہ چھوڑ کر گیا۔ کھلونے، برتن، زیور دوسری روزمرہ کے استعمال کی چیزیں، اوزار وغیرہ۔ مختلف قسم کی عمارتوں کے کھنڈر اور اس قسم کے مختلف آثار زمین و زمان کی گردشوں میں دفن ہو کر شیلوں کی شکل میں محفوظ ہو گئے۔ یہی وہ آثار ہیں، جن سے کسی تحریری یا تاریخی مواد کی عدم موجودگی میں ان کے استعمال کرنے والے لوگوں کی زندگی اور معاشرے کی نشاندہی ہوتی ہے۔

ماہر اثریات کی دلچسپی کا محض کسی تہذیب کی نوعیت یا اس کے ظہور اور ارتقاء کی مختلف منزلوں کو دریافت یا متعین کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان تہذیبوں کی ابتدا، عروج اور اختتام یا انحطاط کی تہ میں کون سے عوامل کار فرما تھے، وہ اپنی ابتداء سے انتہا کی منزلوں اور مرحلوں سے کیسے گزری؟ اس کا خاتمہ خود انسانی عمل کا نتیجہ تھا، یا فطری حوادث اور قدرتی عوامل اس کے ذمہ دار تھے۔ بالفاظ دیگر انسان اپنی ہری بھری آبادی کو عدم سہولیت یا ایسے دیگر وجوہ کے باعث چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ یا سیلاب، زلزلہ، بھونچال اور اس قسم کے قدرتی حادثوں نے اسے بھگانا دیا۔ غرض علم اثریات کا تعلق انسان کی

بد و جہد سے ہے جو اسے اپنی ارتقائی زندگی کی منزلیں طے کرنے کے دوران میں کرنا پڑی۔

تقریباً

اثریات کی ابتدا آثار کی نشاندہی، تلاش و تفتیش اور ان کی دریافت سے ہوتی ہے، جیسا کہ
ہوا۔ انسان کے جو مادی آثار زیر زمین محفوظ رہ سکے ہیں، وہی اس کی زندگی کی حکایت
سلی کی ترتیب میں مقرر و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ انسان نے رو سے زمین پر جہاں
ہیں اپنا مسکن بنایا، وہاں اس نے کچھ نہ کچھ تبدیلیاں کیں اور اس کی سکونت کے ظاہری
پریشیدہ نشان وہاں رہ جاتے ہیں، جن کی نشاندہی مخصوص طریقوں سے ہوتی ہے۔
وہاں ماہرین اثریات ایسے ہی مقامات کو اپنی توجہ اور کاوشوں کا مرکز بناتے ہیں کیوں کہ
ہاں پر انسانی سکونت کے آثار بکثرت ملیں گے، جن سے انسانی معاشرے اور تہذیب کی تاریخ
رتقا کے لیے وافر مواد مل سکیگا۔

ہرین اثریات جن چیزوں پر اپنی تلاش و تحقیق اور مطالعے کا مدار رکھتے ہیں، وہ دو طرح
ہیں: ایک وہ جو خود انسان نے بنائیں اور دوسری وہ جنہیں انسان اپنے استعمال
یا لایا۔ مقدم الذکر اشیا میں یہ چیزیں شامل ہیں: مکان، برتن یا ظروف، اوزار و
لمحہ، لباس، زیور یا خالص آرائش و زینت کی چیزیں وغیرہ۔ دوسری قسم کی اشیا میں
ہر چیزیں شامل ہیں جو انسان نے نہیں بنائیں، لیکن اس کے استعمال میں رہی ہوں، جیسے
ان جانوروں کی ہڈیاں جنہیں اس نے مثلاً اپنی خوراک کے لیے شکار کیا، اناج یا خورد و پودوں
لے آثار، گھریا مذہبی یا دیگر مقامات کے آتشدانوں کا کوئلہ یا خاکستر وغیرہ۔

ان اشیا میں سے کچھ تو ماہرین اثریات کو زیر زمین تلاش کرنا پڑتی ہیں اور کچھ زمین کے اوپر
بوجود ان کے میں خاص طور پر ماقبل تاریخ دور کے حجرے (یعنی پتھر کے) اوزار ہیں۔ بہر حال دونوں
قسم کے آثار کے لیے وسیع پیمانے پر تفتیش، اور تلاش کا سلسلہ ضروری ہے۔ سب سے پہلے
آثار کے حامل مقاموں کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کی قدامت کچھ تجربہ کچھ روایات اور
یا وہ ترتفتیش، تلاش اور مشاہدے سے متعین کی جاتی ہے۔ یہ مقامات عموماً دریاؤں
وادیوں میں پائے جاتے ہیں، خود دریاؤں کی تہیں (طاس) یا کنارے بھی ان مقامات میں

شامل ہیں۔ بستیوں اور آبادیوں کے آثار کے وجود کی ایک بڑی حد تک نشاندہی مٹی کے ادھنے اور پٹھنوں سے ہوتی ہے۔ یہ ماقبل تاریخ عہد کے آثار کے حامل ہیں، تاریخی عہد کے آثار میں مختلف قسم کی عمارات کتبے، سکے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔
محکمہ آثار قدیمہ ہند

ظاہر ہے، ان امور کے لیے ماہرین اثریات کو اپنی کارگزاریوں کو کئی شعبوں اور اعداد میں تقسیم کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ ان کے ذریعے دریافت شدہ اشیاء کے مختلف مسائل — تلاش، تفتیش، تحقیق، مطالعہ، حفاظت و تحفظ وغیرہ بخوبی کر سکیں۔ دنیا کے دیگر ممالک میں اس علم کے شیدائوں نے عرصہ ہوا، کام شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی اس کا باقاعدہ سلسلہ کچھ اوپر ایک سو سال ہوئے، شروع ہوا۔ لیکن اثریات اور آثار قدیمہ کی طرف ایٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کی توجہ اٹھارہویں صدی کے ریچ آخر میں مبذل ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۸۳ء میں سپریم کورٹ کے جج سرولیم جوس کی رہنمائی میں کلکتے میں ایشیاٹک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس کے اغراض و مقاصد میں اثریات کی تحقیق بھی شامل تھی۔ اس اولین کا قیام اثریاتی تحقیق اور مطالعہ کے لیے زبردست متحرک ثابت ہوا۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں سرانجام کے کارپردازوں کے ذریعے سے حاصل شدہ اشیاء کی حفاظت اور نمائش کی غرض سے ایک عجائب خانہ قائم کیا گیا، جو بعد کو انڈین میوزیم کے نام سے موسوم ہوا اور آج ہندوستان کا غالباً سب سے بڑا عجائب خانہ ہے۔

البتہ آٹانکی تلاش و تحقیق کا کام ایشیاٹک سوسائٹی کی سرگرمیوں کا ایک جزئی حصہ تھا اس لیے ظاہر ہے کہ اس موضوع پر اس نے جو کام بھی کیا، وہ محدود ہونے کے علاوہ صحیح طور پر اثریاتی تحقیق کے اصولوں کے مطابق بھی نہیں تھا۔ مثلاً اس کام کی رپورٹیں اور رودادیں حیرت انگیز روایتوں اور قصہ کہانیوں سے مخلوط تھیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ سوسائٹی نے اس سلسلے میں نہایت ہی اہم خدمات سرانجام دیں، جن میں سب سے اہم اور عمدہ فنون ہندستان کے قدیم رسم الخطوں کا حل ہے۔ ۱۷۸۸ء میں چارلس وکسن نے گپتا اور کٹیلادیم الخط کی قرأت کا صحیح حل دریافت کیا۔ اسی طرح ہڈیس ہاین و سن نے افغانستان کا تفتیشی اور تحقیقی دورہ

کیا اور اس زمانے کے وسائل اور طریقوں کے پیش نظر اس کی رپورٹ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد ۱۸۰۰ء میں گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے فرانس بوشان کو ریاست میسور کی تفتیش پر مامور کیا۔ پھر ۱۸۰۶ء میں صوبہ بنگال کے (جس میں موجودہ بہار اور اڑیسہ کا بیشتر حصہ بھی شامل تھا) جغرافیہ تاریخ، اور قدیم آثار کی ترقیق اور تفتیش کا کام اس کے سپرد ہوا۔ بوشان نے آٹھ سال تک دینا چپور، رنگپور، پورنیا، بھاگلپور، پٹنہ، شاہ آباد اور گورکھپور ضلعوں کا معائنہ دورہ کیا اور اس دورے کی باقاعدہ رپورٹ چھپنے کی نوبت نہیں آئی، مگر نوٹنگوری مارن نے ۱۸۳۸ء میں اس کا تھوڑا سا حصہ شائع کیا تھا۔

۱۸۳۸ء کا سال تاریخی عہد کی اثراتی تحقیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال جیمس پرنسپ نے براہی رسم الخط کا عقدہ حل کر کے اشوک کے کتبوں کی قرائت کی راہ صاف کی۔ اس دریافت سے ہندوستان کے قدیم عہد کی مستند تاریخ کی ترتیب کا ایک نہایت اہم وسیلہ دستیاب ہو گیا۔ دوسری طرف انہی دنوں جیمس فرگوسن نے ۱۸۲۹ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک ملک کے فن تعمیر کے نمونوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور ان کی تعمیری خصوصیات کے اعتبار سے اس فن کے ارتقاء اور متعلقہ امور پر ایک مبسوط کتاب تصنیف کی، جو آج بھی اس موضوع کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ۱۸۴۴ء میں لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے پلیٹ، انڈیا کمپنی سے اجنتا اور دیگر غاروں کی تصاویر کی نقل اتروانے اور ان غاروں کے خاطر خواہ تحفظ کی درخواست کی۔ اس پرائیٹ انڈیا کمپنی کی مجلس منتظمہ نے ان قدیم یادگاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی غرض سے ایک کمیشن کی تشکیل کا اسادہ ظاہر کیا۔ لیکن بعد کو گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ کے ایما پر کمیشن کی بجائے اس کام کے لیے کچھ افسر مقرر کر دیے تاکہ وہ ان یادگاروں سے متعلق ابتدائی رپورٹیں تیار کریں۔ بہر حال انھوں نے اس سلسلے میں کوئی خاص کام نہیں کیا۔

ہندوستان کی اثراتی تحقیق میں دوسرا اہم سال ۱۸۷۷ء کا ہے۔ آثار کی تفتیش اور مطالعے کے سلسلے میں آج تک جو جمود طاری رہا تھا، اسے اس سال توڑا گیا۔ اس کام کا سہرا

ایک فوجی انجنیر الگوئرڈ کنگسم کے سر ہے۔ اس نے گورنر جنرل لارڈ کیلنگ کو ملک بھر کے تاریخی عمارتوں اور آثار کی تقویت اور کتبوں کے مطالعے اور ان سب کے تحفظ کے لیے باقاعدہ پروگرام مرتب کر کے ضرورت کا احساس دلایا۔ کیلنگ نے یہ تجویز منظور کر لی اور یوں آرکیولاجیکل سروے آف انڈیا کی بنیاد رکھی گئی۔ خود کنگسم اس کا پہلا ناظم اعلیٰ مقرر ہوا۔ کنگسم اور اس کے معاونین نے پورے چودہ برس تک شمالی، مشرقی اور وسطی ہند کے نشیب و فراز کو چھان مارا؛ اہم عجائبات اور ہتھار کا کھوج نکالا؛ جو مقامات پہلے سے معلوم تھے، انھیں پھر سے دیکھا اور سکوں، کتبہ اور مجسموں اور دیگر آثار قدیمہ کو ڈھونڈا۔ اس نے ہندو قدیم کے بہت سے مشہور شہروں اور تاریخی مقاموں کے صحیح جانے وقوع کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ ان مقامات میں اورٹوس کی چٹان، تسکیلا کا شہر، سنگلا کا قلعہ، سنکیسا، ہراوتی، کوسمبی، بھرہوت، اشوک کے کتبے، بنگوہ، بلسر، بھیتراؤں، گھیسٹرا اور دیگر گڑھ کے گیتا زمانے کے مندر وغیرہ شامل ہیں۔ کنگسم کے کام کی وسعت اور ساتھ ساتھ اس کی باقوسی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ایک پوری کتاب دیکر ۱۸۶۳ء میں مغربی ہند کے آرکیولاجیکل سروے کے نام سے ایک الگ محکمہ قائم کیا گیا جس کے ذمے ۱۸۸۱ء میں جنوبی ہند کے سروے کی خدمت بھی سپرد کی گئی۔ ۱۸۸۵ء میں کنگسم اپنے عہدے سے سبکدوش ہوا۔

اس کے تقریباً تین سال بعد حکومت نے آرکیولاجیکل سروے کی مرکزی ادارے کی حیثیت ختم کر دی اور اٹریاتی کام کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام تقریباً بند ہو گیا۔ دس سال تک یہی صورت حال رہی۔ اگرچہ لارڈ کرزن کے گورنر جنرل بن کر ہندوستان آنے سے کچھ ہی پہلے محکمہ کو دوبارہ مرکزی ادارہ بنانے اور اسے فعال بنانے کے لیے کچھ اقدام کیے گئے، لیکن اس کی سرگرمیاں کرزن کے ۱۸۹۹ء میں آنے کے بعد از سر نو شروع ہوئیں۔ کرزن کے آتے ہی اٹریاتی تحقیقات اور قدیم عمارتوں کے تحفظ پر پوری توجہ کی گئی، غرض کہ ۱۹۰۲ء میں محکمہ آثار قدیمہ کی از سر نو تشکیل ہوئی اور اس کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے جان مارشل انگلستان سے بلائے گئے۔ مارشل نے تھوڑے ہی عرصے میں اٹریاتی سرگرمیوں کی ترتیب و تنظیم مکمل کر لی۔ چند ہی سال میں ملک کی مستند تاریخی عمارتوں کی مرمت ہوئی، اہم مقامات

محکمہ آثار قدیمہ

برکھائی شروع ہو گئی اور عجائب خانے قائم کیے گئے۔ ۱۹۰۴ء میں قدیم یادگاروں کے تحفظ کا قانون بھی نافذ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں محکمہ آثار قدیمہ کو مستقل حیثیت ملی گئی اور طے پایا کہ اس کا عملہ ناظم اعلیٰ یعنی ڈائریکٹر جنرل، ماہر کتھات یعنی گورنمنٹ ایسیکرافٹ اور ملک کے ہر محفل یعنی سرکلوں کے افسران اعلیٰ پر مشتمل ہو گا۔

اپریل کے ۱۹۲۸ء میں وظیفہ یاب ہونے کے بعد محکمے کو کئی نشیب و فراز پیش آئے۔ ۱۹۳۲ء میں شعبہ تفتیش ختم ہو گیا اور محکمے کی دیگر مدوں کے اخراجات میں بھی تخفیف کر دی گئی۔ دوسری رات انہی دنوں بیرونی افراد اور غیر ملکی اداروں نے اٹریاتی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ چنبرہ ڈو ل کھلائی امریکن اسکول آف اٹھین و ایرینین اسٹڈیز اور بورسٹن میوزیم آف فائن آرٹس نے ل کر کے اس کے اگلے سال سیل اور کبرج یونیورسٹیوں کی طرف سے ایک ماقبل تاریخی اور اوقیاتی وفد ہمت و نرا کی قیادت میں ہندوستان آیا۔ اس نے سارے ملک میں، خاص کر شمال مغرب کے علاقے، میں بڑا وقیع کام کیا۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت ہند نے مشہور انگریز ماہر اٹریات سر لیڈ نارڈ و فلی کو تفتیش اور کھدائیوں کی پالیسی میں پر مشورہ کے لیے مدعو کیا۔ ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر ابراہیم ایرک ماڈیر و ہیلڈائریکٹر جنرل مقرر ہوا۔ اس کے چار سالہ دورِ نظامت میں محکمے نے ہمہ جہتی ترقی کی اور اٹریاتی سرگرمیاں مضاعف ہو گئیں۔ اس نے محکمے کے شعبہ، محفل اور عجائب خانوں کی بھی ادرس نو تشکیل کی۔ سرماڈیر کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کھدائیوں کے دوران میں اس نے محکمے کے افسروں کے علاوہ بیرونی اشخاص کو کھدائی کی تکنیک کی باقاعدہ تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ ۱۹۵۰ء کے آئین ہند کی دوسرے محکمہ اٹریات کی حیثیت میں اہم تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ اب قومی اہمیت کے اٹریاتی کام مرکزی محکمے کے ذمے ہو گئے اور اس کے علاوہ جو کام ہیں اس کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر ہو گئی۔

آزادی تک حکومت ہند کے مرکزی ادارے کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں میں بھی کچھ اٹریاتی کام ہوتا رہا۔ سب سے پہلے ریاست میسور نے ۱۹۰۰ء میں اپنا الگ محکمہ قائم کیا۔ اس کے بعد کشمیر (جنوب میں)، پردوکنے اور (مشرق میں) میسور بھیج کی ریاستوں نے اپنے اپنے ادارے قائم کیے کچھ عرصہ بعد حیدرآباد، گوالیار، ٹراونکور، کوچین، بھوپال، بڑودہ اور جمپور کی

ریاستوں نے بھی محکمے قائم کر لیے، ان میں سے بعض نے بہت ہی اہم خدمات انجام دیں۔ آزادی کے بعد جب ریاستوں کا خاتمہ ہوا، تو یہ ادارے بتدریج مرکزی حکومت کے دائرہ اثریات میں منم ہو گئے۔ سب سے آخر میں ۱۹۵۹ء میں کشمیر کے محکمے کا الحاق عمل میں آیا۔

مرکزی محکمہ اثریات اب حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے شعبہ ثقافتی امور سے متعلق ہے، اس کا وسیع نظام ملک کے تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے جس کا مختصر آئہاں ذکر کیا جاتا ہے: (۱) مرکزی دفتر (نظامت اعلیٰ) نئی دہلی میں ہے۔ اس کے ڈائریکٹر جنرل (ناظم اعلیٰ) کی معاونت کے لیے ایک جوائنٹ ڈائریکٹر جنرل (معاون ناظم اعلیٰ) اور تین ڈائریکٹر (ناظم) ایک اثریاتی مہندس (چیف آرکیولا جیکل انجینیر) اور اس کا معاون (اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیکل انجینیر) اور ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیسٹ مقرر ہیں۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو محکمے کی جانب سے اثریات کا ایک اسکول کھولا گیا ہے، جس میں بیک وقت دس طلباء کو علم اثریات کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ اسکول مندرجہ بالا تین ڈائریکٹروں میں سے ایک کے ماتحت چل رہا ہے۔

(۲) محکمہ نے حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک حلقے میں ایک سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیسٹ اور ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیسٹ اور بعض میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیکل انجینیر بھی مقرر ہے۔ ان حلقوں اور ان کے صدر مقاموں کے نام یہ ہیں: (۱) شمالی حلقہ: آگرہ؛ (۲) شمال مغربی حلقہ: ڈیرہ دکن؛ (۳) وسط مشرقی حلقہ: پٹنہ؛ (۴) مشرقی حلقہ: کلکتہ؛ (۵) جنوب مشرقی حلقہ: حیدرآباد؛ (۶) جنوبی حلقہ: مدراس؛ (۷) جنوب مغربی حلقہ: اورنگ آباد؛ (۸) مغربی حلقہ: بڑودہ؛ (۹) وسطی حلقہ: بھوپال۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا حلقہ ریاست جموں و کشمیر کے لیے سرحدی حلقے کے نام سے بھی قائم کیا گیا ہے، جو ایک سپرنٹنڈنٹ آرکیولا جیسٹ کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ ان حلقوں کا بنیادی کام قدیم یادگاروں کی حفاظت کرنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کھوج یا تفتیش اور کھدائیاں بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کچھ میں برس میں تقریباً ہر حلقے میں چھوٹی موٹی کھدائی ہوتی اور کچھ تفتیشی منصوبوں

پر بھی عمل ہوا۔

(۳) لیکن حضریات یا کھدائی کا ایک مخصوص شعبہ ہے، جس کا صدر دفتر پہلے دلی میں تھا اور اب ناگپور میں ہے۔ اس کے لیے ایک سپرنٹنڈنگ آرکیالاجسٹ مقرر ہے۔ یہ شعبہ وسیع پیمانے پر کھدائی کرتا ہے۔ محکمہ اثریات کی جملہ اہم کھدائیاں اسی شعبے کی طرف سے عمل میں آتی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: (موجودہ پاکستان میں) ضلع راولپنڈی میں تنکھیلہ، پانڈپوری کے قریب اریکمیڈو، ریاست میسور میں برہم گری، اڑیسہ میں شیشتوپال گڑھ، گنگا کی اوپری وادی میں ہستناپور، ستلج کے دامن میں روپڑ اور بارہ اور سلورہ، مالوہ میں ناگلا اور اچین، گجرات میں رنگپور اور لوتھل، راجستھان میں کالی بنگان، مہاراشٹر میں پاوئی وغیرہ پچھلے سال اس شعبے نے گجرات کے ضلع کچھ کے ہڑپائی تہذیب کے مقام دیسپور میں کھدائی شروع کی ہے۔

(۴) شعبہ ماقبل تاریخ: یہ شعبہ ۱۹۵۸ء میں مستقل طور پر قائم کیا گیا۔ اس کا دفتر بھی ناگپور میں ہے اور اس کا نگران انسر سپرنٹنڈنگ آرکیالاجسٹ فار پری ہسٹری کہلاتا ہے۔ (جنوبی ہند کے لیے اس شعبے کی ایک شاخ قائم کی جانے کی تجویز ہے) یہ شعبہ ماقبل تاریخ کی تہذیبوں کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے، جس کے لیے جبری عہد کے آثار کی تفتیش و تحقیق اور ان سے متعلق مسائل کا مطالعہ کرنا اس کا بنیادی کام ہے۔ اپنے مختصر زمانہ کار میں اس شعبے نے دریائے ناپتی کی وادی، بندیکھنڈ کے چند دریاؤں کی وادیاں، شمال میں بیاس اور ہان گنگا کی وادیاں، جنوب میں مشرقی ساحل پر گوڈیم اور دیگر مقام ہوشنگ آباد کے قریب نریڈا کی آبادی اور دیگر جگہوں میں تلاش و تحقیق کا کام انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ آندھرا پردیش اور مہاراشٹر کے کچھ غاروں کا بھی دقیق مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ کام ابھی جاری ہے۔

(۵) شعبہ کتبات: اس کی دو شاخیں ہیں: ایک سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے کتبوں کے لیے، اور دوسری، عربی اور فارسی کتبوں کے لیے۔ مقدمہ الذکر شاخ کا یہ دفتر کافی عرصے تک جنوبی ہند کے مشہور و معروف پہاڑی مقام اوٹاکامنڈ میں تھا۔ ۱۹۷۵ء میں طبرہ میں منتقل ہو گیا۔ اس شاخ میں ایک چیف کتبہ خوان، دو سپرنٹنڈنگ کتبہ خواں اور تین ڈپٹی ہیں۔

عربی اور فارسی کتبوں کے لیے ایک شاخ دہلی کے مرکزی محلے میں ۱۹۴۶ء میں قائم کی گئی تھی۔ اب اس کا دفتر ناگپور میں ہے اور اس کے لیے ایک سپرنٹنڈنٹ کتبہ خواں مقرر ہے۔ مختلف زبانوں کے قدیم کتبوں کو ملک بھر سے فراہم کر کے انہیں پڑھنا اور ان کی تاریخی اہمیت کی نشاندہی کرنا شعبے کا بنیادی کام ہے۔ یہ مسئلہ بات ہے کہ ہند کی قدیم تاریخ کی ترتیب کتبوں کے بغیر ممکن نہیں تھی بلکہ ہمارے ملک کے اولین تاریخی دور کا واحد ماخذ یہی کہتے ہیں،

(۶) شعبہ کیمیا: ڈیرہ دُون میں واقع اس شعبے کا افسر اعلیٰ چیت آریکولا جیکل کیمسٹ کہلاتا ہے۔ اس کے تین محلے ہیں: ایک شمالی ہند کے کام کے لیے ڈیرہ دُون میں، دوسرا جنوبی ہند کے لیے حیدرآباد میں، اور تیسرا جو کرنا لاجی کے لیے ہے۔ اس شعبے کے ذیلی افسر ڈیرہ دُون اور بنشور اور مدراس اور اورنگ آباد میں کام کرتے ہیں، اس شعبے کے فرائض میں قدیم عمارتوں، مجسموں، تصویروں، سیکوں، عجائب خانوں کی اشیاء، دستاویزوں اور اس قسم کے اہم کاغذات اور دیگر آثار کی کیمیائی صفائی اور تحفظ کے کام کی نگرانی کرنا اور ساتھ ساتھ اپنے موضوع میں سائنسی تحقیق کرنا شامل ہے۔ پچھلے دو تین سال سے افغانستان کے مشہور مقام بامیان میں بودھی آثاروں کے تحفظ کے کام میں چیت آریکولا جیکل انجینیر کے ساتھ یہ شعبہ خدمت انجام دے رہا ہے۔

(۷) شعبہ عجائب خانہ: یہ شعبہ کلکتہ میں ہے۔ اس کا افسر اعلیٰ سپرنٹنڈنٹ آریکولا جیکل فارمیوٹیکل کہلاتا ہے۔ اس کا ایک معاون بھی ہے۔ اس کے تحت تین اور مقامی دفاتر ہیں جو سارناتھ، ساپچی اور مدراس میں فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس شعبے کا کام ملک کے ان عجائب خانوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنا ہے، جن کا براہ راست تعلق محکمہ اشیاء سے ہے۔ اہم عجائب خانے ان جگہوں پر ہیں: دہلی کا لال قلعہ، مدراس (فورٹ سینٹ جارج)، سرنگاپٹن (ٹیپو سلطان میوزیم)، سارناتھ، نالندہ، بودھ گیارہا، کجوراپور، تاج مارین کونڈ، امراتی، ہسپی، کونڈاپور، بیجاپور، ونگل، گووہ وغیرہ کے عجائب گھر۔

(۸) شعبہ باغات: اس شعبے کا صدر دفتر بھی ۱۹۵۸ء تک دہلی میں تھا، پھر اسے آگرہ منتقل کیا گیا۔ اس کا افسر اعلیٰ چیت ہارٹیکلچرسٹ کہلاتا ہے۔ اس کے تین معاون دہلی، آگرہ

اور مید میں متعین ہیں۔ یہ شعبہ مشہور و معروف قومی یادگاروں کے ارد گرد باغات لگاتے ہیں یا جو باغ موجود ہیں، ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

(۹) مندروں کی تقشیر کا شعبہ: ہندوستانی کے مشہور و معروف مندروں کے فن تعمیر اور ان کی مختلف طرزوں کی تحقیق اور مطالعہ کے لیے شمالی اور جنوبی ہند کے لیے بالترتیب بھوپال اور مداس میں دو شاخیں قائم کی گئی ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ آف کولاسٹ ان کا افسر اعلیٰ ہے۔ اس شعبے کی طرف سے جنوب کے چلکیا عہد کے مندروں اور شمال کے کچھ مندروں پر کتابیں تصنیف اور شائع ہو چکی ہیں۔

(۱۰) شعبہ نقشہ جات: ۱۹۵۸ء میں یہ شاخ قائم ہوئی۔ اس کا دفتر ناگپور میں تھا۔ اسے ابھی تھوڑے دن ہوئے، بند کر دیا گیا ہے۔ اس شعبہ کا فرض ہندوستان کے اثراتی نقشوں کی ترتیب اور اشاعت تھا۔

مندرجہ بالا مستقل شعبوں کے علاوہ جب کوئی عارضی قسم کا اثراتی کام کسی شعبے سے متعلق پیش آتا ہے، تو اس کے لیے مخصوص انتظام کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آندھرا پردیش کے مشہور ناگارجن ساگر منصوبہ میں جب معروف اور اہم بودھی مقام ناگارجن کنڈا ایر آب ہونے والا تھا، تو اس کے ارد گرد کے آثار کو بچانے کے لیے محکمہ اثرات نے پانچ سال سے زائد عرصہ کے لیے عارضی طور پر ایک شعبہ قائم کر دیا، اور اس مقام کی وسیع پیمانے پر کھدائی کرا کے وہاں کے آثار مثلاً استوپ وغیرہ کو بعینہ وہاں سے منتقل کر کے قریب کی جگہ کی چوٹی پر اسے اسی طرح از سر نو قائم کر دیا۔

مرکزی محکمہ اثرات کے علاوہ بیشتر صوبائی حکومتوں کے اپنے اثراتی محکمے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی نیم سرکاری یا غیر سرکاری اداروں نے بھی جن میں یونیورسٹیاں پیش ہیں، اثراتی کام کیا ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں علم اثرات کو تاریخ ہندو قدیم کے شعبے کے اہم نزدیکی مضمون کی حیثیت دی گئی ہے۔ ان اداروں میں قدیم زمانی کاشف کلکتہ یونیورسٹی حاصل ہے، جس نے بنگال میں ۱۹۳۷ء - ۱۹۴۱ء کے دوران میں بن گرھ کے مقام پر کھدائی کی۔ گزشتہ بیس برس میں پونہ کے دکن کالج پورٹ گریجویٹ اینڈ ریسرچ

انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ کے کاشی پرشاد حبیبوالا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، الہ آباد، ساگر پور
میسور، مدراس، بنارس، ناگپور، کرکوشتر، علیگڑھ وغیرہ کی یونیورسٹیوں اور راجستھان،
مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، اندھرا پردیش، تامل ناڈو، اوڑیسہ، مغربی بنگال، اتر پردیش،
کیرالا، میسور وغیرہ کی ریاستی حکومتوں کے محکموں نے اس سلسلے میں قابل ذکر کام کیا ہے
بعض اہم تاریخی ادبیاتی ملاشوں کے علاوہ ان اداروں کے ذریعے سے متعدد اہم
کھدائیاں عمل میں آئی ہیں۔

محکمہ اثریات کا ایک اور کام مطبوعات ہے، آزادی سے قبل یہی ایک ادارہ
تھا، جس کی طرف سے فن تعمیر کے کئی اثریاتی امور سے متعلق روادین، مستقل تصنیف
فہرستیں، کتابچے وغیرہ شائع ہوتے رہے۔ ان مطبوعات کی فہرست کافی طویل ہے، دوسری
عالمی جنگ کے دوران میں ان مطبوعات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ آزادی کے دو ایک سال
پہلے سرارٹھیر وہیلر کے زمانہ نظامت کی نئی تنظیم کے مطابق محکمہ اثریات کی طرف سے ایک
سالانہ جریدہ الموسوم بہ ہندو قدیم (انٹینڈ انڈیا) کے نام سے شائع ہو رہا ہے، جس میں
اثریاتی تحقیق و تفتیش اور کھدائی اور ان کے نتائج اور مطالعے پر مشتمل مضامین اور رونا
اور اسی طرح کی اور اثریاتی کارگزاریوں کے حالات شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک
بھر میں سال کے دوران میں بھی چھوٹا موٹا اثریاتی کام ہوتا رہتا ہے، چاہے وہ مرکز
محکمہ اثریات کی جانب سے ہو، یا کسی اور ادارے کی طرف سے۔ اس کی رپورٹ محکمہ
اثریات کا ناظم اعلیٰ مجلس مشاورت بڑے اثریات کے لیے ترتیب دیتا ہے، اس کے
علاوہ میمور کا سلسلہ بھی بدستور جاری ہے، اسی طرح کتبوں پر مستقل مطبوعات شائع ہوتی
رہتی ہیں، میمور کے کتبوں کو فتر سے ایک رسالہ ایپیگرافیا انڈیکا کے نام سے شائع
ہوتا ہے، جس میں عربی اور فارسی زبان کے کتبوں کے علاوہ باقی سب کتبوں پر مضامین
ہوتے ہیں۔ اسی دفتر سے ایک اور سالانہ رپورٹ چھپتی ہے، جس میں سال بھر میں جو کتبہ
(عربی اور فارسی کتبوں میں) ملے ہوں یا مطالعے میں آئے ہوں، ان کا مختصر حال اور
بیان، ان کی تاریخی اہمیت پر مشتمل مہوط مقدمے کے ساتھ ایک فہرست کی صورت

میں شائع ہوتا ہے۔ پھر اسی دفتر کے افسروں یا بیرونی حضرات کے مرتبہ اہم تاریخی کتبوں کے مجموعے (CORPUS) بھی شائع ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح عربی اور فارسی کتبوں کی شائع کی طرف سے ایک رسالہ عربی اور فارسی کتبوں کا شائع ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ محکمہ اشریات و فتاویٰ مشہور تاریخی عمارتوں اور مقاموں سے متعلق ”زہنا“ (GUIDE) قسم کے عام فہم کتابچے بھی چھاپتا ہے۔ اسی کے ساتھ پوسٹ کارڈ سائز کی یادگاروں کی تصویروں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

۳

مندرجہ ذیل سطور میں اشریات کے مختلف شعبوں نے ہندوستان میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا مختصر مگر جامع بیان کیا جائیگا:

بنی نوع انسان کی ماقبل تاریخ زندگی کو کئی دہائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان عہدوں کے انسان کے بارے میں ہماری معلومات کا واحد ذریعہ اس کے چھوڑے ہوئے پتھر کے اوزار ہیں۔ جن مقامات میں جس قسم کے اوزار پائے گئے ہیں اس مقام میں ان کے استعمال کرنے والے انسان کی بود و باش اور طور طریقوں کا پتہ ملتا ہے، ان اوزاروں کی ساخت اور تراش اور دیگر متعلقہ اشیاء اور امور سے متعین کیا جاتا ہے۔ ماقبل تاریخی عہد کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہاں ایک بات ذہن نشین رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں یا ملکوں میں یہ ادوار زمانی یا عصریہ عصر مطابقت رکھتے ہوں، ان میں مقام کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے، یہ چار ادوار یہ ہیں:

(۱) قدیم حجری عہد (۲) درمیانی یا متوسط حجری دور (۳) متاخر حجری دور (۴) جدید حجری دور۔

دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہمارے یہاں بھی انتہائی قدیم زمانے میں انسانی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ماہرین اشریات نے ہندوستان میں انسان کے ظہور کا زمانہ نیادہ سے زیادہ لاکھ سال کا بتایا ہے۔ یہاں البتہ ابھی تک پتھر لٹے ہوئے انسان کے آثار نہیں ملے۔ قدیم حجری دور کے انسان کی پہچان صرف اس کے چھوڑے ہوئے پتھر کے بعد سے

اور کھردرے آلات اور اوزاروں سے ہوتی ہے۔ یہ اوزار انسانی نے حوالہ ضروری کر پورا کرنے کے لیے بنائے اور استعمال کیے تھے۔ قدیم حجری دھکا آدمی اس وقت زندگی بسر کر رہا تھا جب کہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمین کی آب و ہوا آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ سخت تھی۔ سمندر کی سطح سے بہت بلند مقاموں پر جیسے عرصہ تک سخت سردی پڑتی اور برف باری ہوتی تھی پھر اس کے بعد اچھی ہی سخت خشکی اور کڑا کے کی گرجی کا دور ہوتا تھا۔ ان اونچے مقاموں کے ساتھ کھلے ہوئے میدانی علاقوں میں باری باری موسلا دھار بارش اور زمین کی سکھائی ہوتی تھی۔ موسم کے ان تحولات کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ زمین کی شکل اور ہیئت میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

قدیم حجری دھ کے اوزار پرلے دیباؤں اور ندیوں کے کناروں کی ڈھلوان سطح پر، خشک خشک ندیوں کی تہوں میں، چٹانوں اور کنکرول کے نشین ذخیروں میں، پہاڑی ٹرائیبل میں اور غاروں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اب تک ایسے کسی غار کا پتا نہیں چلا، جس میں قدیم حجری اوزار تھیں طور پر پائے گئے ہوں۔ ہندوستان میں آج تک جو شواہد ملے ہیں، ان کی بنا پر قدیم حجری دور تقریباً ڈیڑھ لاکھ سال پہلے شروع ہوا اور ستر ہزار سال پہلے تک رائج رہا۔

اس ملک میں قدیم حجری اوزاروں کا سب سے پہلا سراغ ۱۸۶۳ء میں ملا۔ یہ اوزار ہندوستان کے ارضیاتی تقسیم کے محکمے کے ایک افسر رابرٹ بروس کو مدراس شہر کے پاس (اور اب شہر کی حدود میں شامل) پلوزم نامی مقام میں ملے، اس کے بعد تقریباً ستر برس کے عرصے میں قدیم حجری اوزاروں کی کثیر تعداد سندھ اور گنگا کے میدانوں کو چھوڑ کر بھر میں ودیا فت ہوئی، لیکن ان اوزاروں کی ارضیاتی اصول پر تحقیق اور مطالعے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں پیل اور کمبریج یونیورسٹیوں کی طرف سے ایک قابل تاریخی و ارضیاتی مشن ہلمت دفنہ کی قیادت میں ہندوستان آیا اور اس نے ملک میں خاص کر شمال مغربی خطے میں بہت ہی دقیق کام کیا۔

علم ارضیات کے ماہروں نے کشمیر میں برفانی دھکے کی تہوں اور تہ در تہ پر توں کا پتا چلایا ہے،

جو ممکن ہے یورپ کے پلاسیٹوسین عہد یعنی علم ارضیات کے جدید ترین عہد کے ساتھ عصرِ بعصر
 مبالغتہ رکھتے ہوں، لیکن یہاں یورپ کی طرح ان برفانی پرتوں کے ساتھ قدیم جہری اوزار
 نہیں پائے گئے۔ کثیر کے ان برفانی عہدوں کا رشتہ دنیا کے مشن کے نزدیک موجودہ پاکستان
 کے ضلع راولپنڈی میں پولوٹو ہار علاقہ میں دریائے سندھ کی معاون سونہ ندی کی ڈھلوان
 سطحوں سے جا ملتا ہے۔ سونہ ندی کی ان ڈھلوان سطحوں پر قدیم جہری اوزار پائے جاتے
 ہیں۔ انھیں ہندستان کے ماہرینِ اثریات نے "سونہ" اوزار کا اصطلاحی نام دیا ہے۔
 مخصوص سونہ اوزاروں میں پتھر کے ٹکڑے کی اوپری حصے کی ایک طرف کی پرتیں تراش
 کر حصار نکالی گئی ہے۔ چونکہ ان اوزاروں میں ایک طرف دھار ہوتی ہے، اس لیے
 وہ گیرنی تیشے کہلاتے ہیں۔ ماہرینِ اثریات کا خیال ہے کہ اوزاروں کی یہ قسم ہندستان
 میں برما، جاوا، اور چین جیسے مشرقی ممالک سے آئی۔ حال میں اسی طرح کے اوزار
 شمالی ہند میں کانگڑہ کے نزدیک دریائے بیاس کے معاون بان گنگا کی وادی اور سرسہ کی
 وادی میں پائے گئے ہیں۔ ہلڈرم مدراس میں پائے گئے اوزاروں کی وضع قطع قدرے
 مختلف ہے۔ یہ پتھر کے ٹکڑے کے ایک حصے کے دونوں رنوں کو تراش کر دستی کلہاڑی، پتھر
 بندہ، وغیرہ کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اس وضع کے اوزار سونہ کی وادی میں بھی پائے
 تو گئے ہیں، لیکن بہت کم تعداد میں۔

اس طہ سرج ہندستان کا قدیم جہری دور دو موٹے موٹے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا
 ہے: ایک رنخی (سونہ) اور دومنخی (ملاس) اور عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ یک رنخی
 اوزار ہمالیہ کے نچلے علاقوں ہی تک محدود ہیں، جب کہ دومنخی اوزار دوسری جگہوں میں
 عام ہیں، اگرچہ کہیں کہیں دونوں مخلوط بھی پائے گئے ہیں۔

پچھلے چند سال سے قدیم جہری عہد سے متعلق تلاش و تفتیش کا کام زور دہاں پر ہو رہا ہے۔
 مرکزی محکمہ اثریات کے علاوہ اداروں اور یونیورسٹیوں بالخصوص دکن کالج اور بٹوہ
 یونیورسٹی کی کوششوں کے نتیجے میں پنجاب، راجستھان، گجرات، وسط ہند، دکن اور جنوبی ہند
 کی کئی ندیوں کی تہوں اور ڈھلوان پر اس قسم کے اوزاروں پر مشتمل سینکڑوں پتھریں وغیرہ

حکیمہ آثارِ قدیمہ

اور کھردرے آلات اور اوزاروں سے ہوتی ہے۔ یہ اوزار انسان نے حراج ضروری کو پورا کرنے کے لیے بنائے اور استعمال کیے تھے۔ قدیم حجری دود کا آدمی اس وقت زندگی بسر کر رہا تھا جب کہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمین کی آب و ہوا آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ سخت تھی۔ سمندر کی سطح سے بہت بلند مقاموں پر لمبے عرصے تک سخت سردی پڑتی اور برف باری ہوتی تھی۔ پھر اس کے بعد اچھی ہی سخت خشکی اور کڑا کے کی گرمی کا دورہ ہوتا۔ ان اونچے مقاموں کے ساتھ کے طے ہوئے میدانی علاقوں میں باری باری موسلا دھار بارش اور خشکی کی سکھائی ہوتی تھی۔ موسم کے ان تحولات کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ زمین کی شکل اہمیت میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

قدیم حجری دھ کے اوزار پرلنے و دیاؤں اور ندیوں کے کناروں کی ڈھلوان سطح پر، خشک شدہ ندیوں کی تہوں میں، چٹانوں اور کنگروں کے نشیمن ذخیروں میں، پہاڑی تراشیلوں میں اور غاروں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اب تک ایسے کسی غار کا پتا نہیں چلا، جس میں قدیم حجری اوزار اچھنی طور پر پائے گئے ہوں۔ ہندوستان میں آج تک جو شواہد ملے ہیں، ان کی بنا پر قدیم حجری دور تقریباً ڈیڑھ لاکھ سال پہلے شروع ہوا اور ستر ہزار سال پہلے تک رائج رہا۔

اس ملک میں قدیم حجری اوزاروں کا سب سے پہلا سراغ ۱۸۹۳ء میں ملا۔ یہ اوزار ہندوستان کے ارضیاتی تفتیش کے حکم کے ایک افسر رابرٹ بروس کو مدراس شہر کے پاس (اوداب شہر کی حدود میں شامل) پلوزم نامی مقام میں ملے، اس کے بعد تقریباً ستر برس کے عرصے میں قدیم حجری اوزاروں کی کثیر تعداد سندھ اور گنگا کے میدانوں کو چھوڑ کر بھر میں دریافت ہوئی، لیکن ان اوزاروں کی ارضیاتی اصول پر تحقیق اور مطالعے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں ہیل اور کیریج یونیورسٹیوں کی طرف سے ایک ناقابل تاریخی و ارضیاتی مشن ہمت و نوا کی قیادت میں ہندوستان آیا اور اس نے ملک میں خاص کر شمال مغربی خطے میں بہت ہی دقیق کام کیا۔

علم ارضیات کے ماہروں نے کشمیر میں برناتی دود کی تہوں اور تہ در تہ پر تلیں کا پتا چلایا ہے،

محکمہ اوزار قدیمہ

برمکن ہے یورپ کے پلاسیٹوسین عہد یعنی علم ارضیات کے جدید ترین عہد کے ساتھ عصرِ بعصر مطابقت رکھتے ہیں، لیکن یہاں یورپ کی طرح ان برطانوی پرتوں کے ساتھ قدیم جبری اوزار نہیں پائے گئے۔ کشمیر کے ان برطانوی عہدوں کا رشتہ دونا کے مشن کے نزدیک موجود پاکستان کے ضلع راولپنڈی میں پوٹھوہار علاقہ میں دریائے سندھ کی معاون سوبہ ندی کی ڈھلوان سطحوں سے جا ملتا ہے۔ سوبہ ندی کی ان ڈھلوان سطحوں پر قدیم جبری اوزار پائے جاتے ہیں۔ انھیں ہندستان کے ماہرین اثریات نے ”سوبہ“ اوزار کا اصطلاحی نام دیا ہے۔ مخصوص سوبہ اوزاروں میں پتھر کے ٹکڑے کی ادھری حصے کی ایک طرف کی پرتیں تراش کر دھار نکالی گئی ہے۔ چونکہ ان اوزاروں میں ایک طرف دھار ہوتی ہے، اس لیے وہ یک رخ تیشے کہلاتے ہیں۔ ماہرین اثریات کا خیال ہے کہ اوزاروں کی یہ قسم ہندستان میں برما، جاوا، اور چین جیسے مشرقی ممالک سے آئی۔ حال میں اسی طرح کے اوزار شمالی ہند میں کاگرہ کے نزدیک دریائے بیاس کے معاون بان گنگا کی وادی اور سرسہ کی وادی میں پائے گئے ہیں۔ پائوزم مدراس میں پائے گئے اوزاروں کی وضع قطع قدرے مختلف ہے۔ یہ پتھر کے ٹکڑے کے ایک حصے کے دونوں رخوں کو تراش کر دستی کلہاڑی، چھرا، بندوق، وغیرہ کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اس وضع کے اوزار سوبہ کی وادی میں بھی پائے تو گئے ہیں، لیکن بہت کم تعداد میں۔

اس طہ سرح ہندستان کا قدیم جبری دور دو موٹے موٹے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک رنجی (سوبہ) اور دوسری (مدراس) اور عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ یک رخ اوزار ہمالیہ کے نچلے علاقوں ہی تک محدود ہیں، جب کہ دوسری اوزار دوسری جگہوں میں عام ہیں، اگرچہ کہیں کہیں دونوں مخلوط بھی پائے گئے ہیں۔

پچھلے چند سال سے قدیم جبری عہد سے متعلق تداخل و تفتیش کا کام زور دیں ہو رہا ہے۔ مرکزی محکمہ اثریات کے علاوہ اداروں اور یونیورسٹیوں بالخصوص دکن کالج اور بڑوہ رینیر ریسرچ کی کوششوں کے نتیجے میں پنجاب، راجستھان، گجرات، وسط ہند، دکن اور جنوبی ہند کی کئی جگہوں کی تہوں اور ڈھلوان پر اس قسم کے اوزاروں پر مشتمل سینکڑوں تہ نشیں وغیرہ

دریافت کئے گئے ہیں۔

وسطی ہند اور دکن میں قدیم حجری دھلکی دستی کلہاڑی اور چھڑے کی قسم کے اوزاروں کی جگہ ایک دوسری وضع کے اوزار کا استعمال پایا گیا ہے۔ کچھ عرصے تک، قدیم الذکر اوزاروں کو سلسلہ اول اور موخر الذکر کے لیے سلسلہ دوم کے اصطلاحی نام استعمال کیے جاتے تھے، لیکن اب ماہرین ان کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس سلسلہ دوم والے اوزار جسامت میں چھوٹے ہیں اور نسبتاً بہتر قسم کے پتھر سے بنے ہیں۔ ان کی شکلوں میں بھی زیادہ تنوع پایا جاتا ہے مثلاً ان میں دھار والے اوزار شامل ہیں۔ کم از کم دریا سے زبدا کے کنارے پر واقع مہیشوڈی اور گوداری کی معادن پر دراکے کنارے فواسا میں واضح طور پر ایسے طبقاتی شواہد پائے گئے ہیں، جن کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلے یعنی دوم کے اوزار سلسلہ اول کے اوزاروں کے بہت بعد کے ہیں کیونکہ اول الذکر واضح اور علیحدہ ذخیرے کی شکل میں بہت اوپری تہوں میں ملے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ دوم کے اوزاروں نے سلسلہ اول کے اوزاروں کی بلاد اسطہ جگہ نہیں لی۔ جسامت سے قطع نظر سلسلہ دوم کے اوزاروں کی شکلوں کو مانکر لینیۃ یعنی چھوٹے حجری اوزاروں کا پیشرو قرار دیا جاسکتا ہے۔

یورپ، افریقہ اور مغربی ایشیا (مشرق وسطی) میں مانکر و لینیوں کو قدیم حجری عہد اور متاخر حجری عہد کے درمیان متوسط حجری عہد کے زمانے کا قریب لایا گیا ہے۔ ہندستان میں متوسط حجری عہد کی موجودگی زیادہ یقینی طور پر ثابت نہیں ہوئی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ عہد یہاں تقریباً پچھتر ہزار سال پہلے شروع ہوا اور اب سے دس گیارہ ہزار سال پہلے اختتام کو پہنچا۔ کچھ دریافت شدہ شواہد کی بنا پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے آخر ہی میں نئے یعنی متاخر حجری دور کی اوزار سازی کی صنعت وجود میں آچکی تھی؛ مگر یہ کب ہوا، اس کی تعیین ابھی تک نہیں ہو سکی۔ اس متوسط حجری عہد کے اوزار مقابلاً صاف اور تیز اور ذکیلے پائے گئے ہیں۔ نوعیت میں یہ اوزار تیز اور نیزوں کی کوکل جیسے چھیلنے والے برے وغیرہ کی قسم کے ہوتے تھے۔ ابتدائیں اس دور میں دستی کلہاڑیاں اور چھڑے پائے جاتے ہیں، لیکن جلد ہی اس کی ساخت اور تراش میں تیزی آیا اور کچھ عرصہ میں ان کا بننا بند ہو گیا۔ اس

حکمہ آثار قدیمہ

ہند کے جن اولادوں کا اوپر ذکر ہوا، وہ بھی جسامت میں چھوٹے ہوتے گئے اور آخری زمانہ ان کی شکل مانگرولیتھ کی سی ہو گئی۔ جنوبی ہند کے مشرقی ساحل پر گوڈیم کے قریب کے آثار بھی اس دور کے حجری اور اڑلے ہیں، اگرچہ وہاں کسی سکونت کے آثار نہیں پائے گئے۔

ہندستان میں مانگرولیتھ کو ان کی جگہ وقوع کے اعتبار سے تین واضح قسموں میں بانٹا ہے: پہلی قسم قدیم ترین مانگرولیتھ کی ہے، جو منترہاے جنوبی ہند میں سرخ ریت کے ٹیلوں (جنہیں مقامی زبان میں تیری کہا جاتا ہے) اور مغربی بنگال میں صنلع بردوان کے ہیر بھلن پور سے مقام پر پائے گئے ہیں۔ یہ شکل میں کچھ بھدے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی اور اشیاء آثار نہیں ملے۔ قسم دوم، ان مانگرولیتھ کی ہے، جو آندھرا پردیش میں ناگارجن کٹھ اور رات میں لنگن باج جیسی جگہوں پر دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ جواشیاء مٹیائی گئی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ اس عرصے میں ظروف کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔ مانگرولیتھ انیسویں قسم، چاکولیتھک یعنی دھاتوں کے استعمال کے زمانے کے شباب سے تعلق رکھتی ہے۔

ہاں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ دنیا کے دیگر ممالک کے برعکس ہندستان میں ابتدائی چاکولیتھک عہد کے آثار اب تک کہیں سے نہیں ملے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ہمارے یہاں اس عہد کی تہذیب قدرے تاخیر سے شروع ہوئی۔

قبل تاریخ کا تیسرا دور متاخر حجری دور ہے۔ اس کی ابتدا کے زمانے کی صحیح طور پر تعین کرنا ممکن نہیں ہو سکا اس کے آثار تقریباً دو ہزار سال قبل از مسیح تک بعض ایسے مقامات پر ملے ہیں، جو دشا و گندار ہیں۔ ان میں سے کچھ مقاموں پر اس حجری دور کے آثار دوسری صدی مسیح تک کے بھی ملے ہیں۔

قبل تاریخی عہد کا چوتھا دور جدید حجری دور ہے جس میں انسان کی تمدنی زندگی نے نمایاں رتی کی۔ اس دور کے حجری اور اڑلے پھیلے دوا دوال کے اولادوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بہتر اور ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں ہندستان میں انسانوں نے زراعت اپنیشہ اختیار کیا اور مویشی اور دوسرے جانور پالنا شروع کیے۔ نیز یہ بھی دیکھا گیا کہ یہاں اس عہد کے جواولین آثار ملے ہیں، وہ اس دور کی تہذیب کے بلوغ پر دال ہیں۔

محکمہ آثار قدیمہ

دریافت کئے گئے ہیں۔

دسلی ہند اور دسویں میں قدیم حجری دھڑکی دستی کلہاڑی اور چھڑے کی قسم کے اوزاروں کی جگہ ایک دوسری وضع کے اوزار کا استعمال پایا گیا ہے۔ کچھ عرصے تک مقدم الذکر اوزاروں کو سلسلہ اول اور موخر الذکر کے لیے سلسلہ دوم کے اصطلاحی نام استعمال کیے جلتے تھے، لیکن اب ماہرین آثار ان کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس سلسلہ دوم والے اوزار جسامت میں چھوٹے ہیں، اور نسبتاً بہتر قسم کے پتھر سے بنے ہیں۔ ان کی شکلوں میں بھی زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ مثلاً ان میں دھار والے اوزار شامل ہیں۔ کم از کم دریا سے نزدیک کنارے پر واقع مہیشوہیں اور گوداوری کی معاون پرورا کے کنارے نواسا میں واضح طور پر ایسے طبقاتی شواہد پائے گئے ہیں، جن کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلے یعنی دوم کے اوزار سلسلہ اول کے اوزاروں کے بہت بعد کے ہیں کیونکہ اولیٰ الذکر واضح اور علیحدہ ذخیرے کی شکل میں بہت اوپری تہوں میں ملے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ دوم کے اوزاروں نے سلسلہ اول کے اوزاروں کی بلا واسطہ جگہ نہیں لی۔ جسامت سے قطع نظر سلسلہ دوم کے اوزاروں کی شکلوں کو مانگر ولیتہ یعنی چھوٹے حجری اوزاروں کا پیشرو قرار دیا جاسکتا ہے۔

یورپ، افریقہ اور مغربی ایشیا (مشرق وسطیٰ) میں مانگر ولیتوں کو قدیم حجری عہد اور متاخر حجری عہد کے درمیان متوسط حجری عہد کے زمانے کا قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں متوسط حجری عہد کی موجودگی زیادہ یقینی طور پر ثابت نہیں ہوئی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ عہد یہاں تقریباً پچھتر ہزار سال پہلے شروع ہوا اور اب سے دس گیارہ ہزار سال پہلے ختم ہو گیا۔ کچھ دریافت شدہ شواہد کی بنا پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے آخر ہی میں نئے یعنی متاخر حجری دور کی اوزار سازی کی صنعت وجود میں آچکی تھی؛ گو یہ کب ہوا، اس کی تعیین ابھی تک نہیں ہو سکی۔ اس متوسط حجری عہد کے اوزار مقابلاً صاف اور تیز اور زکیلے پائے گئے ہیں۔ نوعیت میں یہ اوزار تیز اور نیزوں کی کوکڑ جیسے چھیلنے والے برے وغیرہ کی قسم کے ہوتے تھے۔ ابتدائیں اس دور میں دستی کلہاڑیاں اور چھڑے پائے جلتے ہیں۔ لیکن جلد ہی اس کی ساخت اور تراش میں تیز رفتاری آتا اور کچھ عرصہ میں ان کا بننا بند ہو گیا۔ اس

حکمہ آثار قدیمہ

ہند کے جن اوزاروں کا اوپر ذکر ہوا، وہ بھی جسامت میں چھوٹے ہوتے تھے اور آخری زمانہ ان کی شکل مانگرولیتھ کی سی ہو گئی۔ جنوبی ہند کے مشرقی ساحل پر گوڈیم کے قریب کے غار بھی اس دور کے حجری اوزار ملے ہیں، اگرچہ وہاں کسی سکونت کے آثار نہیں پائے گئے۔

ہندستان میں مانگرولیتھ کو ان کی بجائے وقوع کے اعتبار سے تین واضح قسموں میں بانٹا ہے: پہلی قسم قدیم ترین مانگرولیتھ کی ہے، جو منترہاے جنوبی ہند میں سرخ ریت کے ٹیلوں (جنہیں مقامی زبان میں تیری کہا جاتا ہے) اور مغربی بنگال میں صلیح بردوان کے ہیر بھل پورہ کے مقام پر پائے گئے ہیں۔ یہ شکل میں کچھ بھدے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی اور اشیاء آثار نہیں ملے۔

قسم دوم، ان مانگرولیتھ کی ہے، جو آندھرا پردیش میں ناگارجن کٹھہ اور رات میں لنگن بلج جیسی جگہوں پر دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ جو اشیاء پائی گئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس عرصے میں ظروف کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔ مانگرولیتھ انگریزی قسم، چاکولیتھک یعنی دھاتوں کے استعمال کے زمانے کے شباب سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ دنیا کے دیگر ممالک کے برعکس ہندستان میں ابتدائی اٹکولیتھک عہد کے آثار اب تک کہیں سے نہیں ملے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ دوسرے لوں کے مقابلے میں ہمارے یہاں اس عہد کی تہذیب قدرے تاخیر سے شروع ہوئی۔

قبل تاریخ کا تیسرا دور متاخر حجری دور ہے۔ اس کی ابتدا کے زمانے کی صحیح طور پر تعین کرنا ممکن نہیں ہو سکا اس کے آثار تقریباً دو ہزار سال قبل از مسیح تک بعض ایسے مقامات پر ملے ہیں، جو دشوار گزار ہیں۔ ان میں سے کچھ مقاموں پر اس حجری دور کے آثار دوسری صدی

قبل تاریخ عہد کا چوتھا دور جدید حجری دور ہے جس میں انسان کی تمدنی زندگی نے نمایاں ترقی کی۔ اس دور کے حجری اوزار پچھلے دو ادوار کے اوزاروں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بہتر اور ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں ہندستان میں انسانوں نے زراعت پیشہ اختیار کیا اور مویشی اور دوسرے جانور پالنا شروع کیے۔ نیز یہ بھی دیکھا گیا کہ ہاں اس دور کے جو اولین آثار ملے ہیں، وہ اس دور کی تہذیب کے بلوغ پر دلالت ہیں۔

اس دور کی ابتدائی شکل کی تشفی بخش نشاندہی کرنے والے کوئی آثار اب تک دریافت ہوئے؛ اسی لیے اس تہذیب کا ابتدائی حال معلوم نہیں ہو سکا، اس دور کی جو قدیم تاریخ معلوم ہوئی ہے، وہ دو ہزار تین سو قبل از مسیح ہے اگرچہ یہ قریبی قیاس ہے۔ کی ابتدا تقریباً چار ہزار سال قبل از مسیح ہوئی ہوگی۔ اسی طرح اس کے اختتام کا بھی تقریباً گیارہ سو سال قبل از مسیح کا قیاس کیا جاتا ہے۔

جدید ہجری یعنی نیولیتھ اوزار پیشتر ذکر کردہ صاف کیے ہوئے پتھر کے کھارڈل پر مشتمل ہیں۔ پورے وسط ہند، دکن اور جنوبی ہند میں دستیاب ہوئے ہیں۔ شمال مشرقی ہند میں بھی ان کے اوزار ملے ہیں، لیکن یہاں وہ بحیثیت مجموعی، شکل میں قدرے مختلف ہیں مثلاً مقدّمہ علاقوں میں ان کی شکل تراش کے لحاظ سے مدور اور بیضوی ہے جب کہ شمال مشرقی حصّہ یہ لمبوتری ہے اور کسی کسی میں ان کے شانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال سے ماہرین اثریات نے یہ قیاس کیا ہے کہ کوئی تعجب نہیں، اگر شمال مشرقی اوزار کی وضع مشرقی ممالک کے اوزاروں کی طرز پر ہو۔

اس دور کے چند ہی قدیم مقاموں یعنی وہ مقام جو تانبے کی دریافت اور استعمال سے پہلے کے ہیں، ان کی کھدائی دکن ہی میں عمل میں آئی ہے۔ اس سلسلے میں جو بھی محدود قسم کی شہادتیں دستیاب ہوئی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ جدید ہجری دور میں کھدائی قسم کے کالے یا تھوڑے رنگ کے ظروف رائج تھے۔ ان اوزاروں کے ذخیروں میں بعض اوقات ماگرو لیتھ بھی پائے گئے ہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ وسطی اور جنوبی ہند میں نیولیتھ (جدید ہجری اوزار) اور ماگرو لیتھ (چھوٹے پتھر کے اوزار) تانبے کی بنی ہوئی چیزوں کے ساتھ ملے ہیں۔ یہ بعید از امکان نہیں کہ جدید ہجری دور کی روایات چالکولیتھک یعنی وحاقوں کے عہد میں بندھیا چل کے پہاڑوں تک جنوب سے پہنچی ہوں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہندستان میں چالکولیتھک عہد کے آثار دنیا کے دیگر ممالک کے برعکس کافی بعد کے زمانہ میں دستیاب ہوتے ہیں۔ چاہے تو یہ تھا کہ چالکولیتھک عہد، جدید ہجری دور کے بعد ہوتا، لیکن

ہاں جدید عجمی دور اور چالکولیتک عہد کے درمیان ایک ادھ تہذیب کے رواج کا پتا
نہے جس کا تعلق کانسی عہد (برونز ایج) سے ہے۔

۱۶-۱۹۲۲ء میں سب سے پہلے اس تہذیب کے آثار دریافت ہوئے، لیکن ان میں
اس وقت تک کی کھدائیوں کے آثار میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ دہلی سندھ کی
اس تہذیب کا اصطلاحی نام اب ہڑپا تہذیب ہے۔ اس کی دریافت تاریخ ہندستان
اس ایک معرکہ آراء واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس تہذیب کے آثار پہلے ہل مغربی
پاب (پاکستان) کے ضلع خشکری کے مقام ہڑپا میں برآمد ہوئے۔ اس کے بعد سندھ
پاکستان کے ضلع لاڑکانہ میں موہن جو دڑو کی کھدائی سے بھی اس کے آثار نکلتے ہیں۔ دریافت
ہندوستانی تہذیب کے آغاز کے نظریے میں انقلاب پیدا کر دیا۔ دریافت شدہ چیزوں
اس سنگ جراحہ کی وہ مہریں بھی تھیں، جن پر ایک نامعلوم زبان کی تحریریں ہیں (یہ
زیریں آج تک ناخواندہ ہیں) جب ان مہروں کی مختصر کیفیت لندن اخباروں میں شائع
وئی، تو غیر ملکی اہل تحقیق نے توجہ دلائی کہ ان مہروں میں اور عراق کے کچھ مقامات سے
آمد شدہ مہروں میں بڑی مشابہت ہے۔ چونکہ عراقی مہریں غالباً دو سے تین ہزار سال
بل اندیس کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے ہندوستانی آثار قدیمہ کی مدت عمر میں بھی
دو ہزار سال کا اضافہ ہو گیا، ورنہ اس سے یہاں پہلے یو جی عہد کے آثار کے علاوہ کوئی
قدیم چیز دریافت نہیں ہوئی تھی۔ دہلی سندھ کی یعنی ہڑپا تہذیب کی دریافت کے
ملک بھر میں ایک ہوجان پیدا کر دیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے
۱۹۲۷ء میں شعبہ تفتیش قائم ہوا۔

ہڑپا تہذیب کی خصوصیات میں پختہ اینٹوں کے مکانات، مرتب و منظم شہری نقشہ بندی اور
پانی کی نکاسی کے لیے نالیوں اور موڑیوں کا باقاعدہ انتظام شامل ہیں۔ اس تہذیب کے لوگوں
کی بنائی ہوئی چیزوں میں مذکورہ بالا سنگ جراحہ کی مہریں جن پر غیر معمولی جانوروں کی
تصویریں اور نامعلوم تحریریں پائی جاتی ہیں، چاک پر بنائے ہوئے مخصوص شکلوں کے سرخ
طروف جن میں سے کچھ پر کالے رنگ کی خاص طرح کی نقاشی ہے، چرٹ قسم کے پتھر کے لیے

پھل، کانسی کی اشیاء، پکائی ہوئی مٹی گئے دیوڑیوں، دیوتاؤں، انسانوں اور جانوروں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے، سونے کے زیور اور جھوٹے پتھروں کے منکے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موہن جو دڑو میں ۱۴۳۱ء تک وسیع پیمانے پر کھدائی ہوئی رہی۔ اس میں دو بڑے شہروں کے آثار برآمد ہوئے۔ ایسی اہم دریافت کو ادھورا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک سندھ اور بلوچستان کے مختلف حصوں میں تلاش و تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ اس سے سندھ میں ہڑپا تہذیب کے حامل چھوٹے چھوٹے مقاموں کی بڑی تعداد منظر عام پر آگئی۔ لیکن اس کے علاوہ ایک نہایت اہم دریافت یہ ہوئی کہ امری کے مقام پر ہڑپا تہذیب یعنی قدیم تر تہذیب اور پھر چھوڑا اور چنودڑو کے مقامات پر اس کے بعد کی ایک اور تہذیب کا سراغ ملا۔ بلوچستان میں بھی بکثرت ایسے مقامات ملے، جن میں سے کچھ ہڑپا تہذیب سے قریب تر تھے اور کچھ اس کے بعد کے زمانے کے ماہرین نے اس قابل ہڑپا تہذیب کا زمانہ تین ہزار سال قبل از مسیح کے اوپر متعین کیا ہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد جن اور مقاموں میں ہڑپا تہذیب کے آثار کا پتا ملا ہے، ان میں خاص خاص یہ ہیں: ضلع انبالہ میں کوئلہ ننگ، ریاست بہاولپور (پاکستان) میں پرانے دیبا سے سرسوتی کے ساتھ کے کئی مقام؛ ضلع انبالہ میں روڑی؛ ضلع میرٹھ میں عالمگیر پور؛ ریاست گجرات کے ضلع سریندر نگر میں رنگپور؛ ضلع احمد آباد میں کوٹھل؛ اور ضلع سورت میں مالون، وغیرہ۔ ہڑپا تہذیب کا انتہائی جنوبی مقام جو اب تک دریافت ہوا ہے، دریائے ناپتی کے دہانے کے قریب ضلع سورت کا یہی مقام مالون ہے۔

مغرب سے لے کر مشرق تک اور شمال سے لے کر جنوب تک تقریباً آٹھ سو میل کے طویل عرض میں پھیلی ہوئی اس ہڑپا تہذیب کی بنیادی خصوصیات کم و بیش سب جگہ یکساں ہیں۔ اگرچہ قدرتا ان میں کچھ مقامی فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کوٹھل میں مخصوص ہڑپائی ظروف کے علاوہ ہلکے گیردے رنگ کے اور سیاہ و سرخ رنگ کے ظروف بھی ملے ہیں۔ بہر حال اس تہذیب کا پھیلاؤ امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بات بلا غور و تردید کہی جاسکتی ہے کہ ایشیا کی کانسی عہد کی جملہ تہذیبوں میں اس

تہذیب کا پھیلاؤ سب سے زیادہ تھا۔

جب ۱۹۲۶ء میں ہڑپا میں از سر نو کھدائی کی گئی، تو ایک ٹیلے کے چاروں طرف بہت اونچی فصیل برآمد ہوئی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ٹیلے پر شہر کی اہم عمارتیں ہونگی جس کی حفاظت خاص طور پر منظور تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہاں کی کٹھری زندگی جمہوری طرز کی نہیں ہوگی، علاوہ انین، ایک قبرستان بھی برآمد ہوا، جس کے اجاڑے میں لاکھ دفنائی ہوئی لاشوں کے پتھر ملے۔ روڑ میں کچی اور پکی اینٹیں، پتھر کی دیواریں، سنگ جراثحت کی مہریں اور اس تہذیب کی دوسری مخصوص اشیاء اور ظروف دستیاب ہوئے۔ یہاں بھی ایک قبرستان برآمد ہوا تھا۔ لوٹھل میں ہڑپا تہذیب کے لوگوں کے مکانات عموماً پکی اینٹوں کے تھے، جن میں باقاعدہ اندرونی حمام اور نالیوں کا انتظام تھا۔ یہ نالیاں باہر سڑک کی نالیوں سے ملائی گئی تھیں۔ گندے پانی کی نکاسی کے لیے گندے پانی کے حوض اور مشکوں والے گڑھوں کا استعمال رائج تھا۔ غرض ان دریافتوں سے اس زمانے میں شہر کی بلدیاتی سہولتوں کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوٹھل کی سب سے اہم دریافت اینٹوں کا بہت بڑا احاطہ ہے جس کی لمبائی مشرق سے مغرب تک ۸۰ میٹر اور شمال سے جنوب تک چوڑائی ۷۰ میٹر ہے۔ اس چوڑے سے یہاں کے لوگ گودی کا کام لیتے تھے۔ اس گودی کو قریب میں بہتے ہوئے دریا سے بھر گاؤہ کے ساتھ ایک سات میٹر چوڑے نالے سے جوڑا گیا تھا یہ اور دوسرے بڑا چوک بنا پر یہ قیاس کیا گیا ہے کہ ملک کے اس حصہ سے مغربی ایشیا کے ممالک کے ساتھ تجارت یا اس قسم کی کسی اور غرض سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ نیز یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہڑپائی لوگ مشرق میں دریائے جمن کی وادی تک تو دریاؤں کے راستے سے پہنچتے تھے، لیکن گجرات میں ان کا ورود غالباً سمندری راستے سے ہوا تھا۔

لوٹھل کی سکونت کے بارے میں یہ دریافت ہوا کہ اس مقام کی پانچ ارتقائی منزلیں تھیں، جن میں سے چار تو ہڑپا تہذیب کے عہد تکمیل سے وابستہ تھیں اور آخری اس کے بعد کی حالت سے۔ آخری ارتقائی حالت میں شہری آبادی کا نقشہ اتنا مرتب نہیں تھا، جتنا کہ

حکمت آثار قدیمہ

تھمیر حالاتوں میں؛ یہاں ظروف کی نئی قسمیں بھی تدریجاً ظروف کی ارتقائی شکلیں تھیں۔ یہاں بھی ایک قبرستان دریافت ہوا اس میں ابتدائی تاریخی زمانے کی اود بعد کے اودوں کی قبریں برآمد ہوئیں۔ قدیم زمانے کی قبروں میں دو انسانی ڈھانچے پہلو بہ پہلو رکھے ہوئے تھے۔ یہاں کی مہروں پر جانوروں کی جوشکلیں بنی ہوئی ہیں، ان میں سے ایک شیر کی ہے؛ دوسری شکل ایک ایسے جانور کی ہے جس کا منہ ہاتھی کی سونڈ جیسا ہے، سینک جیل جیسے ہیں اور دم کھڑی ہے اور سانپ کی سی دکھائی دیتی ہے ظروف کے نقش و نگار کے عام موضوع سارس، بارہ سنگا، مور، چڑیا، سانپ وغیرہ ہیں؛ کچھ پرندوں کی جھنک میں بھی ہے۔

عالمگیر پور میں چار زمانوں کی بستیوں کا سراغ ملا۔ ان میں سب سے پرانی آبادی کا تعلق ہڑپا تہذیب سے تھا۔ مگر اس زمانے کی عمارتوں کا کوئی نشان نہیں ملا، لیکن اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ یہ پختہ ایشیوں اور لمبرترے کپڑوں سے بنائی جاتی تھیں۔ اس کے ظروف میں پایہ دار نشتری، مخروطی پینڈے دار پیالے وغیرہ قسم کے ہڑپائی وضع کے مخصوص برتن ملے ہیں۔ ظروف کے نقش و نگار میں پیشوں، مثلث، مربع، متقاطع دائروں، ٹوٹوں، مرد، وغیرہ کو بعد موضوع استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ ناندوں پر کھدی ہوئی مخصوص علامتیں ہیں اور ان میں سے ایک پر کپڑے کے ٹپے کا نشان بھی پایا گیا ہے۔ پکی ہوئی مٹی کے چھوٹے مجسمے بھالو، کوہنڈا، بیل اور سانپ کی شکلوں کے تھے۔ دوسری چیزوں میں قرص، گارٹیاں، گلاب پانسے، تنکے جن میں سے ایک پر سونا چڑھا ہوا تھا، اور چوڑیاں شامل ہیں۔ نیز مٹی کی نقشاں چوڑیاں، سنگ جراثیم اور نیم قیمتی پتھروں کے منکسے، لپین اور ایک کالسی یا تانبے کا ٹوا ہوا پھل پایا گیا ہے۔

ہڑپائی یہ عظیم تہذیب کس طرح وجود میں آئی، اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں۔ اس کا علاقہ سے قریبی تعلق ہڑنا برآمد شدہ مشترک النوع آثار اود اشیا سے ثابت ہے۔ پھر بھی یہ بعید از اسکان نظر آتا ہے کہ ہڑپائی لوگ وسط ایشیا کی کسی جگہ سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہوں۔ بلوچستان میں کئی چالکولیتھک یعنی دھاتوں کے عہد کی تہذیبوں کی موجودگی ہڑپا تہذیب کے

عروج کمال یا بلوغ سے قبل کی تسلیم کی جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ ہڑپائی عہد تک موجود تھیں۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کی خصوصیات ہڑپائی تہذیب سے طبعی جلتی ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو بھی ہڑپا تہذیب کا سرچشمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسی طرح ہڑپا تہذیب کے خاتمے کے بارے میں بھی قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بہت سارے اسباب مثلاً بیرونی حملے، سیلاب، زمین کا سوکھ جانا وغیرہ بتائے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں بھی کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ جہاں تک شمالی حصے کا تعلق ہے، افریاتی شواہد مبہم ہیں۔ موزمبیق جو ڈیو میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ہڑپا تہذیب شہر کے آخری فزوں میں ڈوبا خطاط ہوجی تھی اور بیرونی ذرائع سے بھی کچھ تباہی ضرور عمل میں آئی۔ جھوکنا دھو چھوٹو میں ایک بعد کی تہذیب کا جو جھوکڑ تہذیب کے نام سے موسوم ہے، ہڑپا تہذیب کے بعد مدعا ملتا ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، اس نئی تہذیب کے ظروف ہلکے گیرے یا ہلکے بادامی رنگ کے تھے، جن پر ادورے یا لال رنگ کے نقش بنائے گئے تھے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ جھوکڑ تہذیب براہ راست ہڑپا تہذیب سے پیدا ہوئی۔ خود ہڑپا میں بھی بعد کے زمانے میں ایک نئی تہذیب رائج ہوئی، جو افریاتی شواہد کی بنا پر ہڑپا کے باشندوں کے اس مقام کو ترک کر دینے کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہی۔

مشرق میں اور اسٹے، شمالی میدانوں میں ہڑپائی لوگوں کے بعد وہ لوگ آئے جن کے ظروف میں بعض نمایاں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان ظروف کو منقش بھورے ظروف کا اصطلاحی نام دیا گیا ہے۔ اس بات کے واضح افریاتی جوت برآمد ہوئے ہیں کہ یہ لوگ ان مقامات پر ہڑپائی لوگوں کے فوراً بعد نہیں آئے، بلکہ کافی عرصے کے بعد مقیم ہوئے۔ شمالی ہند کا اڑیسا میں ہڑپا تہذیب کے خاتمے یعنی تقریباً ۱۶۰۰ قبل از مسیح سے لے کر اسکندر اعظم کے حملے یعنی ۳۲۶ قبل از مسیح تک ہماری معلومات آج سے کچھ سال پہلے تشریف لے گئیں۔ پچھلی دودھیاں لوگوں کی کہنا میں سے اس عہد تا ایک "پرکھ روشنی پڑی ہے، جس سے اس تصویر کے خدو خال تو ابھرتے ہیں، لیکن ان کی تفصیلات ابھی مزید تحقیق اور دریافت پر منحصر ہیں۔ خلافت عالمگیر میں مالہر ہڑپا تہذیب کے لوگ منقش بھورے ظروف کے علاوہ کالے رنگ کی مٹی کے گھول

سے پیسے بہتے سرخ و سیاہ اور سادے لال ظروف بھی استعمال کرتے تھے۔ وہ پکی ہوتی تھی۔ جانوروں کی شکلوں کے پیسے دار کھلونے، پائے، تحریری آئنے، نوکدار سوسٹیاں اور ہڈیوں کے بہوتے پیکل، کالے یشب، شیشے کے مسالے اور ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹنگیاں اور شیشے کے تنکے بھی بناتے تھے۔ ان کے مکان نرکل کے ڈھانچوں پر مٹی کی موٹی تہیں جما کر بنائے جاتے تھے۔ گجرات میں ہڑپا تہذیب اور اس کے مابعد کی تہذیب کی صورت قدرے مختلف رہی ہو وہاں رنگپور اور لوتھل میں ان دو تہذیبوں میں چند مشترک باتیں پائی جاتی ہیں مثلاً بعد کی تہذیب کے ظروف کی کچھ شکلیں ہڑپائی ظروف کی مخصوص شکلوں پر مبنی ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ یہاں آبا نے دوسری سے جنم لیا ہو۔ مابعد ہڑپا تہذیب کی ارتقائی حالتیں گجرات میں کئی مقاموں (مثلاً رومہڈی میں) ملتی ہیں۔ اس جگہ سکونت کے تین دور ملے ہیں۔ پہلے میں رہنے والا نے ایک نیچا چوڑا بنا کر اس پر مٹی اور مٹی کی اینٹوں کے مکان بنائے تھے۔ ان کے ظروف عام طور پر اچھی مٹی کے تھے اور خوب اچھی طرح سے پکائے گئے تھے اور چند سیاہ پٹریں۔ قطع نظر غیر منقول تھے۔ چھوٹے چمناتی اوزار، تانبے کے آلات، سونے کے کمانیدار حلقے، تانبے کی چوڑی، عقیق کے تنکے وغیرہ کا استعمال ہوتا تھا۔ کچھ اور بعد کی تہذیب میں گڑا میں ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں بعض جگہوں سے خصوصی طور پر متعلق نظر آتی ہیں۔ مثلاً پٹن سومناٹہ (پریماس پٹن) کی تہذیب۔

ریاست ہند میں واقع برہم گیری کی کھدائی سے ایک ایسی چاکرلیتھیک عہد کی تہذیب ظاہر ہوئی جو سمورے اور لال ظروف، جن میں سے لال ظروف پر کالے رنگ میں نقاشی کی گئی ہے، جنہر جری اوزار، مایکرو لیتھ، چوٹ پتھر کے بے پھل اور کچھ تانبے کی اشیاء کی حامل تھی۔ بعد تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ تہذیب اٹھارہ سو سال قبل از مسیح سے لے کر نو سو سال قبل از مسیح تک پورے کن اور وسط ہند میں رائج تھی جن اہم چاکرلیتھیک مقاموں کی اب تک کھدائی ہوئی ہے وہ یہ ہیں: ہریا پور، تنگ بھدرا کی وادی میں برہم گیری، ہریا پور، گودا وادی کی وادی میں ناسک، جھرو سے، نواسا، چاندولی اور واثم آباد؛ ہریا پور، گودا وادی کی وادی میں بہل، اور پرکاش، وادی نربدا کی وادی میں ہمشید، نودالولی، ایرن اور تھوڑی

دی جنبل میں ناگدا، مغربی بنگال میں پانڈورا جادھی، بہار میں چیراندا، اتر پردیش میں سو باگورا، اور راجستھان میں آبار اور گیلوند۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اگرچہ ان میں سے ہر ایک خطے میں اس تہذیب کی اپنی انفرادی خصوصیت تھی، تاہم کچھ عام خصوصیتیں سب نظروں میں مشترک بھی تھیں، مثلاً جدید جھری اڈار، مایکرو لیمتہ، تانبے کی چیزوں اور کالی نقاشی والے لال ظروف کا استعمال ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ان تہذیبوں میں اور مہجرات کی مابعد ہڑپا تہذیبوں میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے زمانے کی تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ کچھ خطوں میں تہذیب کی ابتدا دوسرے خطوں کے مقابلے میں کچھ قدیم رہی ہوگا۔ راجستھان میں ادھیپور کے نزدیک ابار میں چالکولیتھک تہذیب کی نمائندگی زیادہ تر مایکرو لیمتہ اور منقش یا غیر منقش سیاہ و سرخ ظروف سے ہوتی ہے۔ شمال کے کچھ قدیم مقاموں میں اس تہذیب کے بعد ایک ایسی سیاہ و سرخ ظروف والی تہذیب کا رواج ہوا، جو برتنوں کو آگ میں اندھا کر کے جلانے سے بنے تھے۔ اس طریقے سے برتنوں کے اندرونی حصے کو ہراند گنے سے وہ کاسے پڑ جاتے تھے، جب کہ باہری حصے میں جن پر ہوا لگتی تھی، لال ہر جاتے تھے۔ مالوہ کے قدیم شہر امبین میں اس تہذیب کے لوگوں کی سکونت قریب قریب ساتویں صدی قبل مسیح میں شروع ہوئی۔ لوہے کا استعمال اس زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے شمالی میدانوں کی منقش بھوسے ظروف کی تہذیب کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ روپشکی کھدائی میں یہ دیکھا گیا کہ ہڑپا تہذیب کے خاتمے اور اس تہذیب کے ظروف کی نمود کے درمیان ایک خلا ہے۔ یہ ظروف شمالی راجستھان، پنجاب اور مغربی اور وسطی اتر پردیش میں کئی مقاموں پر دستیاب ہوئے ہیں۔ اس وضع کے ظروف کا خاص مقام ضلع میرٹھ میں ہستناپور کا مقام ہے، جہاں یہ ظروف طبقاتی کھدائی میں جھدے لال ظروف کے بالکل اوپر پائے گئے تھے۔ ماہرینِ اثریات کا قیاس ہے کہ یہ لال ظروف تانبے کے ان ذخیروں سے تعلق رکھتے ہونگے، جو دیاسے گنگا کی وادی میں وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتے رہے ہیں اور جن کا زمانہ ۱۹۰۰ سال قبل مسیح سے لے کر ۱۳۰۰ سال قبل مسیح ہے۔ پھر ہستناپور اور ادھیپور میں منقش ظروف سرخ اور سیاہ و سرخ ظروف کے ساتھ ملتے ہیں مگر کچی ہوائی اینٹیں نہیں

دستیاب ہوتیں۔ لوہا بھی اس دور کے اواخر میں ملتا ہے۔ ہستناپور میں کھدائیوں سے ثابت ہوا ہے کہ اس تہذیب کا خاتمہ وہاں ایک بھاری سیلاب سے ہوا تھا۔
منقش بھورے ظروف کی تہذیب تقریباً ۱۱۰۰ سال قبل مسیح اور ۶۰۰ سال قبل مسیح کے درمیان رائج تھی۔ اس حقیقت کی بنا پر کہ اس تہذیب کے ظروف ہندوستان کے ان علاقوں پر ملے ہیں، جہاں آریہ قوم کی آبادی تھی (باستثنا سے مغربی پنجاب کے جہاں اس لفظ دنیا سے اثریاتی تفتیش عمل میں نہیں آئی، اور بعض ایسے مقاموں پر جن کا ذکر قدیم ہندی ادب میں ملتا ہے، دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ یہ ظروف آریوں کی مصنوعات کا نتیجہ ہیں۔

ہندوستانی اثریاتی کا دوسرا عہد آفرین واقعہ نہایت چمکدار سطح والے ظروف کا ہے، جو عموماً سیاہ رنگ کے ہیں، گو یہ دوسرے رنگوں میں بھی پائے گئے ہیں۔ اس وضع کا ظروف کا اصطلاحی نام شمالی سیاہ پالش والے ظروف ہے۔ چونکہ یہ ظروف ضلع الہ آباد میں کوسمبی اور راجگھاٹ، بنارس جیسے قدیم مقامات میں بکثرت ملے ہیں، یہ خیال کیا جا چکا ہے کہ سب سے پہلے یہ ظروف دیاپور گنگا کے وسطی میدانوں میں نمودار ہوئے اور پھر وہاں سے قریب قریب سارے ہندوستان میں پھیل گئے کیونکہ شمال مغرب میں ملنے والا جنوب میں آندھرا پردیش کے ضلع گنڈاپ میں امراتی کے مقام پر اس وضع کے ظروف برآمد ہوئے ہیں۔ اور ایسے میں بھی یہ ظروف پائے گئے ہیں۔ اثریاتی شواہد کی بنا پر ان ظروف کا استعمال تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر غالباً دوسری صدی قبل مسیح تک رہا۔ اسی عہد میں جس کا آغاز ہما تھادھ اور شری ہما دیر کے ظہور سے ہوتا ہے۔ شمال میں بڑے بڑے شہر آباد ہوئے۔ عمارتوں میں عموماً پختہ اینٹیں استعمال ہونے لگیں۔ لوہے کا رولج وسیع پیمانے پر ہوا اور نئے جامی ہوئے۔ اسی دور سے تاریخی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔

ادھر جنوب میں قبل از مسیح پہلے ہزار سالہ دور کے نصف دوم میں اور اس دور کے اواخر میں ایک نئی تہذیب نمودار ہوئی، جو میگالیتھک یعنی بڑے پتھروں والی تہذیب کہلاتی ہے۔ اس کی خصوصیات میں تدفین کی ایک خاص رسم قابل ذکر ہے۔ اولاً لاش کھلی جگہ چھوڑ دی

جاتی تھی؛ جب اس کی پٹیلیاں اٹک ہو جاتیں تو اسے بڑے بڑے گول مثل گنبد نما پتھروں سے گھرے ہوئے گڑھے میں دفن کر دیا جاتا اور گڑھے پر بھی ایسے ہی پتھر کی سلیں رکھ دی جاتی تھیں۔ جس علاقے میں یہ تہذیب رائج تھی، اس کے ایک خطے سے دوسرے خطے کی قبروں کی شکل میں بھی فرق بھی ملتا ہے۔ کہیں کہیں ایک پتھر بھی نہیں پایا جاتا، تاہم اسی سبب میں جن مشترک خصوصیات ہیں۔ مذکورہ بالا جزوی تدفین کے علاوہ ان قبروں میں سیاہ و سرخ ادف اور لوہے کی اسلحہ ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میگالیتھک تہذیب ایک ہی قوم کے رہیے سے وجود میں آئی تھی، جو بعض اہل تحقیق کی رائے میں ڈراوڈی تھے۔

اس تہذیب کے بعد جنوب میں ایک اور تہذیب کے رواج کا پتا چلتا ہے، جو پہلی صدی بعد از مسیح کے ساتواہن راجاؤں کے عصر میں مروج تھی۔ آخر الذکر تہذیب میں ایک خاص قسم کے ظروف کا استعمال پایا جاتا ہے، جو سرخی مائل بادامی رنگ کے ہیں اور ان پر سفید چاندی اور نقاشی ہے۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے جنوبی جزیرہ نما اور سلطنتِ روما کے مابین بالخصوص تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ ان ہزاروں رومی سکوں کے علاوہ جو ہندوستان کو اپنے مال کے لیے اصل ہوئے، پامٹیہ پھری کے قریب آپریکٹڈ کی کھدائی میں ایسے رومی ظروف بھی دریافت ہوئے ہیں، جو روما سے درآمد کیے گئے ہونگے۔

شمالی اور وسطی ہند کے بہت سے مقامات پر مثلاً روڈر، ہستناپور، ممتر، اہی چمپتر، سراوتی، اجمیر، چندر کیٹو گڑھ، اور جین وغیرہ میں جہاں کھدائی ہوئی ہے، ایسی سکونتوں کے آثار ملے ہیں، جن کا زمانہ شمالی سیاہ پالش واسے ظروف کے بعد کا ہے۔ ان مقاموں میں بعض ایسے بھی ہیں، جن میں قرونِ وسطیٰ تک آبادی قائم رہی، اس آبادی کی سب سے اہم نمائندگی شیشہ نما یعنی ٹکلیز ظروف سے ہوتی ہے۔

ہندوستان کی قدیم تہذیبوں کا تاریخی ترتیب کے لحاظ سے جو مختصر خاکہ پیش کیا گیا وہ زیادہ تر پہلے ایک سو سال کے دوران کی کھدائیوں کا مرہون منت ہے۔ آزادی کے بعد سے کچھ ملک ملک کے طول و عرض میں سرکاری یا نیم سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کے ذریعے سے تین تین مقاموں پر جو کھدائیاں ہوئی ہیں، ان کے نتیجے میں تین ہزار سال قبل از مسیح سے

لے کر آج تک کی ہندوستان کے مختلف حصوں میں مروجہ تہذیب اور تمدن کا قدیمہ مسل
خاکا ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ ان کھدائیوں میں جدید تکنیکوں کے ساتھ ساتھ آثار کی تاریخ
متعین کرنے میں جدید سائنسی طریقوں مثلاً کاربن - ۱۴، فلور این کا کیمیائی طور پر امتحان وغیرہ
کے استعمال سے اثریات اور منکشف شدہ اشیاء کے صحیح زمانے کی تعیین کے علاوہ اسی تہذیب
کا تاریخی تسلسل بھی مستند طور پر قائم ہو گیا ہے۔

آخر میں یہاں آبلدی سے پہلے اور اس کے بعد کی افریاتی کھدائیوں کا مختصر ذکر بیجا نہ ہو گا۔ کننگم
کی طرح مارشل نے بھی بودھی مقامات کی کھدائی پر زور دیا تھا، چنانچہ اس کے دورِ نظامت
میں یعنی موجودہ صدی کی پہلی تقریباً ایک تہائی میں تکسیلا، سارانتھ، راجگیر، سانچی، سراوتی،
کوشی گمر، نالندہ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے کچھ مقامات میں کھدائی ہوئی، جنہیں نے نتیجے
میں بودھی دھرم کے علاوہ بودھی فن تعمیر، فنِ لطیفہ اور علم الاحصاء کے مطالعے کو کافی فروغ
حاصل ہوا۔ قدیم بودھی شہروں کے محل وقوع مثلاً الہ آباد کے قریب بھٹیٹ، بہار میں پٹنہ
تکسیلا میں کھدائی کی گئی۔ پٹنہ کے قریب پانچ پترا میں، عہدِ موریہ کے ایک محل کے آثار ملے، جو
کڑی کا بنا ہوا تھا اور اسی یا اس سے زائد پتھر کے ستونوں پر کھڑا تھا۔ تکسیلا کی طویل کھدائی
میں جو ۱۹۱۳ء اور ۱۹۳۴ء تک کے درمیانی زمانے میں ہوئی، سلسلہ وار تین شہروں کے آثار
برآمد ہوئے۔ ان میں سے بھیٹر شیلہ سب سے قدیم ہے، اس کی بنیاد تقریباً پانچ سو سال قبل
مسیح پڑی ہوگی اور یہ شہر اسکندر اعظم کے حملے سے ضرور دو چار ہوا ہو گا۔ دوسرا شہر سرکپ تھا
یہ شمال مغربی ہند کے یونانی حکمرانوں کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ یہاں آگے چل کر پار تھیل کے
عہد میں ایک نہایت مرتب شہری نقشہ بندی ہوئی۔ تیسرا شہر سیر سکھ تھا، جو کشانوں کے عہد
کی یادگار تھا۔

کھدائیوں کے سلسلے کی دوسری اہم کڑی ہڑپا اور موہن جو دڑو کی کھدائی ہے ان کا ذکر اوپر ہوا۔
انہی دنوں میں پہاڑیوڑ، ناگارجن، کنڈ وغیرہ میں بھی کھدائی ہوئی۔ پھر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء
تک ضلع بریلی کے مقام اہی چھتیر میں وسیع پیمانے پر کھدائی کی گئی۔ اس کھدائی سے پہلی بار
دریائے گنگا کی اوپری وادی کا تہذیبی تعلق پہلی سے پانچویں صدی قبل از مسیح سے لے کر

یادہ سوسال بعد از مسیح تک ثابت کیا گیا۔

۱۹۵۰ء کے بعد یہ کھدائیاں چھوٹی ہیں: نئی دہلی میں پرانا قلعہ (جہاں پچھلے دو سال سے کھدائی پر جاری کی گئی ہے) جس میں قرون وسطیٰ سے لے کر مودیا عہد تک کے آثار برآمد ہوئے ہیں؛ پتھرا، سراوتھی، راجگیر، بیربھان پور اور تالوک (مغربی بنگال)؛ جوگٹار تنہا گیری اور اودھ گیری (اڑیسہ)؛ سالیہ پورٹم اور کوٹور (آندھرا پردیش)؛ سانولہ پٹو میڈو؛ امرت لنگم اور گنٹور (بدراس)؛ مسکی (میسور)؛ دائم آباد؛ بہل شیکوڑہ اور پرکاش (مہاراشٹر)؛ امرلی؛ رنگ پور؛ وٹی ماچیاہ اور لوتھل (گجرات) وغیرہ

نہیں سے کچھ کھدائیوں کا ذکر تو مندرجہ بالا بطور میں آچکا ہے، باقی کا اور ان کے علاوہ دیگر اہم مقامات کا جو گزشتہ چند سال میں سامنے آئی ہیں، مختصر حال یہاں بیان کیا جاتا ہے:

جدید ہجری دور کی تہذیب سے متعلق جو دریافت حال میں ہوئی ہے، اس کی کافی اہمیت ہے۔ ادنیٰ شمیر میں برہمہ نام کے مقام پر کھدائی سے یہ انکشاف ہوا کہ وہاں تقریباً انیس سوسال قبل مسیح غاروں میں بسنے والے لوگوں کی سکونت تھی، جو بڑی اور پتھر کے مختلف شکل و صورت کے اوزار استعمال کرنا جانتے تھے اور ان کے ہاں انسانوں اور جانوروں کے مردوں کی تدفین کی رسم میں قدرے اہتمام اور تکلف برتا جاتا تھا۔ یہاں کی کھدائی سے ایک اور رسم کا پتہ چلا۔ کسی غرض سے یہ لوگ کھوپڑی میں سودا خ کرتے تھے۔ اس کھدائی میں ایک کھوپڑی ایسی ملی جس میں سات مکمل اور چار نامکمل سودا خ پائے گئے ہیں مشرقی ہندوستان میں داو جلی ہارنگ مقام پر جو شمالی کپار ضلع میں میکور کی پہاڑیوں میں ہے، پہلی مرتبہ جدید ہجری دور کے کلوڑار اور بکلی مٹی کے برتنوں کے ساتھ دستیاب ہوئے ہیں۔ اڑیسہ کے ضلع میوہ بھنج کے کوچانی مقام کی کھدائی میں کھروڑے لال ظروف کے ساتھ جدید ہجری دور کے چمکیلے اوزار ملے ہیں۔ جنوبی ہند میں ضلع بلاری میں ٹکل کوٹ مقام میں وسیع پیمانے پر جو کھدائی ہوئی، اس سے بھی گرینائٹ کی پہاڑی پر اسی دور کی کم و بیش انیس سکونتوں کے وجود کا پتہ چلا ہے نیز بلیان گائٹھ کے لیے جو سودا خ پائے گئے ہیں، ان سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ مدد گھروں میں رہتے

تھکڑہ آثار قدیمہ

ہو گئے؛ ان کے مکانوں کے فرش لیے ہوئے تھے اور ان کی رسم تدفین بھی کچھ انوکھی تھی۔ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا میں مردے کی جزوی طور پر تدفین عمل میں آتی تھی، لیکن بعد کے عہد میں مردے کے پورے جسم کو لٹا کر دفنایا ہوا پایا گیا ہے، آندھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر میں اسٹون بھی جدید عجمی لوگوں کی سکونت کی سو ہاں قبیلوں کے گڑھے ایک قطار میں پائے گئے، جس ظاہر ہوتا ہے کہ لکڑیاں گاڑ کر احاطہ بنایا گیا تھا۔ نیز یہ کہ وہاں کی کھدائی میں جلی ہوئی چیزوں کئی تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ سکونت کئی مرتبہ نذرِ آتش ہوئی ہوگی، جنوب میں جو دیگر مقاموں کی کھدائیوں سے اس عہد کی تہذیب کی بستیاں اور آثار برآمد ہوئے ہیں، وہ مسکی، پکھیل، ناگارجن کنڈ، سنگن کلوا دی نرسی پور ہیں۔

ان چند سالوں میں سب سے زیادہ اہم اور محرکہ آرا انکشاف موجودہ ہندوستان میں ماقبل ہڑپا سکونت کی دریافت ہے، جو شمالی راجستھان میں کالی بنگان مقام پر کھدائی سے ہوئی۔ اس نئی دریافت میں جو ظروف برآمد ہوئے ہیں، وہ ہلکے رنگ کی لال مٹی کے ہیں اور ان کے سیاہ اور کہیں کہیں اس کے ساتھ سفید رنگ کے نقوش بھی بنائے گئے ہیں۔ اس لستی میں مکان کچی مٹی کی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے اور وہاں کے لوگ تانبے کا استعمال جانتے تھے نیز وہ پتھروں کے چھوٹے پھل کی قسم کے اوزار سے بھی کام لیتے تھے۔ ظروف کے نقوشوں کچھ ایسے ہیں، جو ہڑپائی ظروف پر بھی پائے جاتے ہیں۔ کالی بنگان کی اس ماقبل ہڑپا تہذیب میں بعض عناصر ایسے ہیں، جو مغربی پاکستان میں سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں کوٹ دیکھی اور دیگر ماقبل ہڑپائی مقامات کے آثار سے بہت مماثل ہیں۔

کالی بنگان کی کھدائی ۱۹۶۱ء میں شروع ہو کر آٹھ نو سال تک جاری رہی۔ آخری سال کی کھدائی کا اہم دریافتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ وہاں ایک مکمل کھیت نمایاں کیا گیا، جس میں چلائے ہوئے ہل کے نشانات پورے طور پر محفوظ تھے۔ ان نشانوں سے اس زمانے کی کاشتکاری اور اناج پیدا کرنے کے طریقوں کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کالی بنگان کے مغربی حصے میں ایک جامد دیوادی والی گڑھی اور شرقی حصے میں فصیل والے شہر کے آثار بھی برآمد ہوئے ہیں۔ اس میں شہر کا جو نقشہ واضح ہوتا ہے، وہ بعینہ ہڑپائی شہر کی مانند شطرنج کی بساط کے نمونے

ہے۔ ایک اور نہایت اہم دریافت آتشی قربانگاہوں کی ہے، جو گڑھی کے رقبہ میں پتھروں میں بنی ہوئی پائی گئیں، ان چولہا نما قربانگاہوں میں سے ہر ایک کے بیچ میں بچی ہوئی مٹی کا بنا ہوا ایک لنگ نکلا ہوا ہے، اس دریافت سے اس تہذیب کے لوگوں مذہبی عقاید یا میلانات پر روشنی پڑتی ہے۔ قبرستان والے حصے میں کچھ قربانگاہوں نال کی طرف سر کر کے لٹائے ہوئے مردوں کے ڈھانچے ملے اور کچھ مشکوں والی طریقہ ریت کے نمونے، اس حصے کی کھدائی کے دوران میں ایک ایسی قبر ملی، جس میں مردے کے پتھر کے برتن رکھے ہوئے تھے، اور چاروں طرف کچی مٹی کی اینٹوں کی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ قرین قیاس ہے کہ یہ قبر کسی سربراہ اور شخص کی ہوگی۔

اس کے علاوہ ان چند سالوں میں جو دوسری اہم کھدائیاں ہوئی ہیں، ان سے ہڑپائی تہذیب پر بالخصوص اس کے پھیلاؤ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ موہن جو دڑو کے بعد اس تہذیب کے تقریباً ایک سو سے زائد مستند مقامات دریافت ہوئے ہیں اور ان میں سے کئی جگہ پر کم و بیش وسیع پیمانے پر کھدائی بھی عمل میں آئی ہے۔ ان مقاموں کا سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے، اس لیے یہاں اس کا اعادہ ضروری نہیں ہے۔ ابھی ابھی پچھلے دو تین سال کے دوران میں گجرات کے سرحدی علاقے کچھ ضلع میں جو وسیع کھدائی عمل میں آئی ہے، اس سے وہاں بھی ان مقاموں کا سراغ ملا ہے۔ اس دریافت سے ہڑپائی لوگوں کی ہجرت یا کسی اور غرض سے آمد و رفت کے راستوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سالوں میں کچھ کے ایسے ہی ایک دوسرے مقاموں کو کھدائی میں محکمہ آثار کے شعبہ حفاریات کی طرف سے وسیع پیمانے پر کھدائی شروع ہوئی ہے جس کا پہلا مرحلہ اپریل ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا۔

ہڑپائی تہذیب کا زمانہ امتداد ابھی تک ڈھائی ہزار سال قبل مسیح سے لے کر ڈیڑھ ہزار سال قبل از مسیح تک کا خیال کیا جاتا رہا، لیکن اس تہذیب کے مقامات کی کھدائیوں کے مختلف نتائج بالخصوص برآمد شدہ اشیاء اور آثار کی کاربن - ۱۴ کے ذریعے کی گئی تحقیق کے پیش نظر اس کا زمانہ امتداد اب تقریباً قطعی طور پر دو ہزار تین سو سال قبل مسیح سے لے کر ستر سال قبل مسیح تک کا قرار پایا ہے۔

ہستاپور، روہڑ، عالمگیر پور، سرادستی، کوسامبی، اترنجی، کھڑہ وغیرہ کی کھدائیوں کا ذکر آچکا ہے۔ پنجاب کے مشرق میں گنگا جمنہ کے میدانوں میں ایک ہزار سال قبل مسیح سے کم پہلے، منقش بھورے غروت کی تہذیب والی جو قوم آباد ہو چکی تھی، یہاں اس کی بودیادیں اور رہن سہن کے طریقوں کے بارے میں کچھ معلومات دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ لوگ درختوں کی ٹہنیوں اور کھجور اور اس قسم کی چیزوں سے بنے ہوئے ڈھانچوں کے مکانات میں رہتے تھے۔ وہ کاشتکاری پیشہ تھے، گھوڑے اور دیگر جانور پالتے تھے، اور تانبے اور بعد میں لوہے استعمال بھی کرتے تھے۔ کھدائیوں سے اس تہذیب کے متعلق جو نتائج نکالے گئے ہیں اس سے ہندستان میں آریوں یا ان کی کسی شاخ کی آمد کے مسئلے پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ گذشتہ سطر میں دکن اور وسطی ہند میں راج جس نیرلیٹیک چالکولیتھک تہذیب کا بیان اس کے لوگوں کے بارے میں اس تہذیب کے کچھ مقاموں کی کھدائی سے یہ بتا چلا ہے اس تہذیب کے لوگ کچی مٹی یا اس کی اینٹوں کی دیواروں والے مکانات میں رہتے تھے، کاشتکاری کرتے تھے، اپنے مردوں کو دفناتے تھے، خاص کر کے نوداؤلی میں جو بستی قلعہ سو لھویں صدی قبل از مسیح میں آباد تھی، اس کے لوگوں کے چاول کے استعمال کا قطعی ثبوت ملا ہے۔ اسی طرح نواسالی کھدائی میں تیرھویں صدی قبل از مسیح میں ریشم کے استعمال کا پتہ ہے۔ یہ یاد رہے کہ ریشم کے استعمال کے بارے میں یہ قدیم ترین شہادت ہے۔

اس عہد کے بعد کی نہایت چمکدار سطح والے غروت کی تہذیب کے کئی مقاموں میں کھدائی ہوئی، جس کا ذکر ضمناً کیا جا چکا ہے۔ میگالیتھک یعنی بڑے پتھروں والی تہذیب کے مقاموں پر کھدائی ہوئی ہے وہ ناگیور کے قریب جو ناپانی، بلیشورم، ناگا راجن کسٹڈ، جٹ سیٹنگ میڈو، پورگم وغیرہ ہیں۔ ان سے بھی اس تہذیب کے مختلف رخن پر کچھ نہ کچھ پڑتی ہے۔ غنان میں بلیشورم میں تدفین کی ایک انوکھی رسم پائی گئی جس کو دھری تدفین کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں ایک انسانی ڈھانچہ دوسرے ڈھانچے کے اوپر پایا گیا، شمالی ہندو صوبہ اتر پردیش کے میرزا پور اور بنارس ضلعوں میں بھی پہلی مرتبہ میگالیتھک تہذیب بارے میں تحقیق، در کھدائی ہوئی۔ لیکن ابھی تک یہاں کوئی قطعی حوالہ نہیں ملے۔

تھے۔ وہ ایرانی بلجے میں فارسی بولتے تھے۔ ان بزرگ کو میں نے بھی ۱۹۳۷ء کے قریب لایا تھا۔ وہ دیکھا تھا، اس وقت ان کی عمر ۸ سال کے قریب تھی۔ وہ بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن اس سے علم زیادہ ہوتا تھا، شعریات کم، بلکروں کچے کہ بالکل غائب۔ بڑے دیکھنے والے تھے۔ والد کا نام اور خالص انھیں یاد تھا فرمایا کرتے تھے کہ میرا شاگرد تو بہت ترقی کر گیا۔ اس زمانے کے لیل و نہار دیکھے، ڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر باوانگیت سنگھ سیدی تھے۔ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر منشی گنبدارام اور ٹرننگ کالج میں اردو فاضل کے مدرس اعلیٰ پنڈت رلام۔ گویا کسی زبان پر کسی قوم کی اجارہ داری نہیں تھی، نہ ہمیں کسی قوم کی لسانی حیثیت ہی تھی۔

والد ٹرننگ کالج سے فارغ ہونے کے بعد جالندھر کے ضلع میں پرائمری اسکول میں اول مدرس رہے۔ ان کے ایک ہم جماعت تھے لالہ رفیق رام شاد جو بعد ڈر (ریاست پٹیالہ) کے رہنے والے تھے۔ شعر میں والد ہی سے متاثر کرتے تھے۔ وہ بڑے کٹر آریہ سماجی تھے اور ایسے ہی موضوعات پر لکھیں کہتے۔ ریاست میں ان پر مقدمہ چلا، تو ان کے مکان کی تلاشی پر والد کی خط و کتابت بھی وہاں سے نکلے۔ اس شبہ میں کہ والد سیاسی لکھتے ہیں، والد کے مکان کی بھی تلاشی ہوئی۔ لیکن چونکہ اطلاع پہلے مل گئی تھی، اس لیے قابل اعتراض کاغذات آپ کے شاگردوں نے اندھا دھند جلادیے تھے۔ ان کے ایک دوست اس زمانے کا ایک مصرع سنایا کرتے ہیں، جو سودیشی تحریک سے متعلق تھا، نہ دھواؤ کا ذرا تو دارغ و امن ملل کو مل کو۔ بہر حال گھر سے کچھ برآمد تو نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود دوسرے اسکول میں تبادلہ کر دیا گیا، جہاں اسس پاس کچھ آبادی نہیں تھی۔ والد نے تنگ آکر استعفیٰ دے دیا اور ریاست حیدر میں سفیدوں کے مقام پر ایک بڈل اسکول میں ملازمت کر لی۔ وہاں سے تین سال بچہ نکال آگئے۔ ۱۹۱۳ء سے نکودرہی میں مقیم ہیں۔

میں ملیاں ہی میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوا تھا، اس لیے والد کے متبع میں عود کو ملیاں ہی لکھنے لگا، ورنہ میری سادہ زندگی نکودرہی سے وابستہ رہی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے آخر میں

محکمہ آثار ہند

ہو سکا ہے۔ دوسرے آثار میں ایک عظیم پتھر کا محل ہے جو کہا جاتا ہے کہ راجا اودین کا تھا جس کی دعوت پر ہما تمام بدھ وہاں گئے تھے۔ اس میں قلعہ بندی، محافظاتی انتظام، فصیل وغیرہ کے بھی دلچسپ آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ اسی طرح راجگیر، سراوستی، راجگھاٹ اور ویشالی کی کھدائیوں سے بھی کئی نئی باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اسی طرح شیٹھ پال گڑھ کی کھدائی میں پچھتی صدی قبل از مسیح کی قلعہ بندی، پچھلے دور کے دیگر کھدائیوں سے اس سے قبل کی تائید ہوتی ہے کہ اس کے دور میں دریافت شدہ اشوک اور کھاروہیل کے کتبوں میں جس خوشامیاد اور کلنگ نگر کا ذکر ہے، وہ یہیں پر آباد تھے۔ اسی طرح اجین کی کھدائی سے ساڑھے سات سال قبل از مسیح کے عہد کے وسیع قلعہ بندی کے آثار ملے ہیں۔ نیز ایسے بھی شواہد ملے ہیں جو اس بات کے منظر ہیں کہ پہلی صدی عیسوی میں وہاں سکے بنانے کی صنعت پورے عروج پر تھی۔

حالیہ کھدائیوں سے ہندوستان کے بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے اور پراکیمینڈوکا ذکر ہو چکا ہے۔ صوبہ تامل ناڈو مداس میں کاویری بیٹم کی کھدائیوں میں مسند کی طرف نکلا ہوا رومن رسم الخط کے حرف آئی (I) کی شکل کا ایک لمبا جوتڑہ برآمد ہوا ہے، جو غالباً محکمہ کا کام دیتا ہوگا۔ تامل زبان کی بعض کتابوں کے بیان کے مطابق یہ مقام سنہ ۱۱۱۱ء کے ابتدائی زمانے میں بندرگاہ تھا۔ اٹری دیا فست سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے ظاہر ہے کہ یہاں سے تجارتی بیڑے مشرقی ممالک کی طرف جاتے ہوئے، اسی طرح مشرق میں مغربی بنگال سمیت تمام ملک کی کھدائی سے یہ ثابت ہوا ہے کہ روم کے ساتھ تجارت کو ملنے والے ہندوستانی شہروں میں یہ انتہائی مشرقی مقام ہے، اسی طرح بنگال ہی میں واقع چندین کی کھدائیوں سے بھی اسی قسم کی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ مثلاً چیروتی میں ایسے کتبے ملے ہیں جن سے یہ بات پائیدار ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ وہی جگہ ہے، جہاں راجا شاشانگ کے دارالخلافت نے کرن سورہ سے ملحق شہر رت مرتکا آباد تھا۔

آخر میں ان چند کھدائیوں کا بھی ذکر ضروری ہے، جہاں سے ہندوستان کے قدیم فن تعمیر کے مطالعے کے لیے اہم مواد ملا ہے مثلاً مدھیہ پردیش میں ویدیشہ (بھیلشہ) سے تین چار سال ہوئے دوسری صدی قبل از مسیح کی طبقاتی سطحوں میں ایک مندر کے آثار بھی پائے گئے

حکمت آثار قدیمہ

اسی طرح اتر پردیش میں بھیترگانوں کی کھدائی میں گپتا عہد کے ایک مندر کے آثار ملے ہیں۔
عقربہ گذشتہ بین بچیں سالی میں جو کھدائیاں ہوئی ہیں، ان سے ہندستان کی قدیم
تہذیب کی تاریخ کی سلسلہ وار کڑیاں مل جاتی ہیں؛ اور ان ادوار کی تاریخ پر بھی کافی روشنی
پڑتی ہے جن سے متعلق ہماری معلومات رُبع صدی قبل بہت محدود تھیں۔

فارم نمبر ۴

ملکدام	نام ایڈیٹر	دہلی	(۱) مقام اشاعت
ہندوستانی	قومیت	تماہی	(۲) وقت اشاعت
۳۹۶ سی ڈیفنس کالونی، نئی دہلی	پتا	محل عباس عباسی	(۳) پرنٹر کا نام
ملکان کننام علی مجلس چھتہ نواب صاحب دہلی	مالکان کننام	ہندوستانی	قومیت
ہم نام محل عباس عباسی دونوں اس بات	ہم نام محل عباس عباسی	۱۲۲۹ چھتہ نواب صاحب فرخشاہ دہلی	پتا
کی تصدیق کرتے ہیں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں	محل عباس عباسی	(۴) پبلشر کا نام	
وہ ہماری بہترین معلومات اور تفصیلات کے مطابق درست	ہندوستانی	قومیت	
صحیح ہیں۔ دستخط: ملکدام محل عباس عباسی	پتا	۱۲۲۹ چھتہ نواب صاحب فرخشاہ دہلی	



عوام دھوکا

دھوکہ کے پرچم ماب تولی
 اگر ایک فیصدی کی بھی غلطی ہو تو پرمان
 عوام کے ساتھ کھڑا کر دے پیہ کا
 دھوکا ہوتا ہے۔
 آپ اس سے بچ سکتے ہیں۔
 سرکاری نشان والے ماب تول کے
 مجمع پیلاروں سے سامان خرید سکتے۔
 غلط ماب تول کی ضمانت اپنے
 کے الیکٹرک ماب تول سے کیجئے۔
 ماب تول کے اعشاری پیلار
 گاہک کی حفاظت کرتے ہیں

تذکرہ غنما مہ جالسو

میں

غالب اور اس کے معاص

تذکرہ جالسو ایک مختصر فارسی تذکرہ ہے، جو ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء میں نیو امپیریل پریس واقع ملہ مسجد کجور، دہلی میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس میں سرورق کے علاوہ ۲۲ صفحات کے قطع کے ۱۷ صفحات ہیں۔ میں سطر مسطر استعمال کیا گیا ہے۔ شروع کے ۱۷ صفحات میں مولف نے اپنی سرگزشت اور اپنے زمانے کے اہم واقعات درج کیے ہیں۔ ص ۱۸ سے ص ۸۴ تک مولف کا منتخب فارسی کلام حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہے۔ باقی صفحات میں اس نے اپنے عہد کے نو فارسی گو دہلوی شاعروں کے حالات اور ان کے منتخب فارسی اشعار درج کیے ہیں۔ شائع شدہ ہونے کے باوجود یہ تذکرہ بہت نادر ہے۔ مولف نے سبب تالیف کے ذیل میں لکھا ہے:

خرد مندان دانشور اور دانشورانِ خرد پر ور پر یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اس جہاں ناپائیدار میں یادگار کی مضبوط بنیاد کفار ہے اور اس دیکر میں نام و نشان کا ذریعہ بھی ہے۔ اس امر کی وضاحت یوں ہے کہ سیکڑوں برس ہونے کے مولا نا نظامی گنجوی امیر سرور دہلوی اور مصلح الدین سعدی شیرازی اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ اگرچہ اس وقت ان کی ہڈیوں کا کوئی نشان بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے، لیکن پنج گنج کی

۱ تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔

تذکرہ غمنامہ جانسوز

”جواہر ریزی“ محکمہ کی قد فاشانی، اور گلستان و بوستان کے گلستانہ ہمیشہ بہا کی خوشبو کے سبب وہ لوگ مشہور آفاق، بلکہ زندہ جاوید ہیں۔ میں بھی چاہتا تھا کہ اپنی سرگزشت لکھوں تاکہ میری یادگار باقی رہے۔

مؤلف نے تذکرے کی وجہ قسمیہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں اسے چند روز حادثات اور مصدمات کا شکار ہونا پڑا تھا۔ ۹ جنوری ۱۹۰۵ء کو اس کا چھوٹا بیٹا طاعون کے عارضے سے فوت ہوا۔ دو مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ یکم مارچ ۱۹۰۵ء کو اس کا بڑا بیٹا بھی داغ مفارقت دے گیا۔ اس کے شب و روز نالہ و فغاں میں کشتے تھے۔ اس کا سینہ گلخن کی طرح جلتا تھا اور دل مضطرب و پریشان تھا۔ اس کی آہیں شرفشاں تھیں اور نگاہیں خونا بہ چپکال۔ بقول غالب:

نہ ہمیں نالہ و فغاں بلیم من و جاں آفریں کہ جاں بلیم
چونکہ یہ مؤلف کی آخری سرگزشت غم و اندوہ ہے، اس لیے اس کا نام غمنامہ جانسوز رکھا ہے۔

ترتیب تذکرہ کے وقت مؤلف کی عمر ۴۴ برس کی تھی۔ اس تذکرے میں اس نے مارچ ۱۸۰۵ء تک کے اپنے حالات درج کیے ہیں۔ اس کی تالیف اور طباعت کا سال بھی یہی ہے۔ مولا کا قطعہ تاریخ تالیف تذکرہ یہ ہے:

ایں نامہ ز آغاز بپایاں چورسید	ابرام نمودم پے سائل دل و جان را
دردا دندا بالعب وانا بہ زبان دین	غمنامہ جانسوز بگو سید آں را
۹۰	۱۲۹۳ = ۱۹۰۵/۵۱۳۲۳

مؤلف نے اپنے حالات زندگی قدرے تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ حالات بجائے خود زیادہ تر نہ ہوں، لیکن ضمنی طور پر اس نے ۱۸۵۴ء کے ہنگامے کے جو چشم دید حالات و واقعات درج کیے ہیں، وہ ضرور اہم اور مفید ہیں۔

مؤلف کا نام کہ پیرام متخلص بہ بہرہ ورنہ منشی شوقی رام بن منشی حبیبی رام قوم کھتری سیٹھ ہے۔ اس کا مسقط الرأس دلی تھا۔ وہ دس برس کا تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ دنوں

تذکرہ غنائہ جالندھر

ہے اس کا قیام اپنے ماموں کے یہاں بھرتپور میں رہا۔ لیکن بھرتپور کا قیام چونکہ تحصیل علم کے باعث تھا، اس لیے وہ دلی چلا آیا۔ یہاں اس نے پہلے مولوی نصیر الدین دہلوی مولوی درجاء اور مولوی انور علی سے فارسی صرفت و نحو کی کتب و متداولہ تا شرح ملاحی اور نطق کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں منشی کیل رام ہشیار دہلوی سے فارسی نظم و نثر کی کتابیں مثل مینا بالار، پنج رقمہ و سمنظر ظہوری و شبنم شاداب و مجمع الصنائع و قصائد عرفیہ و پران مرزا محمد علی صاحب وغیرہ پڑھیں۔ اس طرح وہ ۱۲ برس سے ۲۰ برس کی عمر تک تحصیل علم میں مصروف رہا۔ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو اپنے استاد منشی کیل رام ہشیار سے صلاح لینے لگا۔ ہجرت نے جب عربی اور فارسی میں کچھ استعداد حاصل کر لی، تو اس کے دل میں ملازمت کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے والد منشی شوقی رام منٹو دلی کی نوعداری میں مرشد دار تھے، وہ ان کے ساتھ کچھری جانے لگا اور سر جان منٹو کا رفیق و محبوس بن گیا۔ لاہور میں آئندہ کارنامہ طریق سے حکم، رو بکاری اور پروانہ نویسی کی مشق کرتا رہا اور بالآخر ۱۸۵۷ء کو اسی دفتر میں باقاعدہ ملازم ہو گیا۔

لازمت کے پہلے روز یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہنگام چاشت پنڈت بلدیو سنگھ داروغہ منٹو کے مرابکہ و پریشان مسٹر ایچ بی بی (بھیمین) محبوس کے پاس آئے اور کہا کہ میرٹھ کی فرج سے ہندو جہل، دیول، سوار اور پیادے باؤشند کی طرح آئے اور آتے ہی جہنا پار کے سرکاری کانات کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا اور خزانہ لوٹ لیا چونکہ وہ ”باغیان بد نہاد“ تھے اس لیے ملازمان پہل مقابلہ نہ کر سکے۔ میں اس گروہ شقاوت پر ”وہ“ کی سرکشی اور نافرمانی کی اطلاع دینے آیا ہوں۔ اطلاع ملنے ہی محبوس صاحب رفیع فساد کے لیے جہنا پل کی طرف روانہ ہوئے۔ تمام ملازمان عدالت نصف النہار تک دارالعدالت میں انتظار کرتے رہے، لیکن محبوس صاحب واپس نہ آئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ بھیمین صاحب اور قلعہ دار مارے گئے، باغی صاحبان عالی شان کے ذکر و اثاثہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر رہے تھے۔ شام ہوتے ہوتے انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ دیکھیے، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامہ: ۱۸۳ (مترجمین احمد نظامی) ۱۸ مئی دہلی دنگس۔

تذکرہ غنائہ جہانپور

میرٹھ کی فوج کی بغاوت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی تھی۔

اس دارگیر میں سر جان مشکاف جان تھیلی پرند کہ کراجمیری دروانہ کی راہ سے شہر سے باہر نکلے اور کچھ دیر تک پہاڑ گنج کے تھانیدار نواب معین الدین حسن خان کے یہاں چھپے رہے۔ بعد کر نواب موصوف ہی کی رہبری میں ریاست جھڑ میں پہنچے۔ رئیس جھڑ نے باغیوں کا خوف سے سر جان مشکاف کو پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ سر جان مشکاف نے بھی یہاں قیام خلافت مصلحت سمجھا اور بھاگ کر انگریزی فوج کی فرو دگاہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ انگریزی فوج میں پہاڑی دھیر راج پر جمع ہوئیں۔ یہ جگہ کافی بلند اور مستحکم تھی۔ جو ہڑی دلی میں ہو جانے کی خبر امصار و دیار میں پہنچی، سوار اور پیادے افسروں سے باغی ہو کر دلی کی جا روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ دلی میں اس طرح پچاس ہزار کی سپاہ جمع ہو گئی۔ ہر صبح ایک فوج کی امید پر پہاڑی کی طرف جاتا، لیکن شام کو مایوس اور ہراس زدہ لوٹ آتا۔ اس برعکس دوسری طرف سے ”دلا دران مبارک“ و ”نوجہان ماہر“ گھولہ توپ و تفنگ کی بارش مفسدوں کی روح و رواں کو چھین رہے تھے۔

منشی کرپا رام بھور اپنے والد اور چچا کے ساتھ حیرانی و پریشانی کے عالم میں راج گھاٹی سے نکلے اور دلیا کے کنارے کنارے چل کر پرانے قلعے تک پہنچے۔ وہاں سے شیخ قلندر بخش پرانا قلعہ کے سپاہیوں کی حفاظت میں فرید آباد پہنچے۔ یہاں وہ ۲۲ ستمبر تک مقیم رہے۔ دوران میں بھور کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔

۳۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بھور دلی آئے۔ ۳۱ ستمبر بروز دوشنبہ انگریزی ”فوج ظفر موج“ نے فوج بھنڈے گاڑ دیے۔ فوجیں کشمیری اور کابلی دروازا سے دلی کی فصیل کے برج تک پہنچا اور لٹا کرتی ہوئی جامع مسجد تک چلی گئیں۔ دو تین دن میں شہر باغیوں سے خالی ہو گیا۔ ۱۰ ملازمین کے سوا کسی شخص بلا اجازت و بلا ذریعہ قربانی شہر میں داخل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ نواب عبدالرحمن خان رئیس جھڑ نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ بعد فوج نے کچھ دنوں انھیں دیوان عام میں مقید رکھا اور بعد کو پھانسی دے دی (۱۸۵۷ء کاتاریخ)۔

۱۹ مرتبہ خلیق احمد نظامی۔

وئی شخص دربانوں کی غفلت سے چوری چھپے داخل ہو جاتا تھا، تو اسے ضرب میو کی سزا دی جاتی تھی۔

اکتوبر ۱۸۵۷ء کے شروع میں سرکاری ملازمان کو حکم دیا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، فوراً حاضر ہو جائیں؛ اگر کوئی حاضر نہ ہوگا تو موردِ عتاب ہو کر خود کو تیر باد افراد کا نشانہ بنائیگا۔ مجدد کے والد اور چچا دھڑے کے دن دئی پہنچے۔ اگلے روز علی الصبح لال قلعے میں سر جان شکاف کی آرامگاہ میں حاضر ہوئے۔ کچھ دنوں تک یہی دستور رہا کہ روزانہ صبح لال قلعے میں حاضر ہوتے اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلے آتے۔ اسی زمانے میں ”عدل پرورد“ مسٹر فلپ ہنری ایمرٹن اٹھلٹا سے واپس آگئے اور انھوں نے ”مہر دوست“ جھاوٹمن “ کرنیل بن صاحب کے ساتھ مل کر اس دیران شہر کی آبادانی میں بہت کوشش کی۔

دار الحکومت کے رئیسوں کے کشمکش میں پڑنے اور ہلاک ہونے کی سرگزشت اور جہاں پناہ حقائق آگاہ محمد سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ کے قلعہ و بارگاہ کے باہر خیمہ لگانے اور شاہزادگان و رئیسان والا جاہ کے خوابِ عدم کو جانے کے واقعات بہت اندوہناک ہیں، اس لیے وقائع نگار کا قلم اس اجمال کی تفصیل میں نہیں جانا۔ مجملہً اتنا کہوں گا کہ ہمایوں نژاد تیمور گورکان کے ترقی و اقبال کے ستارے کا اور دوسرے رئیسان باعز و شان کا اوج جاہ و جلال سے پستی و نیستی کی طرف آنا، روزگار ناہنجار کا یہ انقلاب اور چرخِ دوار کی یہ ستمگری دیکھنے کے قابل نہ تھی ان گرامی تباروں کی حالت دیکھ کر چشمِ جہاں میں نے اپنے چہرے پر پردہ ڈال لیا تھا۔

عثمانہ جانشوز ایک مختصر تذکرہ ہے۔ اس کے پہلے حصے کو مؤلف کی سرگزشت کے بعد کے واقعے سے موسوم کیا جائے، تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس حصے میں غدد کے بارے میں کچھ اہم اور مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مؤلف انگریزی نوکر تھا۔ ”بافیان بدہناؤ“ ”مگر وہ تفاوت پڑوہ“ ”انگریزی فرجِ ظفر موج“ اور ”دلاوردان مبارک و بچلیو ماہر“ وغیرہ ترکیبیں

اس کی ذہنی مرعوبیت اور قنوطیت کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ خوف اور ہراس نے حقیقی حیرات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جہاں پناہ، حقائق آگاہ محمد سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ اور شاہزادگان و رئیسان والا جاہ کے ترقی و اقبال اور جاہ و جلال کے ٹٹنے کی داستان درد کو وہ رو دکار

تا ہنجر کے انقلاب اور چرخِ وقایکِ سنگری سے موسوم کرتا ہے لیکن اس اجمال کی تفصیل یہ نہیں جاتا۔

تذکرے کے دوسرے حصے میں مراثی نے وہی کے نو معاصر فارسی گو شعرا کا ذکر کیا ہے۔ شعرا کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے دیے ہیں۔ سوانحی حالات نہایت مختصر اور بہت تشہیر ہیں؛ مراثی فراہمی میں زیادہ کاوش نہیں کی ہے۔ اگر مراثی تھوڑی سی محنت اور تلاؤ سے کام لیتا تو معاصرین کے بارے میں قابلِ قدر معلومات فراہم کر سکتا تھا۔ البتہ محمود نے معاصر کا ہر شعر کا ذکر بہت احترام سے کیا ہے۔ کلام کے بارے میں توضیحی اور تعریفی کلمات سے کام لیا ہے، جن سے شاعر کے کلام کی بنیادی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا کہ کوشش ضرور کی گئی ہے مثلاً شیفتہ کے بارے میں لکھا ہے: ”مریغ نشین چار بائش سخندانِ واقع اسرارِ الفاظ و معانی، نکتہ سیخ شیریں گفتار.... سخنش نہایت دلچسپ و مرغوب سخن سخانت“ (ص ۹۴)۔ مہربانی کے بارے میں لکھا ہے: ”در تحقیق الفاظ گو سے سبقت از پیشینیاں ربودہ... شرح کتب مشکوٰۃ فارسی بشرح و بسط بیای چنان بقید تحریر آرد کہ کم استعدادین سوادِ علم ہم کما حقہ، بمضامینش پے بردہ... زہے نکتہ سیخ کینا کہ بغیر اسی نگار از بحر معنی چنان دیگر شاہوار بدست آرد کہ وصفش نمی توان نمود۔“ (ص ۵۰)۔

مرزا غالب کے بارے میں لکھا ہے:

مقالاتِ دلپندش ہمہ نکرست آئین و خیالاتِ بلندش آنسوے چرخِ بریں۔ سخن سراے

عظیم المثل و نکتہ سیخ شیریں مقل بد و عرائسِ معانی را از حلیابِ اشکل جلوہ گری نمود (ص ۵۹) چونکہ نواب ضیاء الدین خان تیرہ دشتال، شاعر سے زیادہ سخن فہم تھے اور اس سے بھی زیادہ تاریخ د تھے اس لیے ان کے بارے میں لکھا ہے:

کہن و استانہائے گد شغل و سر و حالاتِ سلطنتِ سلاطینِ روزگار از بری داشت (ص ۶۴)

مولوی امین الدین امین، مہربانی اور مولوی عبداللہ خان علوی وغیرہ شعر گوئی سے زیادہ درس و تدریس کا قاطع برہن کے جواب میں سب سے پہلی کتاب قاطع انطالع کے نام سے مولوی امین الدین امین لکھی تھی مرزا غالب نے انہی کے خلاف مقدمہ ادا حیثیت عرفی دائر کیا تھا۔ امین مولوی عبداللہ خان علوی کے شاگرد

تذکرہ غنائہ جانشوز

کے لیے مشہور تھے۔ اس لیے ان کے کلام کے بجائے ان کی علمی استعداد اور نکتہ سنجی کے بابے میں اپنی رائے پیش کی ہے۔ امین الدین امین کے بارے میں لکھا ہے:

بدن و تدوین کتب متداولہ پارسی، بین الانام مشہور... قاطع المقاطع

براستعدادش برہان قاطع و حجت است ساطع۔ (ص ۴۹)

لیکن ان اشاروں کو تنقید و تبصرہ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم یہ تذکرہ ان باتوں کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات کا حامل ہے۔ پہلی یہ کہ مولف نے معاصر شعرا کے فارسی کلام کا انتخاب خود کیا ہے۔ دوسری اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس تذکرے میں مرزا غالب کے فارسی اشعار کی تشریح ملتی ہے، جو خود مرزا غالب نے مولف کو لکھ کر دی تھی۔ اس طرح مرزا غالب کی ایک نادر تحریر جو اب تک ہماری دسترس سے باہر تھی دستیاب ہو گئی ہے۔ غنائہ جانشوز میں حسب ذیل دس فارسی گو شاعروں کا ذکر بالترتیب درج ہوا ہے:

(۱) کر پارام ہجور (یعنی مولف)، (۲) آذروہ، (۳) امین الدین امین، (۴) نواب مصطفیٰ خان سرتی، (۵) امام بخش صہبائی، (۶) مولوی عبداللہ خان علوی، (۷) اسد اللہ خان غالب، (۸) حکیم محمد مومن خان موسیٰ، (۹) نواب ضیا الدین خان نیر، (۱۰) منشی کیول رام ہشیار۔

مولف نے اپنے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اپنے کلام کا انتخاب بھی وافر مقدار میں شامل تذکرہ کیا ہے۔ اس میں ۱۰۵ شعروں پر مشتمل ۱۷ غزلیں، ایک فرد، ایک قطعہ اور چھ رباعیاں ہیں۔ شعرا کے حالات مختصر ہیں۔ اشعار کو چھوڑ کر حالات بحسنہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

آزادہ تخلص اکمل اکلا، حاوی علوم شتی، مقتداے ابابو فضل و کمال، پیشواے اصحاب برست و جلال، اسطوے زماں، مولوی محمد صدرا الدین خان کہ وسادہ منصب حبلیہ صدر الصدوری دہلی بذات باصفائش نازمیداشت۔ بعد ہنگامہ یک ہزار و ہشتاد و پچھلہ و ہفت عیسوی اس خاکدان ظلمانی راگزاشت۔ این اشعار پارسی از تاجیخکار ایشان است۔ ہندہ شعر۔

(۱۲) امین تخلص مولوی امین الدین، صاحب فکر متین و پارسی زبان، تمییز رشید مولوی عبداللہ، بدن و تدوین کتب متداولہ پارسی بین الانام مشہور و بعلم و حکم منشوری و خرد را تجرود (۹)

تذکرہ غنائہ جالوز

قاطع القاطع بر استعدادش برہان قاطع و محقق است ساطع۔ (ایں اشعار از دست (۳۹ شعر)
۳۔ حسرتی تخلص نواب محمد مصطفیٰ خان، یکتا سے زمان، مریج نشین چار بالمش سخنہ انی، واقف
اسرار الفاظ و معانی، نکتہ سنج شیریں گفتار، از نامور این دیار بود۔ درباری درختہ نگری نمود
سخنش نہایت دلچسپ و مرغوب طابع سخن سخاں است و ایں اشعار از نگہداشت و بقی ایشاں
(۳۳ شعر)۔

۴۔ مہربانی تخلص، مولوی امام بخش، در تحقیق الفاظ گوئے سبقت از پیشینیان برودہ و عرائس
معانی را از پردہ خفا باخس، وجود جلدہ گر نمودہ، شروح کتب مشککہ فارسی بشرح و بسط بسیار
چنان بقبیلہ تحریر آورده کہ کم استعدادان سواد علم ہم کما حقہ، بر مضامینش چہ برودہ۔ ہر یکے
بجز علمش فیضیاب گردیدہ و بلا استعداد استلا بدقائق رسیدہ۔ زہے نکتہ سنج یکتا کہ لغزہ
نگہ رسا از بحر معنی چنان در شاہوار بدست آورده کہ وصفش نمی توان نمود۔ اگر ترکیب ادب
نمودہ، گفتہ کہ مولانا جامی را ہم درین فن ایں مایہ دستگا چہ نبود۔ دخی روشن ضمیر
باصفا کہ بجاہر ریزی ریزہ جواہر دامان ہی دستاں علم را باطل و گہرا نہایت و بہ قول
فیصل تنبیہ الفاظین حق و باطل را بجملے خود نگہداشت۔ با جملہ عالم دانشور و فاضل
جزوہ پرور بود۔ (ایں اشعار از تصنیفاتش منتخب نمود (۴۰ شعر)

۵۔ علوی۔ مولوی عبداللہ خان، علم و فضل را روح و رواں، گلبن گلستان فصاحت
سر و بوستان بلاغت، بر ہر اصناف سخن وارد (۹) صحیفہ اش علل نہادان علم
درمانت و نشر و نظرش دوا المسکب تفریح دل نکتہ سخن۔ شیرینی گفتارش شود در عالم انداز
و ملاحظہ اشعارش یاد ملیحان روزگار از دل فراموش ساختہ۔ در نظم و نثر یکمانہ روزگار
در بحر علم گوہر شاہوار بود۔ (ایں اشعار در شمار از دست (۳۳ شعر)

۶۔ مومن تخلص حکیم محمد مومن خان، رمز شناس و نکتہ دان، مہر و خشان سپہر سخندی و
اسمان معنی پروری، مظهر خیالات دقیق و مصدر نکات تحقیق، صاحب اندیشہ، سخن
و ذکا، دلش گنجینہ فصاحت و خاطرش خزینہ بلاغت بود۔ بیشتر ازین توصیف اوصاف
چنانکہ هست، نمی توان نمود۔ (ایں اشعار گوہر شمار از گفتار ایشاں است (۲۰ شعر)

۷۔ نیر۔ نواب فیما الدین خان، سخن سنج و مخمدان، نیر رنخان سپہر حسن گفتاری و
 ہاب، نائب ملک راست کیشی و نیکو کرداری، کہن داستانہائے بزرگان در سرد
 لات سلطنت سلاطین روزگار از بری داشت۔ درباری این اشعار از دست (۲۱ شعر)
 ۸۔ ہمشیار تخلص نشی کیول رام استاد این مستہام، مدتے گزشت کہ این جہاں را
 رود کردہ بر روضہ رضواں طرح اقامت انداختند۔ مجمع فضیلت و فکرت و منبع دلائل
 نطنت۔ در مجمع علوم استعداد کمال می داشتند۔ آید سخن باین مرتبہ بود کہ بلا فکر اشعار دلپذیر
 گفتند و قصائد بینظیر بطرز عبد الواسع جلی می نگاشتند۔ حیف است کہ از انقلاب ماں
 عزے دریاں و نہ از قصائد نشان۔ ہر چند تلاش آن در بدرشتا فتم، لیکن با وجود نگاہ
 یار بیج جانہا فتم و مدت دراز می گذرد کہ از فیض ذات آن بزرگوار مستمند نیستم و بسبب
 ری و مجوری از زمان ممتد از افکار چہرے یاد ہم نماندہ۔ آتا بزمانہ تعلیم رونمے
 مدعاے نیاز کیش ابیاتے چند کہ بطرز مثنوی محل گشتی میرنجابت فی البدیہہ فرمودہ
 دند، من آہا را بنمشہ نگاہ داشتہ بودم، دریں جریدہ بہ تحریر آں می پردازم، دیدنی است
 از سیدی۔ (۸۵ شعروں پر مشتمل فارسی مثنوی درج ہے)

۹۔ غالب تخلص اسم مبارکش اسد اللہ خاں، فصیح دری زبان، شہر یار ملک
 ندانی و فرافراہائے اقلیم خیابانی، در زبان دانی پارسی مشہور زماں و فصاحت و بلاغت
 نیلے سخن سنجان شیراز و شروان، نظیر نظیریش گفتن بجا و طہوری عصر خواندش روا،
 یانست باں کہ خود نغمہ سر است:

سج شکستِ عرفی کہ بود شیرادی مشوا سیر زلالی کہ بود خوانساری
 بسوداتِ خیال در آئے، تا بینی رواں فروز برد و دوشہلے ز تازی
 مقالاتِ دلپذیرش ہمہ فکرتِ آمین و خیالاتِ بلندش آنسوئے جریخ بریں سخن
 لئے عذیم للثال و نکتہ سنج شیریں مقال بود و عرائس معانی را از جلاب اشکال جلوہ گوی
 نمود۔ اشارش شاہد این حال و گفتارش توضیح این اجمال است۔
 مجبور نے مرزا غالب کے ۳۴ شعرا انتخاب کئے ہیں۔ دس شعر کی ایک پوری غزل

اور تین متفرق شعروں کی تشریح صبح کی ہے۔ ۱۲ شعروں کی تشریح اردو میں ہے اطلاق
شعر کی فارسی میں۔ اس تشریح کے بارے میں ہجو کہتے ہیں:
معنی اس غزل حضرت مصطفیٰ علیہ الرحمۃ بقلم خود نگاشتہ من دادہ بودند
ہو بہ ہجو نگارش می آید۔

من بوفام دم در قیب بدرزد نیمہ لبش انگبیس و نیمہ تبرزد
اگرچہ لغوی معنی اس کے ہیں باہر مارنا، یعنی بدر باہر اور دن مارنا۔ لیکن روزم
میں اس کا ترجمہ ہے بھل جانا۔ اب جب یہ معلوم ہو گیا تو یوں سمجھئے کہ معشوق کے ہونٹوں
کو میٹھا کہتے ہیں اور قند اور معری اور شہد سے نسبت دیتے ہیں اور البتہ لکھی مٹھا س (ا
عاشق ہوتی ہے۔ پس جو لکھی معری پر میٹھے، وہ جب چاہے، بے تکلف اڑ جائے، اور
لکھی کہ شہد پر بیٹھیں، وہ جب اڑنے کا قصد کریں، پرو بال اس کے شہد میں پٹ جائیں
اور وہ مر کر رہ جائیں۔ پس، اب یہ کہتا ہے کہ میرے معشوق کے ہونٹ شیرینی میں میرے
واسطے شہد ہو گئے اور قیب کے واسطے معری۔ یعنی وہ چاٹ کر، تکلف اٹھا کر، صبح و رات
چلا گیا اور میں پھنس کر وہیں مر کر رہ گیا۔

در نکش بین و اعتماد لغو زمش گر بہ منے افگند ہم بزم جگر زد
ز دل لازم بھی ہے اور متعذری بھی۔ لازم کے معنی ہندی میں لگ جانا اور متعذ
کے معنی مارنا۔ یہاں ز دل لازم ہے۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ نمک شراب کو بھڑکتا ہے یعنی اگر
شراب میں نون ٹال کر ایک آدھ دن دھوپ میں رکھیں تو اس میں سے نشہ جاتا رہتا ہے
اور سر کہ ہو جاتا ہے۔ اور زخم پر اگر نمک ڈالیں تو وہ کٹاؤ کرتا ہے اور زخم کو بڑھاتا ہے مقصود
شاعر کا یہ ہے کہ تو میرے معشوق کے نمک کو دیکھ اور دیکھ کاس کو اس کے لغو پر کتنا بھڑ
ہے کہ اگر وہ اس نمک کو شراب میں ڈال دیتا ہے تو وہ شراب میں نہیں ملتا اور زخم جگر پر جا لگتا
ہے یعنی اگر بھیل بھی کرشمہ کرتا ہے تو بھی وہ اپنا کام کر رہتا ہے۔

زاں بیتنا زاک پر جائے دعویٰ نوست دست دے دامنے کہ او بگرد
اس شعر کا لطف و جدائی ہے، بیانی نہیں ہے، معنی اس کے یہ ہو، کہ اسو بحث سے

کہ بہت نادر ہے، خون کا دعویٰ کیا کریں کہ اس کو وقتِ مرگ قتل، دامن گردانتے وقت وہ صدر پہنچا (ہے) کہ اس کا ہات ہے اور وہ دامن کہ جماعوں نے گردان کر کر پر باغدا تھا، ایسا لگا کر کہ پہنچا ہے [کہ وہ آپ اپنے دامن پر نادر خواہ بعد بنا ہے۔ پس کوئی اس سے خون کا کیا دعویٰ کرے گا۔

کیست دیں خادکر خطوط شعاعی مہر نفس ریزہ برونڈن درزد
یہ خیال ہے یعنی ایک گھر میں اس کا محبوب بیٹھا ہوا ہے اور اس نے جان لیا ہے کہ کون ہے، مگر بطریقِ تجاہل بھولابن کر پوچھتا ہے کہ آیا اس گھر میں ایسا کون ہے کہ ہر یعنی آفتاب نے اپنے سانس کے ٹکڑے فرط شوق سے دروازے کے رونڈ پر پھینک دیئے ہیں؟ خطوط شعاعی کا یعنی سورج کی کرن کا بصورت سانس کے ٹکڑوں کے ہونا ظاہر ہے۔

غیرت پروانہ ہم ہر در مبارک نالہ چہ آتش ببال مرغِ سحر زد
پروانہ کی غیرت دن کو بھی مبارک سمجھنی چاہیے۔ پروانے کی غیرت وہ غیرت نہیں کہ جو پرانے میں (ہو) یا پروانے کو ہو، بلکہ وہ غیرت جو اور کو آتی ہو پروانے پر، یعنی رشکِ حاصلِ معنی یہ کہ میں تو دن رات عشق میں جلتا ہوں؛ رات کو جو پروانے کو عشق میں جلتا ہوا دیکھتا تھا تو مجھ کو اس پر رشک آتا تھا۔ دن کو ایسا کوئی نہ تھا کہ مجھ کو اس پر رشک آوے۔ [لو] اب وہی غیرت اور وہی رشک جو پروانے پر شب کو تھا اب دن کو بھی مبارک ہو۔ یعنی میرے صبح کے نالوں سے مرغِ سحر کے پروں میں آگ لگ گئی اور میں اپنی بخور دی اور مستی میں یہ نہیں جانتا کہ یہ میرے نالے کے سبب سے ہے۔ مجھ کو [وہ] رنج اور غمشہ تازہ ہو گیا، جو رات کو پروانے کو دیکھ کر کھاتا تھا۔ اب مرغِ سحر کو جلتا ہوا دیکھ کر جلتا ہوں کہ اے یہ کون ہے، جو میری طرح جلتا ہے؟

دعویٰ اُورا بود دلیلِ بدیہی خندہ دندانِ شامِ بخشِ گہر زد
بدیہی اس شے کو کہتے ہیں جو آنکھ سے نظر آوے۔ خندہ دندانِ شامِ بخشِ گہر زد کہتے

ہیں، جو تیسرے سے بڑھ کر ہوا اور اُس میں دانت [سنسنے والے کے] دکھائی دیں، معشوق مورتوں کے حسن پر ہنسنا ہے اور ہنسنا کوئی اُس چیز پر ہے، جس کو اپنے نزدیک دلیل سمجھ لیتا ہے حاصل معنی یہ کہ میرا معشوق مورتوں کے حسن پر ہنسا، گو یا اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ موتی کچھ بھی چیز نہیں۔ اب دعویٰ کے واسطے دلیل ضرور ہے۔ [سو] شاعر یہ کہتا ہے کہ میرے معشوق کے دعویٰ پر دلیل بدیہی ہے یعنی ہنسنے میں اس کے دانت نظر آئے معلوم ہوا کہ وہ حسن جو بیک موتیوں میں گمان کرتے ہیں، وہ لغو ہے۔ حسن یہ ہے کہ جو معشوق کے دانتوں میں ہے۔ [پس] اسی دلیل کو سب نے دیکھ لیا اور چونکہ بدیہی تھی، مان لیا۔

لشکر ہوشم بزرگے لشکری غمزہ ساقی نخست راہ نظر زد
نظر ”فکر“ کو بھی کہتے ہیں، اور ”نگاہ“ کو بھی یہاں ”نگاہ“ کے معنی ہیں شاعر کہتا ہے کہ میں ایسا نہ تھا کہ شراب کی تاب نہ لاتا اور شراب پی کر نہ ہوش ہو جاتا۔ مگر کیا کروں کہ پہلے غمزہ ساقی نے ”نگاہ“ کو خیرہ اور مغلوب کر دیا، پھر اس پر شراب پی گئی۔ یہ خردی کا استعداد تو ہم کچھ ہی گیا تھا، ناچار ہوش جلتے رہے۔

برگ طرب ساقی ہم دواہ گرفتیم ق ہر چہ ز طبع نازد بہ ہمدہ سرزد
شاخ چہ بالہ، اگر ارمغان گل آورد تاک چہ نازد، اگر صلائے خمر زد
یہ دونوں خمر قطعہ بند ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ روئید گیاں بمقتضائے طبیعت خاک ہر طرف ظاہر ہوا کرتی ہیں مثلاً گنا۔ اب کچھ خاک کو اور ہوا کو یہی منظور نہیں کہ اُس کا رس نکلے اور اُس کا تند بنے۔ [یہ] آدمی کی ہوشمندی ہے کہ اُس نے اس گھاس میں سے یہاں پیدا کی۔ پس، اسی طرح انگود ہیں اور گلاب کے پھول ہیں۔ شاخ گل کیا جانے کہ پھول میں کیا خوبی ہے اور تاک کیا جانے کہ میرے پھل میں کیا اہنر ہے، ہم نے اپنے زورِ عقل سے انگود کی شراب بنائی اور پھولوں کو ہر ہر رنگ سے [اپنے] کام میں لائے۔

کام نہ بخشید، گنہ چہ شماری غالب مسکین بافتات نیرد
گستاخانہ اپنے پروردگار سے کہتا ہے کہ جب اس عالم میں تو نے میری داد نہ دی اور میری خواہشیں پوری نہ کیں تو بس اب معلوم ہوا کہ میں لائقِ انتفات کے نہ تھا پس جب۔

۱) لائق توجہ کے نہیں تو اب عالمِ عقبے میں میرے گناہوں کا مواخذہ کیا ضرور ہے؟ جب بے مطالب آپ نے ہم کو نہ دیئے تو ہمارے معاصی کا بھی شمار نہ کیجئے۔ جلنے دیجئے، یہ التفات کی نہیں ہے۔

ت کزار نجد و قریب رنجیدن نداشت جرم غیر از دوست پر سیدیم و پر سیدن نداشت
معنی نبشتہ معصفت علیہ الرحمۃ۔ داشتن بمعنی رکھنے کے ہے، (لیکن) اہلِ مذہب "بالیقین" بھی استعمال کرتے ہیں۔ ظہوری علیہ الرحمۃ:

میرزا ف و کامل گفتہ باشم خویش را گفتہ باشم! میں قدر خویش پیچیدن نداشت
میرے شعر میں پہلے مصرع کا داشت بمعنی "رکھنے" کے ہے اور دوسرے مصرع
داشت بمعنی "بالیقین" ہے۔ مفہوم شعر یہ کہ دوست ایسا جیلہ و دھونڈا تھا کہ اس کے
یہ سے مجھ پر خفا ہو۔ چاہتا تھا کہ آدرہ ہو، مگر سبب نہیں پاتا تھا۔ قصداً کچھ دنوں
بعد قریب سے معشوق کو طال ہوا۔ میری جو شامت آئی، میں نے دوست سے پوچھا
قیب نے کیا گناہ کیا، جو رائدہ درگاہ ہوا؟ معشوق اسی گستاخی کو بہانہ عقاب ٹھہرا کر
یہ ہو گیا اب شاعر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے پر سیدن ماشت، یعنی پوچھنا
بہ چاہیئے تھا۔

خواندی شویں و زود فہمیدم درین پیش ازین بایم زگرد راہ پیچیدن نداشت
معنی از معصفت۔ عاشق ایک عمر تک منتظر رہا کہ یار مجھ کو بلا دے، مگر اس عیار نے
بلا دیا۔ رفتہ رفتہ میں غم سے ایسا مارو ناتواں ہو گیا کہ طاقتِ رفتار نہ رہی اور گردِ راہ
میرے پاؤں الجھنے لگے۔ جب اس نے یہ جانا کہ اب نہ آسکیگا، تب بلایا۔ عاشق
ہے کہ تو نے میرے بلانے میں دیر کی (اور میں اس کی وجہ جلد سمجھ گیا کہ تو نے میرے بلانے
اس واسطے دیر کی) کہ اس سے پہلے میں ایسا ضعیف نہ تھا کہ تو بلائے اور میں آؤں۔
نہ کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ زود فہمیدم پر ہے، یا پہلے سے بیمار نہ ہونے پر ہے۔ درین
دوست کی سیوفانی اور بے سبب آزار دہی اور اپنی عمر کے تلف ہونے پر۔ غالب
دالست از شہادتہم امید حور بود بر گشتنم زوین دم لعل ضرور بود

معنی از مصنف علیہ الرحمۃ - شاعری گوید کہ معشوقِ من گماں کردہ از شہادت
 فداست زمر اک مسلمانان از ہر شہدا احد و قسود ثبات می کنند پس این شخص از
 فدا دمی گوید کہ حیف است کہ من بمیرم و از من مایں گماں در خاطر معشوق ماند - چرا
 نشہ شدن ترک اسلام نہ کروم و کافر نشدم تا میں منطہ دودل دلداز نہ اندی - ہویدا
 زدن نمی ترسد اناں می ترسد کہ دوست بد گماں شد - کافر مردن را بہتری داند از بد گما
 ماند کافر نہ نشدن پشیمانست - غالب

استدراک

یہ تذکرہ مطبوعہ ہونے کے باوجود بیحد نادر ہے۔ اس لئے ہم ڈاکٹر حکیم چند نیر
 کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس کا تعارف کرایا۔ اگلے پرچے میں ہم اس کا تفصیلی
 تذکرہ کریں گے۔ ان شاء اللہ
 ڈاکٹر نیر نے تذکرے میں سے غالب کا مکمل تذکرہ نقل کر دیا ہے۔ بھجودنے
 اس میں غالب کی ایک فارسی غزل کے معنی دیئے ہیں، جس سے متعلق وہ
 لکھتے ہیں :

معنی اس غزل حضرت مصنف علیہ الرحمۃ (یعنی غالب) بقلم خود
 نگاشتہ بمن دادہ بودند؛ ہو بہو جگارش می آید۔

اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ غالب نے غزل کی یہ شرح مؤلف تذکرہ بھجور کے
 لئے خاص طور پر طبع کی تھی اور غالب اب تک یہ غیر مطبوعہ رہی ہوگی۔ اسی لئے
 ڈاکٹر نیر نے لکھا ہے : اس طرح مرزا غالب کی ایک نادر تحریر جواب تک
 ہماری دسترس سے باہر تھی، دستیاب ہو گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ شرح غالب نے ایک اور مکتوب الیہ مولوی کریم اللہ علی
 کو لکھی تھی اور طبع بھی ہو چکی ہے۔ (دیکھیے : اردوئے معلیٰ، طبع لاہور ۱۹۲۲ء
 صفحہ ۳۸۹-۳۹۳) مطبوعہ شرح اور بھجور کے دیئے ہوئے متن میں خفیف سا
 نقلی اختلاف ہے، نیز شعروں کی ترتیب میں بھی اختلاف ہے جہاں بھجور

کے دیے ہوئے متن میں اردو کے معنی کے معنی تھے، اسے مرقعہ اندر سے مکمل کر دیا گیا ہے اور امتیاز کے لئے یہ الفاظ مرزق قلابوں کے درمیان رکھے گئے ہیں۔

میرا گمان ہے کہ مجھ نے اس خط کا یہ حصہ نقل کر لیا اور ظاہر کیا کہ یہ شرح غالب نے بقلم خود لکھ کر انھیں دی تھی۔

انسانی فطرت کی یہ کمزوری ہے کہ وہ کسی بڑے اور مشہور شخص سے نسبت پیدا کرنے میں بڑائی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کا جعل بعض شخصوں نے پہلے بھی کیا ہے۔ صغیر گلگامی نے غالب سے دلی میں ملاقات کی تھی۔ اس کا حال بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ غالب نے یہ باتیں مجھ سے کہیں۔ حال آنکہ وہ باتیں غالب نے صغیر سے نہیں کی تھیں۔ غالب نے وہ سب باتیں جو دھری عبد الغفور سرمد کے نام کے خطوں میں لکھی تھیں۔ سرور بادہرو میں صغیر کے نانا کے ساتھ رہتے تھے۔ صغیر نے یہ خط ان کے پاس دیکھے اور ان کے اپنے تذکرے میں یوں نقل کر لئے، اگر یا غائب نے یہ ان سے کہی ہوں۔ نادر خطوط غالب کے مولف محمد اسماعیل رسا گیا دی نے بھی یہی کہا تھا کہ مطبوعہ خطوں کے ٹکڑے جمع کر کے نئے خط بنائے اور دعویٰ کر دیا کہ غالب نے یہ ان کے پر دادا کرامت علی کے نام لکھے تھے۔ کچھ ایسی ہی بات ابھور نے بھی کی ہے۔

البتہ ایک آخری شعر۔

دالت ارشاد تم اُمید خور بود
بر گشتتم ز دیں دم بسمل ضرور بود
کی شرح کا حوالہ مجھے فوری طور پر نہیں ملا۔ یہ بیخ آہنگ کے آہنگ بیخ میں ہونا چاہئے۔
مالک رام



آدمی کس کے سہارے زندہ ہے.....؟

زندہ رہنے کے لئے صرف روٹی ہی کافی نہیں۔ پیار اور باہمی
 سوجھ بوجھ بھی ضروری ہے۔ زندگی سے احساسات اور خوبصورتی کا
 بھی اتنا ہی گہرا تعلق ہے، جتنا کہ روٹی کا۔ جیسا ایک فن ہے اور منصوبہ بندی
 اس کی بنیاد۔ جب ہم دوسرے معاملات میں منصوبہ بندی کی اہمیت کو
 تسلیم کرتے ہیں تو کنبہ کو محدود رکھنے کے لیے بھی اس کا سہارا کیوں نہ لیں۔
 زندگی میں پیار، تعاون، باہمی سوجھ بوجھ کے لیے اپنا بیٹے.....

خاندانی منصوبہ بندی

DAVP

غالب اور سفیر ہرات

نے اپنی زندگی میں صرف ایک طویل سفر کیا، جب انھیں اپنی خاندانی پیش کے رے کی پیردی کے لئے دکن سے کلکتے جانا پڑا۔ وہ اوسط ۱۸۳۶ء میں دکن سے ہو کر ۲۱ فروری ۱۸۳۸ء کو کلکتے پہنچے۔ مقدمے کے ابتدائی مراحل سے فرصت غالب نے کلکتے کی ادبی سرگرمیوں میں ذوق شوق سے حصہ لینا شروع کیا اور اس بارہ مشاعروں، علمی مجادلوں اور ادبی مناقشوں میں الجھ گئے۔

زمانے میں کلکتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی راجدھانی تھا وہاں مشرق اور مغرب کے سنگم، ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی۔ عربی اور فارسی علوم کی ترویج کی غرض سے ہندوستان پہلے گورنر جنرل دارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں کلکتے میں مدرسہ عالیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۱۸ء میں اس مدرسے کی از سر نو تشکیل ہوئی اور اسے اس عمارت میں منتقل کیا گیا، ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے ویلزلی اسکوائر کی شمالی جانب تعمیر کی گئی تھی۔

ب کی آمد سے پہلے ہی یہ مدرسہ عالیہ علمی اور ادبی مرکز بن چکا تھا۔ کلکتے کے دانشوروں ایک انجمن قائم کی تھی جس کے زیر اہتمام اس مدرسے میں ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفت روزہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ جب غالب کلکتہ پہنچے، تو انھیں بھی ان مشاعروں میں شرکت و دعوت دی گئی۔ چنانچہ یکم جون ۱۸۳۸ء کو جو مشاعرہ منعقد ہوا، انھوں نے اس میں شرکت

نامہ ہای فارسی۔ مرتبہ سید اکبر علی ترمذی (دلی ۱۹۶۹ء) مقدمہ: ۲۳

Handbook of Calcutta : Historical and Descriptive
(Calcutta 1892) p. 255

کی۔ اس کے بعد کے شاعر کے لئے ایک ریختہ کا ادب ایک فلاحی کامصرع طرح دیا
فارسی کامصرع تھا :

دارم امید کہ اں ہم ز میاں بر خیزد
غالب نے اسی مصرع طرح پر غزل کہی اور مشاعرے میں پڑھی جو ۶ جولائی ۱۸۲۸ء
مدرسہ عالیہ میں ہوا تھا۔ اس غزل میں ایک شعر تھا :

جزوی از عالم دازہمہ عالم بیشم
ہجو موئی کہ جاں را ر میاں بر خیزد
اس شعر میں تین اقراض کئے گئے : (۱) مصرع اولیٰ میں ہمہ عالم کی ترکیب غلط
کیونکہ عالم مفرد ہے ؛ اس کا ربط ہمہ کے ساتھ درست نہیں۔ یعنی عالم واحد
لہذا ہمہ کا لفظ واحد سے پہلے نہیں آسکتا۔ مقرر نے بطور سند قتیل کا قول پیش
جن کے اہل کلمتہ بہت معتقد تھے۔ (۲) بیشم کے بجائے بیشتر ہونا چاہیے (۳)
زمیاں بر خیزد غیر صحیح ہے ؛ اس کی جگہ موئی زمیاں بروید ہونا چاہیے۔
ان اعتراضات کے جواب غالب نے اس سے اگلے مشاعرے میں دیئے جو ۳۱
۱۸۲۸ء کو منعقد ہوا تھا۔ ترکیب ہمہ عالم کے جوازیں غالب نے فارسی کے اس
کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے :

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
ہمہ عالم گواہ عصمت اوست (حافظ)
برجہاں خرم از آئین کہ جہاں خرم از دست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست (سعدی)

۱۔ نامہ ہای فارسی غالب : ۱۰۳

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً : ۱۰۶

سرے اعتراف یعنی بیشتر کی جگہ بیش کے استعمال کے جوازیں انھوں نے یہ شعر پیش کیا:

کم از آسم کہ دید معذرتہم باید زد
بیش از آئی کہ دی جملت تقصیر مرا (ظہوری)

اس میں 'اور' و 'بیش' کے مرادف ہونے کی سند میں انھوں نے یہ شعر پڑھا:

از رخ خط مشک سود بر غاست

آتش بہشت و دود بر غاست

جوابات کو سن کر مداحین قاتل، جید جزیرہ ہوئے اور انھوں نے غالب کے خلاف
جے میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس ہنگامے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالب باندو
بولوی محمد علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”دہسرا شمس انگریزی یکشنبہ نخستین سخنگو یاں و سخن فہماں در مدحہ سرکار
کپنی فراہم شدند مے دغز ہا خواندند مے دشیندند مے ناگاہ میفرے
کہ از طرف بادشاہ ہرات ترسہا اللہ تعالیٰ عن الآفات رسیدہ است،
در انجمن حاضر گردید و اشعار پارسی گویان ایں بقعہ شید مرا بہانگ بلند
بستود و گفت: قد بایں کلام را در ہندوستان کہ خواہد دانست؟
آچہ میگوید، در خور آنست کہ فصحا ی ایران بشنوند و خط بردارند۔ دیگر
رؤب جماعت کردہ گفت: یاراں! ایں شخص در میان شہا منعظم است
و قطع نظر از شعر و شاعری عالم زبان پارسی است۔ چوں طبائع
بالذات مفتون خود نمائی است، حد بردند“

اسے قد شا کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں: (۱) کیا غالب کے دوران قیام کلکتہ میں
ان کوئی سفیر ہرات تھا یا نہیں؟ (۲) اگر واقعی کوئی سفیر تھا، تو اس کا نام کیا
تھا؟

جہاں تک سیفر کے نام کا تعلق ہے، غالب نے ایک خط میں مولوی عبدالرزاق کو لکھا ہے:

تفسار اس زمانہ میں شاہزادہ کامران درانی کا سیفر گورنمنٹ میں کیا تھا؛
کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے
اشعار پانچ سات ایسے پڑھے؛ جن میں ہمہ عالم، ہمہ روز و ہمہ جا
مرقوم تھا۔

گویا غالب کے نزدیک سیفر کا نام کفایت خاں تھا۔ کیا اس کی تصدیق ہو سکتی
قومی دفتر خانہ، نئی دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جو دفاتر ہیں ان کے مطابقت
پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں حسین علی نامی ایک شخص کلکتے میں رئیس ہرات
کے فرائض انجام دے رہا تھا؛ گورنر جنرل کے دربار منعقدہ ۱۶ جولائی ۱۸۲۸ء
موجود تھا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس زمانے میں غالب کلکتے گئے ہیں، وہاں
سیفر ہرات ضرور تھا، لیکن اس کا نام میرا حسین علی تھا، جبکہ غالب اس کا نام
خاں بتاتے ہیں۔

اس گنتی کا صل ہیں قومی دفتر خانے ہی میں محفوظ ایک "انقاب نامہ" میں ملتا ہے
انقاب نامہ میں حسین علی خاں کا لقب یوں درج ہے: "سید حسین علی خاں معرو
بکفایت خاں وکیل مالی ہرات۔"

ان حقائق کے پیش نظر ثابت ہو گیا کہ کلکتے کے اس ادبی معرکے میں
مؤید سیفر ہرات کوئی فرضی شخص نہیں تھا؛ اس کا نام حسین علی خاں تھا اور لقب
خاں۔

وفیات

راز بلگرامی سید شریف الحسن

۱۹۰۱ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ریاض الحسن بلگرامی کی کچھ زمیندار تھے۔ راز کی عربی فارسی کی کچھ تعلیم گھر پر ہوئی، اسکول میں آٹھویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن یہ کئی انھوں نے ذاتی مطالعے سے پوری کی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا، فارسی اور عربی دونوں میں بہت اچھی استعداد تھی، اور شعر میں خاص طور پر حافظہ اتنا اچھا تھا کہ جو اے میں سند دینے میں کبھی دقت نہیں ہوتی تھی۔

فنون عروض شادال بلگرامی (ف جنوری ۱۹۴۸ء) سے حاصل کیا، لیکن شعر پر اصلاح سید وجاہت حسین ہنزہ تھری سے لی۔ اور طویل مشق سے خود استاد کی کا درجہ حاصل کیا۔ بلگرام کے میسوں نوجوان ان سے مشورہ کرتے تھے۔ شعر کے علاوہ نثر سے بھی مزاولت تھی۔ سید مقبول حسین وصل بلگرامی کے ماہنامے امرت، میں برابر کے شریک تھے اور اس میں کبھی کبھی نثری مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس زمانے کا ایک مشہور تنقیدی مضمون شاد عظیم آبادی اور اکبر الہ آبادی کے کلام کے موازنے سے متعلق تھا جس پر کچھ بحث بعد کو نگار (لکھنؤ) میں ہوئی تھی۔

مطبوعہ تصانیف یہ ہیں: حسین بیٹی، مائثر حسین، پہنات

آخری ایام میں تاریخ بگرام مرتب کرنے ارادہ تھا، لیکن اس کے لیے جس ذہنی اور جسمانی سکون کی ضرورت تھی، وہ میسر نہ ہو سکا اور کام نامکمل رہ گیا۔
کلام کبھی محفوظ نہیں رکھا، بلکہ جس نے طلب کیا، اس کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ نظم، غزل، نعت، قصیدہ سب اصناف میں کہا، لیکن تلاش کرنے پر شاید ایک معقول جملہ کے لیے بھی اب بدل سکے۔

سادات بگرام کو اہل بیت سے بہت محبت رہی جو سدا مروجہ بھی اس سے متشنی نہیں تھے۔ چنانچہ مرثیہ خوانی سے بہت شغف تھا، بلکہ فارسی "وہ مجلس" کے پڑھنے میں تو ان کی خاص شہرت تھی۔

تبہ دق کے مرض سے ۱۰ اگست ۱۹۷۱ء کو بگرام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

طالب کشمیری، اند لال کول

پنڈت نند لال کول طالب جن کا مختصر علالت کے بعد اچانک ۱۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کو سرنگر میں انتقال ہو گیا، کشمیر کے خاصے صاحبِ وجاہت طبقے کے فرو تھے۔ ان کے والد کا نام پنڈت ٹھاکر پرشاد کول تھا، جو ریاست کے بڑے زمینداروں میں گنے جاتے تھے۔ طالب کے دادا پنڈت دیوہ کوئی حکومت کشمیر میں دفتر دیوانی کے افسر اعلیٰ تھے۔ وہ فارسی کے سنسکرت اور شاعر بھی تھے، دیوہ تخلص تھا۔ مرید میں بھی خاصی دستگاہ تھی اور سنسکرت اور ہندی سے بھی واقف تھے، بلکہ ہندی میں تو ان کا ایک آدھ شعر بھی ملتا ہے۔ افسوس! ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ باقیاتِ صالحات میں سے فارسی کی چند غزلیں رہ گئی ہیں۔ شعر و سخن کے علاوہ خوشنویسی اور مصوری اور نقاشی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اہل نظر سے خواجہ حسین رحیل ہیں، بشیر تصویریا مہند دیوہ مالا اور مہرب سے متعلق ہیں۔ ان کا ۱۸۰۹۲ میں سرنگر میں انتقال ہوا۔

دیہ کے والد یعنی طالب صاحب کے جد امجد اے راگھوناتھ کو ل بہت بڑے رئیس اور زمیندار اور ریاست میں وزارت اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے تھے۔

بذرت نند لال ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء کو سرسنگر میں پیدا ہوئے۔ خاندان کا ماحول علمی تھا، اس لیے ان کی تعلیم پر پوری توجہ دی گئی، چنانچہ ۱۹۲۲ء میں بی اے، دو سال بعد ۱۹۲۴ء میں ایم اے (فارسی) پھر ۱۹۲۵ء میں منشی فاضل (فارسی) اور دہلی کے ماتھ ایم، اے ایل اور ادیب فاضل (اردو) کے امتحان پنجاب یونیورسٹی سے امتیاز سے کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی اور سری پرتاپ گج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے، یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک رہا۔ اس سال ماں سے سبکدوش ہو کر امرنگھ گالچ میں پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی و اردو ہو کر پلے گئے، یہاں ۱۹۵۴ء تک رہے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء تک کے تین برس جوں دشیر دیورٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں جوں دشیر پول اکاڈمی سے بھی وابستہ ہو گئے۔

اس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس میں شعر گوئی کا شوق لابر تھا، ہذا یہ بھی کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے کچھ دن دبیر تخلص کرتے رہے، پھر سے بدل کر ناب کر لیا۔ شروع میں منشی رام سہاے متا لکھنوی (ف ۱۹۳۲ء) سے اصلاح لی، جو منشی دوار کا پرشاد افق (ف ۱۹۱۳ء) کے بھائی اور منشی بشیشور پرشاد منور، لکھنوی (ف ۱۹۰۷ء) کے چچا تھے۔ متا سے اصلاح کا سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔ اس سال عوں نے بذرت برج موہن و تاتھیہ کیفی دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) کا تلمذ اختیار کیا۔

غنی مرحوم نے اپنی وفات سے مدتوں پہلے انھیں فارغ اصلاح قرار دے لیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سیما بکیر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) سے بھی شاگردی کا تعلق رہا، جی دھنی اور سیما بک دونوں سے بیک وقت استفادہ کرتے رہے۔ انھوں نے

کیفی مرحوم سے تلمذ کا ایک شعر میں ذکر بھی کیا ہے :

حضرت کیفی کی شاگردی پر نازاں کیوں ہو! میں ہوا طالب تو غشا، فیض و حانی تھے

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ (۱) اشعار التتمیل یعنی کلام طالب (دہلاویں ۱۹۲۵ء)

اور (۲) مرقع انکار (دہلاویں ۱۹۵۱ء) اس کے علاوہ (۳) تراۃ طالب کے عنوان سے ایک

طویل مسدس بھی شائع ہو چکا ہو۔ منشی تیرتھ رام فیروپوری نے اردو میں پرتھوی راج

چوہان کی سو انجمنی کھنٹی، طالب نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ کشمیر میں فارسی کے

ایک شاعر ہوئے ہیں پنڈت راج کول عرض ہوگی، وہ دیرنی مخلص کرتے تھے، بہت محنت

کلام ہے۔ دیوان شائع نہیں ہوا تھا۔ طالب صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع

کیا۔ ایک کتاب ادب ایران میں کشمیریوں کا حصہ کے عنوان پر شائع کی تھی۔

پنڈت برج کشن کول بخیر اور پنڈت جگموہن رینہ شوقی نے بہار کشن کشمیر کے عنوان

سے کشمیری پنڈت شعرا کا ایک تذکرہ دو جلدوں میں شائع کیا تھا لاہ آباد ۱۹۳۱-۱۹۳۲ء

طالب صاحب نے اس کے لیے شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی میں مرہبین کا بہت ہاتھ

بٹایا تھا جس کا انھوں نے دیا چے میں اعتراف کیا ہے۔

طالب صاحب نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کا تجزیہ کر کے سرمایہ کلام غالب کے

عنوان سے ایک سلسلہ مضامین تاہی رسالے "فوائے ادب" (بہمنی) میں شائع کیا تھا

اسی کو مرتب کر کے کتابی شکل میں جوہر آئینہ کے نام سے چھپوایا۔ ابھی مضامین کا اچھا

خاص ذخیرہ منشر حالت میں پڑا ہے۔

انھوں نے آٹھویں صدی کی مشہور کشمیری شاعرہ لالہ عارفہ کے کلام کا اردو اور فارسی میں

ترجمہ کیا تھا۔ لالہ کا کلام شیوی فلسفے پر مبنی ہے۔ طالب کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ ہر ضو

کی وقت کے باوجود اس میں کہیں اشکال پیدا نہیں ہوا۔ یہ کتاب غیر مطلوبہ نہ گئی۔

اسی ایام میں وہ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ یہ غالباً ناممکن ہو گئی

وفیات

ہا ہو۔ لیکن متناقصہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ اسے شائع کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف ان کی منت ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیگی، بلکہ آئندہ کام کرے والوں کے لیے بنیاد بن ثابت ہوگی۔ وہ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی کہتے تھے جیسا کہ "بہار گلشن کشمیر" انتخاب سے ظاہر ہے۔ "مرقع افکار" میں بھی کچھ فارسی کلام موجود ہے۔ خدا معلوم اسے فارسی کلام کی مقدار کتنی ہو بہر حال یہ بھی غیر مطبوعہ رہ گیا۔ بہت سے مضمون غیر رسائل و جرائد میں منتشر پڑے ہیں۔

اس علمی خدمات کے جلد دیں صدر جمہوریہ ہند نے اس سال انھیں فارسی کا انعام "ماہرہ روپے سالانہ" عطا فرمایا تھا۔ وہ ۱۲ اکتوبر اس کی سند لینے کو دلی آنے والے کہ چار پانچ دن کی مختصر علالت کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۷۱ء صبح ساٹھ سالہ بچے حرکت با بند ہو جانے سے ماہی ملک بقا ہو گئے۔ ان کی آخری کتاب جو ہر آمینہ بھی مطبع نہیں آئی تھی، یہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

لی نوت سے یک صلح کل اور شریف دوست، ہمدرد اور شفیق استاد، ادو کا ایک بنی خادم ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

امام عباسی بلیاوی۔ قاضی محمد عثمان عباسی

ن کا شجرہ نسب میر امتیاز حضرت عبداللہ عباس سے ملتا ہے۔ پرخاندان چلے
یا کوٹ ضلع انظر گڑھ میں مقیم تھا۔ ضلع بلایا میں یلہ تھراہ و ڈریوے اسٹیشن سے
نی چاہیل دو ایک گاؤں پسو باری ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ چچ یا کوٹ سے نقل مکان
کے پسو باری میں آئے۔ یہاں حکومت وقت نے ان کی مناسب قدر و منزلت کا
لندہ پور عزتی کی قضاۃ ان کے سپرد کر دی۔

شاعری

تو نہیں کیا، لیکن زہد و تقویٰ کے باوجود رکیک، عریاں، مبتذل اور فحش مضامین
باندھنے میں حضرت فصیح الملک کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا۔

ان حالات میں صرف حضرت فصیح الملک کو مورد الزام ٹھہرانا بجائے خود قابل الزام ہے۔
چوں کہ میں اس مقالے میں کہیں کہیں ان کے مضمون، اسلوب بیان اور استعمال الفاظ
پر جو فکری کڑہ نکھا، اس لیے دخیل و دخل مقدر کے لیے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج کل ہندوستان
اور پاکستان میں شاید ان کا اتنا ادراج کوئی نہ ہو جتنا میں ہوں، یہ دوسری بات ہے کہ میں
نے ان کی یا کسی اور کی تقلید کبھی نہیں کی۔

حضرت ابو الفصاحت کی شاعری کے ارکان یعنی حسنِ تخیل اور حسنِ بیان خود آپ کی ذاتی
قوتِ ابداع و اختراع کے مہر ہوں منتہی ہیں۔ اس بات میں آپ نے نہ کسی شاعرِ عظیم کی
مثال پیش نظر رکھی اور نہ کسی کی تقلید کی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ زبان، روزِ ترے اور
محاورے کے استعمال میں حضرت فصیح الملک کے کلام سے استفادہ کیا۔ مگر اسے تقلید
نہیں کہا جاسکتا۔ تقلید تو اندازِ فکر اور طرزِ بیان کی نقالی ہوتی ہے۔ اگر آپ اہلِ زبان
ہوتے، تو اتنا بھی نہ کرتے۔ بہر حال آپ نے جو استفادہ کیا، وہ اہلِ زبان کی سب سے زیادہ
ناگزیر تھا۔ آپ کا بیان ہے:

اگرچہ حضرت داغ کی معجز نگاری میرے لیے بہت بڑی محرک تھی، مگر
میں تسلیم کرتا ہوں کہ اپنے میلانِ طبع کے زیر اثر ان کا انداز سخن اپنی طبیعت
میں اس قدر جذب نہیں ہو سکا، جس قدر نوح ناردی، ہجر شاہ جہانپوری
لعل بیجو و بدایونی نے کیا تھا۔ اس میں کوتاہی اور قصور کی کوئی بات نہیں۔
غالب کے ۳۶ اشعارِ درد میں سے ایک نے بھی ان کا اندازِ سخن گوئی قبول
نہیں کیا۔ مگر اس حقیقت کے باوجود میری ہر فرس میں ایسے تین چار شعر
ضرور پائے جاتے ہیں جن پر داغ کے رنگ کی چھاپ صاف نظر آتی
ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ انداز انھیں کافیضان ہے۔ چند شاکیں
ملاحظہ ہوں:

صوت باہم بھی رہی، جو سادہ اور آواز زندگی کا خالق ہے، لیکن وہ برس ہوئے، پوری کی موت (۱۱ اگست ۱۹۶۹ء) نے اس پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ ۷ ستمبر ۱۹۶۹ء کو دل پر پہلا حملہ ہوا۔ علاج معالجے میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن بیسودہ اپنے عزیز دوست حکیم سعید عارفین کے پاس میرٹھ شہر گئے ہوئے تھے کہ وہاں دوسرا حملہ ہوا۔ اسی میں ۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء کو صبح ساڑھے پانچ بجے روح قفسِ محضری سے پرواز کر گئی۔ وہیں تدفینِ عمل میں آئی حکیم صاحب موصوف کے خاندانی قبرستان شاہ سلطان میں آفری خواہ محلہ خضیب پورٹی۔ یوں معلوم ہوتا ہو، گو یا میرٹھ کی مٹی ہی نے انھیں وہاں کھینچ بلا لیا تھا۔

اپنے بچے اولادِ جسانی میں پانچ بیٹے اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے۔ سب سے بڑے سعید عارف لکھنؤ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں۔ انھیں بھی علم و ادب سے شغف ہو۔ اور سعید عارفی کے قلمی نام سے لکھتے ہیں۔

عارف نے شعر گوئی اگرچہ زمانہ طالب علمی ہی میں شروع کر دی تھی۔ لیکن اس میں باقاعدگی ۱۹۷۱ء میں آئی۔ ابتدا میں آزاد فقہوری اور حکیم سید باقر حسین شاعر ٹھہری۔ (۱۹۷۱ء) سے مشورہ ہوا۔ بعد کو جگر مراد آبادی سے مستفلاً تلمذ اختیار کر لیا۔ حبیب احمد صدیقی نے بھی ان کی ذہنی اور فکری تربیت میں خاصی دلچسپی لی تھی۔ وہ خوش فکر اور زوردار گو اور بزرگو شاعر تھے، پگڑا فسوس کہ کلام کی تدوین سے متعلق بہت بے پروا ہے، چنانچہ کوئی مجموعہ سچ تک شائع نہیں ہوا۔ البتہ کے بڑے صاحبزادے سعید عارفی سے مختلف رسائلِ جماعت سے فروہم کرنے کی فکر میں ہیں۔

منظر اکبر آبادی، شمشاد حسین صدیقی۔

منظر اردو کے مشہور شاعر جناب سیاب اکبر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم در تربیت والد مرحوم کی نگرانی میں

ذیلیات

پائی۔ لیکن کمزوری صحت، اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہ میں حائل ہوئی، بیاب مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلے میں کانپور کے بعد اجیر ٹونڈلہ، اگرہ وغیرہ میں رہے۔ منظر کا بچپن بھی انھیں مقامات میں بسر ہوا۔ ٹونڈلہ کے قیام کے زمانے میں یہاں کے ریلوے ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے، لیکن ابھی بچوں کے سب سے بڑے ہنگ نہیں پہنچے تھے کہ بیاب دہلی سے چلے آئے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اور سب کام سے ہاتھ اٹھا کر اگرہ میں قصر الادب کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ پیمانہ جاری کیا۔ منظر اپنی کمسنی کے باوجود اس ادارے سے وابستہ ہو گئے، اور یوں تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا اس کے بعد کچھ مذہبی حرکیں اور اردو مدرسہ عالیہ، جامع مسجد اگرہ اور مدرسہ محمدیہ اگرہ میں حاصل کی۔

قصر الادب کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف پرچے شائع ہوتے رہے جن میں ہفتہ وار، ماہ، ترمائش، کنول، مشورہ، ہفتہ وار ایشیائی خاص طور پر شہرت حاصل کی، منظر کس نہ کسی حیثیت سے ان سب سے متعلق رہے اور غالباً پندرہ برس تک ایٹ کے ایڈیٹر رہے۔

جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی، اس میں شعر گوئی کو یا لازماً حیات تھی۔ یہ بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے، اصلاح اپنے والد سے لی۔ اگرچہ غزل بھی کہتے تھے لیکن زیادہ مزاح و طعنے سے رہی۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں بیاب کانپور میں انتقال ہو گیا، تو منظر صاحب اگرہ سے باہر چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے ایک ماہنامہ 'پرچم' کے نام سے جاری کیا تھا۔ نیا واقعہ ہے کہ پاکستان میں پریشان حال رہے۔ انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔ تندرستی اور بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی، ضیق نفس کا عارضہ، لیکن اس کے باوجود بظاہر تندرستی کی کوئی بات نہیں تھی۔ اپنا ۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء شہید کیا۔

وفیات

شدید دورہ پڑا جس سے ہاگ اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اور دس منٹ بعد آٹافٹا
 لے کر دس بجے روح نقسب عفری سے پردہ اندر لگئی۔

امی، ہادیو پرشاد

روٹی (روپی) کے ایک متوسط الحال کا ستھہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام
 ی پرشاد تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے: بڑے شارد اور پرشاد تھے اور چھوٹے ہی ہادیو پرشاد
 ی پرشاد ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو ہر دوٹی میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم جوہلی
 اسکول، لکھنؤ میں پائی۔ اس کے بعد کنگ کالج میں داخلہ لیا۔ بی ایس سی آخر کی سال
 تھے کہ والد چلے گئے۔ چونکہ اس کے بعد مالی حالت ٹھیک نہ رہی اس لیے تعلیم کا
 نہ منقطع ہو گیا۔ اب انھوں نے ضرورتاً فیض آباد کے ایک اسکول میں نوکری کر لی چندے
 باروں اسکول، جیلپور میں منتقل ہو گئے، اور پھر گویا عمر بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے
 اس محکمہ تعلیم نے انھیں تدریس کی تربیت حاصل کرنے کے لیے منتخب کیا،
 لیکن اسپینس ٹریننگ کالج، جیلپور سے سند حاصل کی، اور اس کے بعد
 ڈسٹریکٹ کالج ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔

۱۹۰۷ء کے اوائل میں تھکالی سبھا، جیلپور نے انھیں شکاری سٹی کالج میں اور دو فارسی
 مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اردو یا فارسی میں ایم اے نہیں تھے۔ اس لیے
 سٹی اپنے قواعد کی رقم سے ان کے انتخاب پر بجا طور پر اعتراض ہو سکتی تھی، لیکن ان کی
 قابلیت اور تجربے کے پیش نظر ناگپور یونیورسٹی کے اباب جلی و عقد نے استثنائی
 بیان کے تحت کی اجازت دے دی۔ اس پر انھوں نے جنوری ۱۹۱۱ء میں سرکاری ملازمت
 انصاف دے دیا اور بقیہ عمر اسی ہتھکارتی کالج میں گذار دی۔ اپنی گرتی صحت
 بڑھتی سال کے باعث وہ جہاں سے ۱۹۱۵ء میں سکون و ش ہوئے۔

وفیات

پچھلے کئی برس سے ان کی صحت تسلی بخش نہ تھی۔ ان کی بڑھ کی بڑی سی کچھ نقص رہا ہو گیا تھا جس سے گردن میں بھی کئی آگئی تھی۔ مزید مصیبت یہ کہ نخی حالات بھی بہت ناخوشگوار ہو گئے۔ خانگی جادو اسے شعلت کچھ تازہ پیدا ہو گیا اور نوبت عدائیت تک پہنچی۔ مقتدی کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔ اور وہ پریشان رہنے لگے۔ اسی زمانے میں ان پر فاج کا حملہ ہوا، اور اس کے بعد اس کے متوازن علم ہوتے رہے۔ آخری مارچ ۱۹۷۱ء کو ہوا اور اسی دن سہ پہر کے پانچ بجے وہ میڈیکل گارج میں جلاں بحق ہو گئے۔ لا ولہ فوت ہوئے۔

جیسا کہ ذکر ہوا وہ گھر کے ناموافق حالات کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے، لیکن خداداد ذہانت اور ذاتی جدوجہد سے انھوں نے یہ کی پوری کر لی۔ سائنس کے وہ طالب علم رہے تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی میں ان کی مہارت کا کچھ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ایچ ڈی کے طلبہ اور پروفیسران سے مشورہ کرتے اور مٹائی حاصل کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی جس سے وہ بہت دن تک دھید پریش کے فارسی عربی بورڈ کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔

شعر و سخن سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ جب شعر کہنے لگے، تو افتخار الملک مضطرب خیرو آبادی سے مشورہ کیا۔ افسوس کہ ایک نعتیہ نظم (رویت حسنہ) کے علاوہ جو جذبات کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا، اتنا اطمینان ہے کہ وہ محض ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔

اس نعتیہ نظم کی شان نزول یہ ہے کہ فروری ۱۹۷۲ء کی شب ۵/۶ شعبان ۱۴۰۵ کو مغرب کے بعد ایک ستارہ ٹوٹا اور آسمان آسمان کی روشنی سے آسمان پر نقشہ محمد ہوا۔ یہ قلم نویس آدمہ تھے، ایک دیکھا گیا اور پھر ستر ستر بجے دم توڑا ہوا ہوا ہو گیا

وفیات

یوپی احمد حمید پرنس (سی پی اے) متعدد شہروں میں ہزاروں اشخاص نے اسے دیکھا۔
 نرمانے کے انباروں میں بھی اس کا بہت چرچا رہا تھا۔ اس سے تعلق کیم مارچ
 ۱۹۶۷ء کو جیلپور میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جس کے کوائف ستارہ محمدی کے
 عنوان سے علی احمد جیلپوری نے شائع کیے تھے۔ اس مجموعے میں سامی کی اس نظم
 رویت حسنہ کے علاوہ تین فارسی رباعیاں، ایک فارسی قطعہ اور ایک فارسی نعت
 بھی شامل ہیں۔ یہ نظم رویت حسنہ انھیں ایام میں جذبات سامی کے عنوان سے
 بھی چھاپی گئی تھی۔ یہ سندس کی شکل میں ہے۔ اس میں سترہ بند (۱۷ شعر) ہیں۔

افقر موبانی، استاد محمد حسین

محبوب الہی حضرت نظام الدین ادویا (ف ۱۳۲۵ء) کے خلیفہ حضرت نصیر الدین کھف (ف ۱۳۵۶ء)
 جرائد دہلی کے نام سے کون صاحب علم واقع نہیں ہوگا انھیں کے خلیفہ اور جانشین حضرت سید
 محمد گیسو دراز تھے (ف ۱۳۳۳ء) جن کا فن ظہر گزین ہو۔ ان سے لگے یہ سلسلہ طریقت چلا۔ ان
 کے خلفاء میں سے حضرت سید شاہ عبدال حکیم عرف دادامیاں اول بہت دن کا لپی (ضلع جالندہ)
 میں مقیم رہے اور پھر ۸۵۰ سی دہاں سے نقل مکان کر کے قصبہ موبان (ضلع آٹاوا) میں
 قاسم گزین ہو گئے۔ یہی دادامیاں ہمارے شاعر سید محمد حسین افقر موبانی کے جدِ اعلیٰ تھے۔
 حضرت دادامیاں کی آنکھیں پشت میں افقر کے دادا مولانا شاہ غلام علی پیرزادہ عرف
 میاں جی ہوئے۔ پیری مریدی کا یہ سلسلہ رشد و ہدایت انھیں پرستہ ہو گیا۔ ان کے جانشین
 ولایتیہ امام علی افقر موبانی کے والد تھے۔ یہ ۱۸۴۵ء میں موبان میں پیدا ہوئے انھوں
 نے عربی فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم اپنے والدین حضرت میاں جی سے پائی۔ وہ چاہے
 تر سجادہ نشینی جاوی رکھتے، لیکن انھوں نے یہ سلسلہ بیعت قائم نہیں رکھا اور خود
 بد حاجی عارف علی شاہ، دیوبند (ف ۱۹۰۵ء) کے مرید ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

وفیات

انہوں نے قصبہ موہان اور قرب وجوار کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں بنجور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ شعر بھی کہتے تھے، بسمل تخلص تھا۔ انفرادی حساب سے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ان کا کلام دیوان کی شکل میں مرتب نہ ہو سکا۔ صرف کچھ اوراق میرے پاس موجود ہیں۔

انفصالیہ کہ انہوں نے خود بھی اطلاع دی تھی ۳۱ جولائی ۱۸۸۷ء کو اپنے وطن مالوہ بٹیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے محمد حسین کے علاوہ ان کا تاریخی نام "ظفر وراثت" بھی رکھا جس سے ۱۸۸۷ء برآمد ہوتے ہیں، ان کے بچے مختلف معاصرین آخوندک انہیں اسی تاریخی نام سے پکارتے رہے۔ انفرکی انہیں بال قصبہ آسیون (ضلع انارک) میں تھی چنانچہ ان کی ابتدائی تعلیم یہیں اپنے ماموں مولانا ضیاء الدین قادری کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کے بعد یہ موہان آگئے اور اب دینیات اور دوسرے علوم رسمہ کی تحصیل میں لگ گئے۔ انھوں نے مقامی اردو مڈل اسکول سے ۱۹۰۱ء میں بھر ۱۳ سالہ بچہ کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں وہ مستقل لکھنؤ چلے آئے یہاں انہوں نے حکیم عبدالعزیز (بھوٹالی ٹولہ) سے طب کی تعلیم پائی، لیکن انہوں نے کبھی باقاعدہ طب نہیں کیا۔ جب فکر معاش ہوئی، تو ۱۹۰۷ء میں مطبع نوکشور میں صحیح مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ بہت دن تک رہا۔ کئی سال بعد میرکاری ملازمت مل گئی اور وہ کورٹ آف وارڈس میں ضلعدار مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد تحصیل میں ناظر اور وکیل باقی نوے برس کے عہدوں پر بھی رہے، ان کا زیادہ تر طمانہ طبع آباد (ضلع لکھنؤ) میں گذرا۔

انفر ۱۹۱۲ء میں بھی چلے گئے۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ وہاں کے ایک سیٹھ حاجی منشی محمد حسین لکھنؤ آئے جب وہ مطبع نوکشور گئے، تو یہاں ان کی ملاقات انفر سے ہوئی۔ منشی محمد حسین کا ایک ہفتہ وار پرچہ "مفید و مذکا" تھا، وہ اس کے لیے کسی

وفیات

ایڈیٹر کی تلاش میں تھے جب وہ انقرہ صاحب سے ملے تو انھیں بہٹی آنے اور وفیدہ پنگر کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ فقر نے اسے قبول کر لیا اور اپنی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ ہو کر بمبئی چلے گئے یہاں وہ مئی برس ۱۹۱۵ء تک رہے بعد رزگار کے ایڈیٹر تھے جی۔ منشی محمد حسین کے ایما پر انھوں نے ایک مزاحیہ پرچہ مولانا پانچ بھی جاری کیا۔ لیکن بہٹی کی مطلوبہ آب و ہوا انھیں اس نہیں آئی، اب وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے بالآخر انھوں نے تنگ آ کر ان صحافتی سرگرمیوں پر ملازمتی اور لکھنؤ کی راہ لی۔ اس سے معاش کا مسئلہ تو حل نہیں ہو سکتا تھا۔ باقی مطبعہ لکھنؤ کے غنیمین نے دستگیری کی اور یہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں وہ ڈسٹرکٹ گزٹ کے مدیر ہو کر گوندہ چلے گئے۔ یہ کانگریس اور خلافت کی سرگرمیوں کی روز افزوں ترقی کا زمانہ تھا، ان دونوں کے خلاف حکومت کے پراگندہ کیوشن نیز می سے کام کر رہی تھی، اور اس کام کے لیے سب ضلعوں سے گزٹ خالص ہونے لگے تھے۔ گوندہ گزٹ بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ ۱۹۳۳ء میں یہ گزٹ بند ہو گیا اور انقرہ صاحب لکھنؤ واپس آ گئے یہاں ان کا لمبا واد دلے دے کے لکھنؤ چھاپہ خانہ تھا، اب کے انھیں صحافتی تجربے کے پیش نظر روزانہ اور دو اخبار کا نائب مدیر مقرر کیا گیا۔

اس زمانے میں سید جالب دہلوی (فوجی لائی ۱۹۳۰ء) لکھنؤ میں مہدم اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ انقرہ صاحب سے ان کے دید و دید کے تعلقات تھے۔ جالب کے مشورے سے انھوں نے ماہنامہ جام جہاں نما جاری کیا، اس کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۳۴ء میں نکلا تھا۔ اس میں لکھنؤی اسلوب بیان اور طرز سخن پر بڑی کڑی تنقید شائع ہوئی جس سے یہاں کے شعرا طلباء اٹھے اور انھوں نے فقر کے خلاف باقاعدہ مجاز بنالیا۔ انھوں نے ان کے نام لکھنے سے فائدہ سمجھ کر عزیز اردو، بیحد موبالی، اسی الدن، امید بھوی

وغیرہ تو البتہ غیر جانبدار رہے۔ بقیہ تقریباً تمام بڑے اور چھوٹے شاعران کے خلاف ہو گئے تھے۔ لیکن اصغر گوٹڈوی، پنچود موہانی، اور انٹر لکھنوی جام جہاں نمل کے متعلق مضمون نگار تھے۔ جب لکھنوی شعر کی دھمکیاں میسوزا بت ہوئیں، تو متعدد حضرات نے تنگ عزت کے مقدمے دائر کر دیے۔ انقر نے ان کے ادھیچے حلیوں کے آگے متحیاد نلنے سے انکار کر دیا اور ڈوٹ کر مقابلہ کیا؛ اور بالآخر مخالفوں کو ہر میدان میں شک اٹھانا پڑی۔ یہ پرچہ اپنی پوری آبن بان سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔ اس کے مند ہو جانے کے بعد وہ پانچ چھ برس تک پڑھاتے رہے جہاں سے ۱۹۵۵ء میں سکے دوش ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں اتر پردیش کی حکومت نے ان کا ایک سو دو پیہ مامز ادبی و ضیف مقرر کر دیا جو انھیں اپنی وفات تک ملتا رہا۔ توکل اور صبر و شکر انھیں ورنے میں لاقھا؛ اس لیے اس قلیل وجہ معاشرہ کہ باوجود انھوں نے کبھی شکایت کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی حضرت وارث علی شاہؒ (دیوہ) کے مرید تھے۔ ان کے نام کے ساتھ دارثی کا اضافہ اگر مناسب سے تھا جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، انھیں معلوم ہو گا کہ وہ بالعموم ایک گبر و اتمد باندھے رہتے تھے۔ یہ بھی دارثی گروہ کا امتیازی نشان ہے۔ ان کے کمرے میں عین پینٹنگ کے اوپر حضرت وارث علی شاہؒ کی ایک تصویر لگی رہتی تھی اگرچہ اس پر ایک پسہ پڑا رہتا تھا۔

انھوں نے اپنے پیر کی یاد ماننے کو ۱۹۵۱ء میں سالانہ طرحی مشاعرہ کی بنیاد رکھی؛ یہ مشاعرہ ایریل کو ہوا کرتا تھا۔ اسے وہ اپنی زندگی بھر باقاعدگی سے کرتے رہے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ مصرع طرح ہمیشہ ہرج منس سالم میں ہوتا اور قافیہ آستان۔ اس کے لیے وہ شاعروں کو دو عنوان مہیچتے تھے؛ اور ان شاعروں کے علاوہ اور کسی کو کلام پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

چونکہ وہ بہت کمزور رہنے لگے تھے اور کمزوری روز بروز بڑھ رہی تھی؛ اس لیے انھیں معلوم تھا کہ اگرچہ

زیادہ دن جینے کے نہیں۔ چنانچہ آخری مشاعرے کے موقع پر انھوں نے اپنے احباب اور تلامذہ سے ان کے نام لے کر یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس مشاعرے کو آئندہ بھی جاری رکھیں۔ سالِ رواں کے مشاعرے میں انھوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ آئندہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہیں ہو سکتے۔ وہی ہوا۔

کبرسنی کا عالم تھا۔ ۸۴ برس کی عمر میں ہندستان کے معیارِ عمر کو دیکھنے ہوئے کم نہیں ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ فلاح کا حملہ ہوا جس سے وہ بہت معذور ہو گئے۔ سالِ گذشتہ دوسرا حملہ ہوا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اب دنوں کے ہمارے ہیں، لیکن موت کا ہمارا قلبی دورہ ہوا۔ وہ ایک زمانے سے عللہ لاش کلن (ماہوں بھانجے کی قبر کے موڑ پر) لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ہمیں مشکل کے دن ۲ نومبر ۱۹۶۹ء/۱۲ رمضان ۱۳۹۱ء کو بعدِ مغرب انتقال ہوا۔ تدفین اگلے دن (۳ نومبر) بعدِ ظہر ہوئی۔ ہمارے خاندان کے رشتے کے بھتیجے محبوب اختر دارائی نے پڑھائی پیش باش کے قبرستان میں قبر نصیب ہوئی۔

ابھی وہ نڈل اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ انھوں نے (۱۹۰۰ء) شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا سب سے پہلا شعر تھا:

دل غنی ہے تو مفلس کیا ہے

گھر میں اللہ کے کمی کیا ہے

یہ شعرون کے خاندان کے مذہبی ماحول کا ترجمان ہے جس نے ان میں یہ لکھنؤ آئے ہیں۔ حکیم ضامن علی جلال (ف ۱۹۰۰ء) اور منشی امیر اللہ تسلیم (ف مئی ۱۹۱۱ء) صاحبِ فن سا موجود تھے۔ چونکہ فقر کو مومن (ف ۱۸۵۲ء) کے کلام سے شغف تھا، اس لیے انھوں نے تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔ تسلیم خود نواب اصغر علی خان نسیم (ف ۱۸۷۶ء) کے شاگرد تھے جن کا مومن کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح فقر کا سلسلہ سخنِ تمیزی پشت میں مومن سے جالمتا ہے۔ اصغر گوندی (ف نومبر ۱۹۲۶ء) اور حسرت خان

دف ۱۹۵۰ء ان کے خواجہ تاش تھے۔ ۱۹۰۵ء کے آخر میں تسلیم کے شاگرد ہوئے؛ حسرت ان سے دو تین سال پہلے شاگرد ہو چکے تھے اور اصغر گوندوی دو تین سال بعد آئے۔

ان کی کچھ تصنیفات شائع ہو چکی ہیں: (۱) رسائل تصوف، پانچ حصے (لکھنؤ ۱۹۱۵ء)؛ (۲) حمید کی ڈال (لکھنؤ ۱۹۱۷ء)؛ (۳) سہی محل (نظمیں) (الہ آباد ۱۹۲۲ء)؛ (۴) مختصر سوانح عمری حضرت حاجی دارت علی شاہ (لکھنؤ ۱۹۳۳ء)؛ (۵) فردوسِ معالی (بہارِ دیوان) (لکھنؤ ۱۹۲۶ء)؛ (۶) رہنمائے شاعری حصہ اول (لکھنؤ ۱۹۶۰ء)؛ (۷) نظر گاہ (دوسرا انتخابی دیوان) (لکھنؤ ۱۹۶۱ء)؛ (۸) رہنمائے شاعری حصہ دوم (لکھنؤ ۱۹۶۶ء) ان میں سے دو کتابوں بنبر ۳ اور ۴ پر حکومت کی طرف سے پانچ پانچ سو روپیہ انعام عطا ہوئے۔ ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ بڑا ہے جس سے ایک مجلد تیار ہو سکتا ہے۔ لہذا کہ اس کے شائع ہونے کا امکان اب کم ہی ہے۔ دو زبانوں نے مصنف کی تقلید میں شاعری اور دوستوں میں تقسیم کر دیا، اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے!

انقر کو زبان و بیان و عروض پر باہر نہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد مک کے مختلف حصوں میں موجود ہے جن کی بدولت ان کا نام روشن رہیگا۔ گو کہ بیور یونیورسٹی کے شعبہ ادب کے استاد ڈاکٹر مسلام سندیلوی بھی ان کے شاگرد ہیں۔

جسمانی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ محشر موہانی تھے۔ وہ طب کے فارغ التحصیل تھے اور طبیب کی حیثیت ہی سے ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ انقر اس زندگی میں بچ کر گئے ہوئے تھے، وہ ان کی غیر حاضری میں فوت ہوئے۔ انشاء اللہ ان کی اولاد موجود ہے۔ ان کے علاوہ دو لڑکیاں شادی شدہ اپنے گھروں والی موجود ہیں

سید عبد اللطیف (ڈاکٹر)

ڈاکٹر سید عبد اللطیف بروز جمعہ ۶ صفر ۱۴۱۹ھ (۱۱ ستمبر ۱۹۹۹ء) کو کراچی (تال ناؤ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہان گشت تک پہنچتا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ جہانیاں جہان گشت اثنا عشری امام دہم حضرت علی نقی (ف ۲۵۴) سے دسویں پشت میں تھے، لیکن فرشتہ سے قبل کی کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کا ذکر نہیں ملتا، نہ خود جہانیاں جہان گشت کے ملفوظات ہی میں کوئی اس طرح کا دعویٰ ہے۔ بعد کے مصنفوں نے فرشتہ کی تقلید کی ہے، لیکن ہر جگہ درمیانی نگرانیوں کے ناموں میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ اختلاف ملتے ہیں۔ والٹر اعلم اس خاندان کے جو فرد سب سے پہلے ہندوستان آئے، وہ مخدوم جہانیاں جہان گشت کے دادا سید جلال الدین حسین سرخ بخاری ابن سید علی ابوالکویۃ تھے۔ وہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں بخارا سے ہجرت آئے۔ یہاں سے ملتان پہنچے اور حضرت شیخ بہار الدین زکریا سے علوم باطنی کی تکمیل کی۔ ملتان سے اوجھ گئے۔ جو بہار پور سے ۲۸ میل دور دریائے ستلج اور جناب کے سنگم پر ایک مختصر ماقصبہ ہے۔ یہ کسی زمانے میں بڑا علمی مرکز رہا ہے۔ سید جلال سرخ بخاری کا ۹۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۱ھ میں انتقال ہوا۔ وہ اوجھ ہی میں مدفون ہیں۔

مخدوم جہانیاں جہان گشت بن سید احمد کبیر بن سید جلال سرخ بخاری کے حالات سے پہلی ول کے پختے روشن ہیں۔ وہ صاحب علم و قلم اور برگزیدہ مولیٰ تھے۔ ان کا بعمر ۷۰ سال چار شنبہ ۱۰ ذی الحجہ ۸۵۷ھ (۲۳ فروری ۱۴۳۸ء) کو اوجھ ہی میں انتقال ہوا اور وہاں ہی سپرد خاک ہوئے۔

اس خاندان نے ہر دور میں صوفیہ کوام اور علمائے عظام پیدا کیے ہیں۔ ان کی ایک

دنیات

شاخ کونول میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اسی کونول خاں دادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شاہ حسین انجینیئر وہاں کے مشہور عالم و صوفی تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۶ء میں کونول میں رحلت کی اور خاندانی ہڑداری میں اپنے جدِ علی حضرت شاہ عبداللطیف قادری عارف یا ہر پادشاہ دت ۱۶۷۵ء کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ ان کی عمر کے بارہویں سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ مقامی ہائی اسکول میں بھیج دیے گئے، یہاں سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کی سند لی۔ اس سے فارغ ہو کر علیٰ تعلیم کے لیے مداس کرسچین کالج میں داخلہ لیا، یہاں سے ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ان کے والد سید شاہ حسین ان کے کرسچین کالج میں داخلے کے خلاف تھے۔ وہ ٹھہرے پرانی وضع کے غمبی آدمی انھیں اندیشہ ہوا کہ بڑا زیادہ انگریزی پڑھ کر گمراہ اور بیدین ہو جائیگا۔ لیکن سید عبداللطیف نے یہ برجستہ جواب دے کر انھیں قائل کر دیا کہ اباجان! میں تو انگریزوں کے لیے سکھینا چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے قرآن اور اسلام کی مقدس تعلیمات کو مغربی ممالک میں عام کر سکوں۔ انھوں نے بچپن کے اس وعدے کو آخر میں پورا کر دکھایا۔ کالج میں ان کا خاص تھمون اصولی متعین ادبیات اور تاریخ تھنید ادبیات انگریزی تھا اور اس میں وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں سے اول نمائے تھے۔

اس زمانے میں نواب بگین پٹی کے بھائی میر اسد علی خان مرکزی مجلس واضح تواریخ کے رکن تھے۔ ان کی وساطت سے سید عبداللطیف صاحب، سید نواب علی چودھری سے ملے اور ان کے ذاتی سکریٹری مقرر ہو گئے۔ چونکہ سید نواب علی بھی مجلس مذکورہ کے رکن تھے، اس سے ان کا قیام انکروڈ کی میں رہتا تھا اور ان کے ہاں ملک کے علماء کی آمد

وفیات

رفت تھی۔ اس طرح سید عبداللطیف کا ان سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں سربراہیم
رحمت اللہ (جسٹس) تھے۔ وہ ان کی قابلیت اور انگریزی میں مہارت سے خاص
طور پر بہت متاثر ہوئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چند برس بعد جب انھوں نے بمبئی کے
مضافات میں پنج مئی کے پہاڑی مقام پر مشمول طبقے کے طلبہ کے لیے ایک پبلک
اسکول قائم کیا، تو انھوں نے اس کی پرنسپل کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دی۔
وہ وہاں دو برس تک رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کا قیام
عمل میں آیا تو وہ ۱۹۲۰ء میں یہاں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔
۱۹۲۲ء میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ یونیورسٹی کے مختلف معزین کے جانا اسسٹنٹ
پروفیسروں کو مزید تعلیم کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ ہر ایک کو تین سال کی تعلیم
دی جائے، جس کے دوران میں انھیں نصف نغذہ شیگی، مزید برآں ہر ایک کو خرچہ کے
بیلے میں ہزار روپیہ قرض بھی دیا جائے جس پر ان سے سود نہیں لیا جائیگا۔ انگریزی
کے شعبے سے ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بھیجنے کا فیصلہ ہوا ان کے علاوہ خلیفہ عبدالکیم
اور پروفیسر وحید الرحمن کا انتخاب ہوا تھا، خیال تھا کہ یہ بی اے آنرز (انگریزی)
میں داخلہ لیں، لیکن یہ پیش آئی کہ ریاست کے نائبہ مقررہ مقام انگلستان نے اطلاع دی

کہ تمام طلبہ پُر ہو چکی ہیں، لہذا احوال داخلہ ممکن نہیں؛ اگلے برس یعنی ۱۹۲۳ء میں داخلہ
ہو سکیگا۔ ان ایام میں ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار سید شاہ حسین حسین بہت سخت
 بیمار تھے اور حالت تشویش تک تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ ولایت کا داخلہ ایک
 برس کے لیے ملتوی ہو گیا ہے، تو بالوسی کا اظہار تو درکنار انھوں نے وطن کی سانس
 لی کہ جلو، بلا ملی — اب میں کیونٹی سے والد کی خدمت اور تیمارداری کو سونپ دیا۔
 لیکن جب ان کے والد کو صورت حال کی اطلاع ملی، تو انھوں نے سخت مخالفت کی اور
 اصرار کیا کہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ تم انگلستان جاؤ اور لندن یا آکسفورڈ

یونیورسٹیوں کے اصحاب ہمارے لو، وہ لہذا انتخاب داخلے کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیتے، اور انہوں نے مزید کہا کہ بھکر رہو، تمہاری داسی تک مجھے موت نہیں آئے گی اس حکم کے آگے انہیں ہر تسلیم کرنا پڑا۔ اور یہ انگلستان چلا گئے۔

انگلستان میں وہ کنکر کالج (کنکر یونیورسٹی) کے صدر شعبہ انگریزی پروفیسر سرازر ہیل کولانز کے سامنے پیش ہوئے۔ سرازر ہیل اور ان کے ساتھی پروفیسر عبداللطیف صاحب کی انگریزی میں مہارت اور انگریزی ادب پر عبور سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے پوچھا، آپ ہی اسے (آئندہ) میں داخلے کی جگہ ایم اے یا پی ایچ ڈی کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے؟ بھلا انہیں کیا انداز ہو سکتا تھا! چنانچہ یہ براہ راست پی ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگے۔ مقالے کا موضوع قرار پایا: انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر، اور اس کی تیاری اور بحث کو کرنے کی میعاد تین برس مقرر ہوئی۔ یہ ۱۹۲۲ء کے شروع کی بات ہے۔

۱۹۲۳ء کے وسط میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی نے انگلستان اور امریکا کی یونیورسٹیوں کے انگریزی کے پروفیسروں کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں شمولیت کے لیے انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں نے پنا ایک ایک نمائندہ بھیجا، لیکن لندن یونیورسٹی نے سرازر ہیل گولانز کی سفارش پر دو نمائندے بھیجنے کی منظوری دی: ایک وہ خود اور دوسرے سید عبداللطیف سال آئندہ ہندو صرفتہ سیرج اسکالر تھے اور پروفیسر نہیں بنے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرازر ہیل کولانز میں ان کی کتنی وقعت تھی، لہذا وہ ان کی قابلیت کے کس درجہ قائل تھے۔ اسی سفر میں انہوں نے امریکا میں پونچھ یونیورسٹیوں کا امریکا میں اور میک گل کینیڈا میں دورہ کیا۔

امریکا سے واپسی پر سرازر ہیل نے ان سے کہا کہ آپ کبیں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں؟ تین سال کی قید تو عام حالات میں ہے۔ مقابلے کے لیے آپ کا مواد جمع ہونے ہو،

وفیات

تو آپ اسے بھیجا کہ قلعہ کو دیکھیے، ہم آپ کا مقدار دو ہی سال میں لینے کو تیار ہیں اس پر انھوں نے دو مہینے کی نصحت لی اور شمالی کانٹ لینڈ کے شہر سٹوٹھریفر چلے گئے۔ وہاں ظہر کر انھوں نے ایک مختصر نوٹس کی مدد سے مقالہ لکھ لیا اور لندن واپس آکر اسے پیش کر دیا۔ لیکن سالانہ جلسہ تقسیم اسٹاڈ کا فوڈکیشن کا زمانہ ابھی دور تھا۔ بارے سربراہیل کی دس سلطنت اور اثر و رسوخ سے یہ اہم بھی سر ہو گئی، ایک غیر معمولی کا فوڈکیشن کا انتظام کیا گیا جس میں انھیں مدد عطا کی گئی (۱۹۲۴ء) یوں یہ زمین برسوں بعد دوسری بری میں لپٹا کام مکمل کر کے حیدر آباد واپس پہنچ گئے۔

جب یہ انجمن تان گئے ہیں، تو یونیورسٹی سفار سے بھی ایک معاہدے پر دستخط کرانے تھے کہ وہ ایسی پرہ کم از کم دس برس تک یونیورسٹی کی ملازمت کو پیگ، سیزن کی خواہ کالکب صدر قرض میں جبراً کوئے کو کاٹا جائیگا۔ چنانچہ دایم حیدر آباد پہنچے تو یہاں ۵۰۰۔

روپے کے خرید میں پر دفیہ مقرر ہو گئے۔ یونیورسٹی دس برس پورے ہوئے، انھوں نے اپنا دسویں دی کہ کچھ ملازمت سے مسکود رہ کر دیا جائے۔ انھوں نے کچھ کر میرا ارادہ مزید ملازمت کرنے کا نہیں ہیں کیونسی سے کچھ علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری سرت آئی درخواست ہو کہ فیشن حکم از کم تین صرمد ہو کہ شریفانہ بسر اوقات کے لئے کفایت کر سکے تاکہ معاش کی فزیرج میرے علمی کام کے رستے میں حائل نہ ہو۔ یونیورسٹی کے احباب مجاز نے یہ درخواست منظور

کولی۔ اولاً انھوں نے پوری خواہ پر ایک سال کی خدمت منظور کی، پھر ملازمت کے

میں پانچ برس کا اضافہ کیا، تاکہ فیشن کی رقم کچھ بڑھ جائے۔ لیکن اس سے بھی فیشن دو

سواہر سے متوار رہ نہیں ہو سکتی تھی۔ جب یہ حالات نظام مروج میر عثمان علی خان (دور فردی ۱۹۶۷ء) کے علم میں آئے تو انھوں نے حکم دیا کہ چونکہ ڈاکٹر سعید عبداللطیف کا ملازمت

سے دست بردار ہونے سے مدعا خدمت علم ہے اس کی قند کو ناچاہئے پس ان کیلئے

پوری پانچ سواہر کی فیشن منظور کی جاتی ہے (جو عام حالات میں پچیس سالہ ملازمت کے

انتظام پر دی جاتی ہے،

ترک ملازمت کے بعد ۱۹۳۷ء میں انھوں نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار نیا برا
(مہر فر) جاری کیا۔ اور اس زمانے میں نظام دکن لندن کی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ ضلع
کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دیں اور یہ آباد میں اصلاحات نافذ کریں، جس سے
لوگوں کو ریاست کے نظم و نسق میں شریک کیا جاسکے۔ ۱۹۳۰ء میں قحط کو یہ مشورہ کوئی
مرد قلند ہی دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سب ان کے خلوص کے قائل تھے، اس لیے اگرچہ
کسی نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا لیکن ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوئی۔
ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی کچھ کم اہم نہیں تھیں، اگرچہ وہ وہاں میجر دہنی اور نظریاتی سطح
پر کیونکہ انھوں نے عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو تھے وہے میں جاری پابسی
ضنا بڑی بوجھان خیز تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اپنی اپنی جگہ بر ملک کی آزادی
کے لیے اصرار کر رہے تھے، لیکن جس بات پر دونوں متفق نہیں تھے، وہ تھی اس کے اثر و
سے محلو خلاصی کے بعد ملک کا دستور کیا ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی اس مسئلے پر
دو سالے د انگریزی میں اقلیت کیسے تھے: دو، مسلم پیران انڈیا ہندستان میں اسلامی
کچھ اور دو، ڈفرنٹ کچھ ل نہ تو ان انڈیا ہندستان میں مختلف کچھ خطے، انھوں نے
ان رسالوں میں جو نظریہ پیش کیا تھا، بعد کو اسے ایک باقاعدہ اسکیم کی شکل دی
جس کی رو سے ہندستان کا دستور وفاقی قرار پایا تھا۔ ہر ایک وفاقی خطے کے لیے پوری
اندرونی آزادی کی سفارش تھی، مرکوز میں صرف دفاع، سود خراج، تجارت و درآمد
پر اعداد و موامعات کے اہم ذرائع رکھے گئے تھے، جو یہ خوب اختیارات بھی وفاقی
خطوں کو تفویض کیے گئے تھے۔ اس سے وہ مسلم لیگ کے حلقوں میں بھی خاصے مورد و
مقبول ہو گئے، بلکہ جناح صاحب ان پر بہت اعتماد کرنے لگے۔ مسلم لیگ نے کسی زمانے
میں عبداللہ اردن کی صدارت میں ایک فائن کمیٹی بنائی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ

وفیات

سلم بیگ کے نظر پنے کے مطابق پاکستان اسکیم کا ایک خاکہ وضع کیا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی اس کمیٹی کے رکن تھے (دوسرے اسکیمن غلام رسول، مرزا رضوان اللہ، ڈاکٹر افضل حسین قادری، پیر علی محمد راستہ دی تھے)

اپنی وفاقی اسکیم سے متعلق ان کی فریقین کے رہائے خط و کتابت رہی۔ بالآخر کانہ بھی جی نے سرسبز دہلی نائیڈ کی وساطت سے انھیں بی بی آنے اور کانگریس اور گج کیٹی کے ایکس سے ملنے کی دعوت دی۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ اس پر یہ بی بی بچے اور کانگریس کے لیڈروں سے ملے۔ کانگریس کی مجلس عالم نے شب ۸ اگست کے جس جلسے میں ہندوستان چھوڑ دو کی قرارداد منظور کی تھی (اور جس کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے عباد خاں کے پہلا ہی خاص میں کیا ہے) ڈاکٹر سید عبداللطیف نہ صرف اس میں موجود تھے بلکہ دوسرے لیڈروں کے ساتھ شہنشین پر بھی تھے۔ اسی رات کے بعد علی احتیاج بہ سب لیڈر گرفتار کر دیے گئے اور انھیں مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا گیا۔ اگر مسلم لیگ یا ہندی نواب بھی گفت و شنید کا روادہ کھلا تھا، لیکن سرطخاں (۲۸ ستمبر ۱۹۴۲ء) نے جو دہلی لیا، ڈاکٹر سید عبداللطیف اس سے اتنے دل گرفتہ ہوئے کہ انھوں نے اس کے بعد نظر بانی اور ذہنی سطح پر بھی کل ہند صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب انھوں نے اپنی کتاب توجہ حیدرآباد کے مسائل پر مزور کر دی، اسی مقدمے سے انھوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں ایک اور انگریزی ہفتہ وار کیس (Clarion) نام کا کھلا۔ یہ پریچین برس تک جاری رہا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۹۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مجلس اتحاد المسلمین اور مولوی قاسم رضوی (د ف جنوری ۱۹۴۰ء) کی عاقبت نااعزیشی کے باعث حیدرآباد کی رضا بہت کمزور ہو رہی تھی۔ رہی ہی کسٹریٹ علی (۱۹۴۱ء) کی وزارت خطی نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے پوری کوشش کی کہ کسٹریٹ حیدرآباد کے قائدوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ وہ جب

رہے پر جا رہے ہیں، وہ تباہی کے غارتی طرف جاتا ہے جس سے ریاست حیدر آباد اور نظام دکن دونوں لیا میٹ ہو جائینگے۔ لیکن رضوی تقار خاں نے طیفی طوطی کی صدا کسی نے نہ سنی۔ نتیجہ ہم سب کو معلوم ہے۔ اور اسی کی پیشگوئی انھوں نے کیہ جن کے آخری شمارے کے ادارے میں کی تھی۔

حیدر آباد کے انصاف کے مجددہ اتنے دل برداشتہ تھے کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک لطیفہ غیبی کے نتیجے میں انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ بہر حال پھر دن سکون اور آرام کے لیے پنج گنی چلے گئے۔ وہاں سے واپس حیدر آباد آئے۔ تو ان کے من کو نوں سے ایک دندہ بچا کر وہ آئیں اور عثمانیہ کالج، کولوں کی ہسپتال سمجھال لیں۔ اس کالج کے قیام میں خود ان کی مساعی بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں یہاں کا انتظام اہل سقا اور معظمین کو اندیشہ ہونے لگا تھا کہ چشم بد دور کالج بند ہو جائیگا۔ وفد کے اراکین ان کے ملنے والے تھے اور مقصد نیک ان کے اصرار کے سامنے انھیں ہتیار ڈالنا پڑے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک درباری اس کالج کے پرنسپل رہے۔ جب ایک معقول جانیٹن کا انتظام ہو گیا۔ تو مستعفی ہو کر حیدر آباد چلے آئے۔ ۱۹۵۲ء میں کو نوں سے واپسی کے بعد انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش پر انسٹی ٹیوٹ آف انڈیٹل امیٹ کچھل اسٹڈیز، اکادمی آف اسلامک سٹڈیز کی بنیاد رکھی۔ مولانا آزاد کی وساطت اور سفارش پر انھیں اس کام کے لیے مرکوزی اور آندھرا پردیش حکومت نے مالی امداد بھی دی۔ ان دونوں اداروں کی طرف سے تقریباً ۴۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے مجددہ مولانا آزاد کے بہت قریب آگئے، انکو چودہ انھیں آزادی ملک سے بہت پہلے سے اچھی طرح جانتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے شاہکار ترجمان القرآن کا ترجمہ انگریزی میں کر دیں اور اس کیلئے انھیں دعوت

وفیات

دی کہ وہ ان کے پاس آکر دلی میں قیام کریں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء سے مولانا آزاد کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک ان کا بیشتر زمانہ مولانا آزاد کے ساتھ بسر ہوا۔ جس دن مولانا کی رحلت ہوئی ہے وہ یہیں کوٹھی میں موجود تھے۔

میری ان سے پہلی ملاقات مولانا آزاد جی کے وہاں ہوئی۔ میں ۱۹۵۴ء میں مصر سے آیا، تو حسب معمول مولانا کی خدمت میں بھی سلام کو حاضر ہوا۔ مجھے اس بات کا فہم حاصل ہے کہ وہ خود ہمیشہ دوسرے یا دفرما سیتے تھے۔ ان کے سکرٹری محمد اعلیٰ خان مرحوم مجھے ٹیلیفون سے مطلع کر دیتے کہ کل صبح آجائیے، وقت دہی فجر سے پہلے کا ہوتا۔ میں پہنچ جاتا اور دو تین گھنٹے مختلف موضوعات پر خوب گپ رہتی۔ بالعموم ناشتہ کے بعد میں اجازت لیتا کہ اب ان کی دوسری منصبی مصروفیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن رخصت ہو رہا تھا، مولانا آزاد ہمیں ساتھ کر کے کدو دانے تک آتے۔ وہ راز کھولا، تو سامنے سے ڈاکٹر صاحب گز رہے تھے۔ انھوں نے مولانا کو سلام کیا۔ اس پر مولانا نے کہا، ڈاکٹر صاحب! آپ مالک رام صاحب کو جانتے ہونگے، انھوں نے جواب نفی میں دیا۔ مولانا نے تعارف کرایا اور دلپس کرے میں چلے گئے، اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں رہیں۔

ایک دن کہنے لگے، میں تو خود آپ کی تلاش میں تھا۔ بات یہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب 'مہرت اور اسلامی تعلیم' کا انگریزی ترجمہ اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کروں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا، بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا! میں نے ہامی بھری۔ اس پر انھوں نے جناب عبدالعلی سے اس کا ترجمہ کروایا اور دوسرا ان 'اسلام' کے عنوان سے اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کر دیا (حیدر آباد ۱۹۵۹ء)۔ ان سے آخری ملاقات مارچ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں ان کے مکان پر حیدر آباد میں ہوئی۔ میں غالب صدیقی تو روبات میں شرکت کے لیے جناب عابد علی خان کا ملایا ہوا گیا تھا، مگر

وفیات

قیام بھی مختصر صرت وہی دن کا تھا، لیکن نامکن تھا کہ بننے چلا آتا۔ چنانچہ ایک دوست کے عہد حاضر ہوا۔ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس موقع پر ایک لطیف ہو گیا، جلتے کیسے دکن کی قوموں کا ذکر پھر دگیا۔ میں نے کہا یہ لوگ تو اناڑی ہیں۔ وہ لہذا چونکے اور دریافت کیا کہ کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا کہ جب آریہ لوگ یہاں آئے تو انھوں نے یہاں کی غیر آریہ اقوام کو (اُن - آریہ) کہنا شروع کیا، جس سے رفتہ رفتہ لفظ نایراد پر تیر بنے۔ اورد والوں نے ہی کو بھانپ کر اناڑی بنایا اور مٹی اس کے ہوئے، وہ شخص جو کسی خاص فن میں ذائقہ نہ ہو۔ نہیں پڑے اور کہا آپ کی باتج کی واد دیتا ہوں، لیکن خیال رکھیے، کوئی سن نہ لے۔

انفوس کو مولانا آزاد کی مدٹی میں وہ ترجمان القرآن کا ترجمہ مکمل نہ کر سکے۔ تفسیر سورہ فاتحہ اور البقرہ کے متین اور حاشی کا ترجمہ وہ کو چیلے تھے کہ مولانا چلے بیٹھے۔ یہ حصہ انھوں نے دیکھ لیا تھا اور اس پر صاف کر دیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے کام اس کے بعد بھی جاری رکھا اور اسے ۱۹۷۱ء میں تین جلدوں میں نکال کر لیا۔ ان میں سے دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور تیسری زیر طبع ہے۔

ترجمان القرآن صرت پہلے بابوں کے ترجمے اور غنیمتی حاشی پر مشتمل ہے، مولانا ایسے مکمل کو ہی نہیں سکے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب اسے انگریزی میں منتقل کر رہے تھے، تو انھیں اپنا وہ وعدہ یاد آیا جو انھوں نے تعلیم کے آغاز میں اپنے والد سے کیا تھا۔ اس پر انھوں نے غور کم کر لیا کہ جس طرح مٹی ہو پورے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر دینا چاہیے۔ ان کے ہندوستانی اور لاد پی دوستوں نے بھی ان سے اس کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس پر بغیر ۱۲ بابوں کے ترجمے کے ترجمے کا اعلان کیا، اسے بھی شائع کر دیا تب مجھے میں اس کا اصول یہ تھا کہ اصلی تین کی روح نمایاں ہو، نہ کہ محض مرادفات الفاظ رکھ دیے جائیں۔ ان کا ترجمہ سب کے سامنے ہے، اور صاحب نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں

نک اس میں کامیاب رہے ہیں
اپر جن کلبوں کا ذکر ہوا ہے ان کے علاوہ نچان گئی گئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ممکن
فہرست درج ذیل ہے۔

1. The Influence of English Literature on Urdu Literature (1924)
2. Ghali - A Critical Appreciation of His Life & Urdu Poetry (1927)
3. The Muslim Culture in India (1932)
4. The Muslim Problem in India (1939)
5. The Pakistan Issue - Plan of Federal Constitution of India. Congress-League reaction and Press statements (1943)
6. The Cultural Basis of a New World Order (1937)
7. An Outline of The Cultural History of India - edited and compiled (1958)
8. Address on National Integration (1967)
9. Language and National Integration (1968)
10. The Concept of Society in Islam (1957)
11. Prophecy of the Prophet (1937)
12. Towards Reorientation of Islamic Thought - A fresh examination of the Hadith Literature (1954)
13. Basic Concept of the Quran (1958)
14. Bases of Islamic Culture (1959)
15. Madras University Lectures : Principles of Islamic Culture (1961)
16. Was the Prophet of Islam Unlettered ? (1964)
17. The Problem of Islamic Studies in Indian Universities (1964)
18. The Call of the Quran (1966)
19. Faith and Action — The Quranic View (1967)
20. The Unity of Man — The Quranic View (1968)
21. Tarjuman-al-Quran of Mawlana Abul Kalam Azad—a rendering into English in three volumes Vol. I (1962). Vol II (1967). Vol. III under print)
22. Al-Quran rendered into English (1969)
23. The Mind Al-Quran Builds (1952) Revised edition (1971)

ان میں سے نمبر ۱، ۲، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔

اردو دان معلقوں میں ان کا نام اس مختصر کتابچے کی وجہ سے زندہ رہیگا، جو انہوں نے

غالب کے عز ان سے انگریزی میں لکھا تھا (حیدر آباد ۱۹۱۲ء) بعد کو اس کا سید محمد علی
زمیشی کا کیا ہوا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا (حیدر آباد ۱۹۳۲ء)۔ یہ صحیح معنی میں مطالعہ
غالب کے سلسلے میں انقلابی مضمون ثابت ہوا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ غالب پر کڑی
نکتہ چینی کی۔ اردو میں غیر جانبدارانہ اور عروسی تنقید کا یوں بھی نقد لکھنا تھا اور بدقسمتی
سے اب تک ہے، اور غالب سے متعلق مبالغہ آمیز خیالات تو ہمارے ذہنوں پر بطرح
سلطنت تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بخوری (دست و مبر ۱۹۱۸ء) نے اس سلسلے میں کچھ ایسے
بلند بانگ و عادی کیے تھے کہ جو سمجھے وہ سمجھا اور جو نہ سمجھے وہ بھی گنگ ہو کر رہ گئے۔
ڈاکٹر بخوری کے مطالعے اور وسعت نظر اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی ذہانت سے
انکار ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ ”محاسن کلام غالب“ بن انھوں نے غالب
سے زیادہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس مضمون پر نظر ثانی بھی
نہیں کر سکے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جیتے رہتے تو ان میں
توازن آجاتا اور وہ غالب کی حقیقی عظمت پر بخوبی دیکھتے اور اسے ہم سے قابل قبول
طریقے پر روشناس کراتے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی مختصر کتاب غالب میں اسی افراط و
تفریط میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی دوسری کام کو شیش طالب کے
اردو کلام کو تاریخی ترتیب دینے کی تھی۔ ان کے لیے انھوں نے سر اکبر حیدری کی دوستی
سے نسخہ حمید یہ کی اصل میں نسخہ بھوپال حاصل کیا اور پھر اسے کلام کو مرتبہ کو کے بچا پنا
شروع کر دیا۔ اس کے ۱۲۶ صفحات تک چھپ چکے تھے کہ اس مطبع میں جہاں یہ چھپ
رہا تھا، آگ لگ گئی اور مطبوعہ کا غذات اور ان کا تیار کردہ اصلی نسخہ بھی جل کر رہ گیا
ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس انوشاک سجاد نے کے بعد دوبارہ اسے مرتبہ کرنے کی کوشش
سمت نہیں تھی، یوں یہ مفید کام ادھور اڑ گیا۔ خوش قسمتی سے مطبوعہ تھے کے فرمے
کئی ملے تھیں کاظمی مرحوم دست ۱۹۶۱ء کے ہاتھ لگ گئے تھے جو انھوں نے مولانا

وفیات

علی خان عشی کو بھیج دیے اور انھوں نے دیوان کا نسخہ عرش مرتب کرتے وقت ان سے استفادہ کیا۔ بہر حال الفضل المتقدم کے اصول کے مطابق ڈاکٹر لطیف ہمارے شکر کے مستحق ہیں کہ دیوان کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ان کے ذہن میں آیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کے اصول و تب کو دیے جس سے ان کے پسروں کو روشنی ملی اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

ان کی ان ہی علمی خدمات کے اعتراف میں ابھی ہمارا سال پیم جہوریہ (۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء) کے موقع پر حکومت ہند نے انھیں پیم جوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔

پانچ چار سال سے ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ پہلے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ بائیں آنکھ پر عمل کرنا اچھی نہ چلایا، جو بد قسمتی سے ناکام رہا اور بائیں آنکھ بالکل بیکار ہو کر رہ گئی۔ دوسری کی بینائی بھی بہت کم تھی اور وہ اندوے بغیر چلنے پھرنے سے محذور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کمی نہیں کی۔ قرآن کا ترجمہ انھوں نے اسی زمانے میں مکمل کیا۔ پہلے اٹھارہ پاروں کے متن کا ترجمہ تو ترجمان القرآن کے ساتھ پورا ہو ہی چکا تھا، اب انہیں کے لیے باقی بارہ پاروں کا ترجمہ درکار تھا۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے اگرچہ اس کے حوت شناس ضرور تھے۔ انھوں نے طریقہ کاریہ اختیار کیا کہ تین چار معادن ساتھ لیے۔ ایک قرآن کی آیت پڑھتا، دوسرا اس کے مختلف ترجمے (اردو، فارسی، انگریزی) پڑھتا، کبھی کبھی وضاحت کے لیے بعض اہم تفسیروں کا متعلقہ حصہ بھی پڑھا جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنا ترجمہ لکھوا دیتے، جو ان کے نزدیک اصل کی روح کے قریب ترین تھا۔ وہ ترجمے سے زیادہ ترجمانی کے قائل تھے۔ اگر کوئی مجبورہ ترجمہ یا ترکیب ان کے معیار پر پوری اترتی تو انھیں ان معنوں کو لفظ بلفظ اپنے ہاں لے لینے میں کسی عار نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اصلی مقصود یہ تھا کہ ایک اور مطالعہ کے قاری کی سمجھ میں آجائے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔

ودیات

پچھلے سال ڈیڑھ سے انھیں حلقے کے کمینسٹر کی شکایت تھی۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن اب خوراک تک گلے سے نہیں اترتی تھی۔ یہاں چیزوں پر کوئی کہاں تک جی سکتا ہے جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب آخری مرحلہ بہت دور نہیں ہے، تو پھر ماہ قبل انھوں نے کونول میں اپنے چھوٹے بھائی حضرت سید عبد اللطیف یاہو بادشاہ کے مزار کے جوار میں اپنی قبر کھدائی کس نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی ساری عمر حیدر آباد میں بسر ہوئی، یہاں کے بھی آپ پر حقوق ہیں، آپ نے کونول کو حیدر آباد پر ترجیح کیوں دی، تو جواب میں یہ شعر پڑھا:

افلک ماندہ ایم یا رنک بودہ ایم
باد آجا میردیم خواہ کہ آں شہراست

اپنی بیماری کے آخری ایام میں وفات سے کوئی ایک مہینہ پہلے انھوں نے 'ڈاکٹر سید عبد اللطیف قرآنک' اینڈ آنڈ کچرل اسٹڈیز ٹرسٹ' کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا، جس میں صرف تین چار سطریں ہیں:

ملکہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف ولد حضرت سید شاہ حسین صاحب مرحوم عمر ۸۰ سال، بیٹہ وظیف باب پروفیسر جامعہ عثمانیہ ساکن ۷۴ آغا پورہ حیدر آباد بہ نسبت ہوش و حواس، اُس دیرینہ دلچسپی کی بنا پر مجھے قرآنی اور دیگر مذہبی احکام سے بے، ایک قرآنی ٹرسٹ قائم کرنا ہوں اور اپنی تمام کتابوں کے حق تصنیف کو اس ٹرسٹ کے حوالہ کیا ہوں۔

اس کے خواجہات کے لیے میں برابر روپیہ کا عطیہ بھی اپنی جیب سے دیا اور اپنی جملہ تصنیفات کا حق اشاعت بھی ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر سید محمد اقبال مرحوم کس زمانے میں ایک ادارہ اسلامیات کے لیے قائم کرنا چاہتے تھے، اور جیسا کہ پودھی محمد شفیع (م۔ش) نے ڈاکٹر سید عبد اللطیف کو ایک خط میں لکھا تھا، اقبال مرحوم اس کی

وفیات

صدارت کیلئے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دینے والے تھے۔ ادارے کی تاسیس سے قبل اقبال رحلت فرمائے۔ بہر حال ان کے کام کی تکمیل ڈاکٹر عبداللطیف نے کر دی۔ اپنا زندگی میں بھی ادارہ کے ذریعے سے اور مرنے کے بعد کے لیے یہ 'ذرائع' طبعی قائم کر کے۔ خدا بخوئے اس کے کارکنوں کو اسی خلوص اور تندہی سے کام کی توفیق ملے جو اللہ دونوں مرحوموں کی خواہش تھی۔

آخر وہ وقت آگیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ۲ نومبر ۱۹۶۱ء رمضان ۱۳۹۱ھ) ساڑھے پانچ بجے صبح اپنی قیام گاہ پر جان حان آفرید کے سپرد کی۔ ہوش و حواس آخری لمحے تک بجا رہے، بلکہ ان کے ارد گرد لوگ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے؛ انہوں نے خود کہا کہ اب کوئی سورۃ یسین کی تلاوت کرے؛ اور اس کے بعد پورے مکان سے اپنے کالے حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

للاذی قوت ہے۔ لیکن ان کی اولاد معنوی اتنی ہے، بالخصوص ان کا انگریزی ترجمہ قرآن کہ اس سے مستفیض ہونے والے ہمیشہ انہیں دعا سے خیر سے یاد رکھیں گے۔ اسی دن یعنی ۲ نومبر ۱۹۶۱ء کو ۴ بجے معطر جانی، رکیٹ کی مسجد الاکنہ میں نماز جنازہ ہوئی، جس کی امامت مولانا ابوالوفائے لکھی۔ اس کے بعد میت کو زل گئی، جہاں ان کی وصیت کے مطابق اگلے دن ۵ نومبر بعد نماز جمعہ تدفین عمل میں آئی۔ پیر محمد اسر تعالیٰ

مہر، مولانا غلام رسول

۱۶ نومبر ۱۹۶۱ء کو مولانا غلام رسول ہرکار حرکت قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔

نئی نسل کے خصوصاً وہ لوگ جو آج پچیس کے پٹے میں ہیں، انہوں نے یہ ایک سطری خبر پڑھی یا سن لی ہوگی۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ غلام رسول تہر کون تھے اور انہوں نے اردو

محانت کی نصیحتوں اور علم و ادب کی شہنائی کی خدمت کی!

مولانا غلام رسولی ہر ۱۲ اپریل ۱۸۹۷ء کو جالندھر سے کوئی چار میل دور، ایک چھوٹے سے گاؤں پھولپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قریب کے ایک اور گاؤں میں ہوئی۔ اس کے بعد جالندھر شہر کے مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا یہاں انھوں نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اب وہ لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج سے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کیا۔ وہ اعلیٰ انٹر میڈیٹ کے درجے میں تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۲ء میں اپنا مشہور آفاق ہفتہ وار اہلال کلکتہ سے جاری کیا۔ ہر صاحب اس سے پہلے شعر کہنے لگے تھے اور مذہبی اور سیاسی مطالعے میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اہلال کے خریدار بن گئے اور یہ پوچھ مسلسل ان کے مطالعے میں رہنے لگا۔

مولانا آزاد نے اہلال کے ذریعے سے ملک کی عام سیاسی بیداری میں عملاً اور سلسلہ میں ہند کی تاریخ میں خصوصاً جو اہم روں کو اکٹھا کیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصر اتنا کہ انسانی ہوگا کہ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریز دوستی اور کانگریس دشمنی کا جو سبق دیا تھا، وہ اس وقت تک اس ملک میں اسلامی سیاست کا اصل اصول بننا ہوا تھا۔ اس کے خلاف پہلی آواز مولانا ابوالکلام آزاد نے بلند کی۔ ان کا اسلوب تحریر اور اپنے نظریات کی تائید میں قدم قدم پر نقل و حرکت سے استدلال ایسا برجستہ اور بدیع تھا کہ اس نے گویا ہنگامہ گادی۔ نوجوان طبقہ اہلال پر دیوانہ وار فریفتہ ہو گیا۔ غلام رسولی ہر بھی اہلال اور صاحب اہلال کے والدین بن گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی تعمیر کے لیے ایک جماعت حزب اشر بنائی تھی اور اس کے اور اکیس کی تربیت کے لیے دارالارشاد قائم کیا تھا۔ غلام رسولی ہر بھی حزب اشر دارالارشاد کے رکن بن گئے۔ ان تمام رکنوں کے نام ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے۔ ہر صاحب نے مولانا آزاد سے جو تعلق اپنی نوجوانی میں قائم کیا تھا، اسے اپنے آخری دم تک نباہا۔ اس دوران میں کیسے کیسے سیاسی زلزلے اور تقریباتی جھلکے نہیں ہوئے لیکن

وفیات

ان کے پاسے اردت بھی نہیں ڈھنگا سے۔ وہ مولانا کے عاشق تھے اور بھی ان کا نام حضرت اور رحمۃ اللہ علیہ کے اخافے کے بغیر نہیں لیتے تھے۔

ہر صاحب لے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کر لیا، تو انھیں حیدر آباد (دکن) میں ملازمت مل گئی۔ وہ وہاں پایگاہ و فارانامہ اریس انسپکشن تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر اتحادی قوتوں کا ترکی کے حالات سے یہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بہت تشویش کا باعث رہا تھا۔ ہر صاحب نے حیدرآباد کے بعض دوستوں کے مشورے سے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا، "مسلطنت" اس کا نام تجویز ہوا اور انھوں نے اجراء کے لیے درخواست دے دی۔

اگر مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بنگال سے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ چونکہ بہادر کے علاوہ بیشتر دوسری صوبائی حکومتیں پہلے سے ان کے اپنے ہاں داخلے پر پابندی عائد کر چکی تھیں، اور سب راستے مسدود یا کڑے راہیں چھنے گئے اور تین چار مہینے بعد ہمیں ان کی نظر بندی کا حکم صادر ہو گیا۔ ان کے کلکتے سے نکلنے پر حکومت نے ان کے گھر اور دفتر کی تلاشی لی اور ان کے تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ انھیں میں "عزب اللہ" کے اراکین کا رجسٹر بھی تھا جس میں سن سبڈ اور اصحاب کے ہر صاحب کا نام بھی درج تھا۔ یہ سب لوگ حکومت کی نظر میں مشتبہ اور خطرناک قرار پائے اور ان سے متعلق پوچھ گچھ ہونے لگی۔ شدہ شدہ ہر صاحب کا کھوج بھی نکلا، اور پولیس مل کہ ان دونوں یہ حیدرآباد میں ہیں اور ایک اخبار سلطنت نکالنے کے لیے ان کی وکیلریشن کی درخواست زیر غور ہے حکومت جو مولانا آزاد کے اخبار الملائہ کی کے اخراجات سے جبر بڑھ رہی تھی، بھلا ان کے کسی مرید کے اخبار کی اجازت کیوں دینے لگی تھی چنانچہ ان کی درخواست رد کر دی گئی۔ اس سے تھوڑے دن بعد ہی ۱۹۲۰ء میں ہر صاحب حیدرآباد سے وطن واپس آئے۔

مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کو اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار سے روزانہ بنایا تھا۔ ظفر علی

وفیات

خان اردو صحافت کا ایک اور نورِ شہنشاہ نام ہے۔ ان کا اخبار زندہ اور گویا اردو صحافت کی درگاہ تھا۔ بھلا جس اخبار میں مختلف اوقات میں عبداللہ العلوی و حید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتحپوری، قلام رسول، ہر عبدالمجید سالک، جواغ حسن، حسرت مرثضیٰ احمد خان سیکش، نصر اللہ خان عزیز نے کام کیا جو لوگوں پر اسے الگ ہونے کے بعد زندگی بھر کامیاب صحافتی فخر رہی ہو اس اخبار کو صحافت کی درگاہ کے سرائے اور کس نام سے یاد کیا جائیگا؟ اور ان اصحاب میں سے کس کا نام اردو صحافت میں فزائش کیا جا سکتا ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ ظفر علی خان بنیادی طور پر ادبی آدمی تھے۔ وہ انگریز سیاست کے غافلہ میں نہیں پھنس گئے ہوتے، اردو نوجوانوں سے علم و ادب اور صحافت ہی کو اپنا اور دھنا سمجھنا بنائے رہتے، تو آج اردو کا دامن کیسے کیسے گلے سے لگا رہا ہے رنگ سے منظر اور رنگبو ہوتا۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہی بات حسرت موہانی اور مولانا محمد علی پڑا اور شاید کسی حد تک مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی صادق آتی ہے۔ کون بتا سکتا ہے کہ ان اصحاب کی شکل میں اردو ادب نے کتنی بڑی قربانی دی ہے، سیاست کی بارگاہ پر! ۱۹۲۰ء میں مولانا ظفر علی خان نے اردو کو عبدالمجید سالک کو دیندار میں آنے کی دعوت دی۔ سالک صاحب اس وقت مولوی سید ممتاز علی دہلوی کا تاج کے وطن کے رسالوں تہذیب نسوان اور پھول کے ایڈیٹر تھے۔ سالک کو انکار کرتے دینی اردو زمیندار سے وابستہ ہو گئے۔ عفو ڈے ہی دن جودان کا نام سرورق بر ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپنے لگا اور وہ اس کے ادارے بکھے گئے۔ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء کا زمانہ ہائی تحریک آزادی کے آغاز کا زمانہ تھا اور شباب کا بھی۔ عدم تعاون کی تحریک پورے زور سے چل رہی تھی۔ حکومت بھی اپنے روسے لاؤ ٹھکرا سے اس کے مقابلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔ ادھر کسی نے حکومت کے خلاف کوئی بات کہی یا کھی، اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ پنجاب میں روزنامہ زمیندار خاص طور پر حکومت کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ ظفر علی خان گرفتار ہوئے، ان کے بیٹے انور علی خان گرفتار ہوئے، یہی اب سالک صاحب کے

وفیات

ساتھ چیں آئے انھوں نے ایک اور بہ نکھا، جو حکومت کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا جنانچہ وہ گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لیے جیل خانہ بھیج دیا گیا۔

ہر صاحب میدان آباد سے واپس آکر خلافت تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے اور اس کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نکالنے کی بھی فکر میں تھے۔ سالک بک جیل چلے جانے کے بعد زمیندار کے فیچر ہر صاحب کے دست تھے، ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آئیے لاہور زمیندار کی باگ ڈور سنبھالیں۔ انھوں نے بھی خیال کیا کہ اگر ذاتی اخبار نکالنے سے پہلے کسی دوسرے پرچے میں کچھ تجربہ حاصل ہو جائے تو یہ مفید رہیگا۔ جنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں ہر صاحب زمیندار کے ایڈیٹر بن گئے۔ لیکن وہ یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکے۔ پکڑا دھکا کا نشانہ تھا، اور زمیندار تو خاص طور پر مقرب سرکار تھا۔ ممکن ہے حکومت نے اپنے کل پرزوں کے ذریعے سے کچھ دباؤ ڈالا ہو۔ بہر حال ہر صاحب کے خاندان کے بزرگ لاہور آئے اور انھوں نے امراد کیا کہ وہ زمیندار کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیں اور واپسی اپنے وطن چلیں۔ ہر سر تسلیم خم ہوئے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد ہی حکومت نے زمیندار کی مالی ضمانت ضبط کر لی، جس پر دعاوی طور پر، اس کی اشاعت بالکل بند ہو گئی۔

تین چار مہینے بعد زمیندار پھر جاری ہو گیا۔ اب کے اخبار کے کوٹا دھرتا ہر صاحب کے گاؤں پہنچے اور ان کے خاندان والوں کو قائل معقول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پر ہر صاحب دوبارہ زمیندار کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سالک صاحب کی قید کاٹ کر رہا ہوئے اور آکر ان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر و سالک کا یہ قرآن السعدین لازماً زمیندار کا ذخیرہ ہی، اور وہ ضمانت کا بھی لاویں دو ثابت ہوا۔ ہر کے بھیدہ، تین دلیل اداروں کی اور سالک کے افکار و حوادث میں ہمارے تمام قوی حقائق پر طنز و مزاح کے انداز میں متبرے کی دھوم مچ گئی۔ بہت لوگوں نے ان کی نقل کی۔ مگر وہ بات کہاں ہو دوسری دن کی سی!

وفیات

مارچ ۱۹۴۷ء کے آخر میں ہر سالک نے وجہ زمیندار سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اخبار کے بشیر علی نے بھی ان کا ساتھ دیا، ان میں ادا، تہی شعبے اور کاتب تک سب شامل تھے۔ شرونگ میں ان کا پیمانہ اخبار جاری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن علی نے آجانے سے وہ مجبور ہو گئے کہ اس کے روزنامہ کا مسئلہ تھا۔ اب ان کے لیے اخبار نکالنے کے سوا بے کوئی چارہ کار نہ رہا۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۴۷ء کو روزنامہ انقلاب جاری ہوا۔ جن اصحاب کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس سے نظریاتی اختلاف کے باوجود اعتراف کرتے ہیں کہ انقلاب نے صحافتی معیار سے کتر کھی کوئی بات نہیں کی۔

تھر نے دیپ اور مرلی ایشیا کے بشیر سالک کے سفر کیے تھے۔ اور وہاں کے کئی اکابر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر ان کی گہری نظر تھی جو ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں آدای آئی۔ ملک تقرر ہو گیا۔ ایک کی جگہ دو دو ملک و جو میں آئے۔ ہر دو سالک نے دیکھا کہ تبدیلیاں شدہ حالات آدای صحافت کے لیے سازگار نہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ اپنی آزادی را سے بھی قائم رہیں اور حکومت بھی ہم سے خوش رہے، تو یہ ناممکن ہے۔ چونکہ آزادی صمیمہ ان کے نزدیک خوشنودی حکومت سے حوزہ ترقی، انھوں نے انقلاب کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو انقلاب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ایک کاتب بااثر و روخ، نفع مند اخبار کو اصول کی خاطر بند کر دینے کی ایسی دردتنا نایاب ہی کہیں مل سکتی۔

اس کے بعد ہر صاحب نے براہ راست سیاست سے ہٹ کر تعلق رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب بھی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے غالب سے یہ کہہ کر ہر شخص پر دلوں کے تقیسات کو اس طرح سے مرتب کیا ہے کہ اس سے نہ پیش غالب کی پوری سوجھ بھری سے آگئی ہے۔ یہ کتاب ان کے غالب سے متعلق ایک نئے پروگرام کا حصہ تھی۔ جو ان کی اور اور مرگروں کے باعث ادھر وادھر گیا۔

لیکن اہل نظر مجھ سے اتفاق کرینگے کہ جو کچھ ہو گیا، وہ بھی بہت قابل قدر ہے۔ پچھلے ۲۵ برس میں غالب پر بہت کام ہوا ہے اور اس کی بعض اچھی سوانحیں وجود میں آئی ہیں۔ اس کے باوجود ہر کی 'غالب' کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوئی اور غالب کا کوئی بنیادہ طالب علم اس کے مطالعے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلے میں بہت بعد کا انہوں نے اردو خطوط غالب بھی دو جلدوں میں مرتب کیے تھے ان کے ساتھ مکتوب الیہم کے حالات اور مفید حواشی کا اضافہ کیا جس سے ان کا افادہ وسیع تر ہو گیا۔

صوفیہ سے دستکش ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر لیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں حضرت سید احمد شہید ماسے بریلو کے حالات جمع کرنا شروع کیے تھے۔ اب فرصت تیار ہوئی، تو انہوں نے اس کتاب کی تکمیل پر توجہ کی۔ ۱۸ سال کی محنت شاقہ اور تلاش و تحقیق کے بعد اسے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے انہوں نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی اور کون کون سے کنوئیں نہیں جھانکے۔ حضرت سید احمد شہید کی تحریک کے بقیۃ السیف افراد کو ریاست ٹونک میں پناہ ملی تھی۔ ان اصحاب کے باعث تحریک سے متعلق بہت قلمی لٹریچر ٹونک کے سرکاری کتب خانے میں جمع ہو گیا تھا۔ ہر صاحب اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے مولانا آزاد نے وہاں سے منگو کر انھیں دیا تھا۔

بعد کو انہوں نے حضرت شہید کے رفیقوں کے حالات بھی جمع کر کے 'سرگزشت مجاہدین' کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ ۱۹۵۷ء کے شہرہ نگار کے کوائف، انقلاب، ۱۹۵۷ء کے نام سے شائع کیے۔

غالب کے بعد ان کا دوسرا دلچسپ موضوع اقبال تھا۔ ان کے اقبال کے ساتھ بہت زیادہ کے تعلقات تھے، بلکہ ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع بھی ملے تھے جب ۱۹۳۱ء میں اقبال دہری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے نکلتے تھے، تو ہر بھی ان کے ساتھ

وفیات

تھے۔ واپس ہر کسی دونوں یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے ایک ساتھ مؤثر اسلامی، پرکٹشلیم کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ہر صاحب کہا کہ تھے کہ اقبال کا ضرر نصف یا ایک تہائی کلام شائع ہوا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اقبال نے اپنی کئی نظمیں یا شعروں پر شائع نہیں کیے یا کسی مجموعے میں شامل نہیں کیے کہ ان کے خیال میں یہ ان کے معیار سے فرد تر تھے یا ان کے عام طرز فکر سے میل نہیں کھاتے تھے چونکہ ہر تہ تو ان کے ساتھ رہے تھے، اس لیے اس طرح کا وافر کلام ان کے پاس جمع تھا۔ وہ اسے تو ضمنی حواشی کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ خدا معلوم اب اس ذخیرے کا کیا حشر ہوتا ہے! انھوں نے ہانگ در اناں جبریل، ضرب کلیم مجوہوں کے مطالب و معانی سے متعلق مستحق مصنفات چھوڑی ہیں۔ ایک کتاب اقبال کی سوانح سے متعلق بھی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے تجوں کے ادب پر خاصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں ان کی چھوٹی بڑی، خدا جوت نہ بولے، کوئی بیچاس کتابیں ہونگی۔ انھوں نے ترجمے بھی کیے۔ اس میں زیادہ توجہ تاریخ اسلام پر رہی۔ عجیب بہرہ گیر طبیعت پائی تھی۔ لیکن ترجمہ ہو کر غالباً، سوانح ہو کر تاریخ، سیاست ہو یا مذہب، ادب ہو یا شعر۔ غرض کوئی میلان ہو، وہ کسی قسم کی گتیا بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جو بھی کہی اور جب بھی کہی۔ ایسی کہ سننے والے کو اس سے شرم محسوس ہوئی، نہ خود انھیں کبھی بعد کو اس کے باعث ندامت۔

صحت کی طرف سے کبھی شکایت نہیں کی۔ سرخ و سفید رنگ، بلند بالا، ورزشی متناسب جسم۔ وہ اپنی عادات میں بہت باقاعدہ تھے۔ سلم ناؤی میں ان کا اپنا مکانی تھا۔ ہر یہاں سے بہت قریب جو کوئی سڑکی ہر موسم کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد نکل پڑتے۔ ہنر کے کتاب کے کتاب کے کوئی ذیل چلے جاتے اس طرح بعد از کم و بیش چار میل کا اوڑھ تھا۔ واپس آکر نہایت کتے اور اس کے بعد کام کی میز پر بیٹھ جاتے چار بجے تک

وفیات

بشت دھواند کا شکر رہتا یہاں سے ماتحتے تو دفعہ ہر کا کھانا کھاتے اور پھر تھوڑی دیر قبل لڑکے تین بچے دوبارہ مطالعے کی میز پر بیٹھ جاتے اور پھر بچہ تک مشغول رہتے۔ پھر شام کی سیر اور اس سے واپسی کے بعد کا وقت احباب کے لیے وقف تھا۔ یادہ ان کے وہاں آجاتے یا یہ کسی کے وہاں چلے جاتے۔ بات کا کھانا کھا کر جلد سو جانے کے عادی تھے۔

ایسی منظم زندگی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ موت اچانک ہوئی۔ شکل کے دن ۱۶ نومبر ۱۹۶۱ء (۲۶ رمضان ۱۳۹۱ھ) کو علی الصبح حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن سپہر کو مسلم ناؤن ہی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ راضی مراد بگو کے قطعہ تاریخ کے آخری مصرعے سے عیسوی تاریخ تکلفی ہے یہ ہے:

فراق قدس و وقار وطن غلام رسول

۱۹۶۱ء میں ان کی شادی ہوئی لیکن چار پانچ سال بعد یہ یکم دوسرے سال بچے اپنی یاگا رچھوڑ کر انھیں رخ منارت دے گئیں۔ دوسرے اچانک انھوں نے بہت دن بعد ۱۹۶۹ء میں کیا اس خاتون سے ان کے رہنے پہلے ہوئے۔ وہاں تک رفت ان کے گیارہ بچے موجود تھے۔ چھ بیٹے (عبدالسلام، فاروق شاہین، اکرم، جادیر سلطان، طارق، احمد سلیم) اور پانچ بیٹیاں۔ پانچ بڑے بیٹے برسرِ روزگار ہیں، سب کے چھوٹے عبدالسلیم بی اس کے کھلم ہیں۔ بیٹیوں کی شادی شدہ اور اپنے گھر بار کی ہیں، دہ ہونز ناگنندہ ہیں۔

میرے ان کے ۱۹۶۱ء سے درمیان تعلقات تھے۔ ۵۰ برس تھوڑی مدت نہیں ہوئی۔ فاسٹ سے موس کے انتقال پر کہا تھا کہ ہم ایک دن میرے کو ۲۰ برس سے جانتے تھے، حضرت، ہرگز کا تو دشمن بھی نہیں ملتا، دوست کا کیا ذکر! میں ہر کے لیے کیا کہوں۔ میں نے انھیں ہرگز میں دیکھا۔ نیکی اور شرافت کا نمونہ، دست پروری اور وضع داری کی مثال:

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

وفیات

سیدین خواجہ غلام السیدین

ان کا سلسلہ نسب حضور مہدی کریم معلم کے مشہور صحابی حضرت ابوالیوب انصاریؓ تک پہنچتا ہے۔ یہ اور وہ شاعری کے مجتہد خواجہ الطاف حسین حالی (ف ۱۲ دسمبر ۱۹۱۳ء) یکجہی تھے۔ مولانا حالی نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے خواجہ ملک علی بہروی، عہد غیاث الدین بلبن (۱۲۶۹-۱۲۸۷ء) ہیں ہندوستان نے حکومتِ وقت نے ان کی مناسب آؤ بھگت کی۔ جاگیر و رپائی پت کی قضاۃ کے علاوہ انھیں منڈی میں مختلف اجناس کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ لیکن یہ سارا جاہ و مال بہت مدت سے ختم ہو چکا تھا اور سیدین کے باپ دوا ایک خاندانی نیک نامی اور عرفہ و عرف کے سوا یہ اس میں سے کچھ نہ پہنچا۔

سیدین کے دادا خواجہ غلام عباس کا نکاح مولانا حالی کی بھانجی سے ہوا تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے غلام حسین، غلام انگلیس، غلام السبطین، سب سے بڑے غلام الحسین کا بطن کو عالم دین اور مفتی تھے۔ انھوں نے ہر برطانیہ سپینر کی مشہور کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ: فلسفہ و تعلیم کے عنوان سے اردو میں کیا تھا۔ میں نے اپنی ملا علی کے زمانے میں ان کے بعض مذہبی رسالے اور ایک آدھ مناقبے کی کتاب دیکھی تھی۔ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں لاہور انتقال کیا۔

سب سے چھوٹے خواجہ غلام السبطین تجارت اور ملازمت کرتے رہے۔ ہندی زبان کے نامور افسانہ نگار اور ناول نویس اور فلم ساز خواجہ احمد عباس انھیں کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں رحلت کی۔

خواجہ غلام السبطین صحیح معنوں میں فخر خاندان تھے۔ وہ ۱۸۷۲ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ ۱۸۸۸ء میں وہ حالی کے ساتھ دلی آئے۔ پانچ برس بعد

وفیات

جہاں گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ نبی زاد تھا، جب انھوں نے 'انظر فی آثار الخ' کے عنوان سے کوئی ۲۰ صفحات کا مضمون حیدرآباد کے مشہور ماہنامے 'حسن' میں چھپنے کو بھیجا۔ یہ مضمون حسن کے معیار کے مطابق قابل انعام ٹھہرا اور انھیں ایک اشرفی انعام میں ملی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ برس سے متجاوز نہیں تھی۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۸۹ء میں ایم اے اور کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا، اور چار سال بعد ۱۸۹۲ء میں (بھمبر ۲۰ برس) بی اے اور پھر ۱۸۹۵ء میں قانون کے امتحان پاس کیے۔ ۱۸۹۶ء کے شروع میں وہ ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہو گئے۔ وہاں وہ پانچ برس سے کچھ زیادہ رہے۔ ۱۹۰۱ء میں وطن واپس آئے اور میرٹھ میں وکالت شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ شاہ ایدور ڈھمکم کے جتن باجوشی کے موقع پر دسمبر ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہربائی انس سرفافا خان کی زیر صدارت دہلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر خواجہ غلام الثقلین نے "اصلاح تمدن" (سوشل ریفارم) سے تعلق ایک تقریر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس نے اپنی سرگرمیوں میں اس موضوع کا اضافہ کر دیا، اور اس کے لیے الگ شعبہ قائم کر کے خواجہ غلام الثقلین ہی کو اس کا سیکرٹری بنا دیا۔ انھوں نے پورے خلوص سے اس شعبے کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے جنوری ۱۹۰۳ء میں اپنا مشہور رسالہ 'معراج' جاری کیا جو پہلے ماہنامہ اور بعد کو ہفتہ وار شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مشوروں کے ذریعے کیے، تقریریں کیں، نیز اس تحریک کے مقاصد کی تشریح کے لیے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام 'مضامین اصلاح و ترقی' تھا۔ یہ بیشتر مفت تقسیم کی گئی تھی۔

وہ اعتقاداً شیعہ تھے اور شیعہ کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں سنی شیعہ فرقوں کے اختلاف اور کشمکش سے بہت رنج تھا۔ انھوں نے بساط پیر دونوں گروہوں میں صلح صفائی اور یکجہتی کی نصیحتیں کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے علمائے کرام نے انھیں اپنے تعاون سے محروم رکھا۔

وفیات

۱۹۰۹ء کے انتخاب میں وہ صوبائی کونسل کی رکنیت کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان تھے، جو ان سے کہیں زیادہ بااثر و درویش تھے؛ لہذا وہ ہار گئے۔ لیکن وہ اس سے حوصلہ نہیں ہارے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور اب کے اپنے مقابل خان بہادر سید آل نبی وکیل وٹیس آگرہ کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے۔ ماکثران کے نام کے ساتھ آنریریل لکھا جاتا ہے؛ یہ اسی انتخابی کامیابی کا نتیجہ ہے۔ لیکن افسوس! ان کی صحت خطرناک حد تک خراب رہنے لگی۔ اگر وہ احتیاط کرتے اور مناسب طریقے پر علاج ہوتا، تو شاید تندرستی بجاں ہو جاتی۔ لیکن ایمان کی حرارت اور قوم کی زلزلہ حالی کی اصلاح کا جذبہ انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ کثرت کار لیے لیے اندرون و بیرون ملک سفروں کی کوفت، اور ذمہ داری تشویش نے انہیں قبل از وقت موت کے منہ میں ڈھکیں دیا۔ جسم ان کی روح کا ساتھ نہ دے سکا، اور تندی صہب سے یہ ابلیغ نہ چھل گیا۔ بروز جمعہ ۳ ستمبر ۱۹۱۶ء ان کے دس بیٹے اس عجایب قوم کا حرکت قلب بند ہو جانے سے پانی پت میں انتقال ہو گیا۔ جنازہ لگے دن اٹھ اور عید گاہ کے متصل درگاہ پیر جی میں سپرد خاک ہوئے۔ صرف ۳۳ برس کی عمر پائی۔

بھلا یہ کوئی مرنے کی عمر تھی! ان کا نکاح مولانا حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین (ف ۱۹۳۷ء) کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ سے ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑے؛ ممتاز فاطمہ، غلام السیدین، سیدہ خاتون، اظہر عباس، مصداق فاطمہ۔ ممتاز فاطمہ کا نکاح سید حسن زیدی سے ہوا تھا۔ سیدہ خاتون کا عین عنقوان شباب میں ۱۹۲۹ء میں انتقال ہو گیا۔ حالی کے مختصر مجموعہ سخن جو اس وقت جاری ہیں ایک چھوٹی سی مثنوی ان سے متعلق ملتی ہے۔ سیدین کی کتاب آندھی میں چراغ میں بھی ایک مضمون ان سے متعلق موجود ہے۔ خواجہ اظہر عباس ابھی چار برس ہوئے ۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو اللہ کو پیار سے ہوئے۔ مصداق فاطمہ

وفیات

مہینہ ادیب و مصنف علامہ عابد حسین کے نام سے مشہور و معروف ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

خواجہ غلام التمدین، جنہیں ان کے سب احباب 'تمدین' کے نام سے جانتے ہیں، مرحوم خواجہ غلام اٹھلیں کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۲ء کے دن پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تربیت اپنے والد اور نانادوڑھالی کی لکڑی میں ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن مجید ختم کیا، اس کے ساتھ علم تجوید و قرأت کفایتی سند حاصل کیا۔ اس کے بعد ان کی انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ اس سال اپنی یونیورسٹی سے بی اے کے واحد طالب علم تھے، اس امتحان میں وہ درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں یو پی کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر مسٹر میکسٹری تھے، وہ ان کے نتیجے اور خاص طور پر انگریزی میں غیر معمولی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی سازش پر حکومت نے انھیں وظیفہ عطا کیا اور بہولپور و لاہور چلے گئے۔ وہاں ایڈریو یونیورسٹی سے پہلے تعلیم و تدریس کی سند ڈیپلوما اور پھر ۱۹۲۵ء میں ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ پھر سال کے آخر میں وہ مہندسان واپس آئے۔

وہاں پہلے علی گڑھ ٹرننگ کالج میں ریڈر مقرر ہوئے۔ تھوڑے دن بعد حبیب الرحمن صاحب صدر شعبہ کہیں باہر گئے اور یہ ان کی جگہ پر لگ گئے۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ۱۹۲۷ء میں انھیں کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ ترقی کر کے پرنسپل ہو گئے۔ اتنی عمر میں شاید ہی کوئی اور پرنسپل بننا ہو۔ وہ اس کالج میں ۱۹۳۸ء تک رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ریاست کشمیر کی حکومت نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ دہلی کے محکمہ تعلیم کے عہدے پر واپس چلے گئے۔ کشمیر میں وہ ۱۹۴۵ء تک رہے۔ اب ان کی ماہر تعلیم کی حیثیت سے ملک میں شہرت بڑھ چلی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ریاست راجستھان میں اپنے دل بلالیا۔

ذیات

دوبیس تک راجپور میں میٹر تعلیم رہے۔ آزاد دی ملک پر جب ریاست جمہوریہ مندرجہ ذیل
ہونے والی تھی، تو ان کا عہدہ بھی تحقیق میں آگیا۔ جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ یہاں سے
سبکدوش ہوئے تو حکومت ممبئی نے اسی عہدے پر انھیں اپنے ہاں مقرر کر دیا۔
انھوں نے صوبہ ممبئی کے تعلیمی نظم و نسق میں ایسی خوشگوار اصلاحات کیں کہ شدہ شدہ ملگو
مند تک ان کی خبر پہنچی۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء
میں ملاکر مرکزی وزارت تعلیم میں میٹر اور جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس
زمانے میں سکریٹری ڈاکٹر ناراج چند تھے ۱۹۵۲ء میں ان کے بعد پروفیسر ہالوں کیرن راف گسٹ
(۱۹۶۹ء) سکریٹری ہو کر آئے، تو سیدین ایڈیشنل سکریٹری مقرر ہوئے اور تین سال بعد ان کے
مستعفی ہونے پر ۱۹۵۷ء میں سکریٹری بن گئے۔ یہیں سے ۱۹۶۱ء میں نیشنل پسرکاری ملازمت
سے سبکدوش ہوئے۔ یہاں سے فراغت پائی، تو حکومت کشمیر نے انھیں دوبارہ اپنے
ہاں دوبارہ بلا لیا۔ لیکن اب احوال دوسرا تھا۔ حکومت کے کل ہند کے انھیں اپنے بھائی
کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سیدین کو یہ مداخلت پسند نہیں تھی۔ اب کے وہ مسائل
سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکے اور ۱۹۶۲ء کے شروع میں مستعفی ہو گئے۔

اسی ملازمت کے دوران میں (۱۹۵۸ء) وہ دعویٰ پروفیسر کی حیثیت سے کولمبیا یونیورسٹی
نیویارک گئے تھے۔ اب جو ملازمت کا جو اگلے سے اترا، تو بیرون ملک کی مختلف
یونیورسٹیوں نے اپنے ہاں مدعو کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ دسکالٹن یونیورسٹی
لامپا (۱۹۶۲ء - ۱۹۶۳ء)۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء - ۱۹۶۴ء کا ایک سال ہوائی
یونیورسٹی میں گذرا۔ یہاں وہ مرکز برائے شرق و غرب میں سینئر سکالرش کر گئے تھے۔
ہوائی ہی سے ۱۹۶۴ء میں وہ شان فورڈ یونیورسٹی گئے اور اسی سال کے آخر میں وہاں
سے واپس آئے، تو یہاں حکومت منہایک تعلیمی کمیشن کی تشکیل کا منصوبہ بن چکی
تھی؛ انھیں بھی اس کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ وہ اس عہدے پر دوبیس سال (۱۹۶۶ء تک)
رہے۔ کمیشن کا ختم ہوا، تو یہاں دلی میں ایک سرکاری تعلیمی اور انتظامی محالہ

وفیات

کے ادارے کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۶۹ء میں الگ ہو گئے۔
۱۹۷۰ء میں شکاگو یونیورسٹی نے دنیا بھر سے آٹھ ماہرین تعلیم کا انتخاب کر کے انھیں
اقتیادی خدمات کا تعین دیا تھا۔ ہندستان کو اس بات پر فخر کہ آجاسیہ کہ ان آٹھ میں
سے ایک ذات تیدین صاحب کی تھی۔ وہ شکاگو سے جون۔ ۱۹۷۰ء میں وطن لوٹے تھے۔
اگر ہم گنوائیں کہ وہ یہاں ہندستان میں اور بیرونی ممالک میں کون کونسی یونیورسٹیوں
اور اداروں کی منتقلی یا عالم کے رکن رہے، تو یہ طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ
حقیقت ہو کہ وہاں سے ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں تیدین
صاحب کا ہاتھ رہا ہو۔ انھوں نے پس پردہ رہ کر خاموشی سے اس میدان میں جو
خدمات سر انجام دی ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ملک سے باہر جس ادارے
سے وہ بہت دن تک وابستہ رہے، وہ یونٹکو ہے۔ وہ اس کی مرکزی سرگرمیوں سے
مختلف منظر پر منسلک رہے اور اس کی طرف سے انھوں نے بعض ممالک کا دورہ
بھی کیا۔

تیدین صاحب کو اردو دارالانگریزی۔ دونوں زبانوں پر یکساں قلمت حاصل تھی۔
(یوں وہ فارسی اور عربی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتے تھے) ان کی اردو نثر بڑی جا
اور سگفتہ ہو۔ بظاہر ایسی سہل متنوع کہ قاری خیال کرے کہ ایسی نثر لکھ لینا کیا مشکل
ہے، لیکن گھنے بیٹھے، تو دانتوں پسینہ آجائے اور اسے معلوم ہو کہ یہ کتنا مشکل کام ہو۔
تقریر کے علاوہ وہ تقریر کے بھی مہر میدان تھے، اور ان کی یہ صلاحیت کا ملاحظہ ادا
تھی۔ رشید احمد صدیقی نے کسی جگہ ان کی ۱۹۱۶ء کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے۔ جو
انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ کے موقع پر امرتسار میں
میں کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس کی تھی ادا اس کنفرس کے زمانے میں یہ تقریر انھوں
نے اس اطمینان اور وقار سے کی تھی کہ سننے والے بہت دن تک اس کا جرجا کرتے
ہے خوش قسمتی سے مجھے اپنی زندگی میں بعض بڑے بلند پایہ اوطاق انسان مقرر

ذیات

کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ میں بلا خوف و تردید، پورے دوق سے کہہ سکتا ہوں کہ قدس ربان، لہجے کی منانیت، انداز و اسلوب خطاب، موضوع کے مالہ و اعلیٰ سے پوری واقفیت، دلائل کی قوت، اپنے نقطہ نظر کی وضاحت، سامع کی تشفی اور اطمینان۔

غرض ان تمام باتوں میں جو کسی اچھی اور کامیاب تقریر کا مایہ الاتیاد ہیں، تیدین کسی سے کم نہیں تھے۔ گفتگو میں بھی ان کا یہی انداز تھا بلکہ یہاں ہلکا سا مزاح کا چلو سونے میں سہاگے کا کام دیتا تھا۔ وہ کبھی جارحانہ رویہ نہیں اختیار کرتے تھے۔ نرم لہجے میں، دوق سے، اپنا عندیہ پیش کرنے میں کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق انھوں نے درشتے میں پایا۔ ان کے خاندان نے علم و ادب کی ترقی و ترویج اور قوم کی ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت میں جو نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، اور یہاں ان سے متعلق کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہ سکتی ہے۔ تیدین نہ صرف ان اقدار عالیہ کے دارث تھے، بلکہ

انھوں نے اپنی زندگی کو، اپنے لغز روگرداں کو، ان اصولوں کے مطابق ڈھال کر اپنے ہم عصروں کے سامنے عمل نمونہ پیش کیا۔ ان کا موضوع سخن تعلیم تھا۔ وہ ساری عمر معلم رہے۔ سقراط سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے روزمرہ کی گفتگو کے ذریعہ سے اپنے عہد کے نوجوانوں کو جو آگے چل کر یونانی قوم کے کتبہ و تراجم بننے والے تھے سکھایا کہ اچھا آدمی اور اچھا شہری کہلانے کا مستحق کون ہے اور کئی شخص کو اس لفظ ”اچھا“ کا مصداق بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ تیدین کا مطلع نظر بھی ساری عمر ہی رہا۔

وہ اقبال کے عاشق تھے، ہر اقبال کا بیشتر کلام انھیں یاد تھا۔ وہ تقریر و تقریر میں بلکہ عام گفتگو میں بھی عموماً اقبال کے اشعار، استدلال یا موضوع کی وضاحت کے لیے استعصال کرتے تھے۔ انھوں نے اقبال کا تعلیمی فلسفہ کے عنوان سے ایک کتاب بھی انگریزی میں تصنیف کی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں لاہور سے چھپی تھی۔ نظر ثانی اور اضافے کے بعد اس کا دوسرا

وفیات

ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں چھپا۔ اس موضوع پر آج تک یہ واحد کتاب ہے۔
ان کی بیشتر کتابیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ اردو میں مندرجہ ذیل
عنوانات ہیں :

روح تہذیب (دلی ۱۹۳۲ء)؛ اصول تعلیم (سندھستانی اکاڈمی، الد آباد ۱۹۴۹ء)؛
علی گڑھ کی تعلیمی تحریک (۱۹۳۵ء) قومی سیرت کی تشکیل (۱۹۳۸ء)؛ شہیدِ وفا
بدایوں (۱۹۳۴ء)؛ آندھی میں چراغ (دلی ۱۹۴۲ء)؛ ذہن انسانی کا ارتقاء (نظام نیچر، دلی
یونیورسٹی ۱۹۶۶ء) زبان، زندگی اور تعلیم (انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۷۱ء)؛

آندھی میں چراغ پر انھیں ۱۹۶۴ء میں ساجتہ اکاڈمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ آخری کتاب
زبان، زندگی اور تعلیم، زیر طبع تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور یہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔
یہ ان کی وفات کے کوئی ہفتہ بعد شائع ہوئی۔ انگریزی کی چھوٹی بڑی کتابوں اور
رسالوں کی تعداد ۲۰۰ ہے۔

ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ماہرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ء میں
انھیں ڈاکٹریٹ ڈگری پیش کی تھی۔ ان کے احباب نے ایک مجموعہ مضامین
لبنان اور خان الفت ان کی ساٹھویں سالگرہ پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ان کی نذر کیا تھا، اس
کے مرتب ڈاکٹر سید عابد حسین ہیں اور یہ کتاب صدر جمہوریہ منہ ڈاکٹر سردی رادھا کرشنن
کے ہاتھوں پیش کی گئی تھی۔ حکومت ہند نے ۱۹۶۶ء میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی
نوازا کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ وہ ہنود سلسلہٴ لازمت سہی میں تھے کہ انھیں
دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہیں ۱۹۵۰ء میں پہلا دورہ پڑا۔ لیکن اس کے بعد بھی انھوں نے
اپنی سرگرمیوں میں کوئی نمایاں کمی نہیں کی۔ حسبِ معمول اپنے کام کاج میں لگے رہے۔ بلکہ
بڑی اور بڑی سفر بھی کرتے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء ہی میں وہ یونسکو کے کام سے عراق گئے
وہاں تک بھی ان کے ساتھ تھیں۔ میں ان آیام میں بغداد میں مقیم تھا۔ میری ان سے پہلی

وفیات

لاحات وہیں بغداد میں ہوئی۔ ان گزشتہ مہینہ بائیس برس میں ہمارے تعلقات میں بہت گہرائی آگئی تھی۔ ان کی وفات سے میں ایک ہریان دوست سے محروم ہو گیا۔ رحمانہ تعالیٰ۔ جبکہ مکہ چکا ہوں، ۱۹۶۳ء میں وہ دسکان میں تھے۔ وہاں ان کی رخصتہ عیادت کا انتقال ہو گیا (۷ جنوری ۱۹۶۳ء)۔ اس کا ان کی صحت پر تیز ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ وہ اپنی قوتِ ارادی سے مردانہ کام میں بٹے رہے۔ لیکن یہ ابرو واقع ہو کہ اس حادثے سے ان کا دل بچہ گیا تھا۔ دل کا درد سراشیدہ حملہ ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ میں ہوا جہاں وہ سلم پونیورسٹی کے طلبہ تقسیم اسناد میں شرکت کے لیے گئے تھے اس کے بعد متواتر ٹھونسے تھونسے وقفے سے کچے کچے کھلے ہوتے رہے۔ تیز لاشدیدہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۷ء کو سینے میں درد کی شکایت کی حسب دستور دن کے علاج اچھلے اپنے ساتھ استیصال لے گئے۔ اگلے دن (۱۹ دسمبر) کوئی سوا تین بجے لاش کا یہ نیک بزدل اپنے خانقہ کے حضور حاضر ہو گیا۔ ہوش و حواس آخر تک قائم رہے، بلکہ تین بجے تک وہ جانے آتے آتے کہتے اور انھیں مختلف ہدایتیں دیتے رہے تھے۔ تجیز و تکفین ۲۰ دسمبر کی صبح کو ہوئی۔ نمازِ جنازہ مولانا سید علی صاحب دہیشی امام مسجد پنجہ خرف، کشمیری گیٹ، نے پڑھائی، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن ہوئے؛

آسمانِ تربت پر تیری عنبر نشانی کرس!

نواب کلب علی خان (دف ۱۸۸۸ء) والی راجپور کے ایک دیہیے شہیر علی خان تھے۔ سیدین کی شادی انھیں کی صاحبزادی عینہ جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ اولاد میں چار بیٹیاں (دہنرو، بلقیس، سیدہ، ذکیہ) اپنی یادگار چھوڑیں۔

مرتب مالک رام

شمارہ ۲	۶۱۹۷۲	جلد ۶
۲	ملاحظات	لک رام اکثر محمد عمر، جامعہ ملیہ اسلامیہ
۳	اردو ادب کا سماجی پس منظر	نئی دہلی
۹۷	پریم چند۔ ماضی اور حال کا ادیب	بنیہ سجاد ظہیر، نئی دہلی
۱۰۹	وفیات	لک رام

نذرہ سالانہ (مع معمول رجسٹری ڈاک) ۱۵ روپے اس شمارے کی قیمت
برساک: ۲ پونڈ انگریزی یا ۷ ڈالر امریکی ۵ روپے

پرنٹر و پبلشر ظیل عباس جاسی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر دفتر ملی مجلس
۱۳۲۹ چھتہ نواب صاحب فرشتخانہ دہلی ۷ سے شائع کیا۔

ملاحظات

یہ تحریر کا سال رواں (۱۹۷۲ء) کا دوسرا شمارہ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس سال تحریر کی اشاعت بہت بے قاعدہ رہی۔ اس کے اسباب کچھ میرے ذاتی ہیں، اور کچھ خوبیِ تقدیر کا نتیجہ۔ جو اصحاب کتابوں کی اشاعت کا کچھ علم رکھتے ہیں، انہیں بتانے کی ضرورت نہیں اور جنہیں اس کا علم نہیں ہے، انہیں بتانے کا فائدہ نہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم واقعی مجبور اور بے بس ہو کے رہ گئے۔

پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ سال کے آخر تک پرچے کی اشاعت اپنے معمول پر آجائے۔ تیسری تاہی کا پرچہ بھی کم و بیش تیار ہے اور عنقریب شائع ہو جائیگا۔ سال کا آخری پرچہ سیدی نمبر ہو گا جو ان کی برسی (دسمبر ۱۹۷۲ء) کے موقع پر شائع کیا جائیگا۔

ملک نام

اردو ادب کا سماجی پس منظر (۲) عام طرز زندگی

اردو شاعری میں عام طور پر اردو دہائیوں میں خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کا گہرا اثر ملتا ہے۔ ان دہائیوں میں ہندوستانی سماج کی جو تصویر ملتی ہے، اگر اس کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دہائیوں کی تمام فضا خالصتہً ہندوستانی ہے۔ قصوں میں نام عموماً فرضی ہوتے ہیں، لیکن سماجی حالات کے بیان میں مصنف اپنے گرد و پیش کے حوالہ ہی کی آئینہ داری کرتا ہے، خواہ قصوں کے کردار بھلا کرسی، اجنبی ملک کے ہوں، اس لیے کہ جس سوسائٹی کا مصنف نے مشاہدہ نہیں کیا، اس کی عکاسی کرنا اصولی نفسیات کے خلاف ہے۔ اور عملاً ناممکن۔ اس لیے جن قصوں میں مقامات کے نام غیر ہندی ہیں، ان میں بھی دراصل ہندوستانی سماج ہی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے شعری سحر (میر حسن)، زہر عشق (شوق)، پھول (ابن نشاظمی)، ادب گلشن عشق (نصرتی) کے تفصیلی مطالعے سے اس عہد کے ہندوستانی سماج کو جا بجا سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً میر حسن دہلوی نے خزاردہ میں نیرنگ کی سواری کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ مجسمہ مغل بادشاہوں کے جلوس کی تصویر کشی ہے۔ سونے چاندی کے زیورات، عمارتوں سے سجے ہوئے ہاتھیوں کی قطاریں، پالکیاں، نالکیاں، رختیں، آئینہ بندی، سازندوں اور گہاروں کی تاش کی پگڑیاں، شہنائیوں کی صدائیں وغیرہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کرین شہر کوئی کے آئینہ بند سواری کا ہولطف جس سے وہ چنچ

اردو ادب کا سماجی پس منظر

زلیں تھا سواری کا باہر ہجوم
 برابر برابر کھڑے تھے سوار
 سنہری رو پہلی تھیں عماریاں
 چمکتے ہوئے باد لے کے نشان
 ہزاروں ہی اطراف میں پاکی
 کہا روں کی زریفت کی گرتیاں
 بندھیں پگڑیاں تاش کی سراپہ
 وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے
 وہ ماہی مراتب، وہ سرور وں
 وہ شہنائیوں کی صدا خوشنما
 وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی
 بجاتے ہوئے شادیاں تمام
 سوار و پیادہ صغیر و کبیر
 وہ نذرین کہ جس نے تھیں ٹھنیا
 ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار
 سجے اور سجائے سبھی خاص و عام
 طرق کے طرق اور پے کے پے
 مریض کہ مازوں سے کوتل سمند
 وہ نیلوں کی اور میگڈ بر کی شان
 چلے پایہ تخت کے ہو قریب
 سواری کے آگے چلے اہتمام
 نقیب اور جلو مار اور چوہدار
 اسی اپنے معمول و دستور سے
 ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سبیر
 ہزاروں ہی تھیں ہاتھوں کی قطار
 شب و روز کی سی طر حاریاں
 سواروں کے فٹ اور بالوں کی شان
 بھلا بور کی جگمگی نا لکی
 اور ان کے بے پاؤں کی ٹھرتیاں
 چکا چوندھ میں جس سے آدے نظر
 جھلک جس کی ہر قدم پر پڑے
 وہ نوبت کہ دو لہا کا جیسے سماں
 سہانی وہ نوبت کی اس میں صدا
 قدم با قدم بالباس زری
 چلے آگے آگے ملے شاد کام
 جلو میں تمامی امیر و وزیر
 شہ و شاہزادے کو گنڈ رانیاں
 چلے سب تھینے سے باندھے قطار
 بالباس زری میں ملے تمام
 ادھر کچھ، ادھر کچھ، درے کچھ پے
 کہ غریب میں روح القدس سے دو چند
 جھلکتے وہ مقیش کے سائبان
 بدستور شاہانہ پنہ جریب
 لیے سونے روپے کے ماحے تمام
 یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار
 ادب سے التفات سے کام لے

یلو نو جوانو! بڑے جانیو
 بڑے جانیو آگے سے چلتے قدم
 غرض اس طرح سے سواری چلی
 تماشاخیوں کا جدا تھا، ہجوم
 لگا قلعے سے شہر کی حد تک
 منڈھے کھتے تمامی سے دیوار عدد
 کیا تھا زبس شہر آئینہ بند
 رعیت کی کثرت، ہجوم سپاہ
 ہوئے جمع کو ٹھکوں پہ جوں مردوں کا
 دو جانب سے بائیں لیے آئیو
 بڑے عمر و دولت قدم با قدم
 کہے تو کہ باد بہاری چلی
 کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی صوم
 دوکانوں پہ تھی باد لے کی چمک
 تمامی تھا وہ شہر سونے کا گھر
 ہوا چوک کا طلعہ واں چار چند
 گزرتی تھی حرکت حرکت کے ہر جانگاہ
 ہر اک سطح تھی جوز میں چمن

شاہی محل کے ساز و سامان کا ذکر میر حسن نے اس موقع پر کیا ہے، جب شہزادی بدینہ اپنے باغ کی عمارت میں شہزادہ بیٹھنے کے بیٹھنے کا ساز و سامان لگواتی ہے۔ میر حسن نے اس موقع پر ہندوستانی گھروں کے اندرونی ساز و سامان کا جو نقشہ پیش کیا ہے، وہ متوسط درجے کے عمارتوں کا ہے سے بڑی حد تک مائلت رکھتا ہے:

خواصوں کو گھر کو دیا انتظام
 بچھا فرش اور کرسی چمکھٹ کو صاف
 دوزخس کے دستے جو آفاق میں
 ولایت کے میوے دھرے ہر طرف
 دھرے نکلنے خاص ایوان میں
 دھریں کشتیاں ایک طرف بشار
 اچار دمرتے دھرے خوشنما
 چمکھٹ کے پاس اک منڈ بچھا
 چمکیر میں بنا اور رکھ پا ندان
 تمامی کے پردے لگائے تمام
 مرقع کا اس پر اڑھا کر غلاف
 نہ نکلیں سوا کر چنے طاق میں
 کہ لے جا دے بوان کی گل پر شرف
 ہوا ہو گئی عطر دالان میں
 چمنی اک طرف ڈالیوں کی قطار
 وہ باہر کے دالان میں جا بجا
 او اس پر تمامی کے تکیے لگا
 قرینے سے اس میں رکھے ہار پان

ادب کا سماجی پس منظر

کئی عطر دان داں مرتب دھرے انوکھی گھڑت کے کئی چو گھڑے
سرمانے جلد دھری اک کتاب ظہوری، نظیری کا کل انتخاب
دھری اک بیاض اور شک چمن چراز شعر سودا و میر و حسن
قلمدان بھی اک نزاکت بھرا قرینے سے زیرِ چہر کھٹ دھرا
دھرا اک طرف گنجفہ خوش ترماش دھری چوڑا اک طرف کو غم تراش
بھی ایک چوکی پڑا تو رہ پوش کریں دیکھ کر غش جسے بادہ نوش
مراچی و ساغر شراب و کباب دھرا اس پہ ساقی نے کرا انتخاب
پکڑا تھ مسند پہ کھینچا اُسے محبت کے رشتہ میں ایسا اُسے
اری ظالم، اک دم تو تو بیٹھ جا زما میرے پہلو سے تکیہ لگا
غرض رفتہ رفتہ وہ مدہوش ہو چہر کھٹ میں لیٹے ہم آغوش ہو
بادشاہانِ دہلی کی بود و باش اور قلعہ معلیٰ کی طرزِ زندگی کا میر حسن نے ان اشعار میں نقش
پیش کیا ہے:

کہوں قلعہ کی اس کی میں کیا شکوہ گئے دب بلندی کو دیکھا اس کی کوہ
وہ دولت سراخانہ نور تھا سدا عیش و عشرت سے محمود تھا
ہمیشہ خوشی، رات دن سپہ بانہ نہ دیکھا کسی دل پہ جز لالہ داغ
سدا عیش و عشرت سدا راگ رنگ نہ تھا زلیست سے اپنی کوئی بنگ
کہاں تک کہوں اس کا جاہ و حشم محل و مکان اس کا رشکِ ارم
سدا ماہر دیوں سے محبت اُسے سدا جامہ نہ جوں سے رعبت اُسے
ہزاروں پری پیکر اس کے غلام کمر بستہ خدمت میں حاضر مدام
اسی طرح مجھ نے نواب سعادت علی خاں کی بزمِ عشرت کا ان اشعار میں ذکر کیا ہے
اور عالم بزم کا اوس کی کہوں کیا زباں بھی اب لگی کرنے ہے گفت

۳ ایضاً: ۱۶، نیز دیکھیے کلیاتِ نظیر اکبر آبادی: ۵۱۶-۵۲۰، ۵۲۱-۵۲۳

۴ دیوانِ مجبورِ قلمی: ۲۳۳-۲۳۴

اردو ادب کا سماجی پس منظر

کہیں ہے خوشنواہلوں کی آواز کہیں بکثی ہے دن اور رات فوجت
 کہیں ہے بھگتیوں کے غل بھگت کا مزا کرتی ہے کہیں بھانڈوں کی سنگ
 کہیں ہیں غول چرنے والیوں کے کہیں گاتے ہیں توال اور کلاؤنت
 کہیں جو طایفوں کے غٹ کھڑے ہیں توان میں ہے عجب ہی ڈھب کی بھبت
 کوئی ناچے ہے مہر اور کوئی دہاں الگ ہی سب سے پھرتی ہے کھڑی گت
 کوئی گاتی ہے بیٹہ کر کھڑی ترانہ کوئی گائے خیال اور کوئی دھرت
 ہایت نے ایک قصیدے میں فوج آصف الدولہ کی بزم عشرت کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور جگہ
 فوج تاج الدولہ میرک حسین خان کی بزم کا بیان ملتا ہے۔
 اٹھارویں صدی کے امیروں کی زندگی بے حد تعیش پسندانہ تھی۔ انہیں شراب اور رقص و
 سرود سے بڑی دلچسپی تھی۔ تاباں نے شہنوی درمدرج استاد خود حشمت و عمدۃ الملک میں امیر
 خان انجام کے رگ رگ کا ان اشعار میں ذکر کیا ہے:

ہمیشہ اسے عشق سے کام تھا سدا اس کو شغلِ مے و جام تھا
 کروں بزم کا اس کی میں کیا بیاں سرا پا خدائی کا جلوہ تھا و ان
 وہ دیوانخانے میں جب بیٹھتا تو دے دے پروردے بلا
 چپ و راست پر امن و روبرو کھڑے رہتے آبانہ مدد کر ہاتھ کو
 صفت اس کے دیوانخانے کی گر لکھوں میں تو کاغذ ہے ایتا کہ مصر
 کہ ایواں و رایواں جہاں اور تھا زمین اور تھی، آسماں اور تھا
 اس ایوان میں غنہ نشین ایک تھا جو تختِ معلق کہوں، ہے بجا
 کروں اس کی رفعت کا میں کیا بیاں معالیٰ تھا وہ عقل سے بھی مکان
 شکوہ و بلندی میں تھا آسماں کہ قوسِ قزح اس کا تھا سایاں
 تیرمایاں حوضِ لبریز تھا اگر رشک کوثر کہوں، ہے بجا

۶ ایضاً: ۲۳۱-۲۲۸

۵ کلیاتِ ہایت: ۲۹۹، ۳۰۱

۸ ایضاً: ۲۶۳-۲۶۶

۷ دیوانِ تاباں: ۲۵۸-۲۶۰

سدا سخن میں اس کے رہتا تھا رنگ سدا تھی نوائے دُست و نئے وچنگ
 کلا دنت و قوال سب مل کے وہاں بوسیقی استاد تھے بیگمناں
 جو قوال قول و غزخوآن تھا وہاں عرب محو، مدہوش ایراں تھا وہاں
 کوئی پیڑ وھرت کو گاتا تھا وہاں ترانے سے دل کو لبھاتا تھا وہاں
 کوئی کر کے آغا زسا توں کرنا دکھاتا بتدریج ہر ایک مقام
 عجب دل کے ساندے سے ہوتا تھا رنگ کہ تھی وہاں فلاطون کی بھی عقل جگ
 کہیں باجے تھے استار و منہ چنگ کہیں خنجر کی اور کہیں جلتزنگ
 کہیں نہ کہیں تھا جلا جسل کا شہد بجاتا تھا قانون کو کوئی زور
 سدا سن کے تنور کی وہاں نوا رنگ باں کا تھا چاک کرنا بجا
 غرض راگ سازوں کا یہاں تک تھا شو غرض غرضیوں کا بھی شو
 کہیں رقص کرتے تھے مرطعتاں کہیں دید کرتے تھے سافر کشاں
 یہ سب خوب رویاں ہندی نژاد نمکسار زاد و نمکسار زاد
 خوشی ہو کے آتے تھے جب قص میں انھیں دیکھ آتے تھے سب قص میں
 زبیں عالم آب بھی تھا سدا سمجھی مست و مدہوش تھے جا بجا
 غرض کیا کہوں بزم اس کی کی بات کہ اندر کا بھی وہاں کھلا تھا
 اس طرح انھوں نے لکھنؤ کی ایک شاہی حرم دلہن جان کی مدح میں قصیدہ کہا ہے، ادا
 کی محفل رقص و سرود کا بڑا دلچسپ نقشہ پیش کیا ہے۔
 میر حسن نے شہسوی محل البیان میں شاہی خاندان کی مستورات کا سراپا اور علیہ اس انداز سے
 بیان کیا ہے کہ اس سے محل کی زندگی اور وہاں کی عیش و عشرت کی فضا سامنے آ جاتی ہے:
 کروں اس کی پوشاک کا کیا بیان فقط ایک پشواں آپ رواں
 زبیں موقیل کی تھی سبغات کل کہے تو، وہ بیٹی تھی موتی میں گل
 ادا کا دھنسی جمل ہوا یا حباب جسے دیکھ شبنم کو آدے حباب

صباحِ صفا اس میں جھلکی ہوئی پڑی سر سے کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی
گرمیاں میں اک نغمہ الماس کا ستارہ سا مہتاب کے پاس کا
وہ کرتی، وہ انگبیا ہوا ہر نگار نیا باغ اور ابتلا کی بہار
وہ چھب تنہی اور اس کی گرتی کا چاک ترا تے کی انگلیا کسی ٹھیک ٹھاک
جھلک پایا جامہ کی دامن سے یوں کہ روشن ہونا نوس میں شمع جوں
صفائی یہ پوشاک کی دیکھو نظر سوچ میں ہے کہ میسلی نہ ہو

زلیورات

وہ ترکیب اور چاند سادہ بدن وہ بار دپہ ڈھلکے ہوئے نور زن
جڑاؤ وہ بالے کے ہالے کا رشک وہ موتی کے مالے کے عاشق کا رشک
وہ موتی کا دولٹا وہ موتی کا ہار سدا اشک، ممدیدہ جس پر نثار
لگا دھند کی پھلڑا است لڑا سراسر گلے حسن اس کے پڑا
جڑاؤ دمکتی وہ چنپا کلی رہے جس سے الماس کو بیکی
تلی اس کے موتی لگے گرد گل کہ جوں شبنم آلود ہو برگ گل
جہانگیر یوں کا کردن کیا بیاں کہ اٹھتی تھی ہاتھوں سے جس کی نیاں
جواہر سے مینے کی پھیل جڑی کمرادر کو لے کے نیچے پڑی
فقط موتیوں کی پڑی پائے زیب کہ جس کے قدم سے گہر پائے زیب
سرا پا اگر ہوزبان میسراتن سرا پا میں اس کے کردن کیا سخن
دُر گوشت جب اس کا تاندہ ہو صدف کا دل صاف شرمندہ ہو
وہ دستِ حنا بستہ خوبی کا باب شفق میں ہو جوں نچہ آفتاب
مفرق جواہر سے اک جفت کفش نہ وہ جفت پا، بلکہ پا جفت کفش
گلے میں پڑا نیرہ شبنم کا ایک بدن سے عیاں نور عالم کا ایک

طرحدار اک سر پہ پھینا سجا تمامی کا چٹکا کر سے بندھا
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں جو گرتی ہے میلی تو محرم نہیں

شہزادی بدر منیر کا سنگار

بہا دمو کے اس روز ایسے بنی کہ دودن کی سچ مچ ہو جیسے بنی
وہ کھڑے کا عالم، وہ کنگھی کا نگ شبِ ماہ ہو دیکھ کر جس کو دنگ
وہ مٹی وہ اس کے لب لعلِ فام سوادِ دیارِ بدخشاں کی شام
وہ آنکھوں کا عالم، وہ کاجلِ غضب کہے تو پڑی نرگستاں میں شب
ستمِ تیں پر سرے کی تحریر سی کھینچی ہاتھ کا فر کے شمشیر سی
لکھو تادہ پانوں کا مٹی کے ساتھ کہ جوں دامنِ شبِ شفق کے ہو ہاتھ

اسی طرح شہزادی بدر منیر کے لباس اور زیورات کی جو تفصیل دی ہے، اس میں عورتوں کے لباس کے تمام اجزاء اور زیوروں میں مانگ بھرنے، ٹیکے، بالے، ہیرے کے ٹکے، چنپا کلی، مالامال کی دھمک کی، الماس کی ہیکل، موتی کے مالے، سمجھند، نورتن، زمرود کی پہونچی، دستبند، پازیر، آوازہ دار، مینا کے چھتے، معطر پیرہن۔ ان سب چیزوں کا ذکر ہے۔ محلوں اور بڑی بڑی حویلیوں میں ملازموں کی بھرا ہوتی تھی۔ مردانے اور زنانے کے نوکر الگ الگ ہوتے۔ میر حس نے زنا خانے کی خواہوں اور لونڈیوں کا نقشا جن الفاظ میں کھینچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے بالعموم ان ملازم عورتوں کے نام پھولوں پر رکھے جاتے تھے۔ صاحبِ خانہ کی حیثیت کے مطابق ان کا رہنا سہنا بھی ان کے رتبے کے مطابق جیگر سی اور خوش باشی کا تھا:

دوا دانیان اور مغلانیان پھوس ہر طرف اس میں جلوہ گاہیں
خواہوں کا اور لونڈیوں کا، جھوم محل کی وہ چلیں وہ آپس کی دھوم
تکلف کے پہنچے پھریں سب لباس رہیں رات دن شاہزادے کے پاس
کنیزان مہر و کی ہر طرف مندریل چنبیلی کوئی اور کوئی راے بیل

کوئی چٹ لگن اور کوئی کامو پ	رنگیلی کوئی اور کوئی شیا ہون پ
کوئی مہرتن اور کوئی ماہتاب	کوئی کیتلی اور کوئی گلاب
کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی	کوئی سیوتی اور ہنس مکھ کوئی
پھر میں اپنے جوں کو دکھلاتیاں	ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں
ارسی اور بسی بکھ پکا رے کوئی	کہیں اپنے پیٹ سنوارے کوئی
تہا تے کہیں اور کہیں گالیاں	کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں
کہیں ہونے ری اور کہیں دا پھڑے	بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے
کہیں سوت بوٹے کہیں تار توڑ	دکھا دے کوئی گو کھر و موڑ موڑ
دم دوستی کوئی بھر بھر جیے	ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیے
کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلاے	کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگاے
کوئی اپنی مینا پر رکھے نقشہ	کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر
کوئی جان کو اپنی وارے کہیں	کسی کو کوئی دھول مارے کہیں
ادا سے کہیں بیٹھی کنگھی کرے	کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
بسوں پر دھڑکی کوئی اپنے جملائے	مقابہ کوئی کھول مستی لگائے
م النساء کا جو گن بننا اور پھر سے اپنی اصلی صورت اور لباس اختیار کرنے کا ذکر ہے:	
لیا سرخ لاہی کا جوڑا پہن	جلانے کو عاشق کے دکھلا بھین
طلا کی طرح سے دیا دگر لگا	تماسی کا سجات اس پر لگا
تراتے کی انجیا کسی ٹھیک ٹھاک	گلے کی صفائی وہ گرتی کاچاک
ڈوپٹہ بنا رس کا سورج کے طور	وہ پا جامہ سبز مخواب اور

ہزاروں کے زیورات و لباس

ہم غلیہ میں بادشاہ، غبار دے اور امیر زادے بھی زیورات اور عورتوں کے سے کپڑے پہنتے تھے۔ مبین

نے شنوی محرابیان میں ایک شہزادے کے تن پران زیورہات کا ذکر کیا ہے:

جواہر سرا سر پہنایا اُسے جواہر کا دریا بنایا اُسے
 کڑے کنگن اور کلغی اور نوزن کیا ایک سے ایک، زیب و بدن
 مرقع کا سر پہچ جوں موج آب منور بشکل رخ آفتاب
 وہ موتی کے ملے، بعد زیب خیز کہیں جس کو آرام جاں، دل کا پس
 ایک۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

گلے میں پڑا نیلہ شبنم کا ایک بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
 تمامی کی سنبھات جلوہ کناں کہ جوں عکس مدبر آب رواں
 طرہ مدار اک سر پہ چھینٹا سجا تمامی کا پٹکا کر سے بندھا

۱۸ طوائفوں اور پیشہ ور عورتوں کا سراپا

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے وہ پاؤں کے گنگنہرو چمکتے ہوئے
 وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں پہرہ کنا دہ نکتے کا ہر آن میں
 وہ گنگنہ، وہ بڑھنا، اداؤں کے ماتھ دکھانا، وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ماتھ
 دکھانا کہیں اپنی چھب مسکرا کہیں اپنی انگیا کو لینا چھپا
 کسی کے چمکتے ہوئے نور تن کسی کے وہ مکھڑے پہنتے کی چھین
 وہ دانتوں کی مٹی، وہ گلبرگ تر شفق میں عیاں جیسے شام و بھر
 دوپٹے کو کرنا کہیں منہ کی اوٹ کہ پردے میں ہو جائے دل لوطا اوٹ
 عام ہندستانی رقاصاؤں کے نقشے کے بعد میر حسن نے شہزادی بدرنیر کی رقاصہ عیش بائی کا تذکرہ کیا ہے:

اری، ہے کوئی یاں، ذرا جیو مری عیش بائی کو لے آئیو
 ایضاً: ۵۹، ۳۶ ۵۹ ایضاً: ۵۹
 ایضاً: ۲۶-۲۴ ۱۸ ایضاً: ۸۲

وہ آنے لگی کافر اس آن سے کہ جلنے لگا جی مسلمان سے
عجب چال سے وہ چلی نازیں کہ مستی میں پاؤں کہیں کا کہیں
وہ خلقت کی گری وہ ڈوس پنا نشے میں بھیمو کا سا چہرہ بنا
لشیں منہ پہ چھوٹی ہوئیں سرسبر کہ بدلی ہو جوں مر کے ابھیرا دھیر
وہ بن پونچھے ہوئوں کی سستی غضب کہ منہ پر تھی گویا قیامت کی خب
فقط کان میں ایک آلا پڑا کہے تو کہ تھا مر کے آلا پڑا
وہ پتہ آواز اگر لئی، وہ نرگس کا مار وہ کنو اب کے بند روئے آزار
بند صاف جوڑا پڑی زرد شان کمر کی چمک اور رنگ کی وہ چال
وہ شبہ نم کی انگلیا بنی تنگ چست کناروں پہ عینا بست کا درست
وہ اٹھی ہوئی چین پشیراز کی وہ مسکی ہوئی چوٹی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑے چھڑے وہ پاؤں میں سونے کے دو در کڑے
چلی داں سے دامن اٹھاتی ہوئی کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

۲۰ و ابانِ حرم کی مستورات کی بد چلی اور امر کی بیگمات کا کردار

رنگ یاں گو کہ ساری آفت ہیں بیگمیں اور بھی تیا مت ہیں
کھلتا ہر اک پہ ان کا حال نہیں کون اس میں ہے جو چمنال نہیں
ڈھونڈتی پھرتی خود حسین ہیں یہ ہم سے دونی تماشا بین ہیں یہ

۱ ایک گھیر دار زنانی پوشاک جس کے دامن گھٹنوں سے بہت نیچے ہوتے تھے۔ اس کی شکل ایسی ہوتی ہے، جیسے کسی شلو کے نیچے لہلہکا جڑ دیا جائے۔ ایک زمانے میں پیشواؤں (پشواؤں) مسلمان عورتیں پہنا کرتی تھیں۔ اس کے بعد اس کے استعمال دھنوں کے لیے مخصوص ہو گیا۔ رنگیاں، رنگیاں اور بھانڈ بھی ناپتے وقت پیشواؤں پہنتے تھے۔ اور ان کے قصبوں میں مسلمان نائیں بالعموم سرخ پیشواؤں پہنتی تھیں۔ بس کچھ فرق ہے یہ پوشاک تقریباً بالکل ترک ہو گئی ہے۔ دیوان ناز: ۲۰۵-۲۰۶ء (۱۵)

۲ طوق: "نریب عشق" ماخوذ از "اردو شعری شمالی ہند میں"، ۴۳

بازار

تروں و سطی کے بازار اس عہد کی تہذیب و معاشرت، اور عام طرز زندگی کی عکاسی کرتے تھے۔ مختصراً ان بازاروں سے عوام کی اقتصادی حالت کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان بازاروں میں قم خاں تھے جہاں شعرا اور ادباء جمع ہوتے اور شعر خوانی کا ہنگامہ برپا ہوتا تھا۔ ان بازاروں میں ہر کے رقص ہوتے اور ناٹاشانیوں کے مجمعے لگتے۔ یہاں نجوی اپنی دکانیں سجاتے، جہاں ان کے گروہ کا مجمع رہتا۔ یہ بازار تہذیبی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے بازار کا منظر ملاحظہ ہو:

اس بازار میں بڑے ہنگامے ہیں... عجب جلسہ ہے، ڈھولک بج رہی ہے شعر خوانی کا ہنگامہ، مطلع، اشعار، خمسے، رباعیات، پڑھ رہے ہیں۔ بعض جل کر کہتے ہیں: میاں! کیا خاموش ہو؟ میاں! آتش صاحب کا داسوخت پڑھو، شعر سے شعر لڑے، اب چودھویں کو مشاعرہ ہوگا۔ استاد مشرد مار بخش آئینگے۔ حسو خان فیض آبادی سے تکرار پڑی ہے۔ بڑی یاد کر کے آیا ہے، بابا باو پہر پڑھتا ہے۔ ہمیں چار دن کی یاد ہے۔ شیخ گھسیٹا ہمارا استاد ہے۔“

فیض آباد کا بازار

میر حسن نے اپنی ٹٹنوی گلزارِ ارم میں فیض آباد کے بازار کی چہل پہل اور خرید و فروخت گرم بازاری کا بڑا دلچسپ منظر پیش کیا ہے۔ ایک طرف جوہری، بڑار، صراف اور ملا بیٹھے ہیں۔ ان کے دلال آوازیں دے دے کر گاہکوں کو اپنی طرف ملتفت کر رہے ہیں۔ کپڑوں کی دکانوں میں کناری، گوٹے اور مسلسل کے کپڑے سجے رکھے ہیں۔ کہیں تر بنناٹے کے انبار لگے ہیں۔ کہیں مالینیں کھڑی، پھولوں کے ہار فروخت کر رہی ہیں۔ کوئی موتیا پھول بیچ رہا ہے، کوئی آوازیں لگا رہا ہے کہ گنے کی گٹھیریاں ہیں، مصری کی ڈلیاں ڈ

کوئی فرنی اور فالودے کو زد میں رکھے فروخت کر رہا ہے۔ کہیں میوہ فروش، کہیں خوائے والے کہیں نمکین اور چنے والے، کوئی سوٹھ کھٹائی، کوئی پٹی، کوئی خطائی، کوئی چاٹ بیچ رہا ہے۔ ایک طرف کھانے کی دکانیں ہیں، جن میں خشک، سالن باہر نکلا رکھا ہے۔ کہیں کبابی ہیں، کہیں شیرمال، روٹیوں، دودھ اور ملائی والے حلوائی ہیں۔ پھلوں اور پاجن، کھیر، ریوڑی بک رہی ہے۔ کہیں گھاس فروخت کرنے والے ہیں۔ کہیں تھوہ کی دکانیں، کہیں علاقہ بند، موچی، آئینہ ساز وغیرہ۔ غرض کہ ہر پیشہ درآحازیں لگا لگا کر گھیروں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ ان بازاروں میں رقص و سرود کے اجتماع ہوتے تھے۔ کبوتر باز اور عیاش طبع لوگ وہاں موجود ہوتے تھے۔ میر حسن کا بیان ۲۳ ہے:

کہیں بن ٹھن کے لونڈے ہی کھڑے ہیں	انہوں کے گرد عاشق جاڑے ہیں
کہیں ہیں زبڈیاں ہی ماہ پارہ	انہوں کا کرتا ہے کوئی نظارہ
پھرین کھترانیاں سنتوں کے ہراہ	کہیں ہندو بچے بھرتے پھرتے آہ
کہیں گھڑ کوئی پیتا ہے باہم	لگاتا ہے چرسس ہی کا کوئی دم
اڑاتے طوطیاں لے ہاتھ اپنے	مدے پھرتے ہیں لے کر ساتھ اپنے
کوئی سیٹی سے زیں چہ چکرے ہے	کوئی دم منہ سے طوطی کا بھرے ہے
ضلع بوے سے کوئی، کوئی پھکڑ	کہیں ٹھٹھا، کہیں ہے، دھول تھڑ
کہیں سکھیاں، کہیں گھنڈا درجنت ہے	ادھر ہے سانگ اور ادھر سنگت ہے
کھڑا کوئی کہیں پونجی بجا دے	کوئی لونڈے کو آگے سے بجا دے
روایچے کوئی، کوئی کرے کھیل	لیے بیٹھا ہے سانڈے کا کوئی تیل
کوئی کھوے کتابیں مودتوں کو	دکھا دے نیک و بد کی صورتوں کو
زبس ہے عیش و مشرت کا وہاں ماند	کہیں ناچیں ہیں کشمیری، کہیں بھانڈ
کبوتر کے کہیں شوقین ہیں جمع	کہ جوں پروانے ہو دیں بر سر شمع
غرض موجود ہے سب جنس دنیا	کہیں بلبل، کہیں ہے لال مینا

کہیں انڈے پچک اور سر لڑے ہیں یدِ بیضا لیے مہر و کھڑے ہیں،
 فقط نوروز پر کیا برس کے برس اسی تفسیر بیضاوی کا ہے درس
 کسی کا کوئی وہاں مانع نہیں ہے کہیں ہے نقل اور قصا کہیں ہے
 بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را بکسے کارے نباشد

دہلی کے چوک کا بازار

چوک نامی بازار شمالی ہندستان کے ہر بڑے شہر میں تھے، لیکن دہلی کا "چاندنی چوک" اپنی خواہش اور دکشی کے لیے بہت مشہور تھا۔ دور دور سے لوگ اس بازار کو دیکھنے آتے تھے۔ درگاہ قلی خان نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ پرند بھی اس پر گرے پڑتے تھے۔ میر حسن نے اس بازار کیوں ذکر کیا ہے؟

یہ دیکھ سپ بازار تھا چوک کا کہ ٹھہرے جہاں پر دہلیں دل لگا
 جہاں تک کہ رستے تھے بازار کے کہے تو کہ تھتے تھے گلزار کے
 وہ بچتے مکافوں کے دیوار دور سپیدی پہ جس کی نہ ٹھہرے نظر
 صف پر جو اس کی نظر کر گئے اسے دیکھ کر سنگ مرمر گئے

اس دور کی اردو شاعری میں دہلی کے دوسرے بازاروں کا ذکر بھی ہے، لیکن ان کی تفصیل نہیں ملتی۔

چاؤڑی کا بازار

'چاؤڑی' مرہٹی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں مقام، پولیس چوکی۔ مرہٹوں کے دور اقتدار میں اس بازار میں پولیس چوکی تھی۔ حوض قاضی سے جامع مسجد کی طرف جانے والی سڑک پر یہ بازار آج بھی موجود ہے۔ سودا کے ایک شعبہ میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ اس نے کوتوال کی ہجو میں لکھا ہے کہ عین تھا نے کے راستے میں بھی رہنری کی وارداتیں ہوتی ہیں؟

۲۴ ایضاً: ۱۵-۱۶؛ نیز کلیات سودا: ۳۶۶ ۲۵ کلیات سودا: ۱: ۱۱، ۳۷۸

دیکھی ہم لے جو راہ چاؤڑی کی پشیم ہے رہزنی تلاؤڑی کی

یہ بھی شاہانِ مغلیہ کی دلی میں ایک اہم بازار تھا۔ اس کا محل وقوع وہ تھا، جہاں اب پریگنڈ کے نام سے ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ یہاں پہلے پانچ بڑے بڑے محلے اور بازار تھے جن میں بیگم بازار، اردو بازار، خاص بازار زیادہ مشہور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۵۷۸ء میں ان علاقوں کے کرخندار باغیوں کے لیے اسکو ڈھالتے تھے اس لیے انگریزوں نے سارے علاقہ کو مسما کر کے اسے زمین کے برابر کر دیا۔ ان بازاروں کے انہدام کا ذکر غالب کے خطوط میں بھی بہت جگہ ملتا ہے۔ سودا لکھتے ہیں:

خاص بازار کا جو سنیہ بیان اون نے نزدیک کے کاٹ ڈالے کا

گڈڑی کا بازار

لفظ گڈڑی غالباً گڈری کی تحریف ہے۔ گڈری کو اردو میں ٹھنڈی سڑک اور آج کل کی اصطلاح میں ال روڈ کہتے ہیں۔ قریباً ہر شہر میں گڈری بازار موجود تھے جہاں لوگ سرشام سیر کو جایا کرتے تھے۔ معنی نے کہا ہے:

ہوتا ہے سرشام تماشا گڈری کا

دلی کے اس بازار میں غالباً اس زمانے میں خاص طور پر کبوتر فروخت ہوتے تھے جیسا کہ سودا کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

وہ تو بچی کا ہرگز ہم کو لکھے نہ نامہ گڈڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گوئے

اردو بازار

دلی میں جامع مسجد پر آج بھی اردو بازار موجود ہے، لیکن اسے شاہانِ مغلیہ کے عہد کے اردو بازار

سے کوئی علاقہ نہیں بدلتی میونسپلٹی نے انگریزوں کے زمانے میں اسے یہ نام دے دیا تھا۔ اصل اردو بازار لال قلعے سے متصل تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یگم بانا اردو خاص بازار کی طرح یہ بھی سمار کر دیا گیا تھا اردو بازار کا یہ نام قلعے کی رعایت سے تھا جسے اردو نے معنی کہا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں اس بازار میں کتب فروشوں کی دکانیں ہیں:

میسو اور سفیر فی ہے سب کا نام اردو بازار بی گیا ہے تمام

حقہ نوشی

اردو شاعری میں حقہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ حاتم لے حقہ نوشی پر ایک شاعری لکھی تھی جس کا ذکر کہیں کر چکا ہوں۔ میر حسن کی شاعریوں میں بھی حقہ نوشی کے حوالے ملتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر طبقے کی عورتوں میں بھی حقہ پیا جاتا تھا۔ مثلاً شہزادیوں کے حقہ پینے کے ذکر میں کہتے ہیں:

خوام ایک حقہ لیے تھی کھڑی کہ لالے کی پتی تھی اس میں پڑی
وہ شیشے کا حقہ، مربع کا کام معرق زری کا وہ نیچہ تمام
وہ ایک اس پر پڑا تھا جو بیچ یر سب اس کے آگے تھے گویا کڑیج
لب نازک اوپر وہ منہال دھر نکالے تھی پردے سے دو درجہ

پھر خواصوں اور نوٹوں کا یوں ذکر ہوا ہے:

ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیے دم دوستی کوئی بھر بھر جیے
اور عام عورتوں کی حقہ نوشی کے بیان میں کہتے ہیں:

کوئی شربت کوئی ساتو بنا کسی کو کوئی حقہ ہی پلاتا
مجھے حقہ سے کب تھا سر پھرا نہ بھاتا تھا کسی کا منہ لگانا

اس باب میں دوسرے شعرا کے ہاں بھی کچھ کم تذکرہ نہیں ہے:

۲۸	دیوان فاکر: ۲۱۵	۲۹	مجموعہ مثنویات میر حسن: ۸۰
۳۰	ایضاً: ۳۱		
۳۱	ایضاً: ۱۳۷، ۱۳۸		

معداد ادب کا سماجی پس منظر

- ۳۲: شوقِ بنِ دل میں نہیں دم مار سکے آہِ گرم
- شب دھواں حق سے بچے، جب پلم پر پڑا آگ
ترے اے غنچِ لب، دم کے انروس پلم میں ہو گیا ہے گلِ تماکو
خاکِ زلفی: پُر تکلف حقے اور منہاں دیکھیں ہیں جہاں
صاف لڑکے دلربا کھاتے ہیں جاگر تپچ واں
مصطفیٰ: جو دم حقہ کا دوں، بولسکے میں حقاً نہیں پیتا
بھر جلدی سے کر سلفا نہیں پیتا
انشا: سرد آزاد کی حقہ کش انیونی نے
بیچے ایک ادھی کو اور کوٹے لئے ڈھاک کے مول
حقے سے حقے، چلموں سے طہیں بھی لڑیاں
بچوں سے نیچے، گڑ گڑوں سے گڑ گڑی لڑی
نصیر: کوئی کہتا ہے نئے قلبیاں کو
فریادِ نفساں میں، دیکھ، سرگرم نہ ہو
دمِ مشق کا کیا بھرے ہے، اے سوختہ جاں!
آتی ہے ابھی منہ سے ترے دود کی بو
شیخ محمد بخش مہجور: حقہ تازہ کر کے تو بھر دیکھو
ادر کہیں جو کچھ، سودہ کر دیکھو
نظیر اکبر آبادی نے ایک پوری نظم "حقہ" کے عنوان سے لکھی ہے:
جہ سے حقہ لبِ جان بخش کا ہر لڑ کیا
تب سے حقِ حق کیا کہ تو کی سی کچھ آدانا ہے
-
- ۳۲ دیوانِ آریزہ: ۱۵۹/۱۱-۱
- ۳۳ دیوانِ شاکر ناجی: ۱۶۳
- ۳۴ دیوانِ مصطفیٰ، ۲: ۵۵، ۵۶، ۵۷
- ۳۵ کلیانہ انشا: ۵۹-۱۴۶
- ۳۶ ایضاً: ۳۰۶، نیز تذکرہ ہستیا: ۳۱
- ۳۷ دیوانِ مہجور (طہی): ۳۱
- ۳۸ کلیاتِ نظیر اکبر آبادی: ۹۰۲-۹۰۳

نظر: پی کے قلیان اپنا ہر دم غیر کو اس نے دیا
میرے ہاتھ آیا تو کوئی بعد اس حدت کے گھٹ

پان

پان کے موضوع پر اردو شعری میں بیشتر اشعار ملتے ہیں اور عورتوں اور مردوں میں ماحول پر پان کھانے کا رواج پایا جاتا تھا۔ ان اشعار میں لوازمات پان کے بھی اشارے ملتے ہیں جنہاں اشعار ملاحظہ ہوں:

آبرو: تمہارے لب کی سرخی لعل کی مانند اعلیٰ ہے
اگر تم پان، اے پیارے! نہ کھاؤ گے، تو کیا ہوگا
شکر ناجی: غیرت میں دل شفق کا چرنا ہوا ہے پھٹ کر
تیرے لبوں کے ادھر دیکھا جو رنگ پان کا
جو کوئی جامہ زبوں کو لگا لینے کی دھن رکھے

تو پاس اپنے اہلاچی، پان سپاری کے دھن کھے
ماقم: چنگیر دپان دان دھو گھڑی سب گل دپان دپاری سے بھرے لبتا
میرزا: خط منہ پہ آئے جانناں خوبی پہ جان دیگا
ناچار عاشقوں کو زنجیرت کے پان دیگا
معصی: سرخی پان کا عالم دھن تنگ میں دیکھ غنچہ گل میں کیا جس نے گلستاں پیا

۳۹	دیوان نظر چارم: ۳۵	۴۰	دیوان آبرو: ۹، ۴۹، ۵۷، ۱۵۷
۴۱	دیوان شکر ناجی: ۶	۴۲	ایضاً: ۳۳۲، نیز ۲۳، ۳۳
	۶۶، ۶۹، ۸۲، ۲۲۲، ۲۹۲، ۳۲۶، ۳۲۵		
۴۳	دیوان زارہ: ۵۰	۴۴	کلیات میر: ۴۴، نیز ۷۹، ۶۱
	۱۱۵، ۲۲۹		
۴۵	دیوان معصی: ۶، ۷، ۱۷		

اردو ادب کا سماجی پس منظر

انشا : پان جو ہاتھ سے کل فیہ کے توئے کھلایا
میں نے دیکھی ہے اس کے کانوں میں ٹوگ
یہ منہ کھڑا وہ پانوں کا مٹی کے ساتھ
کوئی مور جھل لیے، کوئی پیکلن
دلے میں غم سے بے برگہ دنوا تھا
منگنا تھا میں جس خاطر کبھی پان
کسی کے ساتھ پانوں کی پٹاری

پلے کے لو ہو کو فرض گھونٹ رہے ہیں پلے
کیوں نہ خوش آوے مجھ کو پان میں ٹوگ
کہ جوں دامن شب شفق کے ہوں ہاتھ
کوئی لے چنگیوارہ کوئی ہار پان
مجھے تو پان دھتے سے کیا تھا
اُسے کرایا جاتی تھی میری جان
بھرا بھوے میں کٹھا اور پلے

پالکی

اردو کے شاعروں نے بالعموم اپنے مرتبوں کی پالکیوں کی تعریف میں تعبیدے لکھے ہیں ۱۱
اس بارے میں متفرق اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

محمد قاسم قاسم نے نواب نادر خان کی سواری کی پالکی کی تعریف میں یہ قطعہ کہا تھا: ۵۶
نواب پالکی میں تیری ہے وہ ندق برق

چشم ستارہ خیو ہو جس کے خیال سے

اس لطف سے ملا لوں گا کہا ہے بانس پر کہا

فرحی یکے ہیں مہر کی گویا ہلال سے

ہدایت خان ہدایت نے نواب تاج الدولہ میرک حسین خان کی پالکی کی تعریف یوں ۵۷
کی ہے:

عجائب سبز رنگ دہ پالکی تھی مقطع زیب میں جوں نالکی تھی

کہ جس کی من و خوبی دیکھتاؤں کہا روں کے اس کے پاؤں

ہلالی دیکھ اس کے بانس کا خم بلند افلاک کا غفلت سے قدم

کہا اس پالکی کے باد پاتے ہنر میں جلد چلنے کے بلا تے

شاہنامی: گاجاتا ہے اگر فیرو اس کی سواری میں

۵۸ پھوڑے پالکی کہنے کو ہے حاضر جلوں کو

سودا: ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے

۵۹ جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے

انشاء: اپنے گھوڑے پر چڑھا کر یہ نہیں سمجھتی تھی

۶۰ مگر چو جہاں دار ہے پھر پالکی کی پالکی

۵۶ عیار اشعار: ۱۹۲ (۱۹۲) ۵۷ کلیات ہدایت: ۲۸۸ ۵۸ دیوان شاہنامی: ۴

۵۹ کلیات سودا: ۱۱۳۶۴: ۳۶ ۶۰ کلیات انشا: ۱۶۳

احد عذاب کا سماجی پس منظر

تذکرہ آبادی:

دہ پالکی بنی تھی سنہری جھنڈنگ
جھال رہے جس کی ہوتے تھے موتی پڑنے لگا
لانا لکی پہ موت نے جب کر لیا سوار
پھر وہ نہ پالکی، نہ وہ جھال رہا نہ کھار

ڈولی

انشاء: اس پری زاد کے جی مدتے کہا یوں جس نے
میری ڈولی میں لگا دیکھو مہرا پمدا^{۶۲}
کچھ نہیں معلوم، پوچھو، کونسا سیلا ہے آج؟
جاتیاں ہیں جو کچھ کچھ ڈولیوں پڑولیاں^{۶۳}
سننا جاتا ہے جی اپنا دو گانا، اس گھڑی
گھر سے جانے کو منگاتی جس گھڑی ڈولی ہے تو^{۶۴}
اڑیں سے ہو دے وہ ڈولی میں جب سوار
لپٹا تے کیوں نہ دیکھ کے مہرا ازار بند^{۶۵}

نالکی

معصی نے شہزادہ سلیمان شکوہ کی نالکی کی تعریف ان اشعار میں کی ہے
ہے نالکی جو سواری کی تیری، اے ممدوح!
ہنگ تخت سلیمان بہر طرف سیار
میں اس کے تہ زریں کی کیا کرد تعریف
کہ چرخ کھاتے ہے نت جس پہ گنبد نقد

۶۱ کلیات تذکرہ آبادی، ۵۳۷ ۶۲ کلیات انشاء، ۲۱

۶۳ ایضاً: ۲۰۱ ۶۴ ایضاً: ۲۰۴

۶۵ دیوان معصی ششم: ۱۵۱، کلیات سودا: ۳۷۱

اصحاب کا سماجی پس منظر

دور دنگی ادس کی ہے ازبکہ شکل محرابی
 کریں ہیں سجدہ اد سے دیکھ کافر و دیندار
 دونوں ادس کے جو ہیں دوش پر کہا روں کے
 تمام لطف و ترمیم برنگ دست نگار
 انشا، گھٹا ٹوپ اس پری کی، لگی کا کچھ ہوا اچھا
 توپاٹ اس میں لے کر چادر مہتاب کا جوڑا
 تو بھی ہے ایک شہزادہ چاہیے تیرے لیے
 مورچیل دو ہوں مہما کے، اور مغسرتنگی

بیل گاڑی

چلا گاڑی میں یوں آیا میں ناچار قفس میں جس طرح صید گرفتار
 بیل گاڑی کا ڈھانچا نو ہے کی ایک سلاخ پر رکھا ہوتا تھا جو دھری کہلاتا تھا۔ انشا نے
 ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے:
 چو دھری جی! چلے وہ کیا گاڑی کبھی پہیوں میں جو دھری زنگے
 وہ گاڑیاں جو دھریں تھیں گھوڑوں سے بیشتر
 ناگدہی اُن کے ہاتھی کے پاٹھے سے خوبتر
 پہیا قضا کے ہاتھ سے جب اٹا آن کر
 گاڑی ادھر اٹ گئی، مالک گمراہ دھری

۶۷ کلیات انشا: ۲۶

۶۶ دیوان معنی، ۱۰۳

۶۸ ایضاً: ۱۶۳

۶۹ ثنویات میر حسن دہلوی: ۱۳۶

۷۰ کلیات انشا: ۲۱۱

۷۱ کلیات فقیر اکبر آبادی: ۵۳۷ نیز دیکھیے کلیات میر: ۹۵۹

ہنڈول

دوا: لی ز ڈولی انہیں اچوتھے صاحب چنڈول^{۷۲}
بیٹے کے پھر پاس وہ اک ڈولی کے نبض کہا دیکھوں میں، لا، ہاتھ دے^{۷۳}

رتھ

انہاجی: جو لڑکا سیر میں ہمراہ ہو گھر میں نہ آوے دے
تو جانے دے زنا نہ ایک ٹھلا رتھ میں دل پہلا^{۷۴}
نر: پہل درتھ میں بھری ہیں سب عورات
آشنا ساتھ اپنے کرتے ہیں با ست^{۷۵}
معنی: گزروں ہوں جو آگے سے میں اس رتھ (کے)
منہ اپنا لگا دیوے ہے چمن کے برابر^{۷۶}
طیر اکبر آبادی:

رتھیں وہ رتھیں کہ بیٹھتے تھے جن میں پھیل پھیل
بچتے تھے رنگ اور تھے کلس ان کے جوں شہیل
رتھبان نے اجل کے جوہن کر لیا دبیل
پھر کس کی چھتری، پیچھے کہاں، اور کہاں کے یل^{۷۷}

بانہ

بھوانی بھان سے میاں	سا: اپنے سوار کر لے آنا
۷ کلیات سودا، ۱۱، ۱۱، ۳۷	۷۳ دیوان شاکر ناجی: ۳۵
۷ دیوان فائزہ: ۲۱۷	۷۶ دیوان معنی، ۲۷: ۲۴ (ب)
۷ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۵۳	۷۸ دیوان معنی، ۵: ۱۲۱ (الف)

اسدو ادب کا سماجی پس منظر

نظیر اکبر آبادی نے ذیل کے اشعار میں تمام قسم کی سوار یوں کا ذکر کر دیا ہے:

ہاتھی جو تھے پہاڑ کی مانند تن سیاہ
جن پر کہیں عماریاں رخشندہ رشک ماہ
ہو دود کی بھی چمک پہ نظر ہتی نہ تھی نگاہ
کس عیش سے چڑھے ہوئے پھرتے تھے ماہ دا
گھڑ بھل، فیل بھل، شتر بھل، راہوار
ہر لد کی بھل، بکری بھل، گھنٹہ گھنگر و دل
مالک چڑھا جو موت کی ڈولی پر ایک بار
پھر پہلیاں، نہ بھل، نہ جھنکار، نہ پکار
میان، تماخہ اور وہ چنڈ دل، بگھیاں
وہ بیسیں، وہ پوچے، وہ چپائے خوش نشا
مالک ہوا اجل کے جو گھڑ کھڑ پر دواں
بوچا گیا، نہ ساتھ میا نہ گیا، میاں!
چمکڑے، لڑھے، رہکے، شتر بھل اور چمچر
ٹٹو، حمار، بھینسے، وہ لانے کے گور خر
مالک چلا جو مریت کے انکے کو چھیر کر
بھبھنا گیا نہ ساتھ نہ ٹٹو، نہ گاؤ خر

گھریلو ساز و سامان

گھروں کے دروازوں پر بالعموم پردے یا چقین ڈالی جاتی تھیں،
دیچھ انشا کو ایک حور نژاد ہے گھڑی دون کو حق کی ادھ مٹی

۷۹ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۵۲۶-۵۳۸

۸۰ کلیات انشا: ۱۴۳

اردو ادب کا سماجی پس منظر

ہے یہ دالان پری حکم جو پھولوں میں ایک روپہرا لگے، اور ایک سنہرا پھل^{۸۱}
 دالان کے فرش پر چاندنی، قالین اور چادر بچھائے جاتے تھے،
 مسند و فرش اگر نہیں تو عبث کیوں ہے بلوں
 آج قالین ہے آخر تو طے کا گل مسین^{۸۲}
 جس گھر میں تیرے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش
 وہاں چادر مہتاب ہے مکھڑی کا سا جالا^{۸۳}

مسند

دالان یا دولت خانے کا وہ ادنیٰ مقام جہاں مالک خانہ بیٹھا کرتا تھا:
 پھولوں کی سیج پر سے جو بیدار غاٹھے
 مسند پہ ناز کی جوتیوری چڑھاکے بیٹھے^{۸۴}

تہ خانے اور خس خانے

ہندستان میں چونکہ سخت گرمی پڑتی ہے، اس لیے یہاں کے باشندے اکثر اپنے مکانوں میں
 تہ خانوں کا اہتمام کرتے تھے اور اہل ثروت موسم گرما میں خس خانوں میں دن گزارتے تھے،
 آمارہ پڑے پھرتے ہیں کیوں دھوپ میں، صاحب!
 تہ خانہ میں سو رہیے نا، چلتی ہے مہا گرم^{۸۵}
 ہیں مڑگاں اس نمطِ دام ہوں کی ٹٹیاں
 جس طرح گرمی میں چھڑکی جائیں خس کی ٹٹیاں
 باس سخا نہ میں خس کی کیا بھلا باقی رہے
 جب کہ روگرداں ہوں پھر لگے برس کی ٹٹیاں^{۸۶}

۸۱ ایضاً: ۲۱ ۸۲ دیوان شاکر ناجی، ۱۶۴ ۸۳ کلیات میر، ۱۳۹

۸۴ ۳۹۹، ۱۹۶ ایضاً: ۳۸۸ ۸۵ کلیات انشا، ۸۴ ۸۶ ایضاً: ۸۸

خسٹانے ہیں چھڑ کے ہوئے اور عطر نشاں ہیں

پنکھا

غربا عام طور پر گرمیوں میں ہاتھ کے یا چمٹ کے پیچھے استعمال کرتے تھے۔ برسات کی آؤں کے عنوان والی نظم میں نظیر کہتے ہیں:

پنکھے کوئی پکڑے، کوئی کھوے ہے کھڑا بند

دم رک کے گھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند

نظیر نے ”پنکھ“ کے عنوان سے ایک بڑی نظم لکھی ہے:

کیا موسم گرمی میں نمودار ہے پنکھا
خوبوں کے پسینوں کا خمدار ہے پنکھا

گلرو کا ہر اکس جا یہ طلبگار ہے پنکھا اب یاسن سرے یار کے ہر بار ہے پنکھا

گرمی سے نصبت کی بڑا پار ہے نیکیا

غسل کے لوازمات

پیروں کا میل بھانویں سے صاف کیا جاتا تھا۔ اور لوگ بالعموم چوکی پر بیٹھ کر مہاتے تھے،^۹

پلیسٹک ٹیکری ایک ڈھونڈ کے لادے، جس سے

اپنی رگڑا کر دیں میں پانٹو کی ایڑی..... اتنا

شیخ جیو صاحب ہیں جو نہایت مشک سے بیٹھے چمک پر

مونڈی مانڈی چندیا پر کیا خوب تر بڑے پڑتے ہیں

۸۷ کلیات نظیر اکبر آبادی : ۶۵۲ ۸۸ ایضاً : ۵۶۳

۸۹ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کلیاتِ نظیر اکبر آبادی: ۵۷۰-۵۷۲، ۸۵۰-۸۵۱

۹۰ کلیات انشا: ۱۸۷

٩١ ايضا : ٨٨

گھسریلو برتن

کہا نا پکائے امد کھانے کے برتن عام طور پر کابوئیں، دیگچیں، دھنچوں، کڑاہیوں، ہنڈیوں، قابلوں پر مشتمل تھے:

مہمان میرا مت ہو بخوان فلک پہ بگڑے	خالی یہ مہر و دم کی دونوں کابیاں ہیں ^{۹۲}
مدد منی دیگ ہے شکم اس کا	نفس اڑدھا ہے دم اس کا ^{۹۳}
راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی	جاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی ^{۹۴}
گوشت ہانڈی بھر ہے خشک میں	ہنڈیاں گویا تھیں اس کی خشک میں ^{۹۵}
نڈلے دیکھ کر وہ تاب پلاؤ	منہ ہے منہ بیٹا گرہ کھاوے کھاؤ ^{۹۶}

آفتاب: لوٹا

منہ ہاتھ دھونے کے لیے لڑنے کا استعمال ہوتا تھا:^{۹۷}
منہ دھونے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب

کہا دیگا آفتاب کوئی خود سر آفتاب

اٹھارویں صدی میں مٹی کے برتن بھی کثرت سے استعمال ہونے لگے تھے۔ نظیر اکبر آبادی نے "لوٹا برتن" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں گولی، شکا، ٹھلیا، لوٹا، کوزہ، جھوڑا، دھیو کا ذکر کیا ہے۔ اس کا پہلا بند ہے:

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی	جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی
بونڈ پانی کی ان میں جب کھنکی	کیا وہ پیاری صدا سے سن کی

۹۳ ایضاً: ۳۳، نیز کلیات: ۲۰۰

۹۵ ایضاً:

۹۷ ایضاً: ۶۳۷

۹۲ کلیات میر: ۱۰۱

۹۴ کلیات میر: ۸۳۷

۹۶ ایضاً:

۹۸ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۵۷۲-۵۷۴

اردو ادب کا سماجی پس منظر

تمازگی جی کی اور تری تن کی

دواہ کیا بات کو رے برتن کی

سونے بچھانے اوڑھنے کا سامان

پلنگ

تم نے پلنگ اور بچھایا تو کیا ہوا تم جانتے ہو مجھ کو کہ میں ہوں پلنگ نہ عرض^{۹۹}
اک خلق وادخراں۔ تہہ قالے در پے آج کچھ چارپائیاں ہیں دھری، کچھ پلنگ سرخ
پلنگ کن چھوڑ غالی گویا میں جب اٹھ گیا مینا چترکاری لگی کھانے بہن کوں گھر ہوا مینا

چارپائی

چارپائی وہ لگا، بھاند کے آئی کس راہ ایسی دیوار بڑی سے۔ اجڑ، بیرات غلط^{۱۰۲}
مصطفیٰ نے ”درہ بخو چارپائی“ کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے، جس میں چارپائی کی خرابیاں بیان کی ہیں:

یہ جو ہم پاس چارپائی ہے گور ہے، یا کنواں، یا کھائی ہے
بچی، پاپے تنہا ناہموار اور بانوں کی جھول جیسے کہ غار
کچے دوا کچ ہے بسکہ وہ یکسر نعش گردوں کو رشک ہے جس پر
کیوں نہ دل داغ غم سے ہو رہے تنگ کہ درندے ہوئے ہیں مثل پلنگ
ڈھانچ ہے اس کا بسکہ اکول جلون کہیں سل بیٹھتی نہیں ہے چول

۱۰۰ دیوان آبرو، ۱ نیز دیکھیے ممبر مثنویات

۹۹ کلیات انشا: ۶۸ نیز ۶۷، ۶۶، ۶۵

میر حسن: ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

۱۰۲ کلیات انشا: ۱۹۷ نیز دیوان مصطفیٰ، ۶، ۷، ۸

۱۰۳ کلیات مصطفیٰ (مرتبہ نثار احمد فاروقی)، ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ نیز دیکھیے کلیات میر، ۸۱۶

امداد کا سماجی پس منظر

پایے ہیں کہنگی سے زرد سیاہ سیرودن کا بھی حال پھر چہ تباہ
 بسکہ ہے ڈھلڈھلی دہچ دہچر چول کو روز چاہیے پچھس
 اس کی کتا ہوں جس دم ادوائن اک خدا اس گھڑی تو جائے ہے تن
 لیک جس وقت اس پہ پاؤ دھرا جیسے کوئی کنوئیں میں آن گرا
 بانٹ کی اس کی کیا کرطا تعریف تھا وہ بافسدہ بسکذا تشریف
 چید رکھے ہزار بانوں میں گر ہیں ہیں بیشمار بانوں میں
 گر گدیے کا اس پہ ہو بستر تو بھی جھستی ہیں پھانسیں ہون شتر
 آکے جب رات اس پہ سوتا ہوں کر کے ضامن کو یاد کرتا ہوں
 یہ وہی ناتواں پلنگ گڑھی ہے جس کو کہتے ہیں لولی لنگڑی ہے
 نہ چھپر کھٹ سے اس کی نسل ملے نہ کھٹولے کی قسم کوئی کہے
 بسکہ ہے تنگ گیر اس کا بانو اس پہ پیٹے پڑیں ہیں کاٹھ میں پاؤ
 نیچے ادنیچے اس کے ہیں پایے ہیں معطل زمین پہ پروائے
 بسکہ دل اس سے خوش نہیں ہوتا مارے غصے کے میں نہیں سوتا

مپر کھٹ

پلنگ جس کے چاروں پایوں میں اد پر کی طرف کبھی ڈنڈے اٹھا کر چھت کا چوکھٹا بنا
 جاتا ہے امد اس پر مسہری وغیرہ تان لیتے ہیں:

اتنی رچی ہوئی تھی یہ پردوں میں کس کی باس
 یوں میں نے مگر کے شب جو چھپر کھٹ غصے کیا

موسم سرما کا اور صحن بچاؤ

لحاف اور رضائی

جاڑے میں کیا مزہ ہو وہ تو سمٹ رہے ہوں
 اور کھول کر رضائی، ہم بھی لپٹ رہے ہوں^{۱۰۵}
 کھینچ لے، اکاش وہ پری، اپنے مجھ لیٹ میں
 یا کہ بلا سے پھینک دے دامن کوہ قاف میں^{۱۰۶}
 معصیٰ نے شہزادہ سلیمان شکوہ کی خدمت میں ایک قطعہ دردمع و طلب لباسِ سرا کہ
 کر موسمِ سرا کے لباس کی فرمائش کی تھی:^{۱۰۷}
 نہ اس کو کمیس ملے نہ لہادہ نہ پٹو
 نہ کوئی رضائی بھی میلی سی نہ چروانی شال
 بجائے تو شک اک بوریہ ہے فرشِ پلنگ
 ہے اس کے نیچے کچھ برفیوں گھوڑ کی پرال
 بوختِ خواب ہے پوششِ خان کی جاگہ
 خسریدہ ہاری کی دور زندہ غسال

شال، دوشالہ، اور کجیل

گر پڑا جو دوشالہ بھی پڑا چلوں پر ٹانگ جو تم نے دیا تھا، سوزِ شہرِ پریہ^{۱۰۸}
 ع کہیں ہے شال بات ایسا، جو جاوے تک بند لٹوئے^{۱۰۹}

۱۰۵ کلیات، انشا: ۱۹۵، نیز ایضاً: ۱۹۱، ۲۰۰، ۲۰۸

۱۰۶ ایضاً: ۹۱ ۱۰۷ دیوانِ معصیٰ، ۶: ۵۵۱-۵۵۲

۱۰۸ کلیات، انشا: ۲۱ ۱۰۹ ایضاً: ۲۳، نیز ایضاً: ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۱

اسناد کا سماجی پس منظر

سرد مہر ہی کہ بکے مخلوق نے ادھر حسی ابرو پہاڑ نے بھی مثال

کبیلہ

تھے جو کھیل پوش ان کے سامنے کیا تھو
صاحبِ شال و سمر و قائم و سجان کا



۱۱۲

نکلیہ تیرے سر پہ نے کا سو بھی کے غش نہ کیوں ہوں میں

آتی ہے وہ زور باس سحرے سے اس فلاب میں

۱۱۳

اس پر تکیہ کیا تو مٹا لیکن رات دن ہم تھے اور بستر تھا

اشیائے خورد و نوش

کلیا

ایک طرح کی غیر ریاضی
کسی حسین کا ایک منہ تو تھا ہی کچھا
کمال کچھے سے بھر تو ہے سے سیاہ

رچا ڈاٹ اور ہوائی اب کس اس بنا ہے
کاسہ سر ہے جیسے اونہ کا کرنا ہے

منجھری

ایک نم کی میٹھی چیز تھی جس کو میوے اور پھولوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ یہ میوے اور پھول بھی اشد شکر

۲۷۰ کلیات انشاء

۱۵ کلیات میرزا ۸۶

۱۳ کلیات انت. ۹۰: نو (رضا) ۱۱۸۱-۱۱۸۹، ۱۳۷ ۱۳ کلیات میرو ۲۲: نیز (رضا) ۱۳۵۳-۱۳۵۴

۱۱۵ کلیات میرزا ۸۳۳

۱۶۱ کتابت و تصحیح: ۱۶۱

کے ساتھ بھول کر مہدیے یا سوچی میں ملا دیے جاتے تھے۔^{۱۱۷}
کیا پختہ پوری سیلی سیلی ا جی جو کہ ہونٹوں میں مگر بھری نہ لگے

سموسا

ہے ایک تمناعت کو فقط نان جویں بس

درکار نہیں ادن کے تکلف کے سمو سے^{۱۱۸}

اردو ادب میں اس عہد کے ہر قسم کے کھانوں، مٹھائیوں، حلویوں، روٹیوں اور اچاروں کا مجموعہ ملتا ہے۔^{۱۱۹} مونگ پھلی اور پنیر اور ساگ کے ذکر کے دو تین شعر سنیں:

نرماہٹ اور نگلیوں کی ان کی نہ پوچھو مجھ سے

ہے صاف داں تو عالم اک مونگ کی پھلی کا^{۱۲۰}

کھانے والی جو کتنی مصفیٰ چنے کی ساگ

۱۱۶ ہفت تماشاً: ۱۵۲ ۱۱۷ کلیات انشا: ۲۱۱

۱۱۸ ایضاً: ۱۸۲

۱۱۹ مجموعہ ثنویات میر حسن: گولیاں، اندر سے، بیڑے، برنی، لوندے، حبشی طلعہ وغیرہ

۱۲۰ (۱۵۱-۱۵۰)؛ ثنائی کباب ردیوان آبرو: ۵۹؛ بمبئی روٹی کلیات سودا، ۱: ۳۶۴

مسود کی دال اور جو کی روٹی (ایضاً، ۱: ۳۶۶)؛ گوشت میں چنے کی دال (ایضاً: ۳۶۶)

۳۸۲-۳۸۵، ۳۸۷، ۳۹۲)؛ گڑ اور طلیبی ردیوان فائز: ۱۸۱؛ پڑا (ایضاً: ۲۱۰)

حلوا اسرہن ردیوان شاگر ناجی: ۶۴؛ نان خطائی (ایضاً: ۲۲۴)؛ امرتی (ایضاً: ۶۴)

۲۹۹؛ بلاؤ، مربا، اچار ردیوان زادہ: ۳۴۹؛ گنگلا ردیوان نادر

۹۰، ۳، ۳، ۳، ۵۰۷؛ موٹہ مٹر (ایضاً: ۵۱۲)؛ نیز کلیات نظیر اکبر کلبلی: ۶۰

۳۳۳-۸۳۳؛ دیوان شاگر ناجی: ۲۲۴؛ پڑا

(ایضاً: ۵۹)؛ مجموعہ ثنویات میر حسن: ۱۴۹-۱۵۰

۱۲۰ کلیات انشا: ۱۸۵ ۱۱۹ دیوان مصفیٰ، ۶: ۴۵۲

دلِ عاشق کباب اور خط پر پہنے کی پٹیری وہ

۱۲۲ بنا ہے اب مزے کی مافری وہ نان بائی کا

خاگینا

اڈے اور پیاز میں مسالہ ملا کر اسے بھجونا جاتا تھا۔ اسے خاگینا کہتے تھے،

۱۲۳ نہ دھڑی جوڑ خاگینا پکا یا کہ ہے مرغی کا کام اڈے کو سینا

تہوہ نوشی

اٹھارویں صدی میں تہوہ نوشی کا عام رواج تھا۔ تقریباً تیس کے موقعوں پر پان کی طرح تہوہ سے بھی مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ حاتم نے تہوہ پر ایک شبنوی لکھی ہے،

انہیں روح و جان و راحتِ دل جلیسِ بزم و رونقِ بخشِ محفل

برائے حرمت افزائے تواضع تواضع اس کی ہے جائے تواضع

سجوں کے ہاتھ مجلس میں پیالہ چمن سا کھل رہا یکدست لالہ

جہاں دیکھو، تہاں ہر آن تہوہ ہے بزمِ عیش کا سامان تہوہ

قبولِ بارگاہِ بادشاہان شکوہ دست صاحبِ دستگاہان

جہاں میں زندگی، حاتمِ اودوم ہے ادھر تہوہ، اُدھر حلقے کا دم ہے

ہے سب زنجیوں میں تہوہ کا عجیب کبھی ملاؤ اس گنگا ہے شیرنگ

مجھے ہر دن یہ چاروں جام بس ہیں دو پیالہ صبح اور دو پیالہ شام بس ہیں

نہیں ہوتا بجز اشرف کے یار رہے ہے صحبتِ پاجی سے بزار

ضالی ہند کے بازاروں میں تہوہ کی دکانیں ہوتی تھیں۔ فیض آباد کے بازار کا ذکر کرتے ہوئے میر حسن نے لکھا ہے،

۱۲۳ ایضاً: ۳۲۶

۱۲۳ دیوانِ شاکر ناجی: ۵۹

۱۲۴ مجموعہ شبنویات میر حسن: ۱۵۱

۱۲۴ دیوانِ زار: ۳۷۸-۳۷۹

جہاں تھوہ سچا درد پیارا ڈھن بساطی بیٹھے ہیں نیچے دکان چن
ذکر میر کے آخر میں میر نے لکھنؤ میں دارن ہسٹنلز گورنر جنرل کی دعوت کا ذکر کیا ہے۔
میں اس عہد کے کھانوں کے نام گنا تے ہیں۔ اس زمانے میں ایسی کتابیں بھی تالیف ہو
ہیں، جن میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں درج تھیں۔ ایسی ایک کتاب "خوان نعمت"
فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے انیسویں صدی کے شروع میں چھپی تھی۔ اس میں پختہ چوتہ
متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔

دھویوں کا پیشہ

دھوئی ناندیں کپڑے ڈال کر دھوتے تھے، اور دریا پر دھویوں کے مخصوص گھاٹ تھے
جو دھوئی گھاٹ کہلاتے تھے۔ وہ وہاں کپڑے دھوتے تھے۔ انٹانے ذیل کے اشعار
میں دھویوں کا ذکر کیا ہے:

ع جو گھر سے گاؤں سپردہ کپڑوں کو ناندھ میں سوندھ ساندھ نکلا

نہ سطر دیں کی کسی نے سنی تو وہ ناچار

شروع دھویوں کی طرح کھنڈ کرتے ہیں

آپ کے گاہن کی کیا تعریف کیجے واہ واہ!

کوئی دھوئی گھاٹ پر جس روپ کا ناہوتہ کھنڈ

مردوں سے متعلق رسومات

بہتم مسلم افراد کے ہاں کسی شخص کی وفات کے موقع پر تیسرے دن تیجا، دسویں دن دہم، اور
چالیسویں دن چہلم کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اردو شاعری میں ان رسموں کا ذکر ملتا ہے:
سودا، کہیں بیاہ کا دیکھا ہے معمول کہ شہر کی چوکنی کو تیجے کے ہوں پھول

۱۲۶ کلیات، اشعار: ۱۸، ۱۰۳، ۱۹۴

۱۲۷ کلیات، سودا، ۲، ۲۲۰، ۱۸۰

اردو ادب کا سماجی پس منظر

شاگرد ناچی، ۳۸

چہری سیں ناز کی تو کس کو سہل کر دیا ہے

نہ پڑھیے فاتحہ کیرنگ عاشق کا یہ تھا ہے

ظفر، ۱۳۹ نہ ہونے پایا چہلم بھی شہید ناز کا تیرے

ستمگر! آفرین کہیے تیرے مہندی لگانے پر

عام طور پر مزاروں پر گل اور مہندی چڑھانے جاتے تھے۔

مصطفیٰ میرے مزار پر رکھ دیکھو گل دہندی

کہ میں شہید ہوں اس بے خبر معنائی کا

بھول چڑھانے دے لائے گو فریاں پرالا

کشتہ ناز نہاں کی تیرے، تبر فرشتے بھول گئے

نظیر اکبر آبادی،

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھ پر کر سوار

کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں، اور تھے ہی نذر سب آدمی ہی کرتے ہیں سوئے کا گاہ

اردو جو مر گیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

رنڈ سالہ

بیہ عورتوں کو ایک خاص قسم کا لباس پہنایا جاتا ہے جو ہندوستانی زبان میں رنڈ سالہ کہلاتا تھا۔

مصطفیٰ، ۱۳۲ رنڈ سالہ لائے اس کو شب عقد کی صبح

سامان یہ ہو حسین کی دختر کے واسطے

عطا چادر اور مے لگی بیٹی سیں نواے

۱۳۶-
سودا:

۱۳۹ دیوان ظفر، ۱: ۱۱۶

۱۳۸ دیوان شاگرد ناچی، ۲: ۲۱۵

۶۸۵ کلیات نظیر اکبر آبادی، ۱: ۱۳۱

۱۳۸ دیوان مصطفیٰ، ۲: ۱۵۱ (الف)، ایضاً، ۶: ۲۲۳

۱۳۳ کلیات سودا، ۲: ۱۹

۱۳۲ دیوان مصطفیٰ، ۶: ۵۴۳

رسم و رواج

ہر ملک کا ادب اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اردو ادب میں بھی پیدائش، شادی بیاہ، موت وغیرہ سے متعلق رسوم کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہاں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اردو ادب کس حد تک اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔

ولادت

اگر بادشاہوں اور امیروں کے ہاں بچے کی ولادت کی امید ہوتی، تو رٹالوں اور نجومیوں کو بلا کر ولادت کے لیے وقت بہ سعید دریافت کیا جاتا۔ اگر ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا، تو نقارہ اور دوسرے موسیقے کے ساز بجا کر با توپ داغ کر اعلان کیا جاتا، غزب اور دیہاتیوں کے ہاں اس موقع پر تبا کی نقالی استعمال کی جاتی تھی۔ میر حسن دہلوی نے ایک بادشاہ کے ہاں تولد پر کے اعلیٰ کایوں ذکر کیا ہے:

بلا تے ہیں ہم اہل تنجیم کو نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھو
نئی تو دی شاہ کو اس نمط دے اہل تنجیم کو بھیجے خط
نجومی در تال اور برہمن غرض یاد تھا جن کو اس طعص کا فن

میر حسن نے رٹالوں اور نجومیوں کے فن اختر شناسی اور طالع شناسی کی تفصیل لکھی ہے اور اس فن کی اصطلاحوں کو بیان کیا ہے:

یہ سن کر وہ رٹال طالع شناس لگے کھینچنے زائچے بے قیاس
دوسری تختی آگے لیا قوسہ ہاتھ لگا دھبہ ن اولاد کا اس کے ماتھ
جو پھینکیں، تو شکلیں کئی بیٹھیں مل کئی شکل سے دل گیا ان کا کھل
بیاض اپنی دیکھی جو اس رٹل کی تو ایک ایک نقطہ ہے فرد خوشی
ننہ زود ج کی شکل میں ہے فرح پیا کرے وصل کا تو قدح
نجومی بھی کہنے لگے در جواب کہ ہم نے بھی دیکھی ہے اپنی کتاب
نخوست کے دن سب گئے ہیں نکل عمل اپنا سب کر چکا ہے رٹل

ادب کا سماجی منظر

ستارے نے طالع نے بدلے ہیں طور
نظر کی جو تسدیس و تثلیث پر
کیا پنڈتوں نے جو اپنا بھار
جسم پتراشاہ کا دیکھ کر
کہارام جی کی ہے تجھ پر دیا
مہاراج کے ہونگے مقصد شتاب
نصیبوں نے کی آپ کے یادری
مقرر ترے جا ہیے ہو پسر
لد پسر کی خوشیاں

کردن نعمت تہنیت کو شروع
گئے نو مہینے جب اس پر گند
خواصوں نے خواجہ سراؤں نے جا
مبارک تجھے اے خیر نیک جنت
نقیبوں کو بلوا کے یہ کہہ دیا
کہ نوبت خوشی کی بجا دیں تمام
یہ خزدہ جو پہونچا تو نقاچی
بناٹھاٹھ نقار خانے کا سب
غلاف ان پر بانات کے ٹانگ
بجے شادیلے جو داں اس گھڑی
بہم مل کے بیٹھے جو شہنشاہ نواز
لگے لینے ادب میں خوشی سے نئی
گھوڑوں میں نوبت کی خہنک میں
ترمئی اور قرآنے شادی کے دم

خوشی کا کوئی دم میں آتا ہے دود
تو دیکھا کہ ہے نیک سب کی نظر
تو کچھ انگلیوں پر کیا پھر شمار
تلا اور بر چہک پر کر نظر
چند رماں بنا باک ترے ہو گیا
کہ آیا ہے اب پانچویں آفتاب
کہ آئی ہے اب ساتویں مشتری
کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی غیر

کہ اک نیک اختر کرے ہے طلوع
تو لد ہوا شہ کے گھر میں پسر
کئی نذریں گذرانیاں اوکھا
کہ پیدا ہوا دار سیف تاج و تخت
کہ نقار خانے میں دد حکم جا
خبر سن کے یہ شاد ہوں خاص عام
لگا ہر جگہ باد لہ اور زری
مہیا کر اسباب پیش و طرب
شتابی سے نقاروں کو نیک ملگ
ہوئی گرد و پیش آکے خلقت گھڑی
بنا منہ سے پھر کی گھا اس پر ساز
اڑانا گھا بجنہ اور گھڑی
گھر سننے والوں کو کہتی تھی سن
لگے بھرنے زین اند کمرج میں بجم

بھائی اور بھگتیوں کا قصہ و سرود

کیا بھائی اور بھگتیوں نے بھوم
ہوئی آہے آہے مبارک کی دھوم
لگا کچنی چونہ میزنی تمام
کہاں تک میں لوں نزل کا رول کنا
جہاں تک کہ سازندے تھے سازکے
دھنی دست کے اور آواز کے
جہاں تک کہ تھے گانک اور بھکار
گمے گانے اور ناچنے ایک بار
زرد نثار کرنا

دیے شاہ نے شاہزادوں کے ناؤں
مٹایں کو اور پیرزادوں کو گاؤں
خواصوں کو، فوجوں کو جوڑے دیے
پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیے
خوشی میں کیا یاں تلک زرد نثار
جسے ایک دیا تھا، بکسے ہزار
چھٹی

دلالت کے چھٹے دن چھٹی کی رسم ادا ہوتی تھی۔ میر حسن دہلوی کا بیان ہے:
چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات
کہ دن عید اور رات تھی شب بربات
معنی: محل میں ہوئی جو چھٹی کی خوشی
لب بام پر کو س مندرست بجا
جواہر طرب تھے سو آئے تمام
ہر ایک نے جدا اپنا مجھ کیا
اظہار بہت سادہاں سیم وند
جو معمول تھا، وہ سجدوں کو ملنا
۱۳۶

چھوچھک

نمود کے لیے جو سامان تخیال ہے آتا تھا، وہ چھوچھک کہلاتا تھا۔ اس میں کپڑوں کے علاوہ گچ
اور چادل کی بودیاں بھی ہوتی تھیں۔ شاہ عالم ثانی نے اس رسم کا ذکر کیا ہے:

نندیمیں ہیکم جان کے نالی اور نا نا جیا پلائے
جان چھٹی، مل چادسوں کچھڑی نوبت چاہی اوتلائے
۱۳۸

۱۳۵ مجموعہ مستثنیات: ۲۰-۲۶، نیز نادرات شاہی۔ منگل چاگنا: ۹۵-۹۷، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲

گھٹی

شریت ہے مجھ زہر غم جو کہ میری گھٹی جو بنی روز تولد، سودہ رسم سے ۱۳۹
زچہ کوتارا دکھانا

شاہ عالم ثانی نے اس رسم کا یوں ذکر کیا ہے:

مادت منگل چار گنی مل ناخی نکمین دھن وار دیو ہے

دادی، پھوپھی خوشحال پھریں من انگ سہات نہ پھول گیو ہے

تارے دکھائے کے لیت بلائیں، سو مند رتج بنو دیو ہے

۱۴۰ اکبر شاہ کے نند بھیس، سب کے گھر بیچ آنت بھیسو ہے

بہادر شاہ ظفر کے محل میں شہزادے کی ولادت کے موقع پر مرگ دہرن، اپنے کی رسم کا شاہ نے غیر نے ذکر کیا ہے:

دہیں پھر شاہ نے یہ رسم کی داں چہر کھٹ پر قدم رکھ، جو کے شاداں

اداکر جسو: باسم اللہ مارا کمان دتیر لے کر مرگ مارا

نمودار اس طرح تھا سقف میں تیر فلک پر کہکشاں کی جیسے تھو ۱۴۱

ساگرہ یا برس گانٹھ

برس گانٹھ جس ساں، من کا ہوتی دل بٹکان کی گرہ کھل گئی ۱۴۲

ہر سال بادشاہوں، نوابوں اور امیروں کی ساگرہ کا جشن منایا جاتا تھا اور درباری شعرا تہنیت نامے پیش کرتے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ کی ساگرہ کے جشن پر انشائیہ ایک تہنیت نامہ لکھا تھا، جس کا پہلا شعر تھا:

مجلس آراستہ ہے ساگرہ کی اکس کے

۱۴۳ جس کی ہر لحظہ دعا دینے میں ہے سب کوٹ

۱۴۰ نادر شاہی: ۱۱۲

۱۳۹ کلیات: خودا، ۱۸۵

۱۴۲ مجموعہ فتویات میر حسن: ۲۶

۱۴۱ رسوم دہلی: ۵۸

۱۴۳ کلیات انشائیہ: ۲۷۹؛ نادر شاہی: ۱۱۰، ۱۰۵؛ تعابیر و ذوق: ۸۹-۹۳

نواب شجاع الدولہ کی سالگرہ پر سودا نے یہ قطعہ لکھا تھا:

رہے ملک پر درخشندگی میں تا مینزل ہر ایک سالگرہ میں تو موتیوں سے ملے
گنہگار ہے جواب اقبال و بخت میں تیرے الہی تا بدیم حشر یہ گرہ نہ کھیلے
عروج ہو تیرے اعدا کا یوں تنزل میں کہ جسے مہر کی تابش سے کو قاف گھیلے
اس موقع کے ایک دوسرے قطعے کا آغاز ہے: ۱۳۴

بیشمار تیرے عمر سال، عالم کے عروج و دہر کی چاہ ہے بال بال گرہ
سودا نے نواب، احمد خان، والی ذریع آباد، اور نواب، اصمت الدولہ کی سالگرہوں کے موقع پر
بہمیں تیرے لکھے تھے۔ ۱۳۵

بچے کی ابتدائی پرورش

ڈیڑھ سال کی عمر تک بچے کو پالنے میں سٹالیا جاتا تھا۔ یہ پالنا چھوچھک میں ننھیاں سے آتا تھا۔
بیگم جان کے پتر بھمبر، سن سودا سے گود کھلاوت نانا

۱۳۶
لورنی سے، چرم، جھلاوت پالنا، نانی جیسے بڑی لکھ مانا

دودھ بڑھانا

بچے غالباً ماں کا دودھ پارسال کی عمر تک پیتے تھے۔ اس کے بعد رضاعت کا ناز ختم کر دیا جاتا تھا:
وکل جب کہ چہ تھے برس میں لگا بڑھایا گیا دودھ اس ماہ کا ۱۳۷
اس موقع پر چشن منایا جاتا تھا:

ہوئی تھی جو کچھ پہنے شادی کی رسوم اسی طرح سے پھر ہوا داں ہجوم
طوائف دہی اور دہی راگ درنگ ہوئی بلکہ دونی خوشی کی کی ترنگ ۱۳۸

۱۳۴ کلیات سودا، ۱۲، ۵-۶

۱۳۵ ایضاً: ۶: حوالوں کے لیے دیکھیے۔ نادر ایٹ شامی: ۱۱۰، ۱۰۴، ۱۰۲، ۹۲، ۱۱۹

۱۳۶ نادر ایٹ شامی: ۶۵، ۱۱۳، ۱۱۶ نیز کلیات نظیر: ۴۳

جی بھلائے، مہر پرچانے، ادب کھلونے مگراتے ہر کن جھلاتے پالنے میں، وہ ایسے سودا و جیسے پھلاتے

۱۳۷ بمسودہ شہنویات: ۲۷
۱۳۸ ایضاً

بسم اللہ خوانی

جب بچے کی تعلیم کی ابتدا ہوتی تھی تو اس موقع پر خوشیاں سنائی جاتی تھیں اور کچھ رسوم بھی ادا ہوتی تھیں جو خالص ہندوستانی تھیں۔ شادی بیاہ کی طرح موقع پر بھی بچے کے مہندی لگائی جاتی تھی۔ نیا جوتا زیب تن کیا جاتا، سر پر سہرا باندھتے، گلے میں بدھی ڈالتے، کان کے پاس گوشوارہ یا طرہ لٹکاتے، اور اسے دھوا بنا تے، نوبت، بکیتی اور ساعتیں معید بین بسم اللہ خوانی کی رسم ادا ہوتی۔

آج مہندی لگاؤ کو اکبر شاہ پسرارہ لایو

۱۴۹
اتھیں رنگیلی مہندی بسم اللہ کی جینا بیکم لکھو پڑاؤ

برن برن کی آرائش بنائے لئے مرزا نوبت دھر

۱۵۰
آج مہندی بسم اللہ کی صبح ساعت کی یکم جاگ لکھو

رتجگہ

ہندوستانی سوتیلیں خوشی کی تقریروں میں رات بھر جانتیں اور مختلف رسمیں ادا کرتی تھیں۔ رتجگہ کے پانچ موقعے تھے۔ چھٹی، دودھ چھڑائی، ساگرہ، بسم اللہ خوانی اور بیاہ۔ شاہ عام شانی نے اکبر شاہانہ کی ساگرہ کے موقع پر رتجگہ کا ذکر یوں کیا ہے:

گادت منگل چار سبے تید، آپس میں مل رات جگائی

باجت تال، چھپنگ، کچھا و ج، گائے گنی نوچھا و ملائی

ناکھوں سال ہلاں ہلاں سوں، راج کر دیکھوں سکھائی

۱۵۱
اکبر شاہ کی ساگرہ، شاہ عالم کو سب دیت بدھائی

نیا زکری سب پیروں کی، اب جی کی مراد سب بھرائی

۱۵۲
فرنا ری مل ہاس ہلاں سوں، اللہ دیاں کی رتجگائی

۱۵۳
تمام اہل محلہ ہیں بے خور و بیخواب
یرتجگہ تو نہیں، کب تلک جگا دیگا

۱۴۹ ناد مات شاہی، ۱۵۱ ۱۵۰ ایضاً: ۱۱۰

۱۵۱ ناد مات شاہی، ۱۵۲ ۱۵۱ ایضاً: ۱۱۹

۱۵۳ اردوئے معلیٰ (سند نمبر) ۱۱۸۱؛ نیز کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۴۱

رتجگا یا صحنک

ظفر: رات کو سو رتجگا دن کو پروصنک ہم شہا
دھوم یہ خام و سحر آج بھی ہلکلی ہی ہو
باعث صحت تیری روز ہے دن عید کا
کیوں کر خوش ہو لہذا آج بھی ہلکلی ہی ہو
گھر میں مہیا تیرے اندر پے نذر و نیاز
لعل دگرہم وزر، آج بھی ہو، کل بھی ہو

شادی کی رسمیں

شادی کی رسموں میں سب سے پہلی رسم سنگتی کی ہوتی تھی۔ سود نے اپنے مرثیوں میں حضرت قاسم کے بیان میں شادی بیاہ کی رسموں کو ذکر کیا ہے،

غرض: ردتہ، سنگتی، فاشان اس مشہ کو آیا تھا

رشتہ کی تلاش

کئی جوانی وہ بوڑھیاں تھیں، جسودا جی نے انھیں بلایا
کسی کو ایدھر کسی کو اودھر، سگائی ڈھونڈھن کہیں پہنچا

جو بھیہ تھا اپنے من کے بھیر سوان سبھوں کے میں جتایا

ہندوؤں کے بر خلاف مسلمانوں میں رشتے کا پیغام لڑکے والے بھیجتے تھے۔

لڑکے کو دیکھنے رسم

نقل ہے ایک شخص کی نسبت

رسم ہے دیکھنے کی، اے یارو! ہر جگہ ہیں بولاتے دولہا کو

سگائی

ٹھہراؤ سگائی گور کی سبھ ساعت سے تم اس کے گھر

۱۵۶ کلیات سودا، ۲: ۱۶۰

۱۵۵ دیوان ظفر، ۳: ۱۱۱

۱۵۷ کلیات ظفر، ۲: ۷۸۱

۱۵۸ مجموعہ شعور، ۱: ۱۱۲ رجبیہ، بینظیر کا مسعود شاہ کو خواستگاری میں بدھنیر کے۔ اور جو

۱۵۹ دیوان مہجور، ۱۵

۱۱۹-۱۲۱

۱۶۰ کلیات ظفر، ۲: ۷۸۱

اردو ادب کا سماجی پس منظر

مگائی کے بعد شادی کا مرحلہ آتا تھا۔ اس کی متعدد درمیں تھیں۔ ان میں مختلف خطوں اور طبقوں کے لحاظ سے کچھ اختلاف بھی تھا، لیکن زیادہ اہم مندرجہ ذیل تھیں:

شادی کی لگن دھرنا

جب طرفین تیار کر لیتے، تو شادی کی تاریخ مقرر کی جاتی، یہ لگن دھرنا کہلاتی تھی:

دھرنا لگن اس بیاہ کا زہن سار نہ مانوں

کردار فلک میں نہ سمجھتا ہوں تو جانوں

گرداس کے کھڑے پیٹے ہیں سب سینہ دزانوں

بھڑاس دھرا خون کا ہے نام لگن دھرنا^{۱۶۱}

اس دن لڑکی والے ایک تھال میں کچھ اشیاء کے ساتھ لڑکے والوں کے ہاں ایک پیلا رقعہ بھیجتے تھے جس میں نکاح کی تاریخ لکھی ہوتی تھی۔^{۱۶۲}

تب راجہ نے ہر پنڈت سے داں لگن مہورت کی پوچھی

سب جو ۷۰ ماہ پہننے کی سبھ ساعت ہے اور نیک گھڑی

۱۰۔ ٹھہرا بیاہنے کا، سبھ ساعت شادی لگن دھری

تب راجہ نے شیوشنکر کو اس بات کی پٹری لکھ بھیجی^{۱۶۳}

اک اچھی سی تاریخ ٹھہرا اپنے دیا حکم ہم نے تمہیں آئیے

ملا شگنیوں کو پتا سال دسن مقرر کیا نیک ساعت کا دن

نظر بیتاب ہو جب شمعرو میں نہبت اٹھ جائے

۱۳۔ کر جیل جاتے ہیں مشاطے لگن کو: بات پھیرے پر^{۱۶۴}

۱۶۱ کلیات سودا ۱۳۳۱، نیز دیکھیے: ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴

کنگن

دولہا کے ہاتھ میں کنگن باندھا جاتا تھا،

باندھا کنگن تیرے سسکھ کرنے کو کیا میں جانے تھی کہ یوں بھینچا گیا سا
شاخ گل پہنے کلائی میں کئی کاکنگنا زرد جوڑے پہ بست اپنا دکھا کے

ماترو بٹھانا

کوئی دولہن، چھٹ اس دولہن کے، تعقل نے لاکنگن کی رات

ماتروں بدلے دولہا کے ماتم میں لا بٹھلائی ہے

ساجتی

کاٹا ہوا وہ سربقا جو ساجتی کا جتاوا گردن کا خط زخم تھاٹکے کا کلاوا

دولہن نے بیسے آستین دولہائی چڑھاوا ساجتی کا یہ دستور ہے کہ کس کے وطن

مستسرا میں کس کی آئی یہ ساجتی کہ رات کو

جھک جھک پڑی خوشی سے ہر یک گام میں کی مشا

سوفے کے تھے درخت نئے لاکھوں ان کے ساتھ

گوٹوں کے پھل تھے تاروں کے پھول، اور کرن کی مشا

منہدی

جو خزان کردولہن کے لیے منہدی کا آیا

تھا خسرو خسرو پرہ کاخوں اس میں جہا

دولہا کا لہو ہاتھوں میں دولہن نے لگایا

یہ رنگ ہے شادی میں زمانے کے چلج

۱۶۶ کلیات سودا، ۱۲، ۱۶۵

۱۶۵ قصائد نذوق، ۶۹

۱۶۷ ایضاً، ۲، ۱۴۴، ۱۶۰، ۲۱۹؛ نیز دیکھیے نادران شاہی، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۲، ۲۰۴

۱۶۸ کلیات انشا، ۴۵؛ نیز دیکھیے قصائد نذوق مرتبہ سرسلیمان، لکھنؤ ۱۹۳۴، ۴۴

۱۶۹ کلیات سودا، ۲، ۱۴۴، ۱۶۵، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۸۴، ۲۰۸، ۲۱۹، ۲۶۲

آج مہندی سرزرا اکبر شاہ پیارے بنے کی، دیکھ کیسی نیکی بن آئی
اچھی جگہ لگات روشتائی رنگا رنگ کی، سب گئی گائے بجائے دیت بدھائی

نوشہ کے مہندی رچانا اور دان دینا۔

راے ری مائی اگائے بجائے اندیسوں رجھاؤ

اکبر شاہ کی مہندی انیک جتن سوں رچاؤ

لے ری سکھی، چلو مہندی دیکھنے پیارے بننے کی انوشی

سب گئی مل دیو بیاہک دان پا بھر سوٹھی دان، پا بھر موٹھی

شہناگانا

سر وقت دو بھاگے ہاتھوں میں مہندی رچائی جاتی تھی، ڈومیاں جو گیت گایا کرتی تھیں، وہ شہنا
بھلاتا تھا۔

سہلے یہ ڈومیاں گاتی ہیں لے کر جب دھول

شیخ جی بات بھی سمجھتے ہو کچھ اُن سہلوں کے بتل

برات

برات کی رونانگی سے قبل دو لہا کو نہلا دھلا کر، بری کے کپڑے زیب تن کر کے، زیورات پہنا کر، کئی
رسیں ادا کی جاتی تھیں، جن کا ذکر پہلے مفصل کیا جا چکا ہے مثلاً منڈوے کے تلے دو لہا کو نہلاتا، تیل
چڑھانا کنگن باندھنا، زرد رنگ کا لباس پہنانا، سہرا باندھنا، گلے میں بارگجرے ڈالنا، کاندھے پر

۱۴۰ تاوڑات شاہی ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴

شال ڈالتا، اور زیورات وغیرہ پہناتا نظیر اکبر آبادی نے ایک دولہا کا علیہ ان اشعار میں بیان کیا ہے

اس وقت خوشی سے مندر پر شیو بیٹھے بن کریں دولہا
کچھ پان کلالی، مہندی اور آنکھوں نیچے لگا کھسرا

ہر تار چمکتا چیرے کا اور تار سنہرے کا باگلا

اس تار زری کے چیرے پر جوں مہر چمکتا ٹکٹ دھرا

ہر کان مریض کنڈن تھے اور نگہ پر سونے کا سہرا

وہ سہرا کچھ پریوں چمکے جوں سورج ہو دے کرن بھرا

وہ موتی ملے گلے جھلکیں اور ان میں لعلوں کی مالا

وہ بانگ جڑاؤ بازو پہاڑ اور کنگنا پہنچے جھمک رہا

جب بیٹھے شیویوں دولہا بن، تب پریوں کا داں نلچ ہوا

وہ سرنا سرنا، بھانجی بچے، نقارے گونجے، شور مچا

ہرات کا منظر

تیرا ہوتی، تب شیو شکر خوشوقتی سے سوار ہوئے

سب آگے پیچھے دولہا کے دلشا دہراتی ساتھ چلے

فانوسیں رنگین، جھلکیاں اور جھانڈ بڑی دکات کے

ہر آن جٹاؤ چنور ڈھلیں اور سیس کے اوپر چتر پرے

وہ پریاں ناچیں تختوں پر، پوشاکیں، کہنے، جھمک رہے

نقارے، نوبت، طبل، نشان، الفونے بجتے، اور ڈھل

(بقیہ صفحہ ۷۸) کس لایہ بیاہ تھا، جو موتیوں کے سہرو کی ایک تنگ جھڑتی ہے، دامان سحر سے ڈھلا

۱۳۵۷ء دیوان شاہ گان ۲۲۰، ۲۵۵؛ دیوان آبرو ۱۹۷؛ تذکرۂ خدق ۵۰، ۱۳۷

۱۷۷ کلیات سودا ۲۶، ۱۶۶؛ دیوان شاہ گان ۸۵، ۸۶

۱۷۸ کلیات سودا ۱۲، ۵۲۶

۱۷۹ کلیات ہدایت ۳۲۳؛ دیوان شاہ گان ۸۵؛ کلیات نظیر اکبر آبادی ۹۲، ۹۰، ۹۱

اردو ادب کا سماجی پس منظر

ہر عزائیں دُھن میں ہیں کی، اور کرنا ترنی جہاں بھر بڑے
 کر دھوئے دھوئے دھوئے باج رہے اندیشے بکتے کر کر پڑے
 مردنگ، مندیے تال بکین اور سارے گھنگھرو بھی جھنکے
 وہ ڈھول دھما دھم شور کریں، اور جھپٹے بھی جمع جمع کرتے
 وہ جھاڑو مشعلیں، پختا خانے، سب روشن اونچے شعلوں کے
 وہ صحرا جھمکا کو سوں تک اور ابرا جالی جا پہونچے
 وہ گھوڑے، میلنے، گھوڑ بھلیں، رتھ اونچے پیسے ڈھلتے تھے
 سب باجے بکتے جاتے تھے اور ہولے ہولے ملتے تھے
 جس آن برات آئی وہ پرہ خولی ٹھہری زیب بھری
 وہ پریاں ناچیں تختوں پر جھنکاریں مار جھینروں کی
 وہ ڈنکے لگتے دھوئے پر دھن کرنا سرنائی اونچی
 دردازے، کوٹھے، گونج رہے، آواز سہانی ان کی تھی
 کل زیب براتی چار طرف اور بیچ سواری دولہا کی
 سب چھتے چھتے کوٹھوں پر، داں دیکھیں زینت اور خوبی
 وہ آئی تھی جو ساتھ لدی اور آتش بازی تھی چمکتی
 مہتاب، انار اور پھل پھول ہوائی خوب کڑی
 اک پہر تلک دروازے پر داں پھول رہی پھولاری سی
 سب ہاتھی گھوڑے بیل اچھلیں غل خور ہوا اور دھوم مچی
 وہ طبل بکین اور ڈولے بھی نقارے، تاشے اور ترنی
 وہ دہل جھلی کے باج رہے اور گھر میں آواز گئی
 جب راجہ کے دروازے پر ہوئی آن برات اس لمحہ کھڑی
 سب باجے، ہاجے دیر تلک اور چھوٹی آتش بازی بھی

ارداب کا سماجی ہیمنظر

جب سمدھی آئے ملنے کو، اور سمدھلاوے کی ٹھہری
اس وقت بلایا دولہا کو تو ہو دے زیب مندی بھی
جب دولہا ڈیوڑھی پہن گئے، تہہ نکلیں سندھوچری
لے آئیں مندر میں دولہا کو، تو ہو دے زینت مندی بھی

براتیوں کا قیام پذیر ہونا

کچھ جنازے کے پیچھے گئے، کچھ جلیپے ڈالائوں میں
کچھ آنگن میں، کچھ بیٹک میں، کچھ بیٹھے بالائوں میں
کچھ آن پرچے ڈیوڑھی میں، مشغول خوشی کی باتوں میں
کچھ باہر آکر بیٹھ گئے، کچھ بیٹھے رختا درمیانوں میں
ہر ٹھوڑکیں کرنا مشرنا، اور ترنی طبل بھی محلوں میں
ہر جانب دھونے باج رہے، نقارے بجتے کوچوں میں
اور باجین نوہت، جھانچہ پڑی، اس شادی کی گونج میں
کچھ بات نہ سمجھ کان دھری، ان باجوں میں، ان دھونوں میں
کچھ میانے، رختا اور گھڑ بھلیں، لا آں کھڑکیں لہلیں
کچھ گھوڑے اچھے، بیل لڑے، کچھ باقی جھوٹے گلیوں میں
جب جگہ نہ پائی، تہی ہیں، کچھ توڑے شہر سوادوں میں
داں ڈیرے، تنبوتان لیے، اور بیٹھے خوش ان ڈیروں میں
وہ تھے داں جن میں طور اوہنڈ کل فرحت کے آہنگ چمکے
غل شور ہوئے، اور ناچ ہوئے، اور لگا ہوا دھونچکا
براتیوں کے لیے خورد و نوش کی اشیاء
جب راجہ نے حکم کیا، تیاری ہو اب بھوجن کی
مگاوا کے میدان لاکھوں میں، اور میرے دھری، اور ڈنگری

لہذا ادب کا سماجی پس منظر

ملوائی ہزاروں آبیٹے، کرگرم کڑھائے، رکھتے تھے
کرکھٹے سترے دودھ منگا اور ڈالی چینی شکر تری
پھر ڈالا خوب گلاب اس میں اور ڈالیں لڑیاں مٹی کی
انبار لگائے پیڑوں کے، اور ڈھیر گلابی ادھر برقی
پھر لڑو بھی تیار کیے، دے قند، ہفت بادام گری
براق مکد اور خرے بھی خوش رنگ امرتی، بیرلی
وہ خوب جلیبی اور کھجلی، وہ گھیور بالوسائی بھی
سب اتنے داں تیار ہوئے، جو ٹھور نہ رکھنے کو پائی

بھیرے

جب ساعت آئی پھیروں کو، تب ٹھہری اس جا یہ خوبی
گھر بیچ بلا یاد دلھا کو اور پھیروں کی تیاری کی
کچھ بیٹے لوگ ادھر ادھر سب اپنے من کے بیچ خوشی
جو فرشتہ مقرر ہے، اس پر آبیٹے دلھا دھن بھی
جب دلھا دھن مل بیٹھے، تب ریت ہوئی گڑ بڑکیا
وہ پنڈت آئے، ہدم کیا، سب لاکر اس کی چیرکھی
سب پنڈت بیٹھے بید پر عین، کوئی بیٹھا ڈالے شکر گھی
گنیش کی پوجا کر کے داں، پھر بلو جا کی نو گنہوں کی
پھر تھاں جو اہرننگ ملیں، لیں جلد سوا سی اور نیکی
اور لے لے نیگ دعائیں دیں، سب دلھا دلھی کو نیکی
سجدہ ساعت، نیک مہورت سے وہ دلھا دلھن کو بلو
اس طور سے پھر لے مل آپس میں، ہے ریت جو ہوتی پھیروں
جب پھیرے چار ہوئے اگر کل عیش و طرب کی دھواں
ہر چار طرف چمکی، جمبو، خوشحالی، خوبی، خوشوقتی

جہیز

بس آن ہوئے شیو چلنے کو، تب لا کر یہ اسباب دھوے
 پوشاکیں رنگین زیب بھریں، ہر تار پڑا جن کا بھلکے
 زریور کے داں ڈھیر لگے، جو باہر ہودے گنتی سے
 وہ موتی، ہیرے انمولے، وہ لعل، زمرد کے ڈبے
 وہ کسے نئے نئے چاندی کے، وہ تھال کٹڈے سونے کے
 وہ فرش سنہرے نقش بھرے، جو پختے مخلوں بچ پڑے
 وہ چیرے خوب لباسوں کے، اور گنتی میں بھی بہتیرے
 وہ چیریاں اچھی صورت کی، سر پاؤں تلک زیور بھرے
 وہ کجلی جھول جھلکتی کے، انباری جن پر اور ہودے
 وہ گھوڑے گلگوں مثل ہوا، زرد دھندلی جن پر زین بندھے
 چند دل جھلکتے وہ جن پر بات زری کے تھے ہر دے
 رتھ ہلیں اور گھڑ ہلیں وہ سب ٹاٹھ چلتے جن کے تیر
 وہ رنگین جمال دار تھیں وہ بیل بہت جن کے اونچے
 یہ ٹھاٹھ رکھا دروازے پہ اور بغدادی بوجھ اٹھانیکے
 تھے جتنے شادی بیاہ نعمت سامان جو داں تیار ہوئے
 ہر ٹھاٹھ کے داں دروازے پہ ہر جانب سوا بنا ہوئے

رخصتی

جب شیو نے داں یہ حکم کیا تیاری ہو اب چلنے کی
 اور آپ مندر کے سچ گئے تو ہودے بد اوں دولہن کی
 یہ بات بد اکی سنتے ہی داں گور اکی ماں یوں بولی
 سب طور تم اس کے مالک ہو یہ چیری میں نے تم کو دی

امداد کا سماجی پس منظر

میں اس کا بہت ہی رکھیو خوشی مت میلا کیسی اس کا جی
یہ پیاری ہے من کی میرے اور روشنی میری آنکھوں کی
یوں کہہ بولی گویا سے مل مجھ سے میری پاربتی
جب گورا پیاری دوڑ گئے واں اپنی ماں کے آلیشی
واں ماں بھی روتی دیکھ اسے اور روئیں جتنی تھیں گھر کی
ماں دیکھ کے روتی گورا کو کر پیار بہت یوں کہتی تھی
تو آنکھیں رو رہی لال نہ کر میں تیرے مکھ کی بلہاری
کچھ اپنے من کے بچا نہ لائیں تجھ کو جلد بلاؤں گی
پھر آخرواں اس روتی کو کر پیار بہت سا گھڑی گھڑی
چنڈول منگا کر ڈیوڑھی پر واں سب نے روتی بٹھلائی
سچ پوچھو تو ماں باپ کے تئیں ہے بیٹی سے یار پیار بہت
جس وقت وہ بیاہی جاتی ہے جب ہوتے ہیں لاچار بہت

پسی برات

جب ڈیوڑھی سے چنڈول اٹھا دوڑا نہ ہر سو خوشی سے
نوجواں اتنی ک اسپر کل موقی پھول زری بکھرے
سواری دو لہا کی آگے چنڈول دو لہن کا تھا پیچھے
وہ باجے لائے ساتھ جو تھے سب ہر دم پیچھے ساتھ چلے
اسباب دیے جو راجہ نے تھے اس کے جلتے اونٹ لدے
وہ جتنے حیرا چیری تھے سب رتھ اور میاؤں میں بیٹھے
وہ ہاتھی گھوڑے ہر جانب انباری زین جھکتے تھے
اس دیس کے رہنے والے بھی سب دیکھنے نکلے گھر گھر سے
ہر کوٹھے کوٹھے بھیڑ لگی اند سے رستے لوگ بھرے
غل شہر خوشی کا چار طرف سب دیکھیں واں وہ تھا شہر

جہیز

بس آن ہوئے شیو چلنے کو، تب لا کر یہ اسباب دھرے
 پوشاکیں رنگین زیب بھریں، ہر تار پڑا جن کا بھلے
 زرد زور کے داں ڈھیر لگے، جو باہر چھوڑے گنتی سے
 وہ موتی، ہیرے انمولے، وہ لعل، زمرہ کے ڈبے
 وہ کسے نئے نئے چاندی کے، وہ تھال کٹھنے سونے کے
 وہ فرش سنہرے نقش بھرے، جو بچتے بچوں بیچ پڑے
 وہ چیرے خوب لباسوں کے، ادھر گنتی میں بھی بہتیرے
 وہ چیریاں اچھی صورت کی، سر پاؤں تلک زیور بھرے
 وہ کبجلی جھول جھلکتی کے، انباری جن پر اوپر ہو دے
 وہ گھوڑے گلگوں مثل ہوا، زرد دوزی جن پر زین بندھے
 چنڈول جھلکتے وہ جن پر بانٹ زری کے تھے پردے
 رتھ بھینس اور گھڑ بھلیں وہ سب ٹاٹھ چکتے جن کے تھے
 وہ رنگین جمال دار رتھیں وہ بیل بہت جن کے اونچے
 یہ ٹھاٹھ رکھا دروازے پہا اور بخاری بوجھ اٹھانیکے
 تھے جتنے شادی بیاہ نمت سامان جو داں تیار ہوئے
 ہر ٹھاٹھ کے داں دروازے پر ہر جانب سوا بنا ہوئے

رخصتی

جب شیو نے داں یہ حکم کیا تیاری ہو اب چلنے کی
 اور آپ مندر کے بیچ گئے تو چھوڑے بد اوں دولہن کی
 یہ بات بد کی سنتے ہی داں گور کی ماں یوں بولی
 سب طور تم اس کے مالک ہو یہ چیری میرے تم کوئی

اور وہاں کا سماجی پس منظر

میں اس کا بہت ہی رکھیہ خوشی مت میلا کیونکہ اس کا جی
یہ پیادہ ہے من کی میرے اور روشنی میری آنکھوں کی
یوں کہکر بولی گویا سے مل مجھ سے میری پار تہی
جب گورا پیاری دوڑ گئے وہاں اپنی ماں کے آلیشی
وہاں ماں بھی روتی دیکھ اسے اور روئیں جتنی تھیں گھر کی
ماں دیکھ کے روتی گویا کو کر پیار بہت یوں کہتی تھی
تو آنکھیں رو رو لال نہ کر میں تیرے مکھ کی بلہاری
کچھ اپنے من کے بیچ نہ لائیں تب کو جلد بلاؤں گی
پھر آخر وہاں اس روتی کو کر پیار بہت سا گھڑی گھڑی
چنڈول منڈا کر ڈیوڑھی پر وہاں سب نے روتی بٹھلائی
بچ پوچھو تو ماں باپ کے نہیں ہے بیٹی سے یا پیار بہت
جس وقت وہ بیاہی جاتی ہے جب ہوتے ہیں لہا بہت

والیسی برات

جب ڈیوڑھی سے چنڈول اٹھا دوڑے پر سو خوشی سے
نوجوانوں کی اس پر کل موتی پھول زری بکھرے
سواری دو لہا کی آگے چنڈول دو لہن کا تھا پیچھے
وہ باجے لائے ساتھ جو تھے سب ہر دم پیچھے ساتھ چلے
اسباب دیے جو راجہ نے تھے اس کے جلتے اونٹ لدے
وہ جتنے چیرا جیری تھے سب رتھ اور میاںوں میں بیٹھے
وہ ہاتھی گھوڑے ہر جانب انباری زین جھکتے تھے
اس دیس کے رہنے والے بھی سب دیکھنے نکلے گھر گھر سے
ہر کوٹھے کو ٹھے بھڑنگی اندر سے رستے لوگ بھرے
غل شہر خوشی کا چار طعن سب دیکھتا ہوا وہ تھا شہر

اردو ادب کا سماجی پس منظر

جس طرہ خوشی سے بہا ہنسنے کو شبیہ آئے گھر میں راجہ کے
 پھر ویسی ہی خوشوقتی سے کیلاش کے اوپر جا پہنچے
 برات کی روانگی سے قبل دولہا کو گھوڑی پر چڑھایا جاتا تھا۔ لہذا گھوڑی پر چڑھنا ایک محاورہ
 بن گیا۔ انشا کا بیان ہے:

پوتوں بھلنا تجھ، اور دودھوں نہانا ہونے عیب
 بیاہ ہو سونے کے سہرے سے، تیری عمر دراز
 گودے دولہا کے مگی ہاتھ دولہن جو گوری
 نقرے گھوڑے کے نصیبوں سے مل گھوڑی نور
 سری رام نے برات کی رات، سچ دھج اور رقص و سرود کا یوں ذکر کیا ہے:

رقصِ فنیہ گر انجاد و نوا و سرودِ مطربان خوش اما سرہ نقالے دل انجمنِ افشینا نو بہم سرود
 کو بہ نغمہ مبارکبادی سرور کیا۔ مدارات پان والہاچی و عطریات سے مشامِ ارباب
 محفلِ معطر ہوا۔ جلوسِ برات بہزادانِ خوری و انبساط ہوا۔ گلکاری کی ٹیٹیاں
 قطرِ درِ قطار، آرائشی گلدستوں پر بہار، تختِ رداں پر مسجینانِ رقص کناں
 سب سے آگے نوبت، نقارہ، نشانِ دور وید سرور چراغاں۔ روشن چوکی والی شہنائی
 میں مبارکبادی کی غزلیں سناتے آتش بازی منامی گلہاے رنگین آتش بازی کی
 دکھاتے جلتے تھے۔

میر تقی میر نے آصف الدولہ کی شادی کی برات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔^{۱۸۰}

۱۸۰ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ کلیاتِ نظیر کبر آبادی: ۷۷۸-۷۹۲؛ نیز دیکھیے مجموعہ مثنویات

میر حسن، ۱۲۷۔ دیوان شاہ کمال، ۸۶۴۔ معجم جواہر، ۳۹۱۔ الف، ۴۰۔ ب۔ تعبانہ و نذر

۷۰-۸۳ ۱۸۰ کلیاتِ انشا، ۱۹۵؛ کلیاتِ مسودہ، ۱۷۳-۳۷۳

۱۸۱ دقائقِ سری نام: ۱۸۰ دیکھیے کلیاتِ میر: ۷۸۰-۷۸۸۔ الف

کے لڑکے کی شادی کے موقع پر برات کے لیے دیکھیے دیوان شاہ کمال، ۸۶۴-۸۶۳؛

اور ہنظیر کی برات کے منظر کے لیے مجموعہ مثنویات: ۱۲۲-۱۲۳

رقص و سرود کی محفل

جودہ ریت وہ محفل میں گارنائے تو خوشحال خان کو دیوانہ بنائے
 سمان رقص کا ہے یہ اس کے بندھا دلِ معلق ہے ہو رہا مبتلا
 وہ اس طرح کی پہنچا پشواڑ ہے بڑھاتی جو سوناز و انداز ہے
 جو بار بجی ہر اس کی کیجے نظر تو ہے مارے کیڑوں سے بار کیتر
 پہن پایجا مر کے اس کے تلے جودیکھے تو قدموں سے جا سرے
 وہ دکھلائی دے جائے بنداز ہوسیاب ساں دیکھ دل بے قرار
 دوپٹا بنارس کا وہ ددڑ خا جو اوڑھے ہے اس پر عجیب ہنسیا
 کسی جا شجاعت خان اور ان کے باپ رہے ہے محمد خاں اور وہاں الپ
 سمان ان کے گانے کا ہے یہ بندھا مشائخ ہیں سب و جد میں جا کجا
 کہیں لوندے کھٹک کے ہیں گاریے اٹھا ہاتھ ہیں بھاؤ بتلا رہے^{۱۸۳}

دھنگا نا

شاہ عالم ثانی، دیکھن نکسین مہدی اکبر شاہ کی سب ناری بنی پر یاں
 سب بدمعن مل دو ار روک کھڑیں، لے ہاتھوں میں چڑیاں^{۱۸۴}

سودا: ریت و رسم میں دی جان بنے نے تس پر

دیکھنا اسن کو بتو کا نہ ملا بھر کے نظر

نیگ میں جا کے دھنگا گانے کے دینا اپنا

^{۱۸۵} یسے دالوں نے کہا خرم و شاداں ہو کر

انشاء: نو عروسان چین کا دیکھیے گا اغتلاط

^{۱۸۶} چل رہی ہیں خوب سی بھولوں کی چڑیاں باغ میں

۱۸۳ دیوان شاہ کمال: ۸۵۳-۸۵۵ ۱۸۴ نادرات شاہی: ۱۱۵

۱۸۵ کلیات سودا: ۲۶، ۱۶۵، ۱۹۸، ۳۶۳؛ گنج اسرار: ۲۱۰ (رب)

۱۸۶ کلیات انشا: ۱۰۶

تو مجھے کچھ نہ ہو معلوم مگر اتنا کچھ

چھڑی پھولوں کی کوئی جیسے کہ سمدھن مارے ۱۸۷

سمدھنوں کی آپس میں گالی گلوچ

میرمن دہلی، اترنے کی واں سمدھنوں کی بھین کھلیں پھول جیسے چمن درچمن

مکوں میں پنہا نا دہ ہنس ہنس کے ہا سٹاٹ وہ پھولوں کی چھٹلوں کی ما

دکھانا دہ بن بن کے اپنا بناؤ وہ آپس کی زمیں، وہ آپس کی ماؤ

تہا تھے، ہنسی، شہر و غل، تالیا سہانی سہانی نئی گالیوں

نظیر اکبر آبادی :- سمدھن کے موضوع پر نظیر نے پوری ایک نظم لکھی ہے۔ اس کے چند شعر دیکھیے:

کردن کس منہ سے، اے یارو! بیاں میں شان سمدھن کی

لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمدھن کی

کمر نازک، مشکتی چال، آنکھیں شہر، تن گورا

نظر چنیل، ادا اچیل، یہ ہے پہچان سمدھن کی

سنہری تاشن کا لہنگا، روپہلی گوٹ کی انگلیا

چمکتا حسن جو بن کا، جھمکتی آن سمدھن کی

ملائی ساٹم، سینہ معقنا، خوشنما ساقیں

مفازا نولا آیینہ، ملائم ران سمدھن کی ۱۸۹

اخلاقی اعتبار سے اٹھارھویں صدی کا زمانہ کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ اورنگ زیب

کے انتقال کے بعد اخلاقی قدروں کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ جہاندار شاہ کے زمانے

میں یہ حال تھا کہ بادشاہ لال کنور کی آغوش میں ہوا اور کوئی مصاحب اتفاقاً چلا

آئے، تو بادشاہ مسکرا کر سر جھکا لیتا تھا۔ شرم اور غیرت اٹھ چکی تھی۔ شاہی محل میں اب

۱۸۷ ایضاً ۱۵۳

۱۸۸ مجموعہ شعریات میر حسن (۱۲۵۱) نیر دیکھیے ناولٹ شاہی ۵۳۱، ۵۵۵، ۵۶۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹

۱۸۹ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۹۱۲-۹۱۳-۱۵۷۷

اردو ادب کا سماجی پس منظر

خاندانی بیگمات کم اور طوائفیں زیادہ تھیں۔ اس لئے شادی بیاہ کے موقع پر نہایت ہیودہ مذاق اور فحش گالیاں ایک دوسرے کو دی جاتیں۔ بلکہ سمدھی سمدھن ایک دوسرے کے نام لے کر اس قسم کی گالیاں دیتے۔ نادرات شادی ہی اس قسم کی لغویات سے بھرپور ہے اور اس زمانے کے ابتدائی تصویق سے۔ لیکن واضح رہے کہ اس عہد میں سطحی جنرل ادب تھا۔

۱۹: "ادام آفتاب" : سمدھن ملک زمانی نے کہوئے رات پکار

سمدھی! بس کر اب مجھے پھولن گیند نہ مار

سمدھن صاحب محل جب بولی، کیوں تم کو چھڑا

وہیں ہاتھ سمدھی نے پکڑا منہ میں ڈالا پیڑا

سمدھن! تیری تنگ بہت ہے سندر سنگھ نوتھی

انگری جات نہیں ہے رامیں، ایسی لال انگوٹھی

دو لہن کا سنگار

وہ مہندی سوہانی، وہ پھولوں کی باں	میں دہلی امر دس وہ گنہگار، سوہا لباس
لے لے کے آپس میں دنوں کے بھاگ ^{۱۹}	لا شرخ جوڑے پہ عطر سہاگ
کہ جوں دودھ کے بعد شہد ہو صاف	کجوری وہ چوڑی زری کامر باف
تو آنے لگی خون کی اس میں بائیں ^{۲۰}	عروسانہ اس نے کیا جو لباس
پہنایا کس نے یہ عطر سہاگ پانی پر ^{۲۱}	سنی! ہر ایک موج میں دو لہن کی بوجو آتی ہے

زیورات

مصنفی نے ایک مسلم عورت کی حکایت بیان کی ہے جس کی شادی کسی منڈل سے ہوئی تھی۔ اس میں اس نے دو لہن کے سنگار کا یوں ذکر کیا ہے۔

کانوں میں جڑا تو اس کے بالا
ہو جیسے ستارہ دار ہا ل

۱۹: نادرات شاہی ۵۳۱

۲۰: محبوبہ ثنویات میر حسن: ۱۳۶: دیوان فخر، ۱۶۵۱۲

۲۱: دیوان مصنف، ۱۰۰: ۷۴

۱۲: ایضاً: ۱۸۵

نہدناک میں بالہ قمر تھے یا قلزم حسن کے بھنور تھے
 کانوں میں وہ بالیاں طلائی کرتی تھیں ادا سے کچ ادائی
 بازو پہ کسا ہوا وہ بھمند تھی جس کی پری بھی آرزو مند
 الماس کے کڑے ملائیوں میں حل کردہ تھر صفائیوں میں
 ہاتھوں میں وہ پور پور چمکے تھے جن سے بنوں لپاں محلے
 جگنو وہ گل میں ماہ پیارہ جوں ماہ کے پاس ہر ستارہ
 الماس کی انور بسی وہ سادہ موتی کوئی ہوئے جوں پیادہ
 پاؤں میں وہ موتیوں کے پازیب ہو جاوے پری کو جیسے آسیب
 پھر ترس پہ کڑے غضب وہ خموار ہو جن کی کھٹک سے فتنہ بیدار^{۱۹۲}

سہاگ اور گھوڑیاں گانا

ادھر کا تو یہ رنگ تھا اندیدہ راگ محل میں اُدھر گھوڑیاں اور سہاگ
 وہ گھر گھر سے شادی مبارک وہ دھول وہ ٹوٹے سلونے وہ بیٹھے سے بول^{۱۹۳}

ڈومنیوں کا مبارکباد گانا

شادی مبارک، آگے لگے گانے غریب ہر اگنی خوشی سے ہریک اس چمن کی ہل
 بول اٹھیں جن کے ڈومیاں سالی قریاں صاحب ایس دلائے دولہا دلہن کی بیل^{۱۹۴}
 شیخ جن کا جب ہر اسبڑا کی پوتہ سے نکاح ڈومنی گائے بدعا دایرا ہریا لہ بنا^{۱۹۵}

دولہن والوں کے ہاں کی رونق

جب آئی وہ دولہن کے گھر پر برات

کہوں داں کے عالم کی کیا تم سے بات^{۱۹۸}

۱۹۲ ایضاً، ۱۱۵، ۱۱۶ (الف و ب) دولہن کے زیندات میں نہد کو بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ

کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ دیکھیے کلیات سودر، ۲۰۱، ۲۰۲، ۱۰۲، ۱۷۵

۱۹۶ کلیات انظار، ۸۲

۱۹۵ مجموعہ مثنویات، ۱۳۵

۱۹۸ مجموعہ مثنویات میر حسن، ۱۲۳، ۵

۱۹۷ دیران معنی، ۳۳، ۳۴ (ب)

امداد بکاسا ہی پس نظر

جب باد نے جھاڑی خار و خشک اور بادل پانی چھڑکائے
 بانات قناتیں شمیائے دل بادل تنہو تنوائے
 نیکرے جمالِ موتی کے، کنواریاں مشہر جھلکائے
 گل فرش حریر اور دیبا کے، خوشترنگ پہنتے چھائے
 مقیش زری کے لمبے بھی پھر جاگہ جاگہ ٹھکائے
 گل قطر و گلاب اور پانی دھری، کستوری منبر کھائے
 پھر تھال ہلاکچ لوگوں کے، پھر خوب طرح سے چنوائے
 جگر دھریں سوزیب میریں، اور طرہ ہار بھی کندھوائے^{۱۶۶}

لاح اور پھیرے

رواجی رشتہ قائم کرنے کے لئے مسلمانوں میں نکاح اور ہندوؤں میں پھیرے کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں
 ان کے بعد برائیوں میں ہار، پان، شربت پلانے اور خاصداں نذر کرنے کی رسمیں ادا ہوتی تھیں
 ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان بلا سب کو شربت دینے خاصداں
 ان کے بعد سہرے پڑھے جاتے تھے۔ یہ رسم خالص ہندوستانی تھی۔ سہرے لکھنے کی ابتدا مانسیوں
 اہی کے نصف اول سے ہوتی ہے سہرے دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک روایتی، جنہیں ڈونیاں
 فوس کے موقع پر گاتی تھیں، دوسرے وہ سہرے جو شاعر دو لہا کی شان میں لکھا کرتے تھے۔
 میں یا تو وہ خود پڑھتے تھے یا ارباب نشاط سے گواتے تھے۔ اس سلسلے میں ذوق اور غالب کے
 ہرے قابل ذکر ہیں۔

اور شاہ ظفر: ظفر نے اپنے لڑکے کی شادی کے موقع پر یہ سہرا لکھا تھا:

گرتا اس رخ پہ کیا جلوہ غائی سہرا	آئی ہے دیکھنے ساری خدائی سہرا
شکر اللہ کہ اللہ نے دکھایا یہ دن	دیا اس کے رخ تاباں پہ دکھائی سہرا
سیم وزد کرتا مہ سے ہے چہن نثار	دیکھ کر چاند سے کھڑے پہلائی سہرا

۱ کیا نکیر ۸۴۱ء

۲ مجویشی رایت میر حسن: ۱۲۶؛ دیوان شاہ کمال: ۸۶۳؛ دیوان معنی: ۵۴۳

آفریں کرتے تیرے معنی روشن پہ قفر یہ اگر سنتے پہائی و سنا ئی سہرا
اس کے بعد دولہا کو زنا خانے میں بلایا جاتا ہے وہاں مختلف قسم کی رسمیں مل میں آتیں، جن
توصیحات پر تھی۔

پنہ لایوں وہ دولہا دولہن کی طرف اڑے جیسے ببل ہمن کی طرف
وہاں تک پہنچتے ہوئے یہ کہوں ہوئے ٹہکے لاکھوں بہر شگون
مصحف آرسی

دکھا مصحف اور آرسی کو نکال دھرایک میں سر پہ آئین کو ڈال
وہ جلوے کا ہونا وہ شادی کی دھوم وہ آپس میں دولہا دولہن کی رسوم
گھوڑا بنانے کی رسم

زنا خانے کی دیگر رسموں کے علاوہ ایک رسم یہ تھی کہ دولہا کو گھوڑا بنا کر اور اس پر زین
دولہن کو اس پر سوار کرتے تھے۔

زین میریدی کا دکھا س عمر میں ہے یوں بھرنا
پیر سے آپ کو جوں پیر کا گھوڑا کرنا
بیابا کے زرد دھسا سر اوپر دھرتا
زین پر ہو گئی گردن تری جھک کر ہرنا
شکل غوغیر ہے ، داڑھی تری چوکد ہے

رخصتی

اس موقع پر دولہن کے عزیز قریب اور سلیاں اور بھولیاں اس سے مل کر روتی ہیں۔
سمکرا دہ ہونا وہ ڈونے کا وقت وہ دولہن کی رخصت، وہ رونے کا وقت

۲۰۱ دیوان ظفر، ۳، ۱۹-۲۰؛ دیوان شاہ کمال، ۹۶۴؛ قصائد ذوق، ۷۱

۲۰۲ براۓ تفصیل دیکھیے مجموعہ شہزاد میر حسن، ۱۲۶؛ نیز دیکھیے کلیات نظیر گبر آبادی، ۳۷۰-۳۷۱

۲۰۳ مجموعہ شہزاد میر حسن، ۱۲۶-۱۲۷؛ دیوان شاہ کمال، ۹۶۴؛ کلیات سودا، ۱۰۲، ۱۰۳

۲۰۴ کلیات سودا، ۱۰۷

اربعاد کا سماجی پس منظر

کھڑے سب کالا چار منہ دیکھنا کر یا رب! یہ کیا ہے جہاں پیکھنا
 وہ دولہن کا رو رو کے ہونا جدا وہ ماں باپ کا اور رونا جدا
 چنڈول، ڈولی یا پالکی پر بٹھا کر دولہن کو رخصت کیا جاتا تھا۔ یہ رسم آج تک مروج ہے،
 وہ دولہا کا دولہن کو گودنی اٹھا بٹھانا مہمانے میں آخر کو لا
 چلے لے کے چنڈول جس دم کہار کیا دو طرف سے زراں پر نثار
 کھڑے تھے جو داں چٹم کو تو کیے سو موتی انگوٹھوں نے نچھاور کیے^{۲۰۶}
 جب ڈیوڑھی سے چنڈول اٹھا دروازے پر سو خولی سے
 فوجیا در اتنی کی اس پر کل موتی پھول زری بکھرے^{۲۰۷}
 برائے ہی شان و شوکت سے واپس آتی تھی۔ دولہا کے گھر میں چند رسمیں بھی عمل میں آتی تھیں،
 غرض اس طرح جب وہ دلہن کو بیاہ لے آیا جہاں اس کی تھی عیش گاہ
 ہوتی وہ جو ہوتی ہے رسم و رسم سو ظاہر میں تھی یہ بھی درکار و صوم^{۲۰۸}
 چوتھی

شادی کے چوتھے دن دولہن کے گھر میں ایک رسم ہوتی تھی، جو چوتھی کہلاتی تھی۔ اس دن دولہن شوہر
 کے ساتھ اپنے والدین کے گھر جاتی اور اس کے ہمراہ اس کے سسران کی عورتیں ہوتیں۔ اس موقع
 پر رنگ کھیلا جاتا تھا، جسے ہولی کہیلٹا کہتے تھے،

یوں جو ہم سب کو آج رنگ میں لال ہنستی ہے دیکھو کچھ بوڑھی بامثال دکلا،
 اور جو نازک مزاج کوئی ہوئی کھیلتی تھی عبسیر بھر محبوبی
 اور کوئی کسی پہ ڈال کے رنگ کہتی تھی اے بوا! نہ ہولی تنگ
 ہولی کے کھیلنے میں اب اس دم میں تو تنگ گئی، مجھے علی کی قسم

۲۰۵ مجموعہ شویات، ۱۲۷؛ کلیات فقیر، ۷۱-۷۲

۲۰۶ ایضاً؛ ۱۲۸؛ کلیات فقیر (جب ڈیوڑھی.....) ۷۳، ۷۴

۲۰۷ کلیات فقیر، ۷۲، ۷۳، ۷۴

۲۰۸ ایضاً، ۱۲۸-۱۲۷؛ کلیات، ۷۲

امداد کا سماجی پس منظر

کوئی کسی کے غلام منہ پر مل کہتی تھی، ہوتی جان آج غسل
 اور جس سے لگی تھی جس کو لاگ اور سے اس رنگ کھیتی تھی چاگ^{۲۰۹}
 اٹھایا اس دھوم میں گلتے ہاتھ پریرا کا سیاہ چوتھی کے ساتھ^{۲۱۰}
 نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم ”مہادیو کا بیاہ“ اور کھیا جی کی شادی^{۲۱۱} میں شادی کی رسموں کا تعصیب
 ذکر کیا ہے۔ غلام اظہر بیگ اظہر نے اپنی شہزادی گنج اسرار میں بھی شادی کی رسمات کا مفسر
 ذکر کیا ہے۔ یہ شہزادی دکنی اردو میں ہے۔^{۲۱۲}

زیورات

جسم کے مختلف حصوں کی آرائش کا جذبہ عورتوں میں قدرتی طور پر پایا جاتا ہے۔ جمیلہ برج بھوشن لکھتی ہیں^{۲۱۳}
 خوبصورتی اور زیورات سے فطری لگاؤ، انسان اور خدا، دونوں میں یکساں طور
 پر پایا جاتا ہے۔ حسن اور خوبصورتی کے روحانی تصور است کا تاریخی میں جسمانی اور
 باطنی تصور است کے گہرا تعلق رہا ہے۔ اور خوبصورتی کی علامتوں کی ابتدائی
 جڑیں اصلیت اور وجود کی خوبصورتی میں برابر ہیں۔

ہندستان میں زیورات کے استعمال کو ایک مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا کیونکہ انہیں کو سہاگ
 کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اس نقطہ نظر سے ہندو اور مسلمان عورتوں میں زیورات کی یکساں اہمیت
 تھی۔ شادی شدہ ہندو عورت، ہر ایک مذہب کے زیور پہننا لازم تھا۔ لیکن مسلمان عورتیں قیمتی تہ
 اور نگینے کو نظر سے محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ مسلمان عام طور پر انگوٹھیوں میں

۲۰۹ دیوان مجبور، ۱۷-۱۸

۲۱۰ مجموعہ حوثیات، ۱۲۸ کلیات مسود، ۲: ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱

قرآنی آیات کندہ کر کر پھینتے تھے۔ بعض اوقات ہندو بھی منتر وغیرہ کندہ کر لیتے تھے۔^{۲۱۵}

ابتداء میں دنیا سے اسلام سے آنے والے مسلمان اپنے زہد و تقویٰ یا افلاس کی وجہ سے سونے اور چاندی کے زیورات استعمال نہیں کرتے تھے، بالخصوص مرد۔ لیکن شدہ شدہ جب ان کے پاس دولت آئی اور وہ ہندوستانی تہذیب میں گھل مل گئے، تو وہ احتراز جاتا رہا۔ البتہ وہ ہندو جنوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اپنے روایتی اور قدیم زیورات اس کے بعد بھی استعمال کرتے رہے۔ اسی لیے ہندوستانی اور بیرونی مسلمانوں کے آپسی میل جول کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی زیورات کا استعمال عام ہو گیا۔ مغلیہ بادشاہ: صنعت و حرفت کے بڑے مروتی تھے۔ دستکاروں اور بالخصوص سناروں کے فن کو ان کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔ ابوالفضل کا بیان ہے:^{۲۱۶}

ہر شخص ان مکوہ زیورات کو مادہ یا جڑ اذ بخواتے ہیں اور طرح طرح سے پہنتے ہیں زیور سازی کے مجاہد کیا بیان کروں۔ ان کی نزاکت اور ہنرمندی۔ یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک تولہ سونے کے زیور کی اجرت دس تولہ تک دی جاتی ہے۔ جہاں پناہنے اور نئی نئی وضع کے زیورات ایجاد کیے ہیں۔

بملا ہندوستانی عورت قدیم الایام سے اپنی آرایش اور اپنے اوپر بھاری اور وزنی زیورات لانے کی خواہشمند رہی ہے۔ مغلیہ بادشاہوں کے دور حکومت میں متداول رسموں پر پوری طرح سے عمل ہوتا رہا۔ ہندستان میں آنے والے تمام سیاح اس بات پر متفق ہیں کہ زیورات ان کے دلوں کی خوشی تھے اگر بد قسمتی سے کوئی عورت دیوہ ہو جاتی، تو اسے تمام زیورات سے محروم ہونا پڑتا تھا۔ سجان رائے بھٹنڈاری کا بیان ہے:^{۲۱۷}

دوران کہ پس از شوہر خود زندہ می ماند، بمقتضائے وفاداری و عبادت اوستی از لذات خوردن و آشامیدن و تمتعات لباس خوش و زیور پوشیدن خود را بازمی دارد

اپنے شوہروں کے انتقال کے بعد مسلمان عورتوں میں بھی یہی عمل پایا جاتا تھا اور وہ زندگی کی تمام خوشیوں

۱۲۶ آئین اکبری دار و ترجمہ ۲۱: ۲۸۵ ۲۱۷

۲۰۸ منوجی، ۳: ۴۴

۲۱۹ منوجی، ۳: ۴۰ ۲۲۰ خلاصۃ التواریخ: ۲۶

جی حاصل نہیں رہی کم از کم عرووں اور ایرانیوں میں منہ کے استعمال کے لیے کوئی ثبوت دستیاب نہیں
تا۔

انگریز کے عہد میں ایک نئے زلیہ، جہانگیر (پتھروں سے جڑاؤ پہنچی) کی ایجاد ہوئی جو کلائیوں میں
ہی جاتی تھی۔ ۲۲۵ اٹھارہویں اور انیسویں صدی تک ان کی تعداد بڑھ کر ۵۵۰ تک پہنچ گئی، اور ان
سے بہت سے ایسے زیور تھے، جو عہدِ مغلیہ میں ایجاد ہوئے اور ان کو فارسی نام دے دیا گیا تھا۔
تمام زیورات مسلمان عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ ان میں سے کچھ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ اردو ادب
ان زیورات کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

زبسی: یہ زیور عورتوں کے سینے پر لٹکتا رہتا ہے۔ ارد میں اسے دھمکڑی بھی کہتے ہیں۔

دو لڑا، مالا، بدھی، اُربسی (الف) رین باری (ب) گھنے کے پھنسی ۲۲۶

الماس کی اُربسی دہ سادہ موتی کون ہوے جوں پیادہ کذا،

گلے میں اُردبسی اب لعل ٹکڑوں کے مت پہنڈ ۲۲۸

۲۲۹

ستم ہے اُربسی لٹے پڑی دن رات چھائی پر

معصی: ہیرے میں اس کے پیر بیضا کی روشنی

ہو کیونکہ اُربسی کے ترے ہسر آفتاب

نوٹ: ایک گمنگنہ و در زیور جسے ہندوستان کی عورتیں پیر کے بخوٹے میں پہنا کرتی ہیں۔

دہی سر اسری، چنپا کلی، دہی گھنے دہ ٹیکا بنیے، دہی جھیکے، اور دہی لوٹ ۲۳۰

تویزوں میں ہیکل کے کیا بقیہ اس کو پردیں کی جو ہاتھ آئے شب اُٹی پائل کی لوٹ ۲۳۱

معصی: پشتِ پاپن دہ لاکت کو تلاش کے ڈسے جھکِ گل کو زکرے پاؤں کا اپنا انوٹ

۲۲۰

۲۲۶ دیوانہ فائز: ۲۰۶ (الف) رین = ن رات باری مبارے

۲۲ دیوان معصی: ۱۱۴: ۵ (الف) ۲۲۸ مجموعہ منظر: ۱: ۱۲۶

۲۲۰ ایضاً: ۱: ۳۸۹ ۲۳۰ کلیات انشا: ۲۶۱

۲۲۰ دیوان معصی: ۵: ۲۸ (ب)

انگوٹھی یا انگشتری: ہاتھوں کی انگلیوں کا زیور۔

دل چلا چاہے، تو پہن انگشتری زیب دے ہاتھوں کے تئیں رنگ پری
ضعف اگر خوش رنگ واسلوب ہے تو انگوٹھی بیچ رکھنا خوب ہے ۲۳۲
انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی

جنھوں کی آن پہنچی، لڑ موندے وہ ایک چیلپر ۲۳۳
یا انگوٹھی کی گہڑی ہے وہ نزاکت سے بھرے

جس پہ قریاں کیے سینکڑوں بچتے ارگن ۲۳۴
یاں نگین لعل کی انگشتری ہے کس کو طبع

نفر کا ہر گز نہیں آتا ہے زیر رنگ دست ۲۳۵

آر سی: ایک، چاندی یا سونے کی سادہ یا اینا کا سا انگوٹھی کا نام ہے جس میں چھوٹا سا گول آئینہ جڑا ہے
ہے اندر سے عورتیں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں اسی غرض سے پہنتی ہیں کہ ہر وقت اپنا سنگار دیکھ
کرتی رہیں۔

آبرو: رہے ہے تیس دن خڑگاں کے سنگھ کلیجا آہنی ہے آر سی کا ۲۳۶
یکرو: چور دیاؤ تو دل میرا دکھاؤ سنتا ہے شوخ خواہاں آر سی کا ۲۳۷
میرا آر سی کے گھر میں شرم سے میر کم ہی وہ ہمیشہ آتا ہے ۲۳۸
دیکھ اس دہن کو ہر دم اسے آر سی کو یوں ہی

خوبی کا در کسو کے منہ پر بھی دار ملے ہے ۲۳۹

۲۳۲ دیوان آبرو (ضمیمہ) ۴

۲۳۳ کلیات انشا: ۲۶۶، ۵۷، ۱۶۵، ۱۹۶؛ مجموعہ نغمہ: ۲۶۱، ۱۲

۲۳۴ دیوان شاکر ناجی: ۱۰۲؛ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۰۳، ۱۸۲، ۲۱۵

۲۳۵ کلیات سودا: ۱۱، ۴۵ ۲۳۶ دیوان آبرو: ۳

۲۳۷ دیوان یکرو: ۲ ۲۳۸ کلیات میرا: ۷۸، ۸۱، ۸۱

۲۳۹ ایضاً: ۱۸۲

تظیر اکبر آبادی: (ادھر جگنو، ادھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر ہوئی، دس ۲۵۵)
 کوئی اس چاند سے ماتھے کے ٹیکے میں اچھلتا ہے
 کوئی بندوں سے مل کر کان کی نرمیوں میں ملتا ہے
 لہٹ کر دھککتی میں کوئی سینہ پر چھلتا ہے
 کوئی جھمکوں میں جھولے ہے، کوئی بالی میں ہلتا ہے
 بجلی: عورتوں کے کان کا ایک طللی زبور، جو سانہ یا جڑاؤ ہوتا ہے،
 میر: بجلی وہ ہر ایک زینت گوش تھی برق براے فرمیں ہوش
 تظیر: نہ جھمکیں کس طرح کانوں میں اس کے حُسن کے چھمکے
 ادھر جھمکا، ادھر بندھا، ادھر بجلی کا بالا ہے ۲۶۴
 ظفر: گونج بالی کی مرے دل میں جیسے ہے جس طرح
 نیش کتر دم میں ہے کاہے کو اس منوں کی تلاش ۲۶۵
 دکھاتا کان کا بالا جو تور خسار پر اپنے
 ترے حلقہ بگوشوں میں میر ہالہ نشیں ہوتا ۲۶۶
 سودا: منہ سے نقاب اٹھتے ہی حلقہ بگوش ہو گئے
 خال کے، خط کے، زلف کے، بالے کے گڑ کے کال کے ۲۶۷
 بندہ: آدیزہ / گوشوارہ کی تم کا ایک سراخی دار گینہ ہوتا ہے، یہ بھی کان میں پہنا جاتا ہے،
 رنگین: بندہ جو کان میں ہے، تو بالاضرف ہے ہر بات میں فرض کہ چھالاضرف ہے
 انشا: بندہ اپنی کے یوں تو نہ پھر وزیر آسمان
 ایسا نہ ہو کہ زہرہ گردوں ٹپک پڑے ۲۶۸

۲۶۳ کلیات تظیر اکبر آبادی: ۱۵۱

۲۶۵ دیوان ظفر: ۱۵۱، ایضاً: ۲، ۱۶۵، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱

- کچھ دے اپنی نشانی مجھے مُبنداً، بالا
 ۲۶۹ قوطا، زنجبیر۔ قول کا چمکا لٹھوینڈ
- ہے ظلم ادس پر ہی پر ہم فشن نہ ہو دیں جس کے
 ۲۷۰ یہ جھکے، مُبندے، بلے، قوطے، کرٹے، چڑے ہیں
- معصی، کوئی کیوں نہ گریباں چاک کرے، اب، دیجھ کے چمپ کو اس مُبت کی
 ۲۷۱ مُبندے کا جھلکنا ہاے خدا، چوٹی کی مسک، پھر ویسی ہے
- نظیر، انگیا کی بھوک، گوٹوں کی جھمک، مُبندوں کی کاٹ ویسی ہے
 ۲۷۲
- بلاق، ایک زبیرہ کا نام ہے جو عورتیں دیوارِ مینی میں پہنتی ہیں،
 ۲۷۳ مام، چاند سے تارے کا ہوتا ہے کھرجو اتفاق
- اس طرح منہ پر ترے پیارے جھمکتا ہے بلاق
 ۲۷۴ معصی، عالم سادگی کے دمعت میں نے جو کچھ، تو ناک سے
- اس نے اتار کر دیں اپنا بلاق رکھ دیا
 ۲۷۵
- گر بلاق اس کے کاموتی نکھتے فردا جائے یاد
 ۲۷۶ جیسے نقطہ اک، دُرِ کمون قلم سے گر پڑے
- شکر ناجی، آبِ چہرے کی نہ تھی حُر کے اتارے میں بولے
 ۲۷۷ ناک رکھی حسن کی پیارے جوتیں پہنی بلاق
- کیلے بغیر ارافسوس نکتور دل میں ناجی کی
 ۲۷۸ یہ موتی سنیں بلاق اس کی میری ناک لگا کی ہے

۲۶۹	ایضاً: ۵۰	۲۷۰	ایضاً: ۹۵
۲۷۱	دلیوں معصی، ۴، ۷، ۸، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱		

ظفر: مجاہد کا تری ہے یہ موتی کہ قائم اٹار ہے یہ پارا ۲۷۸

عجب ہیں صورت سے رہا بہ تیرے لڑکے تیرے گروہ
بیسرو ایک طلائی زیور؛ اسے بھی عورتیں ناک میں پہنتی ہیں۔

۲۷۹
ہیں ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام و شرموتی
جہیں پر موتی اور بیسروں موتی، مانگ پر موتی

بانک: ایک قسم کے چمکے کا نام ہے،

جو دیکھا میں نے ان مہندی بھرے ہاتھوں کا ہل جانا

۲۸۰
انگوٹھی، بانک، چمکے، آرسی کا پھر نظر آنا

پور: چاندی یا سونے کے پھول، ایک قسم کا زیور، پائی کے چھوٹے چھوٹے گھنگھرو
شوخ پر اپنے زرد تھے، اس کے برن بھی زرد تھے

۲۸۱
توڑے، کڑے، دوبرتے، چمکے بھی پور پور تھے

بجھبند یا بازو بند، عورتوں کے بازو کا ایک زیور

۲۸۲
وہ بجھبند بازو کے، اور نورتن
کہ جوں گل سے ہوشاخ زیب تن

۲۸۳
حافظی بازو بند کی جوڑی
بھاری دیکھت کی تول کی تھوڑی

۲۸۴
بازو پہ کا ہوا وہ بجھبند
تھی جس کی پری بھی آرزو مند

۲۸۵
یک طرفہ دست بند بازو بند
علقہ غم میں تھے اسیر کند

بھول آئے ہو کہاں، بچے لو کہو، بازو بند

۲۸۶
آتے خالی ہیں آج نظر تمہارے بازو

۲۷۸ دیوان ظفر، ۲: ۲۵۱ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۷۵

۲۸۰ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۱۵ ۲۸۱ ایضاً: ۳۱۱

۲۸۲ مجموعہ شہنشاہت میر حسن: ۶۹ ۲۸۳ تذکرہ مجمع التمثال: ۲۸۳

۲۸۴ دیوان معصومی، ۵: ۱۱۷ (الف) ۲۸۵ ایضاً، ۵: ۱۲۰ (الف)

۲۸۶ دیوان ظفر، ۴: ۱۲۲

بیتا: ماتھے کا ناز زریں جو ہر کی قسم کا ہوتا ہے اس کا کڑوا لہو کو پہناتے ہیں:
جرات: اس مُبندے کے ہم بندے ہیں، وہ بالاسب کو دے بالا
موتی سے ساری مانگ بھری، بیسے کی جھک پھر دی ہے
باہو:

۲۸۷ باہو پہنچی دکنگن، پچھلاڑی سرسوں تھی پاگ جواہر میں جڑی

بدھی:

۲۸۸ دولڑا، مالا بدھی، اُربسی رین باری میں گہنے کے پھینسی

ہوئی پیرہن سے بھی خوشدلی، کلی دل کی اور بہت کھلی

۲۸۹ کبھی طرے سے، کبھی گھرے سے، کبھی بدھی سے، کبھی ہارے سے

پہنچی: ہاتھوں کا ایک زریں، جو نقرئی یا طلائی سادی یا جلاؤ ہوئی ہے۔

۲۹۰ وہ پہنچی زمرہ کی اور دست بند نزاکت میں تھی شاخ گل سے دھند

پہنچیاں داچھڑے، اور کان کی بالی بیدار

۲۹۱ نورتن ایسی ہی گہنے کی جڑ اورٹ خاص

۲۹۲ ہلکی پہنچی سے چمکتا ہے ہاتھ نازک اس کا ہے اس قدر پہنچا

۲۹۳ باہو پہنچی دکنگن، پچھلاڑی سرسوں تھی پاگ جواہر میں جڑی

۲۹۴ گوہر، لہرینت، ڈانک تلخ کیمیت اور ایک پہنچی کے دریافت خودار کے گہند

نق لڑا، دولڑا، اور ستلڑا، مختلف قسم کی گلے کی زنجیر کے نام ہیں جس میں دو دو پانچ پانچ، سات سات لڑیاں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ خالص موتیوں کے بھی ہوتے ہیں۔

۲۸۷ دیوان خانہ: ۲۸۸ ایضاً: ۲۰۶

۲۸۹ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۶۶، ۱۰۴، ۹۰، مجموعہ نقر: ۱۵، ۱۲

۲۹۰ مجموعہ شہزادہ مرص: ۶۹۱ اردوئے معلیٰ (سوزنبر): ۳۱۰

۲۹۲ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۱۱، ۱۴۵، ۲۱۵، ۲۵۹

۲۹۳ دیوان خانہ: ۲۰۶ کلیات انشا: ۲۹۴

اردو ادب کا سماجی پس منظر

دہ موتی کا دھڑا، دہ موتی کا ہار سدا رشک خمیدہ جس پر نثار
لگا دھکڑھکی پچھلا، ستلا سراسر گلے حسن اس کے پڑا^{۲۹۵}
باہو پہنچی دسنگن، پکڑی سرسوں تخی پاگجوا ہر می جڑی^{۲۹۶}
چمک: پیر کا ایک زیورہ

بیان کیوں کر کروں ان میں رفتار کروں تقریر کیا بھجن کی جھنکار^{۲۹۷}
پازیب یا پایل: پازیب پاؤں میں پہننے کے ایک زیورہ کا نام ہے۔ چاندی یا سونے کی بنی
ہوتی ہے۔ چونکہ اس زیورہ میں گھنگھروں کے ہوتے ہیں، اس لیے رفتار کے وقت آواز پیدا ہوتی
ہے۔

نقطہ موتیوں کی پڑی پائے زیب کر جس کے قدم سے گہر پائے زیب^{۲۹۸}
وہ لعلوں کی پازیب کا دیزوار سدا اشکب خونی ہو جس پر نثار^{۲۹۹}
پاؤں میں دہ موتیوں کی پازیب ہو جاوے پری کو جس سے آسیب^{۳۰۰}
خوشنما تھا اس کے پگ میں پائے زیب ایڑی نارنگی، دہ لہو سے تھے سیب^{۳۰۱}
پازیب موتیوں کی جو زیب پاہلی ہے پردیں پر خند فلک ہے راتوں کو جھپٹا کا^{۳۰۲}
رنگین: کھڑے پازیب پاؤں کے گل سے زیب گردن کے واسطے تل سے^{۳۰۳}
قہر آوے نہ بھلا جو دے جب ہے پردہ دشواری

جس کی چلون ہی سے پازیب کی چھن چھن مارے^{۳۰۴}
کڑے، پازیب، توڑے جس گھڑی آپس میں لڑتے ہیں
تو ہر جھنکار میں کس کس طرح باہم جھگڑتے ہیں^{۳۰۵}

۲۹۵	مجموعہ شذوئیات میر حسن، ۵۶	۲۹۶	دیوان فائز، ۳۶؛ مجموعہ نغمہ، ۱۱۱
۲۹۷	دیوان فائز، ۲۰۲	۲۹۸	مجموعہ شذوئیات میر حسن، ۱۵۷
۲۹۹	ایضاً، ۶۹	۳۰۰	دیوان معنی، ۱۲۵، ۱۲۶ (دب)
۳۰۱	دیوان فائز، ۲۰۶	۳۰۲	دیوان معنی، ۶۵، ۶۶ (دب)
۳۰۳	تذکرہ مجمع الانتخاب:	۳۰۴	کلیات انشا، ۱۵۵
۳۰۵	کلیات نظیر اکبر آبادی، ۲۵۵		

اردو ادب کا سماجی پس منظر

۳۶ کا فردی، جی دیکھ جے سوار قیامت کا لہرے
 پادب، کرپے، پائل، گھنگری، کڑیاں، چھپیلی، مجھری، تڑپ
 جرات، جی چلا جائے ہے پازیب کی جھنکار کے ساتھ
 فتنہ، حشر ہے اس شوخ کی رفتار کے ساتھ
 معصی، اول منسم، اگر می رفتا غضب ہے

اس پر تری پازیب کی جھنکار غضب ہے
 تعویذ، ایک زیور طلائی یا فخری کا جو بالعموم بازو پر باندھا جاتا ہے اور سرگردن کا بھی نشان
 ہے۔

۳۰۷ فقط تعویذ دریائی کا خوش رنگ - بندھا بازوئیں اور کھینچا ہوا تنگ
 تعویذوں میں ہیکل کے کیا تعبیر اس کو

۳۰۸ پروں کے جو ہاتھ آئے شب اٹن کے پاؤں کی نوٹ
 گلے میں چاہیں کیا جھکوسیم تعویذ لگتے ہیں تری ہیکل کے تاکر تعویذ
 ۳۰۹ تعویذ باتھ بازو کے تجویز باندھ
 ۳۱۰ قیامت ہے جھمک بازو کے تعویذ طلائی کی

۳۱۱ عصا، حسن کوں قائم کیا بانی ہے یہ لڑکا
 اور اس جوڑے میں با صدف خنائی جھلکتا ہے جو تعویذ طلائی

۳۰۷ ۲۵۹: ۱۵۶ مجموعہ شہزادہ حیات ۱۵۶

۳۰۸ دیوان معصی، ۲۸: ۲۸ (ب)، ۲۹: ۲۹ (الف)، ۳۰: ۳۰ (الف)

۳۰۹ ایضاً، ۱۲: ۲۳ (ب)

۳۱۰ دیوان اکبر (ضمیمہ)، ۵۰

۳۱۱ دیوان خاکرناجی، ۱۳: ۱۳؛ نیز دیکھئے کلیات ہمت، ۱۱: ۱۱، دیوان زادہ حاتم، ۳۳: ۳۳؛

کلیات نظیر اکبر (پادب)، ۱۸۰: ۹۰

۳۱۲ کلیات قاسم، ۱۴۹: ۱۴۹؛ کلیات انشا، ۵۰

۳۱۳ ہاتھ میں پہنچی غضب، بازو پہ بھیند غضب

سر پہ تعویذ پری، پانوں میں تعویذ کڑا

ڈرتا ہے نزاکت سے مراد دل، ارے کہہ دو

۳۱۴ تعویذ نہ یوں بازوؤں پر کھینچنے کے نامدھے

توڑا، چاندی یا سونے کی زنجیر سی ہوتی ہے، جو عورتیں پاؤں میں پہنتی ہیں۔ توڑا گمراہ کا بھی لک
زیادہ ہوتا تھا۔ یہ سمجھ زنجیر بنا ہوتا تھا۔ توڑا کسی زمانے میں ہاتھوں میں بھی پہنا جاتا رہا ہے اور ممکن
ہے، لکس کے بعض حصوں میں اب بھی اس کا رواج ہو۔

صنم کے ناز نہیں پاؤں میں کیا ہی خوب توڑے ہیں

۳۱۵ گویا اللہ نے اپنے یدِ قدرت سے جوڑے ہیں

وہ توڑے ہاتھ میں تاروں کے باریک

۳۱۶ کہیں دیکھے جہاں ہو جس کے تار بیک

مرے ہے جو بازو میں ایک نیل سا

۳۱۷ سوتیرے ہے پاؤں کا توڑا لگا

یدِ دست برد خوب نہیں، اس سے کیا حصول

۳۱۸ توڑا جو تیرے ہاتھ کا دلدار توڑے

باؤں میں سونے کے توڑے بھی رہیں

۳۱۹ کیا مضا لکھ ہے اگر رہیں

۳۱۳ مجموعہ نغمہ، ۸۸:۱۱

۳۱۴ دیوان نغمہ، ۲۱۲، ۳۲۸؛ ایضاً، ۳۶۱، ۳۶۲

۳۱۵ مجموعہ نغمہ، ۲۰۱ مجموعہ شغویات میر حسن، ۵۶، ۵۷، ۵۸

۳۱۷ کلیات انفا، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰

۳۱۸ دیوان مصطفیٰ، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰

۳۱۹ دیوان اکبر (مجموعہ)، ۵۱؛ نیز دیکھیے کلیات انفا، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰

اردو ادب کا سماجی پس منظر

نیکا: ماتھے کا ایک بڑا ذریعہ

میرسن! وہ مانتے پہ لیکے کی اس کے جملہ
 ہوس ہونہ دیکھ اس کے زیور کو پھر
 ظفر! اس جبین پر جلوہ گرہ اس کا ٹیکہ نہیں
 سحر، چاند تاروں کی جیسے چمک
 کہ ٹیکا تھا سب اس کے سر

۳۲۲
آسمان پر دن چڑھے دیکھو قمریہ راہرا

جنگنویا جگنی : زنانہ زیور جو گلے میں پہنا جاتا ہے۔

جگنو کو نہ رکھ محرم شبہم میں، اری چھوڑ

ایک زہر بھرا میرے دل تنگ میں کیڑا

جنگزدہ محل میں ماہ سپاہ جوں ماہ کے پاس ہوتا تھا

میں جی جگنو سے جو چمکتے تھے اشکِ خویاب سا ٹپکتے تھے

اس کے جگنو کی چمک ویسی ابھی ہوتی تھی

کیوں جلاتا ہے تو اے کریمِ خستہ تاب، مجھے

د مملکت کی چاند سی، جگنو بھی تاروں کی مثال

۳۶۷
عطر و اسطرلاب، وہ تو بڑے بھی درختان پر

ادھر جگنو، ادھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی

۳۲۸
بھڑے ہیں اس پری میں اب تو بار بار ہنس رہی تھی

زلزلیں وہ مشکناں سی، چہرہ وہ چاند سا

۳۲۹ جگنور ہاگلے میں ستارہ صاحب گمنا

۳۷۰ مجموعہ شہنشاہ میر حسن ۶۸۱، نیز دیوانہ خانہ: ۲۰۶

۳۲۱ ایضاً: ۳۰۶ ۳۲۲ دیوان ظفر: ۱۱: ۱۱: ۲: ۷: ۷۶

۳۳۳ کلیات مذاق، ۱۸ ۳۳۴ دیوان مصطفی، ۵: ۱۴۱ (الف)

٢٢٥ ايضاً: ٥: ١٠ (الف) ٢٢٦ ايضاً: ٦: ١٢ (م)

۳۲۷-۳۲۹ کلمات نظیر اکبر آبادی : ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷،

اب رنگ جوے ہاں سنی کا ہے جھکتا توڑا بھی پڑا جھکے ہے جگنوں بھی دھکتا^{۳۳۰}
 بالابھی جھکتا ہے، جگنو بھی دھکتا ہے بڑھی کی لپٹ، تیس رو تعویذ کی ہیکل ہے^{۳۳۱}
 جگنی کو دیکھ جیب پہ کرنی کی ہریش منڈلاتا ہے اپنے گریاں میں آفتاب^{۳۳۲}
 جوشن: ایک لہری یا طلائی، سادہ یا جڑاؤ زبرد جو عورتیں بازوؤں پر باندھتی ہیں۔
 کیا یہ عکس دام کم ہے جوشن سے فواد سے^{۳۳۳}
 جھمکا: کان کا ایک زیور۔

ماقم، اس جھکے سے تو کیا رات کو، اے رشک ماہ! روشنائی شمع کی جلوے نے تیرے مات کی^{۳۳۴}
 سرکے بالوں سے لنگ، جھمکے سے اُجھا تو کیا اب لگا جھکومتا نے یہ نگوڑا تعویذ^{۳۳۵}
 اے ظالم! اس پہی پر ہم فش نہ دوں جس کے یہ جھمکے، اُجھدے، بالے، توڑے، کڑے جڑے ہیں^{۳۳۶}
 دو ہی سراسری چنپاکی، وہ ہی گہنیں وہ ٹیکہ بیٹے، وہ ہی جھمکے، اور وہی انوٹ^{۳۳۷}
 معنی: جو کے وہ جو جگمگاتے تھے سراسر افسوس کو ہلاتے تھے^{۳۳۸}
 میر: چشمک ہے نہیں تازے شیوے یا کی کے ہیں جھمکے سے دکھا دے کر عالم کو گلا رکھا^{۳۳۹}

۳۳۱-۳۳۲ کلیات نظیر اکبر آبادی ۱۵۹۱، ۲۵۵، ۲۶۳، ۲۶۹، ۲۷۰

۳۳۲ دریاں ظفر، ۱۲: ۷۷ ۳۳۳ مجموعہ نغز، ۱۱: ۹۵

۳۳۴ مجموعہ نغز، ۱۱: ۱۹۳، ۱۸۸، ۱۵۹

۳۳۵ کلیات نغز، ۵۰: ۳۳۶ ایضاً: ۹۵

۳۳۷ ایضاً: ۲۶۱ ۳۳۸ دریاں معنی، ۱۵: ۱۴۰ (الف)

۳۳۹ کلیات میر، ۵۳

اردو ادب کا سماجی پس منظر

نظیر اکبر آبادی: اس کان کے جھکے کی لنگ دیکھ لی شاید

۳۴۰ ہر خوشہ اسی تاک میں رہتا ہے غیب کا

۳۴۱ سدھ لے گئی بالے کی جھمک، صبر کرن بھول، ادھر قتل کو بندے

بالے کی گئی جھوک لگا سینہ میں اک بھول، دل لے گئے جھمکے
یہ جھمکیں کس طرح کانوں میں اس کے حسن کے جھمکے

۳۴۲ ادھر جھمکا، ادھر مہندا، ادھر بجلی کا بالا ہے

جھمکے جھمکے وہ تریاکے کرن بھول، وہ بھول

۳۴۳ بندے بالے پری، سوتی پری، اور کان پری

اس کے جھمکے کی لنگ سے جو ملا بالا ہے

دل میرا جھوکے سے دلوں کی ترو بالا ہے

نہر جھمکوں کی جھمک، تہں پھغیب ہے بالا

۳۴۴ اب کوئی آن میں سب غلطی ترو بالا ہے

جہانگیری: ایک جڑاؤ زلیخا کا نام ہے دراصل یہ بھاری قسم کی چوڑی کا نام ہے، جسے عورتیں ہاتھوں میں پہنتی ہیں۔

۳۴۵ جہانگیریوں کا کردن کیا بیاں کہ اوٹھتی تھی ہاتھوں سے جہ کے فعال

چھڑے: ایک قسم کے پاؤں کے کڑے، پیردن کی چوڑیاں۔

۳۴۶ فقط پاؤں میں سونے کے کڑے ہیں تکلف کچھ نہیں، ان میں چھڑے ہیں

۳۴۷ وہ مہندی کا عالم، وہ توڑے چھڑے وہ پاؤں میں سونے کے دودھ کڑے

اے ظلم! اس پری پر ہم غش نہ ہو دیں جس کے

۳۴۸ یہ جھمکے، بندے، بالے، توڑے، کڑے، چھڑے ہیں

۳۴۳-۳۴۴ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۱۶، ۱۸۷، ۱۵۱، ۱۵۹، ۱۶۸، ۱۸۷، ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۵۹

۳۴۵ مجروح شہزادہ حسن: ۱۵۵، ۱۵۶

۲۸۵، ۲۸۸، ۹۱۰

۳۴۶ ایضاً: ۱۸۲، ۱۵۵ ۳۴۷ ایضاً: ۱۸۲، ۱۵۵ ۳۴۸ کلیات انشا: ۹۵

اسعاد کا سماجی بینظر

۳۴۹ نہ چھڑے اور نہ کڑے نظر آئے مجھ کو

اک صفائی سی نقطہ کر گئی انگار مجھے

۳۵۰ بدن میں جائے زرخش، سراپا جس پندیب آد

کڑے بندے، چھڑے، چھلے، انگوٹھی، نون، ہیکل

ارادہ ہے کہیں جہاں آج جانے کا

۳۵۱ وہ پہننے کو جو بائے، چھڑے، نکالتے ہیں

چھلّا: چاندی، سونے یا کسی ادھ دھات کا گیند کے بغیر حلقہ جو ہاتھ اند پاتوں کی انگلیوں میں

پہنا جاتا ہے۔

۳۵۲ میر حسن: جو اہر کے چھلے بھڑے پود پود ندی کی مٹی جیسے مغل پہ تورا

افشا: چھلے ہر انگلیوں کی پوروں میں، مہندی وہ شوخ

۳۵۳ کر نہ عباسی کی چٹٹ میں بھی ایسی ہو سمٹ

ہیں جو یہ سادہ دپر کا سے بیٹے، سو مجھے

۳۵۴ قول کا چھلّا اگر دیویں تو چھل سکتے ہیں

سونے کا چھلّا حور کا پر ہی فقط نہیں

۳۵۵ اک زرد پولی میں بھی تورا اسبند باندھ

معصی: چھلے قول کے وہ کر بند کیوں کر کھولے

۳۵۶ جب یاد نہو دے اس کے نہیں گراں کا

۳۴۹ دیوان معصی، ۶: ۲۳۳، ۲۳۴

۳۵۰ کلیات نظیر اکبر آبادی، ۱۰۳؛ نیز مجموعہ نظریات، ۸۷

۳۵۱ دیوان نظریات، ۹۰

۳۵۲ مجموعہ شریات میر حسن، ۸۲؛ نیز دیکھیے: ۱۵۶، ۱۸۶، ۱۸۰، ۱۶۹

۳۵۳ کلیات افشا: ۲۴۸ ۳۵۴ ایضاً: ۱۶۴، ۱۶۸

۳۵۵ ایضاً: ۱۱۷ ۳۵۶ دیوان معصی، ۵: ۶ (ب)

- کس دستِ حنا بند کے چھٹوں کے یہ گل ہیں
 ۳۵۷ جھٹلتے ہیں گل ان سے عین نذر پیکر کے
- ہاتھوں میں وہ پور پور چھٹے
 ۳۵۸ تھے جن سے بخوں طہاں جھٹے
- شکر اہی: انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت، آج کھڑی
 ۳۵۹ جھٹوں کی آن پہنچی، لڑھکے وہ ایک جھٹے پر
- نظیر اکبر آبادی: بالی کو ہلا، ہم سے کتنوں کو دیا چھٹے
 ۳۶۰ جھٹوں سے بھی بھیا جانے کس کس کو چھٹے نہ ہوگا
- بدن پر جامہ زرکش، سراپا جس پر زیب آدر
 ۳۶۱ کھڑے، بندے، چھٹے، انگوٹھی، توڑنا، مہل
- داں تو ہاں حوریں کے گھنے کے بہت ہونگے نشان
 ۳۶۲ ان پرینا دوں کے جھٹوں کی نشانی پھر کہاں
- چھٹے غیروں پاس، تو وہ خاتمِ زراے نگار
 ۳۶۳ ہے ہمارے پاس بھی اب تک نشانی آپ کی
- دہ پہونچے، جن میں پہونچی سو نیاز و محب سے پہونچی
 ۳۶۴ اور ان پور دں کے ملنے سے بڑی ہے شان جھٹوں کی
- جو دیکھا میں نے ان مہندی بھرے ہاتھوں کا ہل جانا
 ۳۶۵ انگوٹھی، بانک، چھٹے، آرسی کا پھر نظر آنا
- ظفر: اس آرزو میں کہ اس کے پاؤں کے چھٹے کوئی مجھے بنا دے
 ۳۶۶ اِدھر تو ہے سیم ماہِ خالص، اُدھر زیرِ کتابِ خالص

۳۵۷ ایضاً، ۲۰: ۵ (دب) ۳۵۷ ایضاً، ۵: ۱۴ (الغ)

۳۵۸ دیوان شاکر ناجی، ۱۰۲

۳۵۹-۳۶۵ کلیاتِ نظیر اکبر آبادی، ۲۲: ۱۰۳، ۱۱۹: ۱۵۲، ۶۵: ۷۵۹، ۳۱: ۶۹۳

یہ دیکھیے دیوانِ مصطفیٰ (انجمنِ ترقیِ اردو)، ۶: ۱۳۵ (الغ) ۳۵۷ دیوانِ ظفر، ۳۵

امداد ادب کا سماجی پس منظر

ہاتھ رخسار تلے دھو کے نہ سو یا کیجیے

۳۶۷

رہتے عارض پہ ہیں چھٹوں کے نشان

چودانی، کان کا ایک، زیوریں میں مٹی کے چار دانے لگے ہوتے ہیں۔ ۳۶۸

جڑاؤ بوڑی ایک چودانیوں کی ادراک جوڑی چمکتی لونگوں کی

یک طرفہ کانوں کی وہ چودانیں پڑی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں

رنگین، سادی چودانیاں بنائیں چار اور گھٹنا بہت کیا تیار

چنپا کلی: طلائی خواہ فقری، سادہ یا جڑاؤ، گلے کا ایک زیور جس کے دانے چنپا کے پھول کی کلی کے مشابہ ہوتے ہیں۔

جڑاؤ دمکتی وہ چنپا کلی رہی جس سے الماس کو بیکلی

تلے اس کے موتی لگے گرد گل کہ جوں شبہم آلودہ ہو برگ گل

چنپا کلی کو دیکھ گئے ہاتھ پاؤں پھول

۳۶۹

بالے کے جھونک سب مرے اداں لے گئے

افشا: پھیلی ڈنک سے سامعین نازک بدن کی بیل

۳۷۰

چنپا کلی سے آن بھڑی نور تن کی بے سیل

۳۷۱

دیکھ چنپا کلی کو خوں روتی

۳۷۲

۳۷۳

۳۷۴

۳۷۵

۳۷۶

۳۷۷

۳۷۸

۳۷۹

۳۸۰

شکر ناجی، دلبری حسن کا زیور ہے جو ناجی، ہو بنلاؤ
 ۳۷۶ دل اگلتا نہیں چنپاکی اور مالوں میں
 اب تجھ سے میں ایک کوڑی بھی نہیں مانگی
 ۳۷۷ ہاں کھول تجھے اپنی میں چنپاکی روٹی
 چوڑی، چوڑیاں سونے یا چاندی دونوں قسم کی ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ یہ کانچے، خواہ بلوہ
 اور لاکھ سے بھی بنائی جاتی ہیں۔ یہ کلائی میں پہنی جاتی ہیں۔
 ۳۷۸ رنگین، گہر میں ایسی چوڑیاں دس ہیں کہ ہاتھوں میں آئیاں پھنس پھنس
 کیا کہوں عالم اس کی چوڑی کا گنڈ لی مارے ہو جیسے کالا ناگ
 نفرا ایک تو آفت تیری گوری کلائی گول ہے
 ۳۷۹ اور پھر اس میں غصب چڑی ملائی گول ہے
 چندن ہار دھگے کا ایک زیور۔ اس میں چاند پڑے ہوتے تھے۔
 ۳۸۰ بنا یا یہ نورتن چندن ہار جگنو، چمپا کی، کرن پھول، اے یارا
 چاند پشانی پر پہننے کا ایک زیور۔
 ۳۸۱ چاند ہتا کتا وہ جو زیب جمیں لعل خاتم بنا تھا ہوس کے حزمیں
 چھٹی، فقری دھلائی اور جڑاؤ ایک زیور کا نام ہے، جو ہاتھ میں چوڑیوں کے درمیان پہن
 جاتا ہے۔

چوڑیوں میں حسن بھرتی ہیں جڑاؤ چھتیاں

یا کین عشق جڑتی ہیں جڑاؤ چھتیاں

چھتیاں ہیں جڑاؤ ہاتوں میں

دکشی کی ادا ہے ہاتوں میں

۳۷۷ کلیات نظیر اکبر آبادی، ۶۹۳

۳۷۸ دیوان شکر ناجی، ۱۶۹

۳۷۹ دیوان ظفر، ۱۲، ۱۶۹

۳۷۸ تذکرہ مجمع الانتخاب

۳۸۰ دیوان حسرت ظہری، ۱۷۱ (ب)

۳۸۱ دیوان معنی، ۱۵، ۱۴۰ (الف)، ۱۴۷ (الف)

امدادیہ کا سماجی پس منظر

چھاگل: چاندی کا زیور جو پیروں میں پہنا جاتا ہے، اس میں گھنگروں کے ہوتے ہیں۔
میر: چھاگل کے وہ گھنگروں کی آواز عشاق کے دل پہ برق انداز
حمایل: چھوٹی تقطیع کا قرآن شریف جسے فقری یا ملائی پتروں میں منڈھوا کر گلے میں
ڈالتے ہیں۔

رنگ عاشقی نہو کیوں رشک سے اصغر، جب ہوں
۳۸۲
پھول گیندے کے تھے وہاں زیب حمایل دوچار
۳۸۳
پھول بن کر تجھ میں اے گل کی حمایل رہ گیا

خلخال: - پازیب، پیر کا ایک زیور۔
۳۸۴
وہ جو پاؤں کی ادس کی تھی خخال سوکھ کر ہو گئی تھی رشک ہلال
اگر خخال پائے یار کی ہم کو صد آئے
۳۸۵
نکل آدینکے پیش از عشر ہم مضطر ہوئے

دست بند: موتی کی لڑیاں، جن کو عورتیں ہاتھوں میں پہنتی ہیں۔
۳۸۶
وہ پہونچی زمر دنگی اور دست بند نراکتیں گئی شاخ گل سے دو چند
دگر گوش، کان کی تو میں ایک چھوٹا سا حلقہ مثل بالی کے ہوتا ہے، اس میں ایک موتی پڑا
ہوتا ہے۔

۳۸۷
دگر گوش جب اس کا تابندہ ہو صدف کا دل صاف شرمندہ ہو
۳۸۸
میر: رخسار کے پاس دو دگر گوش ہے پہلوے ماہ میں مستند
انفا: ہے یوں دگر گوش اس کی زلف کے حلقے میں
۳۸۹
ہبتاب میں کالے کا جس طرح سے من نکلتے

۳۸۲	دیوان معصی، ۱۵: ۲۸ (ب)	۳۸۳	مجموعہ نثر، ۱: ۱۶۸
۳۸۴	دیوان معصی، ۱۵: ۱۴۷ (الف)	۳۸۵	ایضاً، ۱۴۹: ۱۴۷ (الف)
۳۸۶	مجموعہ شہنویات میر حسن، ۶۹	۳۸۷	ایضاً، ۵۷
۳۸۸	فرہنگ زیوریت (قلبی)، ۹۲: ۱	۳۸۹	کلیات انفا، ۱۳۷

اردو ادب کا سماجی پس منظر

کنگن، دست برنخن۔ کلائی کا زیور ہا سے جو ہے دندیاں بھی کہتے ہیں۔
 جیسے کنگن گیا تھا ہاتھ سے چوٹ موتیوں کی بڑی تھی مالا ٹوٹا^{۲۰۱}
 باہو دہنچی دکنگن، بچ بڑی سرسوں تھی پاگ جواہر میں جڑی^{۲۰۲}
 چمن چمن بچیں ہاتھ بچ کنگن چمن چمن کریں پاؤں بچ... پیچمن^{۲۰۳}
 فیروزی: ایک قسم کا کان کا زیور تھا۔ آئین اکبری میں اس زیور کا نام نہیں ملتا۔ گمان غالب ہے
 کہ یہ بعد میں ایجاد ہوا۔

صدف درختے گر آدینہ گوہر سے وہ کان
 پہنی فیروزی تو لک اور بھی سنگین ہوئے^{۲۰۴}
 عقدِ گوہر

تیرے کانوں میں دیکھا ہے میں جب سے عقدِ گوہر کو^{۲۰۵}
 میری نظروں سے پیارے گر گیا ہے خوشہ انجم کا
 علی بند، ملائی یا نقری زیور جو شیعہ حضرات لوگوں کی کلائیوں میں باندھتے ہیں۔
 مصطفیٰ: مارا ہے آج علی بند نے مجھے دوا انگلیاں بھی کم نہیں کچھ ذوالفقار^{۲۰۶}
 قول کا چھلا: وہ چھلا جو بطور مہدیادداشت کے واسطے عاشق اور معشوق ایک دوسرے کو
 دیتے ہیں اس چھلے کی ساخت اس طرز پر ہوتی ہے کہ آنسو نیچے کا حصہ اس طرح ملا ہوا ہوتا
 ہے، گویا کوئی ہاتھ میں ہاتھ دے کر قول کر رہا ہے۔ یہی چھلا اکثر باہم لیا دیا جاتا ہے۔
 انشا: ان انگلیوں میں قول کے چھلے لٹھڑے والند، تم تو سخت چھلے نظر پڑے
 مصطفیٰ: چھلے کو قول کے وہ کر بند کیوں کے کھوئے

جب یاد نہ ہو اس کے تئیں گراس کا

- | | | | |
|-----|----------------------------|-----|-------------------------|
| ۲۰۱ | دہم، مصطفیٰ، ۱۶: ۱۲۰ (الف) | ۲۰۲ | دیوان فائز، ۲۰۶ |
| ۲۰۳ | ایضاً: ۲۱۹ | ۲۰۴ | دیوان مصطفیٰ، ۲: ۷۸ (ب) |
| ۲۰۵ | دیوان مصطفیٰ، ۵: ۱ (الف) | | |
| ۲۰۶ | دیوان فائز، ۲: ۱۸۱، ۱۸۲ | | |

کرن پھول: کان کا ایک زیور

میر حسن: وہ آنکھوں کی مستی وہ مڑگاں کی نوک

کرن پھول کی اور بالے کی جھوک

معصی: تھے کرن پھول وہ جو مثل چراغ غمِ فرقت میں ہو گئے تھے داغ
چشمِ نرگس بھی جھپیں دیکھ کے شرمائے ہے

کیا کرن پھول ہیں کانوں کے پیارے زور

فائز: مڑکی دنتہ، مانگ، ڈیکا، کان پھول دیکھ کر گئی سدا سکل تن من کی بھول
نظیر: سدا لے گئی بالے کی جھمک، صبر کرن پھول اور عقل کو بندے

بالے کی گئی جھوک لگا سینہ میں اک پھول، دل لے گئے جھمکے

ہزار گل کی بہا میں نہ ہو سکیں تھمر تمہارے ایک کرن پھول کی بہا کے ساتھ
جھمکے جھمکے وہ انریا کے کرن پھول وہ پھول

مبندے بالے پری موتی پری اور کان پری

کان کا موتی، بالا اور بابیوں کے ساتھ موتی آدینزاں کیے جاتے تھے۔

بوسے رخسار کا وعدہ کیا کس نے وفا!

کان کا موتی تلک تیرے لگتا ہی رہا

کان کا موتی تیرے ہلتا جواے مہ پارہ تھا

مشنری اس کا تلک یا سب سے سیار تھا

کانوں میں یہ نہیں ہیں اس رخک ماہ کے موتی

تارے سے ہیں چمکتے اپنے نظر تلے دو

۴۰۷ دیوان معصی، ۳: ۷۸ (ب)

۴۰۸ مجموعہ نظری: ۱: ۳۲۹، اردوئے معلیٰ (سوزنبر): ۱: ۲۵۷، ۲۶۸؛ دیوان شاکر جنت

۲۵۱، ۱۹؛ دیوان فائز: ۱۸۲

۴۰۹ کلیات سودا، ۱: ۱۷۶، ۱۷۷؛ دیوان نظری: ۲: ۲۲۶

کڑا : بچوں اور عورتوں کے ہاتھ یا پاؤں میں پہننے کا سونے چاندی کا حلقہ جو سادہ اور جڑاؤ
بھی ہو سکتا ہے۔ دست برنجین، پابرنجین :

میر حسن : وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے

جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے

طلائی کڑے اور کفک کا وہ رنگ

سنہری شفق جس کو ہو دیکھ دنگ

وہ الماسی کڑے پاؤں میں موٹے کہ جن کے ہاتھ دل عاشق کا ٹوٹے

وہ مہندی، اور کڑے وہ گھو کر کے انار میں گلبند کی وہ بھبھو کے

انشا : اسے، نہ آواز سنا دیں مجھے دنگ اگر

اپنے پاؤں کے کڑوں کو تو تم بچا سکتے ہیں

نیلے ڈورے توڑ بھی ڈال اپنے دونوں پاؤں کے

کیا بھلا موٹے، کڑے، سونے کے توڑے اڑ گئے

کل ایک گھر میں خوب سے چھوٹے بڑے لڑے

ہاتھوں سے ہاتھ اور کڑے سے کڑے لڑے

معنی : الماسی کڑے کلائیوں میں حل کردہ قمر صفائیوں میں

تختے کڑے ہاتھ کے جوہرہ نما پیس کر کھا گئی تھی وہ پیرا

زنجین : سنہرے ہاتھوں کے واسطے وہ کڑے

سادہ کاری سی خوب اس نے گھر لے

۴۱۰ مجموعہ فتویات میر حسن : ۳۱، ۳۲، ۳۸، ۱۸۲، ۱۵۵

۴۱۱ کلیات انشا : ۱۹۰، ۱۱۲، ۱۱۹، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰

۴۱۲ دلبران معنی : ۱۵، ۱۱ (الف)، ۱۱ (ب)، ۱۱ (ج)، ۱۱ (د)، ۱۱ (ه)، ۱۱ (و)، ۱۱ (ز)، ۱۱ (ح)، ۱۱ (ط)، ۱۱ (ی)، ۱۱ (۲)، ۱۱ (۳)، ۱۱ (۴)، ۱۱ (۵)، ۱۱ (۶)، ۱۱ (۷)، ۱۱ (۸)، ۱۱ (۹)، ۱۱ (۱۰)، ۱۱ (۱۱)، ۱۱ (۱۲)، ۱۱ (۱۳)، ۱۱ (۱۴)، ۱۱ (۱۵)، ۱۱ (۱۶)، ۱۱ (۱۷)، ۱۱ (۱۸)، ۱۱ (۱۹)، ۱۱ (۲۰)

۴۱۳ مجمع التناقب نیز دیکھیے کلیات نظیر کبریا : ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰

۴۱۴ مجموعہ نظریات : ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰

اردو ادب کا سماجی پس منظر

میر ہاتھوں میں جبراً ڈکڑے تھے تار سے خشک میدان میں جڑے تھے
 نظیر تھی پہنچے دونوں ہاتھوں میں کافر جو کڑے گنگا مینی
 ۴۱۴ کچھ شوق کٹوں کی جھنکار میں کچھ جھکے چوڑی پاہوں کی
 ۴۱۵ وہ کافر صبح، جی دیکھ جسے سو بار قیامت کا لڑے
 پازیب، کڑے، پائل، گھنگرو، کڑیاں، چٹریاں، مجرما، ٹوٹے
 ۴۱۶ ظفر، کرنی مضطرب ہے دل سدا ایک پہن کر پاؤں میں کڑے نہ پھرو
 کیل، ایک زیور جو لوگ کی شکل کا ہوتا ہے، اردو میں ناک میں پہنتی ہیں،
 معصی، کیل ہیرے کی کس کی ناک میں ہے مبرے دل میں گڑی جو کیل ہی ہے
 گوکھرو، ایک غار دار زیور۔ یہاں کازیر ہے۔ بعض لوگ اسے جھپے دتیاں یا لنگن بھی کہتے
 ہیں،

شیخ خادم علی کبیر علی خادم، چھاتی پر اس کی یاد میں بھرتا ہے سانپ سا
 ۴۱۷ ہے گوکھرو کی لہر جو اس کے سینہ بند پر
 سوزا دیکھ کے لہرائے یہ دل کہتا ہے گوکھرو اور دینت کی یہ بناوٹ خاصی
 گھنگرو، ایک قسم کے بجنے والے گھنگے کا نام جسے اکثر ناچنے والے اپنے پیروں میں باندھتے ہیں
 یا عورتیں پہنتی ہیں، پازیب وغیرہ اردو جڑے میں بھی نصب کیے جاتے ہیں، تاکہ چلتے وقت
 خوب آواز دیں۔

گھنگر و جودم نزع لگا بولنے ہمد! ۴۱۸
 اس تارِ نفس پر مجھے طنزور کی سوچی ۴۱۹

۴۱۴ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۵۸-۲۵۹

۴۱۵ ایضاً: ۲۵۹ ۴۱۶ دیوان ظفر، ۲: ۱۰۷

۴۱۷ مجموعہ نظیر، ۱: ۲۳۲

۴۱۸ اردو معنی (سوزنبر، ۳۱)؛ نیر دیوان شاگر ناجی: ۱۱۵؛ مجموعہ غنویات میر حسن: ۱۵۵

۴۱۹ مجموعہ نظیر، ۲: ۱۱۳

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے وہ بالوں کے گھنگر دھمکتے ہوئے
گوشتوارہ: کان کا آدیزہ۔

گوشتوارے کا گہر مر جائے ہو کر بیقرار

دیکھ تجھ رخ کی صفائی کوں سدا پکڑے ہے کان^{۲۲۱}

مکھ پر یہ گوشتوارہ موتی کا جلوہ گر جیسے ظران باہم سواہ و مشتری کا^{۲۲۲}

لچھا: ہاتھوں اور پیروں کے بھی لچھے ہوتے ہیں۔ ایک پتھار یعنی ایسا بھی ہوتا ہے جسناؤں
عورتیں ساعدیسمیں میں پہنتی ہیں۔ لچھے سادہ اور پرکار دونوں قسم کے ہوتے تھے۔

وہ مختولوں کے لچھے ان میں پرکار چمک سے جن کی شرمندہ ہو گلازار^{۲۲۳}

وہ زنجیروں کے پاؤں بیچ لچھے قیامت دل کے شیں گتے تھے اچھے^{۲۲۴}

لچھے ہیں یہ ریشم کے، نہ یہ خطِ خواہی ہے مہر بھی اک عالم نیرنگ میں کھڑا^{۲۲۵}

لونگ: عام طور پر عورتیں کانوں کے چھیدوں میں اس زمانے میں لونگ پہن لیتی ہیں، جب وہ
اور زیور نہیں پہنتیں کہ کہیں وہ چھید بھرنے جائیں۔ ویسے لونگ ناک کے ایک زیور کا بھی
نام ہے، جو لونگ کے مشابہ ہوتا ہے۔

میں نے دیکھی ہے اس کے کان میں لونگ^{۲۲۶}

مُرکی: کان کی پھولدار سونے کی کیل جسے عورتیں کانوں میں پہنتی ہیں، اس کو دھوپ یا گھوٹھو بھی
کہتے ہیں۔

میر: خوش آب ہیں تیرے کانوں کی مُرکیاں کیا خوب

صدف سے ہونگے نہ ایسے دھنیں پیدا

۲۲۱ دیوان شاکر ناجی: ۱۸۲

۲۲۸ مجموعہ شغلیات میر حسن: ۳۷

۲۲۲ کلیات سودا، ۱: ۱۱۲، ۱۱۱

۲۲۳ یعنی مختولوں کے لچھے معیش و ضیو کے پھندے

۲۲۴ مجموعہ شغلیات میر حسن: ۱۵۵ ۲۲۵ ایضاً: ۱۵۶

۲۲۶ کلیات انشا: ۱۸ ۲۲۷ کلیات انشا: ۱۹۹

جرات، صبح کا تارا بجل ہو دیکھ بندے کی تنگ

۲۲۸

دیکھ سو سوچ یہ جسٹاؤم کیاں تھرتا ہے

۲۲۹

فانز، مڑکی دنتہ، مانگ، ٹیکا، کان پھول دیکھ گئی سہ سکل تن من کی بھول

منگرا، کان کا طلائی یا نفرتی زلیور جو منگر چھ کی شکل کا ہوتا ہے۔ اسے ادب پرہ کوئی بھی کہتے ہیں

خود سے دیکھا، تو کیا کیا دل کی پھلی کے، نظیر!

گھات میں رہتے ہیں بالے کے منگر دونوں طرف

۲۳۰

مالا، موتی یا سونے کا ہار۔ سگ ہر وارید۔ اہل دہلی موت بولتے ہیں۔

۲۳۱

دہ موتی کے مالے نکلتے ہوئے رہیں دل جہاں سر پکیتے ہوئے

۲۳۲

دو دلا، ملا دہ بھی اُربسی رین باری میں گہنے کے پھٹی

موتی کی لڑی، نظم گہر۔ عقد لالی، موتیوں کی مالا، کان کا نانا زلیور۔

معصی، تم نے حسن اپنے کو چو چند کیا، نام خدا!

موتیوں کی لڑی کان میں ڈالی، کیا خوب!

مانگ کے موتی، سر کی مانگ کے درمیان، موتیوں کا زلیور۔

انفا، موتیوں سے جو بھری مانگ وہ دیکھی اس کی

۲۳۳

سیر سے تاروں بھری دلت کی جی جالتے ہٹ

معصی، مافق سے یہ کہتے ہیں تیرے مانگ کے موتی

۲۳۴

زینبہ بیک ملک گہر ہو گئی یہ شب

نظیر! رہیں ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام دھرموتی

۲۳۵

جیہیں پر موتی، اندھیر میں موتی، مانگ پر موتی

۲۲۹ ایضاً: ۲۰۶

۲۲۸ دیوان فاکز: ۲۰۶ (طاشیر ۲)

۲۳۱ مجموعہ غنویات میر حسن: ۶۸

۲۳۰ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۹۹

۲۳۲ کلیات انفا: ۲۰۶

۲۳۲ دیوان فاکز: ۲۰۶

۲۳۵ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۵۵

۲۳۴ دیوان معصی: ۲۰۶ (دب)

امداد کا سماجی پس منظر

میرزا، بھری ناگ موتی سے جلوہ گناں نمایاں شب تیرو میں کہکشاں^{۴۳۶}
 ظفر، بھری جو موتیوں سے اس نے ناگ، حیف، ظفر!
^{۴۳۷} نہ ترے گوہرِ مژگانی در افشاں سے بھری
 نتھ، ناک کا ایک زبرد۔ چاندی یا سونے کا ملکہ جو سہاگ کے دن سہاگینیں پہنا کرتی ہیں۔
 نتھ کے ملکہ کا دیکھ کر عالم ناک میں آ رہا ہے اپنا دم^{۴۳۸}
 مصطفیٰ، ملکہ میں نتھ کے چنے جو ہی موتیوں کے بچ
^{۴۳۹} یہ بوند کس کے خونِ جگر کی ہے، کیا کہوں
 نتھ ناک میں ہارے مرتھے یا قلزمِ حسن کے بہنور تھے^{۴۴۰}
 حسن کی آرائش، ایسی بھی تو نہ آساں سمجھو
^{۴۴۱} لاکھ نتھ ٹوٹیں جب اس کے کان کا بالا بنا
 کسی کے چمکتے ہوئے نورتن کسی کے وہ مکھڑے پہ نتھ کی بھین^{۴۴۲}
 لوگنا، عورتوں کے بازوؤں کا ایک زبرد۔ اس میں نو لگیئے ہوتے ہیں۔
^{۴۴۳} جڑاؤ جوڑی اک چوہا نیوں کی ادراک جوڑی چمکتی نو لگوں کی
 نورتن، ایک قسم کا جڑاؤ زبرد۔ اس میں نوجواہر کے لوگ ہوتے ہیں جیسے ہیرا، پتہ، نیلا، ہانگہ،
 لعینا، پکھراج، موتی، لعل، مرجان، زمر، فیروزہ وغیرہ۔ اس کو امیرزادیاں اور بیگمات بازو
 پر پہنتی تھیں۔

-
- ۴۳۶ مجموعہ غزلیات میر حسن: ۷۸
 ۴۳۷ دیوان ظفر، ۲: ۳۱۹
 ۴۳۸ مجموعہ غزلیات: ۲: ۲۷۱، ۲۷۷
 ۴۳۹ دیوان مصطفیٰ، ۱: ۷۱۵ (العت)
 ۴۴۰ ایضاً، ۱: ۷۱۵ (العت)، ۱: ۷۱۵ (العت)، ایضاً، ۲: ۳۳ (ب)، ایضاً، ۶: ۲۹۳، ایضاً، ۱۱
 ۱۱، کلیاتِ تکریم کر باہی: ۱۵۹، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴

مدد ادب کا سماجی پس منظر

۴۴۴ وہ ترکیب ادب چاندیاد بدن وہ بازو پہنٹھکتے ہوئے نورتن

ہمارے مورچوں پر نورتن باندھے تھے انھوں نے

۴۴۵ کہی بھینتی کہہ کہ چتر کیا دس کا جوڑا

بدن میں چاندی زرخش، سراپا جس پر زیب آمد

۴۴۶ کرے، بندے، چھڑے، اچھوٹی، نورتن ہیکل

یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے

۴۴۷ جھلک کسی کے دمپٹے میں نورتن کی کسی

جھلکتے ہیں ستارے جس طرح باریک بادل میں

۴۴۸ ترے بازو پہ زیر آستیں یوں نورتن جھکے

۴۴۹ کسی کے چمکتے ہوئے نورتن کسی کے وہ کھڑے پتھر کی پگھلی

۴۵۰ ہیروں کا نورتن نہیں تیرے، بھٹے ہیں جمع

یہ چاندنی کے پھول، مگر کھل کے، چاندیاں

ناد علی؛ سونے یا چاندی کی تختیوں پر ہشت بہل رخاہ چار گوشہ ناد علی کو کندہ کرا کے لغز

حفظہ دنج نظر بد خوش اعتقاد مسلمان اپنے بچوں کو پہنتے ہیں اور حسین عورتیں گلے میں پہنتی

ہیں۔ اکثر ناد علی زہر مہرے کی تختی پر کھودتے ہیں۔ اس وجہ سے زہر مہرے کی تختی کو بھی جو گلے

میں ڈالنے کے واسطے بنائی جاتی ہے، ناد علی کہتے ہیں۔

انشا؛ ممکن نہیں اس پر نظر بد کا اثر ہو زہر میں علی بند بھی ہے، ناد علی بھی

ہمیکل؛ تعویذ، ایک زہر جو گلے میں پہنا جاتا ہے۔

۴۴۴ ایضاً؛ ۲۵، ۵۶، ۵۹، ۶۹، ۷۱، ۷۵ کلیات انشا؛ ۱۲۵، ۱۳۵

۴۴۷ کلیات نظیر اکبر آبادی؛ ۱۳۷ ایضاً؛ ۱۳۳

۴۴۸ کلیات قاسم؛ ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰

۴۴۹ مجموعہ مثنویات میر حسن؛ ۲۵

۴۵۰ دیوان لغز، ۲؛ ۱۸۱، ۱۹۱، ۲۰۱، ۲۱۰

جواہر سے مینے کی ہیکل جھڑی کمر اور گولے کے نیچے بڑی
 وہ الماس کی ہیکل اک خوشنما تصور رہے جس سے دل کا ٹکڑا
 وہ ہیکل جس کو دیکھے دل کو پہل وہ چھلے جس کے اندازوں میں چل بل
 تعویذوں میں ہیکل کے کیا تعبیر اس کو

پرویں کی جوتا آئے شب ان پانڈ کی لٹ
 کھل سے روز کہ تعویذوں کی خدا میں ہو کر

اس کے ہیکل میں پڑنے لکھی دل دو چار
 مگر گڑھا ہٹ جو سنی، صنم اتیری ہیکل کی

کل گئی اور محو میرے دل بیسکل کی
 بدن میں جا آئے زرخش، سراپا جس پر زیب آد

کڑے، بندے، چھڑے، چھلے، انگوٹھی، توڑی ہیکل
 اگر کہتے کہ ہم ہیں ہیکل، ذرا گلے مل تو ہنس کے ظالم

دکھا دے ہیکل اٹھا کے، یعنی بلا سے میری، مجھ کو کل
 دیکھی جو اس محبوب کی ہم نے جھلک ہیکل کی کل

ہائی ہر ایک تعویذ میں اپنے دل بیکل کی کل
 پیسے دھو کر تیرے ہیکل کے تعویذ دیے بھینک دے سب مل کے تعویذ

۴۵۱ مجموعہ شغویات میر حسن: ۶۹، ۱۵۶، ۵۶

۴۵۲ ایضاً: ۶۹ ۴۵۳ ایضاً: ۱۵۶

۴۵۴ دیوان معصی: ۵، ۲۸ (ب) ۴۵۵ ایضاً: ۵، ۱۵ (الف)

۴۵۶ ایضاً: ۳، ۷۱ (الف)؛ ایضاً: ۶، ۶۲

۴۵۷ کیا حقیقتیں اکبر آبادی: ۱۰۳ ۴۵۸ ایضاً: ۱۰۴

۴۵۹ ایضاً: ۱۰۵

۴۶۰ دیوان غفر: ۳، ۳۶

ہار: موتیوں یا پھولوں کی مالا۔

۴۶۱ وہ ہاتھ ٹوٹ جائیو، یارب اشب وصال
جس ہاتھ سے گلے کا تیرے ہار توڑے

۴۶۲ رشک سے اشک نہ کیوں ہار گلے کے ہوں میرے
سینہ یار سے ہے موتیوں کے ہار کو فیض

۴۶۳ پہن کر ہار گلے میں جو وہ سویا شب کو
پڑھئے گردن نازک کپکپی ہار کے خط

۴۶۴ بندھا جواں گلوں کا تار دیکھا، تو اس نے ہنس کر یہ مجھے پوچھا
تو نے اپنے گلے میں ڈالا یہ موتیوں کا ہار کیسا

۴۶۵ کہتا تھا میں گلے کا ترے ہو پڑ گیا ہار
دیکھا نہ گل کو سر پہ چڑھانے کے کیا کیا

ہنسلی: نقری یا ہلائی گلے کا زیور۔

۴۶۶ پہنے پھرے ہیں شوق کڑے اوز نہیلیاں
پھولوں کی میوہیوں میں ہیں شاخیں اُرس لیاں

۴۶۱ دیوان معصوم، ۱۹، ۲۶۲؛ نیز دیکھیے مجموعہ غزل: ۱، ۱۳۹، ۱۵۸، ۱۷۶، ۵۸

۴۶۲ دیوان نظریات: ۱۳۶ ۴۶۳ ایضاً: ۱، ۱۳۹

۴۶۴ ایضاً: ۳، ۱۴

۴۶۵ کلیات سودا، ۱: ۱۱۷، ۱۶۷، ۱۱۷؛ مجموعہ غزلیات میر حسن: ۵۶

۴۶۶ کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۲۲

پریم چند — ماضی اور حال کا ادیب

ایک فوجوان ہونے کا فاضلہ نگار سے باتوں کے دوران میں پریم چند کا ذکر نکل آیا۔ اُن کا خیال تھا کہ پریم چند جدوجہد آزادی کے زمانے میں تھے لہذا اُن کے دور کے مسائل اور تھے، آزادی کے بعد کے مسائل اور ہیں۔ اس وقت ادب، جدوجہد آزادی کی وجہ سے سماج میں پیدا ہونے والی اجتماعی پھل اور حرکت کے ساتھ زیادہ وابستہ تھا اور آج انسان کی انفرادی زندگی کی محدودیوں اور تنہائیوں سے زیادہ وابستہ ہے، اس وقت ادیب اُسی جدوجہد کا ایک حصہ تھا اور ادب و معانیات یہ ہیں کہ ادیب کسی کا پابند اور کسی کو جوابدہ نہیں، وہ مکمل طور پر آزاد ہے۔ اُس وقت ادب کی طرزِ براہِ راست اور سادہ تھی کیونکہ منزل صاف تھی؛ اب چاروں طرف پیچیدگی ہے۔ اس لیے ادب بھی بلا واسطہ اور پیچیدہ ہے۔ آزادی کی جلد بڑے وقت پر سے ملک میں اُمید کی لہر تھی؛ آزادی کے بعد اس کی جگہ مایوسی نے لے لی ہے، لہذا ادب میں بھی اس مایوسی کا موجود ہونا لازمی و ناگزیر ہے۔ آزادی سے پہلے بین الاقوامی رنگ و معانیات ہمارے ادب پر کم اثر انداز ہوتے تھے، آج زیادہ ہمارے ملک میں سماج کا ڈھانچا بڑی حیرتی سے بدل رہا ہے، پُرانی قدیں بدل رہی ہیں، نئی ہندو متحکم نہیں ہوئی ہیں، اس صورتِ حال کی وجہ سے نفسیاتی پیچیدگی بڑھ رہی ہے جس کا نتیجہ ادب میں بھی گھٹک، ابہام، مادرائی کیفیات اور داخلیت کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔ اگر آج ہم ان کیفیات کو ادب میں جگہ نہ دیں، تو حقیقت پسند نہ ہونگے اور اس لیے یہ ادبی مصیبت

اور ادب کے وہ نمونے اور وہ موضوعات جو پریم چند نے پیش کیے تھے، وہ اُن کے وقت کے لیے درست اور صحیح تھے، ہمارے لیے آج وہ تقویم پارینہ ہو چکے ہیں۔ وہ موضوعات پرکرنے ہو چکے ہیں۔

واقعاً مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ اُس نوجوان نے اتنا سوچا اور یقیناً حالات کی جو تصویر اس نے پیش کی، وہ بھی درست ہے۔ لیکن یہ صرف آدمی حقیقت ہے اور اس نے اس حقیقت سے جو نتیجہ اخذ کر کے، ادب کے لیے جس رخ کا تعین کیا، وہ میرے خیال میں قطعاً درست نہیں ہے۔

میں آج کل عام طور پر دیکھتی ہوں کہ پریم چند کی اہمیت کو گھٹانا اور ان کے قائم کیے ہوئے ادبی میبادوں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کچھ فیشن سا بنتا جا رہا ہے۔ اس کوشش میں رجعت پسندوں کا بھی کچھ ہاتھ ہے؛ اور باہری ادب کے اُن "متوں کا بھی اثر ہے" جو ہمارے ملک کے لیے بالکل غیر موزوں ماحول نامناسب ہیں۔ ساری دنیا میں ادیب کی آزادی کاغزوہ لگا کر اسے سلج کو بدلنے کا ایک زوردار آڑ کا رہنے سے روکنے کی جو شعور ہی کو بخش کچھ اطراف سے ہر دہی ہے، اس کا بھی اس میں دخل ہے۔ لیکن ساتھ ہی کم از کم میں یہ نہیں ماننا چاہتی کہ ہمارا نوجوان ادیب اتنا سلی ہے کہ وہ صرف ان سب باتوں ہی سے متاثر ہو کر پریم چند سے دُور ہٹ رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ادیب بنیادی طور پر ہمیشہ پُرانی ٹوکر سے ہٹ کر چلنا چاہتا ہے، وہ اپنی تخلیق میں سدا ایک نیا پن پیدا کرنا اور اپنے بزرگوں سے آگے جانا چاہتا ہے۔ اس کی یہ خواہش نہایت مستحسن ہے !

ایک مرتبہ کسی ادبی محفل میں ایک نوجوان ادیب نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا تھا کہ یہ بڑے ادیب جن سے اُن کی مراد کرشن چندر وغیرہ تھے، قطب مینار کی طرح ہمارے راستے میں کھڑے ہیں، اُن کو ڈھاننا چاہیے۔ میں نے اُن سے آہستگی کے ساتھ کہا: بھائی! ہم نے تو جبر میٹری میں یہ پڑھا تھا کہ کسی لکیر کو چھوٹا ثابت کرنا ہر تو اس کے برابر میں اس سے بڑی ایک لکیر کھینچ دی جائے۔ قطب مینار کو ڈھانے کی کیا ضرورت، اس کے برابر میں

ایک اسکاٹی اسکریپر کھڑا کیجیے۔ مگر یاد رکھیے کہ آرن سیمنٹ اور لوہا اور انسان کی محنت اتنی سستی ادھالتو نہیں ہے کہ آپ صرف بنانے کی خاطر کوئی چیز بنا دیں گے۔ اگر وہ اسکاٹی اسکریپر لوگوں کے رہنے یا کام کرنے کے لیے نہیں، آپ کی تفریح شان کے لیے ہوگا، تو اس کا ٹھہرنا تو درکنار بن ہی نہیں سکیگا۔

سوال یہ ہے کہ ہندوگوں سے مختلف ہونے کی کوشش، اُن سے آگے بڑھ جانے کا ارادہ نہایت مستحسن، مگر اس کے لیے بھی تباہی کوئی سیار ہونا چاہیے۔ ادب میں پڑانے اور نئے کا رشتہ زمین اور بیج کی مانند ہے۔ زمین وہی ہے، لکھو کھاساں پڑانی، لیکن نئی اور پہلہاتی فصلیں سال میں دو دو بار ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ ہر سال اس زمین کو تیار کیا جائے، اس میں نیا اور عمدہ بیج ڈالا جائے۔ یقیناً ہم ہر سال نئی ہی فصل چاہتے ہیں، لیکن نہ تو زمین کے بغیر نئی فصل کا تصور ہو سکتا ہے، نہ نئے بیج کے بغیر۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج حالات پریم چند کے زمانے سے مختلف ہیں لیکن میں یہ نہیں مانتی کہ وہ موضوعات ختم ہو گئے جو ان کے زمانے میں تھے۔ پریم چند ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے صدارتی خطبے میں کہتے ہیں:

ہم اتنا بدو، اور حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ سب ہی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر مساوات کی عمارت کھڑی کرنی چاہی، مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی، اور آج اعلیٰ وادنے کی تفاوت جتنی بیدردی سے نمایاں ہو رہی ہے، شاید پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس بات کو ایک حقیقت سمجھ کر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے؛ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے، جہاں وہ مساوات، اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قانون کی صورت اختیار کرے۔

کیا آج بھی یہ واقعہ نہیں ہے اور زیادہ شدت سے نہیں ہے کہ کچھ لوگ امیر تر ہوتے جا رہے ہیں اور زیادہ لوگ غریب تر؟ منصوبے پر منصوبہ بن رہا ہے اور پڑھے لکھے پستور گار لو جو انوں کی تعداد بڑھ رہی ہے؛ اُن میں سمجھنی، پریشانی، بدعالی اور اس کے

نتیجے کے طور پر نظمیں، انتشار اور تشدد کا رجحان فطری طور پر بڑھ رہا ہے۔ مسادات کیلئے آج حوا اقدام حکومت کی طرف سے بھی ہوتا ہے، وہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جاتا پھر یہ موضوع تعزیم پارینہ کیسے ہو گیا؟

پریم چند کی متعدد کہانیوں کا ایک مخصوص موضوع ذات پات کی تفریق اور رسوائی فرسودہ و نظام رنگ اکودہ کی عکاسی تھا۔ کیا گزشتہ چند سال میں ہمارے ملک میں ہر بچوں پر نظام نہیں ہوئے؟ فرقہ وارانہ فادات کی ہیبت سے ہمیں دوچار نہیں ہونا پڑا؟ کیا زندگی کے سلسلے میں آج بھی لائق فوجانوں کے بدلے بارسوخ لوگوں کے نالائق رشتے داروں کو ترجیح نہیں دی جاتی؟ اب شیڈیل کا سٹ کا اثر ناک لفظ عام طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ کیا اس کا یہ نتیجہ تو نہیں نکلیگا کہ رعایت پانے والے کو ہر وقت یہ بات یاد آتی رہیگی کہ میں بھی تھا اس لیے مجھے یہ رعایت دی گئی۔ کیا فیض ابھی تک ٹھونگ سے کچھ زیادہ ہے؟ کیا عورتیں آج جینز کی لعنت میں پہلے سے زیادہ گرفتار نہیں؟ — اگر یہ سب کچھ صحیح ہے، تو پھر پریم چند کے یہ موضوعات آج پڑانے کیوں سمجھے جائیں؟ جب تک کسی نئے ادیب کا تخلیق کیا ہوا کوئی افسانہ "کفن مے آگے نہیں جاتا، کوئی نیا ادیب پریم چند سے آگے جانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

میں تسلیم کرتی ہوں کہ آج لوگوں پر حد درجہ احساس محرومی طاری ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اب لوگوں کی بہت بڑی تعداد کام پر لگی ہوئی ہے، محنت مشقت کر رہی ہے اور بڑی جرات کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ساتھ ساتھ اپنے حق کے لیے لڑ بھی رہی ہے۔ اسی انسانی ریلے کا ایک فرد ادیب بھی ہے؛ اس راہ میں جو سب پر گنتی ہے، وہی اسے بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ احساس طبیعت رکھنے کے باعث وہ حالات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ — پریم چند نے کہا ہے: "جماعت کی ہستی کے ساتھ اس کی ہستی بھی قائم ہے، جماعت سے الگ وہ ایک صفوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جن کو جتنی ہی بہتر تعلیم اور ذہنی قوی حاصل ہیں، ان کا دھڑ سدا

کی اتنی ہی زیادہ ذمہ داری مائد ہوتی ہے، اس معیار کے مقابلے میں آج کل ادیب کی انفرادیت کا ایک نمبر چل پڑا ہے، جس سے بالعموم یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ ادیب کی کوئی سماجی ذمہ داری نہیں، وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں — ان دونوں باتوں کو سامنے رکھیے تو ایک اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ ادیب کی ذات اور اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سماج کی کیفیات کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ اگر ماحول میں انتشار و بے نظمی، بے عنوانی اور مایوسی ہے، تو ادیب کو اس سے کس طور پر متاثر ہونا چاہیے؟ میں ادیب کی ذات اور اس کی انفرادیت کی بڑی شدت سے قائل ہوں، مگر میں اس کی عظمت اور انفرادیت اس میں سمجھتی ہوں کہ بیشک، وہ ماحول کی مایوسی کا عکاس ضرور ہو، لیکن اس کا شکار نہ ہو، چاروں طرف جتنی بھی مایوسی ہو، ادیب اس گھپ اندھیرے میں بھی اپنے دل میں امید کا چراغ روشن کیے رہے، اس کا یہ اعتقاد کہیں نہ ڈوگلائے کہ خصلتِ انسانی بنیادی طور پر نیکی کی طرف مائل ہے، محنتِ انسانی بالآخر کامیاب ہوگی — یہ کام بہت مشکل ہے، لیکن اگر ادیب اس مشکل پسندی کو نہیں اپناتا تو پھر اس کا امتیاز اور انفرادیت کس بات سے ثابت ہوگی؟ — پریم چند نے لکھا ہے: ”ہمارے لیے وہ جذبات ہیمنی ہیں جن سے دنیا کی بے خباتی ہمارے دل پر اور بھی مسلط ہو جائے، جن سے ہمارے دلوں پر اندھ مایوسی طاری ہو جائے.... داخلیت وہ شے ہے، جو جمود، پستی اور سہل انگاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لیے نہ اجتماعی حیثیت سے مفید ہے، نہ انفرادی — میرے خیال میں یہ معیار جتنا درست اور بر محل آج ہے، اتنا وہ پریم چند کے زمانے میں بھی نہیں تھا۔

یقیناً پریم چند نے یہاں جو لفظ انفرادی استعمال کیا ہے، وہ بڑا اہم ہے۔ آج کل افسانوں میں ایک ترکیب استعمال ہوتی ہے: ”میرے اندر کائنات“۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ہم پڑانے قسم کے زبان دان تو ہیں، کو برے معنی میں استعمال کرتے ہیں جب کسی کو مغرور و خود پسند معاہدہ پرست کہنا ہو تو کہتے ہیں: ”ظان میں تو بڑا میں ہے“

یہ میں ہمہ تن ادیب کو کسی اندھیری کوٹھری میں ڈھکیل دیتی ہے، جس میں روشنی اور آکسیجن کے لیے روزانہ تک نہیں ہوتے۔ پریم چند نے لکھا ہے: ”جو سچا آرٹسٹ ہوگا وہ خود برستی کی زندگی کو پسند نہیں کر سکتا، وہ اپنے اطمینان قلب کے لیے نرالیش کا پہلا نہیں لے سکتا۔“

آج کل افسانوں میں ایک ردِ محال یہ بھی دیکھتی ہوں کہ بڑے معنوں میں غیر معمولی (جسے ABNORMAL کہہ لیجیے) کردار، ذہنی الجھنیں، جنسی براہِ رویاں پسندیدہ موضوعات بن گئے ہیں۔ ان کو بڑھ کر میرے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان ہی موضوعات کا انتخاب کیوں؟ اگر یہ واقعہ ہے کہ ادیب انہی چیزوں پر قلم اٹھاتا ہے، جو اس کے دل کو لگتی ہیں، تو ادیب کے دل کو اتنے سارے کردار چھوڑ کر یہ طیرھا میٹرھا کر دیتا کیوں پسند آیا؟ اتنے بہت سے سماجی مسئلے ہیں جن کا اثر ادیب پر بھی پڑنا ناگزیر ہے، تو ان کو رد کر کے یہ ایک الجھا پلجھا نفسیاتی مسئلہ ہی اسے کیوں بھایا؟ کیا یہ ادیب صرف حیرت کے جذبے کے تحت لکھتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں پانی ناقص ہے اور مٹے تلخ کیا اب، اس لیے کہی کھار منہ کا مزہ بدلنے کے لیے یہ بھی اچھی لگ سکتی ہے۔ لیکن اگر صرف اسی کے استعمال کی عادت پڑ جائے تو آخر میں جگر پھلنی ہو جاتا ہے۔ ادیب سماج کا معالج ہے، لیکن اگر وہ خود ہی اس بیماری میں مبتلا ہو جائے، تو کب کیا کہیے گا؟ یہی ناکہ اس نے اپنے پیشے کے ان اصولوں سے بے احتیاطی اور لاپرواہی برتی، جن پر اسے شدت سے قائم رہنا چاہیے تھا۔ ایسے ادیبوں کے متعلق پریم چند نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابھی ان کی نگاہیں اتنی وسیع نہیں ہوئی ہیں کہ وہ کشمکش جیتا میں زندگی کے حسن کا عروج دیکھیں۔ اور یہ کہ ”آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کر کے اسباب و حالات کو بایدیگی کے لیے سادہ کار بناتا ہے۔“ میرے خیال میں ادیب جب تک معمولی میں غیر معمولی یعنی اچھے معنوں میں غیر معمولی دیکھنے کا اہل نہیں بنتا، وہ معمولی سے عظیم ادیب نہیں بن سکتا۔

ہر طرف ”ادیب کی آزادی“ آج کل ایک زبردست فحشو ہے۔ ظاہر ہے کہ اصولاً اس

سے کون اختلاف کر سکتا ہے! مگر یہ آزادی کیسی ہوا اور کس لیے؟ اس سلسلے میں بھی پریم چند کا نام ابھی تک سرِ فہرست ہے۔ اس نے ادیب کی آزادی کے نعرے تو نہیں لگائے، مگر ایسی تخلیقات ضرور کیں کہ جنہیں انگریزی شہنشاہیت نے جلا دینا ضرور سمجھا۔ آج ہم اس بات کو تو مانتے ہیں کہ محلات پریم چند کے زمانے سے بدتر ہیں، لیکن ہم آپ میں سے کس کی تحریروں کو صاحبانِ اقتدار نے اتنا مٹو کر سمجھا کہ ان میں الگ لگادی جائے؟ کبھی کسی کتاب کے ممنوع قرار دیے جانے کی خبر آتی بھی ہے، تو حنیات یا مذہبی تعقبات کے الزام میں! پریم چند ایسے ادیبِ آزاد قلم کا خیال ایک طرف یہ تھا کہ ”ادیب انسانیت، علویت اور شرافت کا علمبردار ہے، جو پامال ہیں مظلوم ہیں، محروم ہیں، اُن کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے اور سوسائٹی اُس کی مدالت“۔ اور دوسری طرف اس کا یہ خیال تھا کہ ”ادب سیاسیات و وطنیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں، بلکہ ان کے آگے آگے مشعل دکھانے والی حقیقت ہے“۔

ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھیے، تو یہ معیار بنتا ہے کہ پریم چند کی نظر میں ادیب اپنے سماج کا سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد زبان انسان ہوتا ہے؛ اس میں اتنی جرأت ہوتی ہے کہ نہ کوئی بات برسرِ اقتدار طبقے کے ڈر سے، اپنے مفاد کے حساب سے، اور نہ اپنے کے مصلحتات کے لحاظ سے نہیں، کسی کی نقل میں نہیں، بلکہ اپنے یقین اور اصول کے مطابق کہتا ہے۔ اور اس لیے اس کی ہر تخلیق کے قدم مضبوطی سے اُس کی دھرتی میں گڑے رہتے ہیں، اس کی شخصیت اور انفرادیت کثرت میں وحدت کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ وحدت جس کا ظہور اور خہر و کثرت ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ پریم چند کا یہ معیار ان طبقات کے بالکل خلاف جاتا ہے جن کی کوشش یہ ہے کہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ ادیب کو زیادہ سے زیادہ سرج سے کاٹ دیں۔ اُسے اُس کی انفرادیت کی انیون، ذات کی آزادی کی شکر میں لپیٹ کر اس حد تک دے دیں کہ وہ اس اصول ہی سے مشکوک ہو جائے کہ سرج کو بدلنے میں ادب کا بھول کو ہٹا ہے جو ہیرے کا جگر کاٹ سکتی ہے۔ کیونکہ سرج میں صمند تبدیلی، نیچے دبی

پریم چند

ہوئی اکثریت کے لیے راہ حیات ہے تو اور بڑھتی ہوئی اقلیت کے لیے پریم موت!
ایک ادیب ہونے کے ناتے میں یہ انتی ہوں کہ ادیب کو حکم نہیں دیا جاسکتا۔ مگر ساتھ ہی
میرا یہ عقیدہ ہے کہ ادیب سے امید بھی کی جاسکتی ہے، اس سے گلہ بھی ہو سکتا ہے
اور یہ تو تسلیم شدہ امر ہے کہ جس سے ہوتی ہے امید، اُسی سے گلہ ہوتا ہے! اگر لاکھوں
انسان کسی ایک انسان کی نوکِ قلم کو اپنی نوکِ زبان سمجھنا چاہتے ہیں تو یہ اس صاحبِ
قلم کے لیے انتہائی مسرت اور فخر کی بات ہونی چاہیے، اور اس عظیم اعتماد کا جب اگرچہ چند
الفاظ میں دے سکے تو یہ سودا نہایت ارزاں ہے!

ہم میں سے ہر ایک کو پریم چند کی زندگی کا علم ہے۔ کیسی مشکل، پریشانی اور بد حالی میں
انھوں نے اپنی ساری عمر گزاری۔ لیکن کم از کم مجھ کو ان کے کسی افسانے میں اس تنہائی
اور فرطِ طیش کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا، جس کی آج اس قدم ہائے ہائے بچی ہوئی ہے۔
مانا، ہر فنکار پر اکیلے ہونے کا احساس کبھی کبھی طاری ہوتا ہے، مگر یہ تو ہر انسان پر بھی
کبھی کبھی طاری ہوتا ہے۔ تو پھر اس احساس کا راگ الاپتے رہنے میں ادیب کی کیا
فضیلت ہوئی؟ اور اگر ایسا ہی تنہائی سے عشق ہے، تو سنیاں کیوں نہ لے لیا جائے؟
کم از کم دوسروں کی جان تو آپ کی محرومی کا دکھڑا سننے سے بچ جائیگی۔ اس غیر مستمند
روحان کا علاج تو وہی ہے، جو ایک عینی کہارت میں کہا گیا ہے: ”مجھے اس کا فہم تھا کہ
میرے پیروں میں جوتے نہیں، یہاں تک کہ میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس
کے پیروں میں جوتے تھے۔“

کچھ دن پہلے میں نے ایک تنقید نگار کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ انھوں نے جدید ادب میں
اس ذاتیاتی رنگ، تنہائی و محرومی کے احساس کی یوں تاویل کی تھی کہ مشینوں کی وجہ
سے زندگی میکانیکی ہو گئی ہے؛ چنانچہ محبت، مروت، دوستی، رفاقت سبھی ختم ہو گئے
ہیں، چنانچہ ادیب تنہائی محسوس کرتا ہے اور اپنے آپ میں بند ہوتا جاتا ہے۔ میں
حیران رہ گئی کہ اتنے بڑے کلمے آدمی نے یہ کیا کھ دیا ہے؟ ہندوستان کے سماج کو یہ یقیناً
منفق سوسائٹی نہیں کہا جاسکتا! یہاں مشینیں کہاں ہیں؟ پھر جب وہ حالات ہی نہیں تو

سوچنے کا یہ طریقہ کہاں سے آیا؟ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ یورپ ہی کے کچھ ملکوں میں مشینیں اگر انسان کے لیے لعنت ہیں تو کچھ ملکوں میں برکت — جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے فولاد کی بنی تو اور مجاہد کے ہاتھ میں اعلان حق ہے تو ظالم کے ہاتھ میں علامت جبر و استبداد — پس قصور مشینوں کا ہے یا نظاموں کا؟

مجھ سے کئی فوجوان ادیب کہتے ہیں: ”آج کل ہندوستان میں جدوجہد ہی کونسی ہو رہی ہے؟ آزادی کی لڑائی میں منزل صاف تھی، اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا“ — پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے: ”اگر گورے کی جگہ کالا اور جان کی جگہ گودند ٹیٹھ جائے، لیکن کرے وہی جو جان کرتا تھا تو اس کے خلاف بھی وہی کرونگا۔ جو جان کے خلاف کرتا“ اور پریم چند کی تخلیقات دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف انگریزی حکومت ہی کے خلاف نہیں تھے، انھوں نے اس چیز پر بھی کاری فرمیں لگانے کی کوشش کی، جسے انھوں نے ”مہاجنی تہذیب“ کا نام دیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں سے پوچھتی ہوں کہ ”انا“ آزادی مل گئی، لیکن کیا آپ آج کے حالات سے مطمئن ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو سوچیے، اس عالم اسباب میں کوئی نتیجہ بغیر سبب کے ظاہر نہیں ہوتا۔ اس لیے سوچیے اور اس سوچ میں پریم چند آپ کا سب سے بڑا رفیق اور سب سے قریبی دوست ثابت ہوگا۔

موضوعات اور نفس مضموں سے متعلق اتنی بات کے بعد اب میں بیان کے متعلق دو ایک باتیں کہنا چاہتی ہوں۔ افسانے کی زبان کے لیے بھی وہی معیار ہونا چاہیے، جو مولانا حالی نے ابن رشیق کے حوالے سے شعر کے لیے قائم کیا تھا۔ یعنی ایسی زبان ہو کہ ہر بڑھنے والا سوچے ایسی تو میں بھی لکھ سکتا ہوں، مگر لکھنے بیٹھے، قونہ کھ سکے۔ حالی کے اسی معیار کو پریم چند نے کسی قدر مختلف انداز میں یوں لکھا ہے: ”آئینہ دل کی وسعت کے ساتھ زبان طوطی خود سلیس ہوجاتی ہے۔ حسن معنی آرایش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو امر کا ادیب ہے وہ امر کا طرز بیان اختیار کرتا ہے، جو عوام الناس کا ہے، وہ عوام کی زبان کھیلتا۔“ مگر ان ہندوؤں کی دھن باتوں سے الگ ایک اور قسم کی بھی زبان آج کل نظر آتی ہے۔

— ابھی ہوئی زبان، جسے ہندی کے ادیب امرت لال ناگر، ”جلیبی اسٹاکس“ کہتے ہیں۔ میری نظر میں اس زبان کی دو وجہ ہیں — ایک تو سیدھی سی دھبہ ہے کہ خیالات میں الجھن ہوگی، تو بیان میں بھی ضرور ہوگی۔ پریم چند نے سیاری زبان کی ایک اور تعریف بھی کی ہے: ”ادیب جس ذہنیت یا زاویے سے کسی امر کو دیکھے، اس میں اس کا پڑھنے والا بھی اُس سے متفق ہو جائے۔“ اس جملے میں ذہنیت اور زاویہ دونوں بڑے اہم لفظ ہیں۔ حالات کے اسباب و علل کا علم حاصل کر کے، کسی نتیجے پر پہنچنے کے زبان و بیان میں مہارت حاصل کرنے کے بعد کسی واقعے یا کردار یا صورت حال کو ادب کی شکل دینا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا پتھر کو مہیقل کر کے آئینہ بنانا۔ اس لیے جب پریم چند ذہنیت اور زاویہ کی بات کرتے ہیں تو گویا وہ ادیب سے اس تمام ریاض کی اُمید کرتے ہیں جو ذہنیت اور زاویہ بنانے میں صرف ہو کر اُسے ادب کی تابانی بخشی ہے۔ جو ادیب کو شروع کر کے کل بڑا کہلانے کا خواب دیکھتے ہیں، انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ جہاں تک سیوا کا سوال ہے اور خاص کر نثر میں، وہاں یہ نہیں چل سکتا کہ کاتا اور لے دوڑی! پہلے فکر سلیس ہو، پھر بیان نفیس — تب ادب بنیگا۔

پریم چند نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ ”افسانے میں جہاں کہیں ایسا موقع آتا ہے، جہاں طبیعت پر زور ڈال کر شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے، تو میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔“ کیا اس حقیقت سے انکار ہو سکتا ہے کہ ٹپس کی ایک رات، ٹوڑھی والی تشکر، قید گاہ، اندھکن، ابھی تک ادو افسانے کے تابندہ شاہکار ہیں، جن میں نثر اور شعریت بڑے کمال کے ساتھ گھل جلی گئی ہے؟

یہ بھی کہیں کہیں سننے میں آتا ہے کہ پریم چند کے یہاں سپاٹ پن ہے۔ اس کی شکایت غالباً انہیں ہوگی جو یا تو سادگی کے حسن کو پوری طرح نہیں سمجھتے، یا سادگی و پُرکاری جن کے بس کا لوگ نہیں ہے، کیونکہ زبان پر انہوں نے ابھی تک اتنا عبور حاصل نہیں کیا بیان پر محنت کو انہوں نے اپنا شیوہ نہیں بنایا۔ زبان پر عبور کا ذکر کرتے ہوئے میں اپنے

پریم چند

فوجان ساتھیوں سے ایک سلسلے میں ہمدردی رکھتی ہوں۔ مجھ سے ایک نو عمر ادیب نے کہا تھا کہ ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اردو ہاتھ سے چھٹ گئی، ہندی آتی نہیں، انگریزی بہر حال بدیسی زبان ہے اور جب ہمارے حرام ابھی ستر فی صدی اپنی زبانوں میں ہی اُن پڑھ رہے ہیں تو انگریزی کو کون کہے۔۔۔ اُس کی یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی کو ادیب بننا ہے تو وہ ریاض کرے، وردہ شعر گفتن چھ ضرور۔۔۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیال بھی فن تو جیسا کہلائیکا، جب وہ کوئی آڈی لباس پہن لیگا۔ وہ رنگ ہو یا لکیریں، پتھر ہو یا الفاظ! پریم چند نے زبان کو منزل پر پہنچنے کا ذریعہ بتا دیا ہے۔ آپ سوچیے کہ راستہ اور بڑا کھارٹ ہو گا، یا ایسا جسے ہر دم گم ہی کرتا رہے، تو اس کے منزل تک پہنچنے کا سوال ہمیشہ سوال ہی رہیگا!

میں نے جان بوجھ کر اس مضمون میں اپنے اُن ساتھیوں میں سے کسی کا نام نہیں لیا، جن کے یہاں مجھے یہ رجحانات نظر آتے ہیں۔ جو نہ کہ فی الحال اپنی ذات وغیرہ اُن کے لیے بڑی اہم ہے، اس لیے خطرہ ہے کہ کہیں وہ مجھے اپنے ایک خیر خواہ دوست کے بجائے ناصح نہ سمجھ بیٹھیں! ناصح تو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا، پھر ان کو کیوں لگے! البتہ وہ یہ سمجھے رہیں کہ جن صحرا میں انھوں نے قدم رکھا ہے، اُس میں پریم چند ایسے دیوانوں کے نقش پا بھی موجود ہیں!



عوام سے دھوکا

مذمو کے پرچوں ماب تول میا
 اگر ایک فیصدی کی سبھی غلطی ہر تو پر سان
 عوام کے ساتھ ۱۰۰ کروڑ روپیہ کا
 دھوکا ہوتا ہے۔
 آپ اس سے بچ سکتے ہیں۔
 سرکاری نشان والے ماب تول کے
 صمیم بیازوں سے سامان خریدیے۔
 غلط ماب تول کی نشانیات اپنے علاقہ
 کے انسپکٹر ماب تول سے کیجئے۔
 ماب تول کے اعتشاری پیمانے
 گاہک کی حفاظت کرتے ہیں۔

وفیات

عادل رشید - سید محمد منظور الحق

داغ کے مشہور شاکر و نوح ناروی کا ایک شعر ہے :

چڑھیں ریل پر اور پہنیں سسرا تھو

سرا تھو سے نو میل و کمن ہے نارا

یہ جغرافیہ اور محل وقوع انہیں اس لیے بتانا پڑا کہ ایک صاحب نے ان سے پوچھا تھا کہ حضرت! یہ نارا کہاں ہے، جس کی نسبت سے آپ ناروی کہلاتے ہیں۔ نوح ٹھہرے شاعر اور شاعر بھی ایسے کہ شعرا کی کاغذی کلام تمام انہوں نے جواب میں یہ شعر کہ دیا۔ سائل کی تسلی ہو گئی۔ خدا کرے کہ آپ کی بھی ہو جائے اور آپ مجھ سے یہ نہ پوچھنے لگیں کہ ہم کو نئے اسٹیشن سے ریل پر چڑھیں؟ اور سسرا تھو کہاں ہے؟ میں شاعر نہیں ہوں اور نوح صاحب بھی ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۲ کو اللہ کو پیارے ہو گئے، ورنہ کہتا مان سے پوچھیے۔

تو ناں کا یہ فقہ اس سے یاد آیا کہ عادل رشید بھی ۲۰ نومبر ۱۹۹۲ کو اسی نارا میں پیدا ہوئے یہاں ان کی نا اخیال تھی۔ ان کے نا ملا جی یہاں کے بہت بڑے پیر تھے۔ جب یہ پیدا ہوئے میں تو ان کے نا نا آبا کرک دنیا کر چکے تھے۔ اور ان کے بیٹے میڈ شاہ حسام الدین احمد عادل کے ماموں، مسند سجاد کی پر رونق افزہ تھے۔

وفیات

عادل رشید کا اصلی نام محمد منظور الحق تھا۔ ان کے والد سید شاہ محمد فضل الحق خلع الہ آباد کی تحصیل سرانہو کے قصبہ رشید مئی کے جاگیردار تھے۔ یہ جاگیر انھیں بزرگوں سے ودائے میں ملی تھی، جہاں وہ اپنے آبائی مکان کٹرا انچپور سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ بزرگوں میں قضاۃ اور طبائے پشتوں تک رہی تھی۔ چنانچہ عادل رشید کے پردادا اور پردادا سید شاہ محمد عبدالحق بھی اس علاقے کے نامہ ہوئے حکیم تھے۔ دادا نے ان کے پیدا ہونے ہی اعلان کر دیا کہ میں اپنے پوتے کو طب کی تعلیم دے گا اور حکیم بناؤں گا۔ لیکن قدرت کو منظور نہیں تھا۔ دادا ابا کا سال بھر بعد ۱۹۲۱ء میں انتقال ہو گیا۔ والد شاہ محمد فضل الحق کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی، انھیں اپنی کیفیت باطنی کے علاوہ صرف انھیں چیزوں سے دلچسپی تھی، جن سے اس عہد کے دوسرے جاگیرداروں کو دلچسپی تھی اور اس میں کئی طرح کی بازیاں شامل تھیں۔ اس کے برعکس ان کی والدہ ماجدہ (امتہ الفاطمہ) پڑھنے لکھنے اور علم و ادب کا ذوق اپنے میکے سے ساتھ لائی تھیں۔ ان کی بڑی تہمتا تھی کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر ادیب اور مصنف بنے۔ ان کی تہمتا اور دواپوری ہوئی۔ لیکن افسوس کہ وہ اسے دیکھنے کو زندہ نہ رہیں۔ عادل صرف آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۸ء میں ان کی والدہ رحلت کر گئیں۔ اس زمانے میں خاندان کا پھر میں رہتا تھا۔

۱۹۳۱ء میں کانپور میں زوروں کا فساد ہوا تھا۔ شاہ محمد فضل الحق اس سے ڈر گئے۔ انھوں نے مستقبل کے موموں خطروں سے بچنے کے لیے کانپور سے نقل مکان کر الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی وہاں ان کے رشتے دار اپنے محلے دائرہ شاہ رفیع الزماں (حکیم بادشاہ) کے گویا مالک تھے محلے میں رفیع الزماں لائبریری نام کا ایک دارالمطالعہ تھا جس میں ملک بھر کے مشہور رسالے اور جرائد آتے تھے۔ عادل نے اگرچہ علم و ادب کا ذوق اپنی والدہ سے ودائے میں پایا تھا، لیکن اس ذوق پر جلا نہیں ہوئی۔ وہ باقاعدگی سے اس لائبریری میں جلتے اور یہاں رسالوں کا مطالعہ کرتے۔ اسی سے بڑھ کر انھیں خود بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کا سب سے پہلا افادہ قرص "کے عنوان سے کانپور کے رسالے مستورات کے خاص نمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔

اس افادے تک وہ سید محمد منظور الحق عادل رشید میٹروی تھے۔ عادل تخلص اور رشید میٹروی وطن سے نسبت ادنیٰ طلب است۔ لیکن بعد کو دیکھا کہ نسبت کبھی رشید میٹروی چھپ جاتی ہے کبھی

رشید میٹھی، تو انہوں نے اسے بکیرا ڈال دیا، جس سے وہ عادل رشید بن گئے۔ بعد کے زمانے میں وہ اس نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ آج شاید ہی کوئی ان کا صحیح نام محمد منظور الحق جانتا ہو۔ شروع میں وہ بہت دن تک نعت اور قوالی لکھتے رہے۔ اس زمانے میں ان کے چند گانوں کے ہزار سطر اس وائس کمپنی نے گراموفون ریکارڈ بھی تیار کیے تھے۔

۱۹۳۵ء میں وہ والد کے سلوک سے جنھوں نے دوسری شادی کر لی تھی، تنگ آکر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ حال آنکہ وہ اس زمانے میں اسلام آباد کالج میں زیر تعلیم تھے اور اس کی تکمیل کی منزل ہنوز بہت دور تھی۔ وہ پہلے بریلی گئے۔ یہاں سے اس زمانے میں ایک ماہنامہ شاہد شائع ہوتا تھا۔ ساحر قدوائی (مال ڈاکٹر ساحر بریلوی، لائل پور، مغربی پاکستان) اس کے مالک اور مدیر تھے۔ عادل صاحب اس رسالے میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں ساحر صاحب اس رسالے کو ساتھ لے کر دلی آئے، تو عادل بھی ان کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ وہ یہاں تین برس رہے۔ اس زمانے میں وہ یہاں کے ہفتہ وار پرچے جمیل کے بھی مدیر رہے۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۴۰ء میں قسمت آزمائی کرنے کو بجٹی کی راہ لی۔ ادھر ساحر نے دیکھا کہ وہ اکیلے شاہد کو نہیں چلا سکتے۔ انھوں نے پرچہ عادل کے سپرد کر دیا اور خود واپس بریلی چلے گئے۔ عادل بجٹی پہنچے تو انھوں نے اسے ہفتہ وار کر دیا اور وہیں سے شائع کرنے لگے۔

بجٹی بڑا غبار شہر ہے اگر کسی شخص کو دنیا کا نام نہ ملے تو اس کے لیے بجٹی میں کامیابی حاصل کرنا محال نہیں، تو بہت مشکل ضرور ہے۔ عادل بھی اس فن سے نااہل تھے۔ لہذا انھیں بھی ہر طرح کی مشکلات سے گزرنا پڑا، جن میں خاتے اور رات کو بازان کی پٹری پر سونا بھی شامل ہے۔

یہاں بجٹی میں ایک صاحب تھے سلطان حسین۔ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے، لیکن کتابیں چھاپنے اور ان کے بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ (سلطانی پریس) تھا، اس کے علاوہ لکھڑی کایو پار بھی تھا۔ غرض بہت کامیاب تاجر تھے۔ عادل کی ان سے دوستی ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ تجارت میں ان کے شریک بن گئے۔ انھوں نے شاہد بھی سلطان حسین صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس زمانے میں شاہد کا دفتر ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا مرکز بن گیا۔ بجٹی کے جتنے ادیب اور شاعر تھے، وہ عادل کے دوست اور شاہد کے دفتر کے مستقل حاضر باش تھے۔ سلطان حسین بھی عادل کو بہت اٹانتے

تھے، چنانچہ ان کی وساطت سے پہلے مستغول کو سلطان حسین صاحب سے مالی مدد ملی، مادل نے خود بھی کسی زمانے میں ایک انجمن صداقت پسند مصنفین قائم کی تھی۔ وہ اس کے صدر تھے، حیات وارثی اس کے سکتر تھے۔

لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کے خلاف پولیس ایکشن ہوا۔ خدام معلوم کس نے سلطان حسین کے خلاف رضا کاروں کی امداد کرنے کا اتہام لگایا۔ بس پھر کیا تھا، سلطان حسین مگر قتل کر لیے گئے۔ تین دن حالات میں رہے۔ آخر کار کرشن چندر اور عادل رشید انھیں ضمانت پر رہا کر لائے۔ تعینش پر الزام غلط ثابت ہوا۔ اور وہ بے قصور قرار پائے۔ لیکن اس تین دن کی حالات نے ان کے اوسان خطا کر دیے۔ وہ اسے اپنی انتہائی توہین اور ذلت تصور کرتے تھے۔ یہی کاسار کاروبار چھوڑ چھاڑ کر اچھے چلے گئے۔

سلطان حسین کے بھئی سے جلفے کے ساتھ ہی عادل رشید کا ادب بھی شروع ہوا۔ ان کا اپنا ہانہ پریم نجات اور اشتہاری کہنی جو انھوں نے کسی زمانے میں چلائی تھی، وہ پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ اب 'شاہ' بھی بند ہو گیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا عزیز ترین دوست ان سے پھٹ گیا۔ ان کے بچلے دل کے تمام دوست ہٹھ دکھا گئے اور کسی نے جھوٹوں بھی ان سے نہ پوچھا کہ بھائی بھوس حال میں ہو۔ نوبت فاقوں تک پہنچی۔ لیکن آفرین ہے ان کی ہمت مردانہ پر کہ وہ ان انتہائی مخالفت حالات میں بھی اپنے آپ سے مایوس نہیں ہوئے۔

اب انھوں نے قلم کا سہارا لیا۔ ان کے ناول مینہ کی طرح برسے لگے۔ ہر مہینے نیا ناول کسی مہینے دو دو بھی، پچھنے لگے۔ ان کے کم و بیش ڈیڑھ سو ناول شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کالمک کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ وہ آخر تک اپنے قلم کی کمائی کے سہارے عزت آبرو سے جیے۔

صحت بالعموم اچھی رہی، لیکن آخر کار متواتر کثرت کا لے پانا اثر دکھایا، کبھی کبھی بیمار بھی ہو جاتے تھے۔ اسی طرح کی کچھ شکایت محسوس کی، تو علاج کے لیے نانا دی اسپتال (دہلی) میں چلے گئے۔ وہیں پیر کے دن ۳ جنوری ۱۹۷۲ء صبح کے ساڑھے تین بجے دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کیا اور اسی شام جو مہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

وفیات

مادل نے ۱۹۴۱ء میں مدرا بیگم سے شادی کی تھی۔ مدرا، مسلمان الارشد، حال مدیر ماہنامہ اشباع، کراچی، کی سھو سچی زاد بہن ہیں۔ ارشد تھانوی ان کے ماموں تھے، شوکت تھانوی بھی رشتے میں ماموں ہوتے تھے ماس نیک بیوی نے مادل کا ہر حال میں ساتھ دیا۔ ان کے چھ بچے ہیں، چار بیٹیاں (ناہید اور تسنیم) اور نسریں (اور شاہینہ تنویر) اور دو بیٹے (جاوید اور گلریز)۔

بشیر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم

ان کا خاندان دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ہجرت کر کے دکن میں جا بیٹے تھے بشیر کے والد مولوی عبدالرحمن ریاست حیدر آباد دکن کے محکمہ سیاسیات میں مدکارا کسٹنس کے عہدے پر فائز تھے، اور والدہ شمس النساء بیگم، میرزا صادق علی بیگ تعلقدار کی سبھا بھتیجی تھیں۔ ماموں نے سبھا بھتیجی کی تعلیم و تربیت اپنی نگرانی میں کی۔ وہ خود اپنی طہریتی، فیاضی اور درویشانہ صفات کے لیے مشہور تھے شمس النساء بیگم نے جو اس ماحول میں تربیت پائی، تو یہی خصوصیات ان کے کردار کا بھی جزو بن گئیں۔ وہ بہت اچھی خوشنویس تھیں اور خطابت میں بھی ان کا شہرہ تھا۔

بشیر ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم سراسر نجی طور پر ہوئی۔ فارسی کی تحصیل بہت حد تک اعلیٰ درجے کی تھی۔ عربی میں قرآن بامعنی، تفسیر کے ساتھ پڑھا تھا۔ اردو اور فارسی شعرا کا وافر کلام تعلیم کے دوران میں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ چونکہ حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا، اس لیے اس کا بشیر حقہ یاد میں محفوظ رہ گیا، اور پھر اسی سے خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ جلد ہی کلام دلی کے رسائل عصمت، ساقی وغیرہ میں چھپنے لگا۔ شاہر دکن نے بھی ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ وہاں کے زمانہ رسائل شہاب، ناہید وغیرہ نے ان کی پذیرائی کی۔ نفاست طبع کے ساتھ شعر و سخن کے اس شغف کے باعث خواجہ حسن نظامی مرحوم (د جولائی ۱۹۵۵ء) نے انھیں چن آرا کا خطاب عطا کیا تھا۔

شروع میں مہتاب بخش پر شاد (د ۱۹۴۱ء) کے دیباری شاعر صادق حسین خبار سے شہورہ ملا

خبر نے جلد ہی کہہ دیا کہ کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔ ان کے بعد سید علی حیدر نظم جلالی (ف ۱۹۳۳ء) اور اپنے والد کے دوست ابو ظفر عبدالواحد صاحب سے کچھ استفادہ کیا تھا۔

وہ مدتوں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے شعبہ نسوان کی نائب معتمد رہیں۔ ڈاکٹر محمد الدین قادری زود مرحوم (ف دسمبر ۱۹۶۲ء) کو ان سے ہمیشہ پورا تعاون ملا اور وہ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دکن میں عورتوں کی تعلیم و ترقی میں ان کی مساعی بہت قابل قدر تھیں۔

ان کا مجموعہ کلام ”آئینہ شعر“ بھی ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) کی طرف سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، اس میں مذہب اور اخلاق کا جو مقام تھا، ناممکن تھا کہ اس سے متاثر نہ ہوتیں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی حمد و نعت پر متعدد نظمیں ملتی ہیں۔ یوں بھی انھیں غزل کی بہ نسبت نظم سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس دور کے شاعروں میں وہ اقبال سے بہت متاثر تھیں۔ انھیں بزرگان دین سے والہانہ عقیدت تھی اور ان کی بعض معرکے کی نظمیں اسی جذبہ کی مظہر ہیں۔ نظم کے علاوہ نثر سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔

۱۹۳۶ء میں مرزا حسن علی صفوی غازی میر عمار اور ٹھیکیدار سے نکاح ہوا۔ اتفاق سے وہ بھی ہم فخر بکلی۔ غازی صاحب کے والد یعنی بشیر کے خسر بزرگوار مرزا اکرام علی صفوی بھی شعر کے رسیا اور سخن شناس بزرگ تھے۔ انھوں نے بشیر کے ذوق شری کی تربیت کیا اور انھیں گھسریلو پریشانیوں سے بیکار کر دیا۔ اس سے بشیر نے بہت فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے ادا ورجہانی میں ایک صاحبزادہ (راشد علی صفوی) اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

صحت بہت دل سے غراب تھی۔ اسی میں یکشنبہ ۲۰ فروری ۱۹۷۴ء (۴ محرم ۱۳۹۲ھ) بعد مغرب حیدرآباد میں رحلت کی۔ جنازہ اگلے دن ۲۱ فروری کو اٹھا۔ نماز جنازہ مسجد شطابہ (دیرپور) میں ادا ہوئی اور انھیں قبرستان ملک پیٹ (مقابل ٹپہ خانہ صحیفہ) میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا رَاجِعُوْنَ۔ قبر کے لیے ان کے جان نثار شوہر غازی صاحب

نے سنگ مرمر اور سنگ سیاہ کا دلکش اور خوبصورت تعویذ تیار کر لیا ہے۔
بہت لوگوں نے تاریخ وفات کہنی حکیم محمد خواجہ شفیع حسن عارف (ابوالعلائی آقائی) کے
خطے کا آخری شعر ہے:

نما آئی رضوان سے، عارف، یہی
کہ کہہ دو: ٹھکانہ ہے خلد بریں
(۱۳۹۲)

جی اظمی

ان کا آبائی وطن قصبہ بہاراج گنج (ضلع اعظم گڑھ) تھا۔ جہاں وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً
۱۹۱۹ء میں انھوں نے مقامی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد فارسی کی
تعلیم اپنے والد مولوی ضیا اللہ سے پائی۔ مولوی صاحب موصوف پڑنے طرز کے مدرس اور
ردو اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کی اردو اور فارسی کی استعداد بہت اچھی
تھی۔ یحییٰ صاحب نے ان کی تعلیم سے پورا استفادہ کیا۔ بلکہ جب زمانہ تعلیم کے دوران ہی میں
انھیں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو کلام بھی والد ہی کو دکھایا۔ انھوں نے حوصلہ افزائی بھی کی
اور کلام پر اصلاح بھی دی۔

۱۹۲۰ء میں ہماری سیاسی تحریک نے نیا موڑ لیا تھا۔ خلافت تحریک بھی اپنے پورے شباب
پر تھی۔ نوجوان یحییٰ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ دراصل ان کی قومی اور ملی شاعری کا منبع یہی
سیاسی تحریکیں ثابت ہوئیں۔

جون ۱۹۲۵ء میں بعض احباب اور بزرگوں کی وساطت سے وہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے
دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق انھوں نے عمر بھر نباہا۔ یہیں کے قیام کے دوران میں انھوں
نے پرائیویٹ طور پر دسویں درجے کا انگریزی امتحان بھی پاس کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی
باقاعدہ تعلیم کسی درنگاہ کی مرہون منت نہیں تھی۔ اپنے وطن کے مڈل اسکول کا تعلق بھی
برائے نام رہا۔ جیسا کہ خود انھوں نے ایک مرتبہ بتایا تھا، انھوں نے جو کچھ بھی پایا، گھس کر
تعلیم سے۔ اردو فارسی کا ذوق ذاتی مطالعے اور فاضل بزرگوں اور شفیعوں کے فیض صحبت

اور حسنِ قرابت کا قیمہ تھا۔

دارالمصنفین میں انھیں جو فضا میسر آئی، یہ سراسر علمی اور ادبی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (د ف ۱۹۵۳ء) کی صحبت میں ان کے جذبہ شعر گوئی نے بہت ترقی کی، اب وہ برابر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ غالباً ان کی سب سے پہلی نظم جو معارف میں شائع ہوئی، وہ غازی نادر شاہ مرحوم دہلی افغانستان کے حادثہ قتل (۸ نومبر ۱۹۳۲ء) سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ یہ خطاب بملت افغانستان کے عنوان سے معارف کے دسمبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شامل ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ افغانستان کے مشہور ہندوستان دوست شاعر سرور خان گویا لے کیا تھا، جو ان کے اپنے جواب کے ساتھ دہاں کے رسالے کابل کی اشاعت ۶ جنوری ۱۹۳۴ء میں چھپا تھا۔ یہ بھی اعلیٰ نے پھر اس کا جواب فارسی میں لکھا، جو معارف کی اشاعت مارچ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اپنی قومی اور سیاسی شاعری کے باعث وہ قوم پرورد طبقہ میں نہ صرف متعارف تھے، بلکہ غلام مقبول تھے۔ چنانچہ ان کے کلام کا مجموعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (د ف مئی ۱۹۶۶ء) کے ایسا پر "نوائے حیات" کے عنوان سے حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے شروع میں مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔

کلام کا دوسرا مجموعہ نوائے عمر بھی جنوری ۱۹۴۷ء میں اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ پیش لفظ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا ہے۔

یہ بھی اعلیٰ مرحوم شبلی اسکول کے شاعر تھے اور ان کے ذوقِ شعری کی تربیت میں اقبال احمد سہیل کا بہت ہاتھ تھا۔ شبلی (د ف نومبر ۱۹۱۴ء) اور سہیل (د ف نومبر ۱۹۵۵ء) کا جتنا کامیاب تالیف انھوں نے کیا ہے، وہ کسی سے نہ ہو سکا۔ ان کے دونوں مجموعے اس دعوے پر شاہد مادل ہیں۔ انھوں نے رجالِ مصر سے متعلق جو نظمیں کہی ہیں اور ان میں کلام کا جو شکوہ ہے، اس سے ان کی قدردان زبان، فارسی میں دلک، فن کی مہارت ایک ایک مصرعے سے نمایاں ہے۔

شاعر کے علاوہ وہ ذاتی طور پر بھی بہت اچھے انسان تھے، درویش صفت اور انکسر مزاج اور قناعت کا مجسمہ۔ دارالمصنفین کی نوکری سے جو تنخواہ انھیں ملتی تھی۔ وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کو بھی

بھصل ہی کفایت کرتی ہوگی۔ لیکن اللہ کے اس نیک بندے نے مہر و شکر سے اس میں سادی زندگی بسر کر دی۔

انہیں کچھ عرصے سے جگر کی خرابی اور فشارِ دم کا عارضہ لاحق تھا۔ آخر میں صبرِ بول کے دہلے پڑنے لگے۔ اسی میں کوئی دو ہفتے کی طالت کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۷۲ء چار بجے شام رحلت کی۔ تدفین اگلے دن ۲۳ فروری صبح کے دس بجے ہوئی۔ نماز جنازہ حکیم محمد سحاق صاحب نے پڑھائی اور اعظم گڑھ شہر کے قبرستان میں دفن ہوئے، اپنے پیچھے جسمانی اولاد میں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑے۔

ناصر کاظمی، ناصر رضا

اگرچہ کچھ موردِ فانی زمینداری بھی تھی لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے خاندان میں سپاہبری اور فوج کی ملازمت پشتوں سے چلی آتی تھی۔ چنانچہ ان کے والد محمد سلطان بھی فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ بزرگوں کا وطن انبالہ شہر تھا۔ اور وہیں ناصر صاحب ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم ایف اے تک پائی۔ دسویں درجے تک اپنے وطن میں اور انٹر اسلامیہ کالج لاہور میں۔ بی اے میں تعلیم پار ہے تھے کہ بوجہ امتحان دینے سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ چھڑا، واپس انبالہ چلے گئے۔ یہاں دوڑدھائی سال گھر کی زمینداری کا کام دیکھتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں پھر لاہور چلے گئے اور اس کے بعد اسی شہر کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا۔ اولاً چند سے ایک نیم سرکاری دفتر میں نوکری کی تھی۔ لیکن ان کا مزاج ادبی تھا۔ یہاں دل کیسے لگتا! چنانچہ سال بھر بعد اوراقِ نو، ماہنامے کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ تین برس تک یہاں کام کیا اور ۱۹۵۲ء میں مشہور رسالے ہالیوں کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ وہ آخر تک یہیں رہے۔

انہوں نے شامی طالب علمی کے زمانے میں شروع کی تھی۔ اس دور میں ان پر میراورد فانی کا گہرا اثر تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب دوسرا دور شروع ہوا، تو وہ فانی کے جنگل سے آزاد ہو گئے اور ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ انہوں نے فزل میں وہ رنگ اختیار کیا، جو مسلسل فزل اور نظم سے قریب تر تھا۔ اب غیالات میں جنگل آگئی تھی۔ یہی اسلوب آخر تک قائم رہا۔ وہ میر کے کامیاب

وفیات

متبع کہے جاسکتے ہیں۔ وہی جذباتی دھیما پن اور کسک اور سپردگی کا لہجہ اور انداز جو میر کی خصوصیت ہے۔ لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکال لی تھی۔ میر کے علاوہ ان پر ہندی شاعری بالخصوص دوہے کا بھی نمایاں اثر تھا۔

ان کے کلام کا انتخاب 'برگ نئے' کے عنوان سے پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ابتدائی زمانے کے چند شعروں کے علاوہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۲ء کا کلام لیا تھا۔ جب کتاب دوسری مرتبہ (۱۹۵۷ء میں) شائع ہوئی، تو اس میں ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء کا انتخاب بھی اضافہ کر دیا گیا۔

۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا، اور ان کے ساتھ اردو کا ایک پختہ کان روایت کا پابند، وضاءری کا دلدادہ شاعر ہم سے جدا ہو گیا۔

آدمی کس کے سہارے زندہ ہے.....؟

زندہ رہنے کے لیے صرف روٹی ہی کافی نہیں۔ پیارا اور باہمی سُوجھ بوجھ بھی ضروری ہے۔ زندگی سے احساسات اور خوبصورتی کا بھی اتنا ہی گہرا تعلق ہے، جتنا کہ روٹی کا۔ جیسا ایک فن ہے اور منصوبہ بندی اس کی بنیاد۔ جب ہم دوسرے معاملات میں منصوبہ بندی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں تو کنبہ کو محدود رکھنے کے لیے بھی اس کا سہارا کیوں نہ لیں۔

زندگی میں پیارا تعاون، باہمی سُوجھ بوجھ کے لیے اپنائیے.....

خاندانی منصوبہ بندی



بچے ہم پر امید لگائے ہوئے ہیں

ہاں۔ ہیرمان کا خیال رکھنا چاہئے۔

اسکی ہر شے خاصہ دیکھ بھال کی ضرورت کی ہم پر ہی ہے۔ اپنی
فرک نا ہے کہڑے سادہ بھی تعلیم کی حق ہے۔ لہذا ہر کڑا نہیں اچھا سنگار
بھی لٹنا چاہئے۔ لیکن اگر بچے زیادہ ہوں تو کیا ہم ان کی تمام ضروریات
پوری کر سکتے ہیں؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔۔۔۔۔ چھوڑ گئے۔ کتبہ جتنا
پھرنا ہوگا اتنا ہی ہر بچے کو زیادہ پیلوں سکے گا۔

مفت مشورہ اور خدمت کے لئے فیملی ویلفیئر ٹنگ سوسائٹی
نظر میں ہے۔

تعمیر

علمی مجلسِ دہلی کا تہائی رسالہ

جلد ۶	مرتب: مالک رام	شمارہ ۳
۶۱۹۷۲		
مالک رام	ملاحظات	۲
پروفیسر نذیر احمد، مدرسہ شعبہ فارسی	مارا الا فاضل کی ترتیب نو پر ایک نظر	۳
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	ناگپور کے اخبار و رسائل	۷۷
سید محمد شرف الدین ساحل، ناگپور	نقد و نظر	۱۰۳
مابد رضا بیگار	وفیات	۱۰۷
مالک رام		
چندہ سالانہ (مع محصول رجسٹری ڈاک) ۱۵ روپے	اس شمارے کی قیمت	
غیر ملک: ۲/۱ پونڈ انگریزی یا ۷ ڈالر امریکی	۵ روپے	

پرنٹ و پبلشر نخل جاس جاسی لے کوہ فوڈ پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر
دفتر علمی مجلس ۴۲۹ چھتہ نواب صاحب فراشتادہ دہلی سے شائع کیا۔

ملاحظات

ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس سال 'تحریر' کی اشاعت ہماری تمام خواہشوں کے باوجود بہت ببقاعدہ رہی۔

یہ ۱۹۷۲ء کا تیسرا شمارہ ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ سال کا آخری شمارہ خواجہ غلام السید بن مرحوم سے مخصوص کیا جائے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اس کے مضامین کی کتابت بروقت مکمل نہیں ہو سکیگی۔ اس لیے فی الحال یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ بعد کو دیکھا جائیگا۔

۱۹۷۳ء کا پہلا شمارہ اردو کے مشہور شاعر اور بزرگ ادیب حضرت جوش ملیح آبادی سے مخصوص ہوگا، اور ہمیں قوی توقع ہے کہ اسی کے ساتھ 'تحریر' کی اشاعت بھی معمول کے مطابق آجائےگی۔

حکیم

مدار الافاضل کی ترتیب نو پڑ ایک نظر

مدار الافاضل فارسی زبان کی اہم لغت ہے جس کو فیضی سرہندہ نے اکبری مہد کے اواخر یعنی ۱۰۱۱ھ میں مرتب کیا اس فرہنگ کے اہم خصائص میں سے یہ بات ہے کہ مولف نے اس کی ترتیب میں صحت کتب سے مواد اخذ کیا ہے اکثر ان کے نام درج کر دیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں اس میں شعر کے کلام سے اکثر استشہاد ہوا ہے، مگر بسا اوقات شاعر کا نام ظہور نہیں ہو سکا ہے، بعض مقامات پر تاریخی کتابوں کے حوالے سے بھی واقعات درج ہوئے ہیں۔ انھیں وجوہ کی بنا پر قدیم فرہنگوں میں سوائے چند کے کوئی فرہنگ اتنی اہم نہیں ہے۔ حال ہی میں پروفیسر محمد باقر، پرنسپل اورنٹل کالج، لاہور کے اقتباس اس فرہنگ کے تین مجلدات شائع ہوئے ہیں۔ یہی مطبوعہ نسخہ ہمارے اس مقالے کا موضوع ہے۔

موصوف نے اس فرہنگ کی تعلیم و ترتیب میں ایک مدعا صرف کی ہے۔ انھوں نے اس کے منفرد نسخے جمع کیے اور ان کے مقابلے و مقابلے میں بڑی کاوش کی۔ اگرچہ حاشیے میں کہیں کہیں اختلاف نسخہ بھی نظر آتے ہیں، لیکن یہ زیادہ نہیں۔ یہ اختلافات کثیر تعداد میں لے ہوئے، اس بنا پر ان کے اندراج سے صرف نظر ہوا۔ بعض اوقات قدیم فرہنگوں کے حوالے سے حاشیے میں مطالب درج ہوئے ہیں۔ لیکن ان سے متن کی تعلیم میں مدد کم لی گئی ہے؛ مرتب کی تو بہ اکثر ایسے معانی کی طرف رہی ہے، جو مدار الافاضل میں درج ہونے سے رہ گئے تھے۔ اگرچہ یہ بھی ایک سود مند کام ہے، لیکن متن کی تعلیم میں ان سے استفادہ مقدم تھا۔ بہر حال دور جدید میں تعلیم کے کلاسیک معرہ اصول یہ ہے کہ جس طرح کسی متن کے تمام اہم نسخوں کی فراہمی ضروری ہے۔ بالکل

دارالافتاء کی ترقیب و نمو

اسی طرح جن ماخذوں سے کسی متن میں مندرجات و مطالب درج ہیں۔ ان کا فراہم کرنا امدادی کی مدد سے متن کی اصلاح بھی لازمی ہے۔ اکثر ایسے مسئلے جو براہ راست اخذ سے حل نہیں ہو سکتے۔ محض انہیں ضمنی اور ثانوی ماخذ کی مدد سے حل ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر تحریر کی ضرورت سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ لغت کی اکثر کتابوں میں عموماً اور دارالافتاء میں خصوصاً حوالے نہایت کثرت سے ملتے ہیں۔ اس بنا پر حوالے کی ساری کتابوں سے استفادہ وقت طلب ہے، لیکن ہے بیکہ ضروری۔ دراصل مدار کی موجودہ ترقیب میں اس میں ضرورت کی طرف جتنی توجہ لازم تھی، اتنی نہیں ہوئی۔ اس بنا پر متن کتاب جتنا دقیق، ناقدانہ اور معیاری ہو نا چاہیے تھا، اتنا نہیں ہو سکا۔ راقم حروف نے محولہ کتابوں کے مندرجات سے بعض جگہ مقابلہ کیا، تو موجودہ متن کی بعض خامیاں سامنے آئیں، جن کی طرف قارئین کی توجہ لازم بذکر ہو نا چاہیے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ مقالہ تحریر ہوا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اصل متن کے بارے میں کچھ لکھا جائے، معجم کے تحریر کردہ دیباچے کے سلسلے میں چند ضروری باتیں درج کر لے گی ہیں۔ ۱۴ صفحے کے دیباچے میں بعض غلطیاں ہو گئی ہیں، پہلے ان کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جا رہا ہے:

ص: ج: مہذب الاسماء: مولف: آل محمود بن عربیہ محمود بن منصور القاضی افرنجی السجری
است۔

مولف کی آفری دو نسبتیں یعنی افرنجی اور السجری غلط ہیں۔ افرنجی میں ال، کا حذف ممکن نہ تھا اس لیے کہ اس کے پہلے اور بعد کی دونوں نسبتوں میں یہ علامت موجود ہے۔ مہذب الاسماء کے دیباچے میں افرنجی الزنجی کی شکل میں آیا ہے (مقدمہ لغت نامہ: ۲۰۲)، لیکن مرحوم آقا سے دھما لے الزنجی کو الزنجی کی تصحیف قرار دیا ہے۔ زنجی سمرقند کے اطراف میں ایک قدیم قصبہ تھا۔ بہر حال الزنجی دراصل ہوا الزنجی، افرنجی تو بہر حال غلط ہے۔ اسی طرح السجری بھی غلط ہے۔ السجری ہونا چاہیے۔ دراصل سجری، بھستان یا سیستان کے رہنے والے کو کہتے ہیں لیکن ہم واقعیت کی بنا پر ہندستان میں یا سب سے تصحیف خوانی سے سجری میں تبدیل ہو گئی۔ حضرت ۱۔ بار غلط کے بیان کے مطابق سمرقند سے غلام بلانے والی مرکز پر قصبہ داران سے پانچ چھ فرسخ کی دوری پر غلامی قصبہ داران میں خوارزم شاہ ایل بلانے کے زمانے میں یہ قصبہ آباد ہو گیا۔ (کرستان: ۹۷)

خواجہ معین الدین چشتی یا میری سبزی کی غلط نسبت سے اس درجہ مشہور ہوئے کہ علامہ اقبالؒ نے حضرت داتا گنج بخشؒ کا ہمدردی کو اشتباہاً پیر سبزی لکھ دیا ہے۔ حال ہی میں دائم خروف کو قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کی کتابت حضرت خواجہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ غائر مطالعہ سے واضح ہوا کہ قرآن کے آخر میں کسی جعلی قلم سے معین الدین چشتی سبزی لکھا ہوا ہے۔ ملاوہ اور اہم قرینوں کے یہ غلط نسبت ہی اس نسخے کی اہمیت کم کر دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ سبزی کی نسبت جو ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے درج کی ہے، کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

ص ج : تاج المعاد : مؤلف آن البرجفرا محمد بن علی المقرئ البیہقی است؛

مؤلف کی نسبت المقرئ جو ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے درج کی ہے، یہ غلط ہے۔ صحیح المقرئ ہے۔ تاج المعاد کے دیباچے میں اس کا نام اس طرح آیا ہے؛

الشیخ الامام الزائد البرجفرا محمد بن علی المقرئ البیہقی۔

علم قرأت سے اس کی دلچسپی کا حال یا قوت کے حسب ذیل بیان سے ہوتا ہے، جو سمعانی کے حوالے سے آیا ہے؛

وی در قرأت و نحو و لغت و تفسیر امام بود۔ تصنیف دے در بلاد محس

شد۔ دانشمندان برای استفادہ بجماد وی می آمدند و او جز در اوقات نماز

کہ مسجد میں نہ۔ بجائی تعمیرت، و در سلخ رمضان ۵۴۴ درگذشت۔

ص ۵ : نصاب الصبیان لغت نامہ منقول عربی بغدادی تالیف ابو نصر فارابی مسعود۔

نصاب الصبیان کا مؤلف ابو نصر فارابی ہے، نہ فارابی۔ ابو نصر محمد فارابی مشہور فلسفی گزرا ہے؛

اس کی تاریخ وفات ۳۲۹ ہے۔ فارابی کا پورا نام ابو نصر محمد بن علی مجہود (یا مسعود) فارابی سبزی

ہے۔ ۹۷۰ء سبزی کے بعد فوت ہوا گویا دونوں کے فائز میں کچھ کم تین سو سال کا فرق ہے۔

روضة المعطاء، حبیب السیر، اوّل بعض دوسری تاریخوں میں نصاب الصبیان کے مؤلف کے سلسلے میں

۲۔ سید مجیر محمد ام مرتبہ امیر سحر راحزم (اسرائیل خودی)

۳۔ ایضاً

۳۔ مقدمہ لغت نامہ ۲۷۹

ایک اور التباس بھی پایا جاتا ہے۔ البوصرفراہی کا ایک مہم وطن اور ہمعصر امام شرف الدین احمد فراہی ملک الکلام تھا۔ وہ یحییٰ الدولہ بہرام شاہ بادشاہ نمرود (۶۱۲-۶۱۸) کا صاحب تھا۔ متذکرہ العدد کتابوں میں نصاب الصبیان شرف الدین کی بلک قرار دی گئی ہے، جو مراۃ غلط ہے۔ بہر حال جس طرح قدیم زمانے میں نصاب الصبیان کے مؤلف کے بارے میں التباس رہا ہے، آج بھی اسی قسم کا التباس ڈاکٹر باقر صاحب کی تحریر میں پایا جاتا ہے۔

ص ذ: تاریخ تالیف مؤید الفضلا: ۹۲۵ھ

یہ تاریخ بلا غمین نے درج کی ہے۔ لیکن خود مؤید (۱: ۱۵۹) میں اکبر بادشاہ کا ذکر ہے جو سلطان جلال الدین محمد اکبر کے علاوہ کوئی بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب ۹۶۳ ہجری کے بعد لکھی گئی ہے۔ ۹۲۵ ہجری صرف اس صورت میں تاریخ تالیف قیاس کی جاسکتی ہے، جب اکبر سے متعلق بیان غلط ہو، لیکن بحالت موجودہ اس کی کوئی صورت نہیں اس سے واضح ہے کہ ۹۲۵ ہجری جو مؤید الفضلا کی تاریخ درج ہوئی، غلط ہے۔

ص ذ: و درین لغت (مؤید الفضلا) معانی کلیہ لغات و عبارات مشہور

نظم نظامی و شش قطعا (اشعار سنائی و دیوانی خاقانی و لغوی ظہیر

۵۔ فراہ کا باشندہ اسی لیے فراہی کہلا تا ہے۔ ہجر لغت نامہ و نغما (ابوسعید — اثبات)

ص ۹۰۷ میں فراہ کے بجائے فرو لکھا ہے اس صراحت کے ساتھ کہ اس میں الفا زیادہ ہے۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ باب الالباب، طبقات نامری وغیرہ میں قصص کا نام فراہ ہی ہے۔ البوصرفراہی اور شرف الدین فراہی کے سلسلے میں دیکھیے: باب الالباب (تعلیقات ۶۱۲-۶۱۳)؛ لغت نامہ و نغما (مقدمہ ۲۹۳)؛ ایضاً (ابوسعید — اثبات)؛ ۹۰۷ نیز دیکھیے طبقات نامری (۲۸۲: ۱) و فقیر گوید کہ این لغت را از مجموعی کہ در دین خود فاضل بود و آرد شیر نام داشت و در عهد محمد اکبر پادشاہ از حکیمان بہندوستان آمدہ بود، تحقیق نمودم الخ

دارالافتاح میں مرتبہ ہو

مبہری و حافظ و سلمان و سعدی و غیرہم شرح دادہ شدہ است،

یہ جملہ دارالافتاح کے حسب ذیل بیان سے مستفاد ہے :

چنانچہ مولف (مؤلف مؤید الفضل) در تعریف آن کتاب گفتہ کہ این نسخہ کافی و شافی است برای خواندن و سبق گفتن شاہنامہ فردوسی طوسی و خمسہ خواجہ نظامی و ستہ سنائی و دواوین خاقانی و انوری و طہیر و مبہری و حافظ و سلمان و سعدی و خسرو و جز آن۔

دارالافتاح کا یہ بیان مؤید الفضل کے بیان سے ہر موافقت نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر باقر کا بیان اپنے آخذ سے باعتبار ذیل مختلف ہے :

۱۔ دارالافتاح میں یہ نہیں لکھا ہے کہ مؤید الفضل میں شاہنامہ، خمسہ نظامی، اشعار سنائی وغیرہ کے سارے لغات اور عبارات کی شرح کی گئی ہے۔ اس کے برعکس اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مؤید الفضل کی تالیف سے ان کتابوں کا مطالعہ آسانی سے ہو سکیگا۔

۲۔ شش قطعہ از اشعار سنائی، ستہ سنائی کی غلط توجیہ ہے۔ ستہ سنائی دراصل سنائی غزنوی کی حسب ذیل چھ منظموں کے مجموعے کا نام ہے، حقیقۃ الحقیقہ طریقیہ التحقیق، سیر العباد، کارنامہ بلخ، عقل نامہ اور عشق نامہ۔ ڈاکٹر باقر صاحب نے درجہ نامے کیونکہ انہیں شش قطعہ سے تعبیر کر لیا۔

ص ۲: کرد انشا صید بد قنیۃ الفتیاں کہ بہت

در لغت نزدیک اہل فضل و کمال شایگان

پہلا مصرع و نل سے خارج ہے، قنیتہ کے قبل لفظ 'این' درج ہونے سے یہ گیا لغتاً و تخریماً (مقدمہ: ۳۲۱) میں یہ مصرع صحیح صورت میں نقل ہے۔

۳ - ۱۵ ص ۳

۳ - ۱۵ ص ۳

نہیں۔ ہندوؤں بالاقول سے واضح ہے کہ زفان گویا کے مؤلف کا نام بدابرہیم تھا اور وہ جامع مرقم نامہ کے مادہ (جد) کا بھائی تھا۔ شیرانی مرحوم کا بیان اپنے اخذ کے صحیح بیان سے دو اعتبار سے مختلف ہے:

- ۱ شیرانی مرحوم کے یہاں مؤلف کا نام لا رشید درج ہے۔ جب کہ مرقم نامہ کے قابل توجہ نسخوں میں اس کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔
- ۲ شیرانی صاحب کے یہاں (جہاں تک پنجاب میں اردو کے مطبوعہ نسخوں کا تعلق ہے) بدابرہیم بدابرہیم پڑھا گیا، جو لا رشید کے رشتے کا مطلب ہے۔ یعنی لا رشید پڑاؤ کے باپ تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ زفان گویا کے مؤلف کا نام بدابرہیم تھا، اس فقرے میں اضافت ابنی ہے، یعنی بدربن اجڑا ہیم گویا مؤلف کا نام بدادر اس کے باپ کا نام ابراہیم تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خود جس بیان کی طرف سے شیرانی صاحب نے زفان گویا کے مؤلف کا نام لا رشید لکھا ہے، اس کے اعتبار سے مؤلف کا صحیح نام بدابرہیم ہے۔ اس نام کی تائید حسب ذیل امور سے ہوتی ہے:

- ۱ زفان گویا کے مقدمے میں خود مؤلف نے اپنا نام بدابرہیم لکھا ہے۔
- ۲ اس کے قلمی نسخے کے سرورق پر مؤلف کا نام بدابرہیم درج ہوا ہے۔
- ۳ مؤلف فرنگ جہانگیری نے اس کا نام عبدالدین لکھا ہے۔ بد سے عبدالدین کا قیاس: تقدق طود پر ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر باقر صاحب نے پنجاب میں اردو کے حوالے سے زفان گویا کی تاریخ تالیف ۱۷۷۲ء عجمی لکھی ہے، جو کسی سہو کا نتیجہ ہے۔ زفان گویا میں کہیں تاریخ درج نہیں، اور نہ کوئی ایسی داخلی شہادت نظر میں موجود ہے جس سے اس کی تاریخ تالیف پر روشنی پڑتی ہو؛ البتہ بعض قرائن ایسے ہیں جن سے اس کے دو قلمی نسخوں کا طم ہے، ایک خدا بخش خان پبلک لائبریری، بانکھی پور، پٹنہ میں ہے، دوسرا ایمن گھاڑ میں ہے۔ دوسری عالم بالیاسکی نے مجھ سے دوسرے نسخے کی اطلاع دی ہے۔ میرے مطالعے میں صرف اول الذکر نسخہ مل رہا ہے۔

اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۸۲۲ حوالہ ۸۳۷ ہجری کے درمیان مکمل ہوئی، اس سلسلے کی بحث میرے مضمون قدیم فرسنگوں میں اردو عناصر - زبان گویا رسالہ اردو جولائی ۱۹۶۷ء (۱۹۶۷ء) میں لیلی۔ اس پر کوئی سو و نڈ اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔

ڈاکٹر باقر کا صاحبِ جہانگیری سے متعلق حسبِ ذیل بیان بھی مبہم اور غیر واضح ہے: نام لکھا کہ:

جہانگیری کے مطبوعہ نسخے میں صرف اس قدر ہے:

فرنگ زفان گویا و جهان تو یا مشهور بلقب مخفی تصنیف بدرالدین :-

اس بیان میں 'تویا' اور 'بلقب' کتابت کی غلطیاں ہیں۔ صحیح لفظ 'پویا' اور 'بہفت' ہیں۔ چنانچہ فرسنگ جہانگیری کے قلمی نسخوں میں یہ جملہ بالکل صحیح طور پر منتقل ہے۔ ڈاکٹر باقر صاحب نے کاتب کی غلطیاں مصنف کی طرف منسوب کرنے میں جملت سے کام لیا ہے۔ موصوف کے یہاں سے مزید یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جہانگیری میں زفان گویا کے بجائے فرسنگ کا نام جہان تو یا ہے بلکہ یہ واقع نہیں۔ جہانگیری میں اور دوسری کتابوں کی طرح اس فرسنگ کا دہرا نام زفان گویا اور جہان پویا ہے۔ خود مقدمہ زفان گویا سے اسی دہرے نام کی تائید ہوتی ہے۔ نام اس فرسنگ نامہ زفان گویا جہان پویا نہاد۔

زفان گویا کے دوسرے نام پنج بخشی یا ہفت بخشی کے سلسلے میں چند باتیں عرض کر لے
 کی ہیں۔ دراصل یہ نام خود کتاب میں کہیں نہیں آیا۔ بظاہر کتاب کے مندرجات کی وجہ سے
 زفان گویا اس نام سے مشہور ہوئی، چونکہ زفان گویا حسب ذیل سات بخش میں منقسم ہے
 اس بنا پر اس کا نام ہفت بخشی مناسب ہوگا:

بخش نخست: سخنان پهلوی و ددی که جداگانه است و می‌نویسد با سبختی دیگر غلامد.

بخش دوم : سخنانی پهلوی و ردی که از دو سخن پیونید یافته است.

بخش سوم : ستمنان پہلوی و درمی کہ از آن کردار پابیرون آید۔

بخش چهارم : سخنان تازی

۱۲ دیکھیے مقدمہ کتاب

دارالافاضل کی ترتیب تو

ششم : سخاوت آمیزہ الامازی و ترکی و عجمی

ششم : سخاوت آمیزہ الامازی و یونانی

ششم : لغات ترکی

یہ فرہنگ نامہ : لغات متفرق

سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ زفان گویا کا دوسرا نام ہفت بخشی مناسب ہوگا، نہ کہ بخشی۔ البتہ دارالافاضل میں بار بار اس کا نام پنج بخشی آیا ہے جو یقیناً کسی غلط فہمی کا ہے۔ پنج بخشی فرہنگ نامہ قواس کا نام مناسب ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ آخر الذکر باب پانچ حصوں (بخش) میں منقسم ہے، اور زفان گویا کے مندرجات فرہنگ نامہ قواس پر دی میں سات بخش میں منقسم ہوئے۔ مختصر یہ کہ زفان گویا کو پنج بخشی کے نام سے یاد کرنا غلطی ہے۔ اس کا نام ہفت بخشی ہے اور ہی نام فرہنگ جہانگیری میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس غلطی سے ڈاکٹر باقر صاحب کا تعلق نہیں۔ لیکن وہ مدار کی پیروی میں اس پنج بخشی اور فرہنگ جہانگیری کی رعایت سے ہفت بخشی قرار دیتے ہیں۔ گویا وہ مدار جہانگیری کے اختلاف بیان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ بلکہ انہوں نے اس غلطی کو در خود توجہ ہی نہیں سمجھا۔

ط : این سہ کتاب در زفان، تجتزی، حل لغات الشعراء، بانصاف منابع

و دیگر کہ ذیل بلانہا اشارہ می شود۔ مؤلف استفادہ مؤلفین دو لغت نامہ

مؤلف الفضلا و تحفہ السعاده اسکندری بودہ است، و مؤلف مدار نسبت

بہر دو مؤلف مذکور بحکم و احترام فراوان مرعی میدارد۔

۱۵ ص ۲ میں ہے، چنانچہ زفان گویا کہ ادب پنج بخشی نیز گویند، ڈاکٹر باقر صاحب نے اس پر

تیر بڑھایا ہے، زفا گویا و جہان بولوا مشہد ہفت بخشی تصنیف بدرالدین (فرہنگ جہانگیری)۔

ن گویا مرکب نویسی ہے، اس لیے اس کو بیست لکھنا غلط ہے؛ بولوا، بے محل ہے۔ بولوا ہونا چاہیے

الطرح یہ پوئیدہ لکھنا صحیح فاعل ہے۔

۱	نصیب الولدان
۲	دستور و خلاصہ فارسی از ضمیر
۳	دستور و فرہنگ فخر قواس
۴	فرہنگ علمی
۵	قنیۃ الطالبین
۶	مواید الفوائد
۷	لسان الشعراء
۸	طب حقائق الاشیاء
۹	فرہنگ علی نیک پی

یہ بیان گنجگ اور اپنے ہاتھ سے کافی مختلف ہے؛ مگر قبل اس کے کہ اس سے متعلق براہ راست کچھ لکھا جائے، مدار الافاضل کا بیان درج کیا جاتا ہے:

وہر دو آن کتاب (تحفۃ السعادة و مؤید الفضل) منقولہ اند، از کتب معتبرہ و معتبرہ چنانچہ لغات تازی از مراح و تاجین و نصیب الولدان و دستور و خلاصہ فارسی از ضمیر و دستور و فرہنگ فخر قواس و علمی و علی نیک پی و شرح مخزن و قنیۃ الطالبین و مؤید الفوائد و لسان الشعراء و طب حقائق الاشیاء

مدار الافاضل کی اس عبارت میں کتابت کی چند غلطیاں ہیں :

- ۱ 'خلاصہ فارسی' غلط ہے؛ صحیح عبارت یہ ہوگی: خلاصہ و لغات پارسی الخ
- ۲ مؤید الفوائد کے بجائے مؤید الفوائد ہونا چاہیے۔

گویا مؤلف مدار الافاضل کے بیان کی زد سے تحفہ اور مؤید کے مولفوں نے نہ مرئی کی اور نہ فارسی کی فرہنگوں، ایک شرح اور ایک کتاب طبی سے اپنے لغات تیار کیے لیکن یہ فہرست تحفہ اور مؤید کے تمام ہاتھ کو مادی نہیں؛ ذیل میں دونوں لغات کے اخذ

درارالفاضل فی ترتیب

درج کیے جاتے ہیں؛ تحفۃ السعاده کے مقدمے میں ہے:

و معجم از نسخہ ہامی معتبر و فرہنگ نامہ ہامی مقتدر چنانچہ ضمیر و دستور و
فرہنگ فخر قواس و زفان گویا و دستور الفضلا و شرح مخزن و فرہنگ
قاضی ظہیر و فرہنگ ابراہیمی و سینی و فرہنگ عجائب و لغات تازی
از صراح و غلامہ و نصیب الولدان و تاجین نقد اللہ احکامہم بیک

نور و آورده الخ

مؤید الفضلا میں ہے:

این کتاب مشتمل است از لغات عرب علی قدری محتاج من القراح و
التاج و از لغات فارس و روم و سمرقند و اورام النہر و ترک و جزآن سلسلہ
الشعراء و ادات الفضلا و دستور الافاضل و زفان گویا و مواد القوائد
و شرح مخزن اسرار و طب حقایق الاشیاء و آنچه در شرف نامہ و قیاس
الطالبین و در فرہنگ نامہ و نسخہ ہامی متعارف و متداول مسطور

است استخراج نموده الخ

گویا متحدہ اور مؤید کے عربی اخذ یہ تھے:

صراح، تاجین، غلامہ، نصیب الولدان (۵)

فارسی اخذ کے نام یہ ہیں:

- | | |
|---|----------------|
| ۱ | فرہنگ ضمیر |
| ۲ | دستور الافاضل |
| ۳ | فرہنگ فخر قواس |
| ۴ | زفان گویا |

۱۵ مخطوطہ نمبر ۲۴۸۳ کتابخانہ جامعہ

۱۶ مواد دستور الافاضل

۱۷ ۱۵ ص ۲-۳

۵	دستور الفضلا
۶	شرح مخزن الاسرار
۷	فرہنگ قاضی ظہیر
۸	فرہنگ ابراہیمی یعنی شرفنامہ
۹	فرہنگ حسینی
۱۰	فرہنگ عجائب
۱۱	لسان الشعر
۱۲	ادات الفضلا
۱۳	مواد الفوائد
۱۴	طب حقایق الاشیاء

اس فہرست کے مدارالافاضل میں درج فہرست کے مقابلے سے واضح ہے کہ مدارالافاضل میں ایک عربی لغت زیادہ ہے، جس کا نام دستور لکھا ہے۔ اگر یہ بیان صحیح ہے اور صاحب مدار کو تحفہ مؤید کے اخذ میں اس لغت کا نام لکھا ملا ہے، تو شاید اس سے مراد لفظی کی کتاب دستور اللغات ہوگی۔ البتہ فارسی کی حسب ذیل کتابیں مدار کے مقدمے میں ان دونوں کتابوں کی نسبت سے درج نہیں۔ زبان گویا، دستور الفضلا، فرہنگ ظہیر، فرہنگ ابراہیمی (شرفنامہ)، فرہنگ حسینی، فرہنگ عجائب، ادات الفضلا۔

حسب ذیل دو فارسی فرہنگوں کے نام مجھے تحفہ اور مؤید میں نہ مل سکے :

فرہنگ علمی، فرہنگ علی نیک پی،

لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤید الفضلا میں آخری فرہنگ یعنی فرہنگ علی سے مستفاد ہوا ہے۔ جس کو وہاں فرہنگ علی بھی بتایا گیا؛ گو دیباچہ میں یہ نام صراحتہً مذکور نہیں۔

مدارالافاضل میں تحفہ السعادة اور مؤید الفضلا کی نسبت مجھے جو اخذ کی کتابیں درج ہیں،

مدارالافاضل کی ترتیب نو

ان کی نوعیت پر اب تک گفتگو ہوئی ہے؛ ڈاکٹر باقر صاحب نے مدارالافاضل سے اس سلسلے میں جو کچھ اخذ کیا ہے اور جسے ہم اس بحث کے شروع میں نقل کر چکے ہیں، وہ اپنے ماخذ سے کافی مختلف اور غلط فہمی پر مبنی ہے اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابلِ توجہ ہیں :

۱ ڈاکٹر محمد باقر نے تحفہ اود مؤید کے ماخذ کی جو فہرست مدارالافاضل کی رو سے مرتب کی ہے، اس میں صراح اود تاجین کے بجائے زفان گویا، تبغری اور حل لغات الشعر کا ذکر ہے، حال آنکہ یہ تینوں لغات مدارالافاضل میں مندرج فہرست سے غائب ہیں۔

۲ دستور و خلاصہ فارسی از ضمیر کو ایک نمبر کے ذیل میں نقل کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے نزدیک یہ ایک فرہنگ ہے۔ حال آنکہ یہ فرہنگ نہیں ہے۔ دراصل یہ فقرہ مقدمہ مدارالافاضل میں غلط چسپا ہے اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، خلاصہ پر پہلا جملہ تمام ہو جاتا ہے گویا وہاں تک عربی کی جو فرہنگیں ہیں، اس کے بعد فارسی کی فرہنگیں درج ہو رہی ہیں اس لیے خلاصہ پر پہلے اضافت غلط ہے اس کے بعد ولغات کے الفاظ درج ہونے سے ردہ گئے ہیں۔ پس مندرجہ بالا فقرے میں تین لغات یعنی دستور و خلاصہ (لغات عربی) اور ضمیر کا ذکر ہے اور ضمیر سے پہلے ولغات فارسی بھی تھا جس میں ولغات درج نہ ہو سکا، جس کی بنا پر ڈاکٹر صاحب موصوف اس پورے فقرے سے ایک ہی لغت پر استدلال کر رہے ہیں۔

۳ دستور و فرہنگ فقر قواس کو نہ جانے کس غلط فہمی کی بنا پر ایک نمبر کے ذیل میں نقل کر کے یہ قرینہ پیدا کر لیا ہے کہ ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف انہیں ایک ہی فرہنگ خیال کرتے ہیں۔ حال آنکہ ایسا نہیں؛ دستور سے مراد صاحب غیرت کی دستورالافاضل اور فرہنگ فقر قواس سے دوسری فرہنگ مراد ہے۔ حسب اتفاق سے ان دونوں فرہنگوں کے واحد نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بمبائل، کلکتہ میں موجود ہیں۔

مدار الافاضل کی ترتیب نو

- ۳۔ شرح خضر بن اسرار، مدار میں مندرج فہرست میں شامل ہے۔ مگر ڈاکٹر طرابلسی نے دجاغے کس وجہ سے اسے اپنی فہرست میں درج نہیں کیا۔ اس شرح سے ملا محمد بن قوام بن رستم کی شرح ہے، جو ۷۹۰ھ کے قریب ہندستان میں مرتب ہوئی۔ شارح ایک مشہور فرننگ بحر الفضائل کے مؤلف ہیں۔ جو ۸۲۷ھ کے قریب مرتب ہوئی تھی۔
- ۵۔ فرننگ ملی کی دوسری صورت فرننگ ملی حسین انجوشیرازی کی فرننگ جہانگیری کے ملبوم نسخے میں درج ہے؛ قیاس ہوتا ہے کہ استاد نفیسی نے اسی نسخے سے یہ صورت لی ہوگی۔ اس بنا پر نفیسی کے بجائے جہانگیری کا حوالہ مناسب تھا۔
- ۶۔ فرننگ ملی نیک پی کا نام فرننگ ملی یکی مؤید الفضلا میں چند بار اور جہانگیری کے دیباچے میں کم از کم ایک بار آیا ہے۔ اگرچہ ملی نیک پی مدار کے متن میں واضح طور پر موجود ہے، اور سعید نفیسی کے یہاں بھی نام ملتا ہے۔ لیکن مؤید الفضلا اور جہانگیری کے بیان کی روشنی میں یہ مسئلہ حقیقتاً طور پر حل ہونے کا متقاضی ہے۔

شروع میں ذکر ہو چکا ہے کہ ثانوی اخذ کی مدد سے متن کی تصحیح میں عموماً بڑی مدد ملتی ہے اور فرہنگوں کی تصحیح میں تو خصوصاً ثانوی اخذ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے لیکن مدار الافاضل کے ملبوم نسخے کی تصحیح میں اس سے بہت ہی کم مدد لی گئی ہے۔ اس بنا پر باوجود توجہ کے اس کا متن متوقع معیار کا نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں چند مثالوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جائیگی۔

مدار الافاضل میں ذوالفقار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے،

ذوالفقار، دبراہیمی و مؤید و ملقات است، بفتح فاء، شمشیر است
کہ از سید بن حاج و قتی کہ سہمی بھضرت رسیدہ بود و بجهت عود اختیار
فرمودہ بود، و در عرف شمشیر شاہ مروانست کزانی الابرار سیمی و المؤمنین

اس بیانی سے صراحتاً واضح ہے کہ یہ قول فرننگ ابراہیمی یعنی شہر قنار اور مؤید الفضلا سے اخذ ہے۔ لیکن یہ دونوں فرہنگیں میرے سامنے ہیں، خرفانہ کا تنقید کا پابند نہیں ہے

دارالافتاء کی ترتیب نو

جو چند نسخوں سے تیار ہوا ہے، اور مؤید کا مطبوعہ نسخہ، مگر ان دونوں کتابوں میں ذوالفقار کی شرح دوسرے انداز میں کی گئی۔ شرح فنامہ میں ہے:

ذوالفقار بفتح فاء نام تیغ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ دکن پیغامبر علیہ السلام بخشیدہ بود؛ ذوالفقار اسم سیف النبیؑ

مؤید الفضل کی روایت یہ ہے:

ذوالفقار بالفصح نام تیغ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ

تفصیلات بالاسے واضح ہے کہ دارالافتاء میں جو کچھ شرح فنامہ اور مؤید الفضل کے حوالے سے درج ہے، وہ ان دونوں کتابوں کے موجودہ نسخوں سے مختلف ہے۔ ممکن ہے صاحب مدار کے پیش نظر نسخوں میں یہ عبارت موجود ہو۔ یا صاحب مدار کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر ان امور کا ذکر مع مدارالافتاء حاشیے میں درج فرماتے، تو یہ نسخہ اور زیادہ وسیع ہو جاتا۔

لیکن یہ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ مدار کے موجودہ نسخے کی عبارت فوق غلط طور پر نقل ہوئی ہے۔ اور اس میں اسماء بھی غلط درج ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

”حرف لغات“ کے بعد ”است“ سے عبارت کا مفہوم غلط ہو جاتا ہے؛ اس کو حذف کر دینا چاہیے۔

مسید بن حاج غلط ہے؛ مسید، منبہ کی اور حاج، حاج یا الحاج کی تصحیف ہے اس کی تصحیح لغات کی مدد سے بخوبی ممکن ہے۔ سب سے زیادہ سہل الحصول کتاب لغت نامہ دجہا ہے، جس میں ذوالفقار کے ذیل میں ہے

نام شمشیر منبہ ابن الحاج کہ بروز بدکشتہ شد و آن شمشیر را رسول اکرم صلوات اللہ علیہ برائے خویش برگزید، و کان ذوالفقار لمنبہ ابن الحاج، استخلصہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصطفاه لنفسه یوم بدر۔ الجاہلی فی الجحیم

۱۱ اکثر نسخوں میں تو میں کی جگہ موجود نہیں ہے، تو میں کے نسخے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۱۲ واضح ہے کہ یہ غلط ہے؛ پہلا حرف مفتوح نہیں، بلکہ فامفتوح ہے۔

للبيروني - ذوالفقار سيف رسول اللہ کا لقب ابن الحجاج وبعضی
آنرا شمشیر ماض بن منبہ گفتہ اند^{۱۲} الخ

بہر حال واضح ہے کہ جناب مصحح تنقیدی متن کی ترتیب سے عہدہ برا نہیں ہو سکے۔ جس کی
بڑی دیکھالوی آغذ کی طرف سے صرف نظر ہے۔

ایک اور مثال آگنج کی ہے، جس کی مدار میں اس طرح شرح ملتی ہے:

آگنج با کاف پارسی بوزن آگند، روده کہ پُر از گوشتاب باشد، عرب
آنرا عصیب خوانند۔ و در پنج بخشی است کہ بہ پنج و جگر پُر کردہ در
تنور بریاں کنند، و در سکندر لیست آنرا جگر آگند نیز گویند۔

اگر اس شرح کا موجد کے حسب ذیل بیان سے مقابلہ کریں، تو بعض مسائل روشن ہو جائیں گے:

آگنج بوزن آگند، روده کہ پُر از گوشتاب باشد، عرب آنرا عصیب

خوانند، کفانی شرفنامہ؛ و در لسان الشراہم مدعی آوردہ، حیث قال

آگنج بوزن آگند۔ عصیب کہ آنرا یا رسی جگر آگند گویند الخ

لسان الشعر تو مفقود ہے؛ لیکن شرفنامہ موجود ہے۔ اس میں موجد کے بیان کردہ مطالب
سے کچھ زیادہ مطالب موجود ہیں یعنی یہ کہ خود شرفنامہ میں ہے کہ آنرا جگر آگند گویند۔

پس مدار میں مندرج معنی اول آوردہ معنی جو سکندری کے حوالے سے مندرج ہے، سب

موجود ہے۔ اس طرح واضح ہے کہ خود مؤلف مدار نے قدیم حوالے کے بجائے جدید حوالے پر

اکتفا کیا ہے یعنی شرفنامہ کے بجائے سکندری کا حوالہ دیا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ

شرفنامہ سے قدیم تر کوئی اور حوالہ بھی مل جائے، لیکن زیادہ سہل الحصول شرفنامہ ہی ہے۔

اسی بنا پر مصحح مدار الافاضل سے توقع تھی کہ وہ اس کا ذکر کرتے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ پنج بخشی

کے حوالے سے جو کچھ صاحب مدار نے نقل کیا ہے وہ زفان گویا میں موجود ہے، اس فرق کے

ساتھ کہ موجودہ نسخے میں کچھ عبارتیں درج ہونے سے مدہ گئی ہیں۔ زفان گویا کی اصل عبارت

یہ ہے:

۲۱ غیاث اللغات میں بھی یہی ہے۔

ملارالا فاضل کا ترجمہ

آجنگ باکاف پادسی مصیب ان طعانیست کہ رودہ را بہ برنج و حبگر پڑ
کرہ الخ

اس کا عبارت مندرجہ مار سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اول سے رودہ را "ملگ کی عبارت
ملارالا فاضل کے معنوں سے درج نہیں ہو سکی ہے۔ مار کے مطبوعہ نسخے کی اس عبارت
میں: درنج بخشی است کہ بہ برنج و حبگر الخ، مفعول فاعل ہے اور اسی بنا پر ناقص ہے۔
اور لفظ قوی ہے کہ اس واضح نقص کے لیے خود مع نسخہ ہذا ذمہ دار ہیں۔
ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

اور مزد واول روز ازماہ چنانچہ اسامی سی روز ماہ موافق
حکیم پارس دفاتر اکبر شاہی درین قطعہ مولف مندرج است:

اذلا اند مزد و دیگر ہم وادی بہشت
بعد از آن شہر گور و اسفند مرخورداد دان
چوں امر داد و دیگر دبا درآمد در شمار
آورد و آبان و خوراک گاہ ماہ تیر خوان
گوش کن دیگر کہ آمد گوشک نام دہمبر
ہست تا این نصف مہر و مشرب بعد از آن
فرش و فرود ہی دان و دیگر نیز ام درآمد
باد دنیا دین و دین آنا و استار آسمان
بعد ازین زمیناد و مار اسفند ایران یادگر
از حکیم پارس سی روز ماہ، اہی نکتہ دان!

ظاہر ہے کہ تیس دہائی کے ایرانی نام اکثر لوگوں کی طرح ڈاکٹر باقر صاحب کو بھی معلوم نہ تھے اس
لیہ انہوں نے فیضی سریندی کے قطعہ کو بہت غلط درج کیا ہے۔ ذیل میں ان غلطیوں کی نشاندہی
کی جاتی ہے:

پانچواں دن اسفند اند یا اسفند (اسپند، سپند) ہونا چاہیے۔

”تر“ غلط ہے۔ مسعود سعد سلمان کا شعر ہے:

سپندارند روز خیز، ای نگار!

سپند آرماد و جام می آر (ص ۶۶۰)

آٹھواں دن دیا آند ہے، نہ دیا۔ برہان میں ہے:

نام روز ہشتم از ہر ماہ شمسی و دین روز از ماہ دی کہ دیماہ باشد فارسیان

حمید کنند (ص ۹۰۹)

مسعود سعد سلمان کے دیوان میں دیا ذر روز غلط ہے۔ دیا ذر روز ہونا چاہیے (ص ۶۶۱)۔ ڈاکٹر

باقر کے یہاں دیا کے بعد کا ٹکڑا ذر، فعل آمد کا جز قرار دیا گیا ہے جو مراۃ اشتباہ ہے۔

بارھویں اور تیرھویں دن ماہ تیر سے ظاہر کیے گئے ہیں جو بصورت موجودہ بغیر اضافت کے

موزوں نہیں ہوتے۔ دراصل ماہ تیر درست ہے، ماہ بارھواں دن ہے اور تیر تیرھواں۔ صاف

مدار نے کلمہ تیر کے ذیل میں قطعہ مندرجہ بالا کا حوالہ دیا ہے:

وسیز دہم روز از ماہ چنانکہ در ضمن اور مزد گذشت (۴۱۰: ۱)

اگر معجم نے اسے توبہ سے دیکھا ہوتا، تو ماہ اور تیر کو ہرگز پیوست نہ لکھتے۔ ماہ روز کے بارے

میں مسعود سعد کی یہ بیت ہے:

ماہ روز اے بروی خوب چو ماہ

بادہ لعل مشکبوی بخواہ

اور تیر روز کے بارے میں بھی اسی شاعر کی یہ بیت ملاحظہ ہو:

ای نگار تیر بالا! روز تیر

خیر و جام بادہ دی بر لب زیر (ص ۶۶۲)

چودھویں اور پندرھویں روز کے نام کے بارے میں ڈاکٹر باقر صاحب کی اطلاع ناقص ہے

”مغوش نام دیکھو“ دراصل دولوز نام کا حامل ہے۔ چودھویں دن کا نام گوش^{۲۳} ہے، اور

۲۲ یعنی دی باز رک، کتاب مزدیسنا، ۱۶۲

۲۳ رک، کتاب مزدیسنا، ۱۶۲

مبارک املا کا ضل کی ترتیب نو

پندرہویں مادی بہتر ہے۔ گوش کے متعلق مسعود سعد سلمان کا شعر ملاحظہ ہو:

گوش روزِ ای نگاہِ مشکینِ خال

گوش بر لبِ مجیر و نیک بمال (ص ۶۶۲)

دی بہر کے متعلق برہان میں ہے:

نام روزِ پانزدہم بود از ہر ماہِ شمسی و مغانی این روز را از ماہِ دی مبارک

دانند و جشن کنند الخ (ص ۹۰۹)

مسعود سعد کی شہادت ملاحظہ ہو:

دی بہر است مہربانی کن

کز ہمسہ چیز مہربانی بہ (ص ۶۶۲)

خود صاحبِ مدار نے دی بہر کے ذیل میں لکھا ہے: دی بہر یا دہم روزِ از ماہ۔ چنانکہ در ضمن اور مزد ذکر یافت (۲۸۲: ۲) واضح ہے کہ یا دہم غلط ہے، پانزدہم ہونا چاہیے۔ چنانچہ کہ ایسے واضح اشارے پر بھی ڈاکٹر باقر نہیں چونکے۔

سترہویں روز کا نام باقر صاحب کے ہاں ٹھیک نہیں ہے۔ ہر شب کے بجائے سروس ہونا چاہیے۔ چنانچہ خود صاحبِ مدار نے سروس کے تحت قطعہ بالا کا ذکر کیا ہے:

وسروس و سہدہم روز ماہ چنانچہ در ضمن اور مزد گذشت۔

اگر ڈاکٹر باقر چاہتے، تو اس کی مدد سے وہ قطعے کو درست کر سکتے تھے۔ سروس روز کے بارے میں مسعود سعد کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

روزِ سروس است کہ محمود سروس

بادِ خود و نفہِ مطربِ نبوش (ص ۶۶۳)

قطعہ مندرجہ بالا میں صحیح مصرع یوں ہوگا:

ہست تا این نصف مہ، مہر و سروس و بعد از ان

۲۳ تک، کتاب مزدیستا، ۱۶۲ ۲۵ ایضا

۲۶ اس کا تعلق بعد کی بیت سے ہے۔

مارالا فاضل کی ترتیب نو

اٹھارویں روز کا نام ڈاکٹر اقر صاحب نے فرش لکھا ہے یہ رشن پونا چاہیے۔ برہان قاطع میں ہے :

رشن ... نام روز سیدیم از ماہی ہای شمسی۔

رشن کے بارے میں مسعود سعد سلمان کا شعر ملاحظہ ہو :

روز رشن است، اے نگار دلربای !

شاد بنشیں و بجایم می محرامی (ص ۶۶۳)

”باد“ ہر ماہ کے ۲۲ ویں دن کا نام صحیح ہے، لیکن مارہی میں پاد کے ذیل میں آیا ہے :

”نیز روز دوم از ماہ دوم (۱: ۲۷۸)۔ باد کے بارے میں برہان نے واضح طور پر لکھا ہے: نام

روز بیست و دوم از ہر ماہ شمسی باشد الخ (ص ۲۵)

اس سلسلے میں مسعود سعد سلمان کی شہادت بھی ملاحظہ ہو :

چوں باد روز روز نشاطد، ای نگار !

شادی فزای من و بدہ بادہ دیار (ص ۶۶۳)

دینا دین غلط، تیسویں روز کا نام دینا دین ہے ”برہان قاطع“ میں ہے :

دینا دین نام روز بیست و سوم باشد از ہر ماہ شمسی (ص ۹۰۸)

دی کے ذیل میں اسی فرہنگ میں آیا ہے :

و روز دی بہر و دینا دین و دینا دبد بد متعلق است

مارالا فاضل میں ”دی بدین“ کے ذیل میں آیا ہے :

بیست و سوم روز از ماہ چنانکہ در ضمن او و مرز گذشت

بظاہر دی بدین دینا دین کا مختلف ہے دراصل کلمہ دی + باد دین، جو یہاں بدین کی شکل

میں آیا ہے۔ لیکن خود صاحب مارلے اپنے قلمے میں اصل شکل دینا دین درج کی ہے، جو ہم

کی غلطی کی وجہ سے دینا دین ہو گئی ہے مسعود سعد سلمان کے یہاں دین بدین ہی آیا ہے :

۲۵ رگ، کتاب مزدیسنا: ۱۶۲، ۲۲۱

۲۸ کتاب مزدیسنا: ۱۶۲ دی بدین ہی ہے۔

دارالافتاء میں ترقیب لو

دین بدین است و دین مرد خرد

آن شناسم کہ لعل بارہ خورد (ص ۶۶۵)

ہیجری ۲۶، ۲۵، ۲۶ دین دن کے نام کے بارے میں ڈاکٹر باقر کے یہاں بڑی غلط فہمی
اقع ہوئی ہے و دین آرا کسی دن کا نام نہیں ہے۔ دراصل دین ۲۴ واں اور ارد
۲۱ واں دن ہے۔

دین کے بارے میں مدار میں ہے :

بیت و چہارم روز ماہ کذا فی نغان گویا (۲: ۲۸۶)

بہ خود پہلے ایک اور آخذ سے اس لفظ کو قطع میں درج کیا جا چکا تھا، تو یہاں
فان گویا کے نام کا اندراج غیر ضروری تھا۔ بہر حال سعودی مسلمان کی بیت یہ ہے :

دین روز، ای روی تو اکفنت دین

می خود و شادی کن و خرم نشین (ص ۶۶۵)

رد کے بارے میں مدار میں ہے :

بیت و پنجم از ماوردی بہشت (ص ۷۰)

نامخ رہے کہ اس میں اردی بہشت کی تفسیر غلط ہے، ہر ماہ کا ۲۵ واں اور وارو بتخلف
(۱) ہی کہلاتا تھا۔ برہان قاطع میں ارد کے ذیل میں ہے :

و تدیر و مصالح روز ارد کہ بیت و پنجم از ہر ماہ شخصی است بدو تعلق

دارد (۹۸-۹۹)

سعودی مسلمان نے ارد (بالفتح) اس طرح نطق کیا ہے :

ارد روز است فرخ و میمون

باہم لہو و خرمی مقرون (ص ۶۶۵)

ظہر میں استاد نام لفظ طور پر درج ہے۔ اشتاد ہونا چاہیے۔ برہان قاطع میں ہے :

۲۱ کتاب مزدلینا: ۲۵۶، ۱۶۲ میں لکھا ہے۔ جو تھری شکل ہے۔

۲۰ ایضا ص ۱۶۲

مدار الاطمان کی ترتیب تو

نام بیست و ششم است ہزار ہا ہفتی الخ (ص ۱۳۷)
 مسعود سعد سلمان کے یہاں اس طرح آیا ہے :
 اشتاد روز تادہ زمحل بوستان
 ای دوست ! می ستان زکف دوستان
 قطعے کا مصرع اس طرح درست ہوگا :

باد، دیادین و دین، آرد و اشتاد آسمان

۲۸ دین روز کا نام قطعے میں زیاد تخفیف کے ساتھ ہے۔ مد اصل اس روز کا نام زامیاد^{۳۱}
 ہے۔ خود صاحب مدار نے زامیاد کے ذیل میں لکھا ہے :

زامیاد بیست و ششم روز از ماہ، چنانکہ در ضمن اور مزد مذکور شد (۲۵۶: ۲)
 مسعود سعد سلمان نے زامیاد نظم کیا ہے، لیکن مطبوعہ نسخے میں زامیاد غلط درج ہے :
 چوں روز زامیاد نیاری زمخی تو یاد

زیرا کہ خوشتر آید می روز زامیاد (ص ۶۶۶)

قطعہ بالا میں تیسویں دن کا نام ایران، مدار کے مطبوعہ نسخے میں ڈاکٹر باقر صاحب کے ہاں
 بالکل غلط درج ہوا ہے، یہ انیرانی ہونا چاہیے۔ چنانچہ خود صاحب مدار نے انیران کے ذیل
 میں اس قطعے کا حوالہ دیا ہے، جسے ہم بعد کو نقل کریں گے۔ مسعود سعد سلمان نے بھی انیران ہی نظم
 کیا ہے :

انیران، زبیران شنیدم چناں

کہ می خود باید بہ رطل محراں (ص ۶۶۷)

ان شالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی متن کی تصحیح میں ثانوی متن کس طرح مفید ثابت
 ہوتے ہیں۔

۳۱ کتاب مودیتنا ص ۳۲۰، ۳۲ ۱۵، ص ۱۳۱

۳۳ رک، مودیتنا : ۱۶۲

مدار الافاضل کی ترتیب نو

راقم حروف نے مدار الافاضل کی محو کہ کتابوں میں سے خصوصاً زان گویا اور مؤید الفضلا کی مدد سے مطبوعہ نسخے پر ایک ناقلاً نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے جو سطور ذیل میں ناظرین کی خدمت میں پیش ہے :

مدار الافاضل	مؤید الفضلا
آہنج بوزن آہنج انداختن چنانچہ گویند	آہنج بوزن آگنج انداختن و اندازہ و انداز کذا
آہنج یعنی باندا، نیز بمعنی اندازہ و در	فی شرفنامہ و در لسان الشعر بمعنی اول مذکور
لسان الشعر بمعنی اقل است۔ صاحب یزید	است، و میان قاضی شہ در حاشیہ لمقطع بعلم
از قنیز بمعنی پوشیدہ نقل کردہ است و	خود بمعنی نوشندہ نوشتہ است و این لفظ مشتق
در قنیز آہنجیدن بمعنی کشیدن گفتم الخ	از آہنجیدن بمعنی آہنجیدن در قنیز کشیدن
	نہشتہ است الخ

ظاہر ہے کہ مدار کا یہ پورا قول مؤید سے مستفاد ہے اس لیے کہ صاحب مدار کے پیش نظر نہ لسان الشعر اتھی، نہ قنیز، مؤید کے نسخہ مطبوعہ میں نوشندہ اور مدار میں اسی کتاب کے حوالے سے پوشیدہ ہے۔

اگرچہ پوشیدہ صحیح ہے اور مؤید میں اس کے بجائے نوشندہ قاطع ہے، کیونکہ آہنجیدن کے تحت مؤید لکھیں ہے و

انداختن و در قنیز بمعنی کشیدن است و در حاشیہ بخط میان قاضی شہ مرقوم است : آہنج پوشیدہ۔ ازین معلوم میشود کہ بمعنی پوشیدن نیز است۔

لیکن اختلاف کا اندراج اور تحقیق مرتب نسخہ کی ذمہ داری تھی۔

مدار	مؤید
البو قلموں... در مؤید است :	(بو قلموں... در عجائب البلدان است : مرغی است بر کوہ
مرغی است کہ بکچہ چرخک، چوں	امداد اول کذا، ہر کوئی کہ در عالم است در پرتہای دی باشد

دارالافتاء کی ترتیب نو

شب دہا آتشی نماید و آوازی سخت بامداد بلونی نماید، و میانه روز برنگی دیگر و آخر روز برنگی
نیکو دارد۔ و نیز گفته: سبز خالوست دیگر۔ چون شب در آید مانند آتش نماید و آوازی سخت
از حرم اقدری بزرگ کہ در صبح برنگی نیکو دارد و کاتب را سماع است از زبان بندگی۔ شیخ
و در میانه روز برنگی دیگر و شب برنگی المشائخ شیخ سلطان کہ در عہد ملک شمس مقطع بہار
نماید۔ گویند شخصی سیاحی آورده بود بوتلمون را در بہار آورده و آن جانوری از حرم اقدری بزرگ
چنین بود و در شرف نامہ است و برنگہای گوناگون می نماید۔ و در شرف نامہ است:
کینیت حرم باست الخ کینیت حرم باست الخ

ان دونوں بیانوں کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ صاحب مدار نے مؤید کے تفصیلی بیان کا خلاصہ
لکھ دیا ہے، جس میں مؤید میں منقول سارے اخذوں کو حذف کر دیا ہے۔ مؤید میں بوتلمون کے
ذیل میں مزید یہ ہے کہ در عہد ملک شمس مقطع بہار آنرا سیاحی آورہ بود۔ یہ اطلاع صاحب
مؤید کو شیخ المشائخ کے ذریعہ ملی تھی۔ مدار میں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ علاوہ بریں مدار کے مطلوبہ
متن میں بعض خامیاں ہیں: (۱) آتشی نماید کے بجائے مانند آتشی نماید ہونا چاہیے۔ (۲) سبز
جانوریت غلط ہے، و آن جانوریت، صحیح ہے۔ (۳) چنین بود کا ٹکڑا مہمل ہے۔

اشکوب، و در شرف نامہ تعبیر بہ بام کردہ کہ عرب آنرا سطح گویند؛ صاحب مؤید این را نسبت
بہو کردہ و تا نید از لسان الشعر آورہ کہ بمعنی سقف گفتہ و در مقدمہ سیر مؤید آنست
اس بیان میں چار فرہنگوں کے حوالے ہیں، جن میں ایک یعنی لسان الشعر مفقود ہے، باقی
کے چند جات یہ ہیں:

مشرف نامہ اشکوب: با شین موقوف و واو ناری، بام و آنرا اشکوب بقصر، و
آسمان نیز گویند، بتازیش سقف خوانند۔

(مؤید الفضل) اشکوب: با سین موقوف آسمان کہ عرب آنرا سقف خوانند؛ و در شرف نامہ
مندرج است بام کہ بتازیش سقف خوانند و فیہ نظر زیر اچہ بام را بتازی سطح گویند
و ہم در شرف نامہ مذکور است کہ بام بالائی سقف؛ و دداوات مذکور است آسمان سقف کہ

مدار الافاضل کی ترتیب نو

اہل ہند آخر اچھت می نامند و قول لسان الشعر امویہ قول ادات است۔ ومعنی
سقف در مقدمہ جارا لند ز محشری آسمان خانہ نبشتہ است، و بعضی آسمان نیز مگھیند
زیرا چہ این برد و مترادف اند و ہم از بہر این در شرفنامہ معنی آسمانہ سقف نوشتہ است
و ازین جملہ معلوم می شود کہ بسہو بجای آسمانہ بام نبشتہ الخ
(مقدمہ محشری، سقف بمعنی آسمان خانہ)

اس سلسلے میں چند معروفات ہیں :

۱ صاحب مدار نے ادات کا نام ضبط نہیں کیا ہے۔ دراصل جملہ یوں ہونا چاہیے :
و تائید لانا دات و لسان الشعر آوردہ،

۲ مدار کے ملبوم نسخے میں ہے : در مقدمہ سیر مویہ آنست، یہ غلط درج ہوا ہے۔ صحیح
جبارت یوں ہوگی : مقدمہ نیز مویہ آنست، اور مقدمہ سے مراد محشری کا مقدمہ
الادب ہے۔ بظاہر ڈاکٹر صاحب معجم مدار الافاضل نے اس جملے کی تصحیح نہ کر کے یہ
گمانی پیدا کر دیا ہے کہ وہ مقدمہ کو کسی مخصوص کتاب کا نام نہیں سمجھتے۔

۳ جہاں تک مویہ الفضلا کے ملبوم نسخے کا تعلق ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اس میں
شرفنامہ کے متعلق صحیح اطلاع درج نہیں ہے اور اس پر اس اعتبار سے اعتراض کہ
اس میں اشکوب کے معنی بام لکھے ہیں۔ اور بام بمعنی سقف غلط ہے۔ درست نہیں،
اس لیے کہ خود شرفنامہ میں دو معنی دیے ہیں : ایک بام اور دوسرا آسمان جس کا متبادل
عرنی لفظ سقف ہے۔ اور یہ آخری معنی خود آخر میں مویہ الفضلا میں شرفنامہ ہی کے
حوالے سے درج کیے ہیں۔ مختصر یہ کہ مویہ و دیگر مدار میں شرفنامہ پر ایراد جمل ہے۔

اس گناراش سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر باقر صاحب معجم مدار اگر محو کتابوں کی طرف
متوجہ ہوتے تو ایک طرف ان کا مرتب کیا ہوا متن غلط سے پاک ہوتا، اور دوسری طرف
متن ناقض نہ ہو جاتا۔

۱۔ محو محشری کے ملبوم جہاں کے نسخے میں سقف بمعنی آسمان خاد آیا ہے۔ (۵۱ ص ۱۳۰)

مدار الافلاک کی ترتیب نو

افکار الطیب نام داروئی است کہ ادا ناخن پریان و ناخن خوش نیز گویند و قبل جانودیسیت از حشرات دریا، ہند سنکہ خوانند۔

اگرچہ اس میں کسی کتاب کا حوالہ نہیں لیکن یہ بیان مویدا الفضلا سے مستفاد ہے، چنانچہ مویدا میں ہے :

افکار الطیب ناخن خوش کہ ہند وی جیٹھ کھر گویند کذا فی زفان گویا، وود فرینگنا نامہ است کہ افکار الطیب خرف و آن جانودیسیت از حشرات بھری کہ ہندیش نکھہ و نکھوترمی گویند و نیز در فرینگنا نامہ مسطور است کہ افکار الطیب را پیارسی ناخن پریان گویندیش، ہندیش نکھہ نامند و آن داروئی است (۱۰۱) مویدا میں خرف کی شرح ہے :

وود قنیدہ مویدا حیوانی است از حیوانات دیدہ کہ بتازیش افکار الطیب و ہند نکھہ و نکھوترمی گویند۔ (۳۶۲: ۱)

مویدا کے ان دونوں بیانات کا مدار کے بیان سے مقابلے پر معلوم ہوتا ہے کہ مدار میں مندرج ہندی مترادف سنکہ یقیناً غلط ہے۔ یہ نکھہ (بمعنی ناخن) کا مصحف ہے۔ خود مدار میں خرف کی یہ تشریح ملتی ہے :

خرف ... وود از قنیدہ نقل کردہ کہ حیوانی است دیدائی کہ آنرا افکار الطیب و ہند نکھہتر خوانند۔ (۱۳۰: ۲)

ڈاکٹر باقر صاحب نے جلد اول میں افکار کا ہندی مقابل سنکہ، لکھا اور جلد دوم میں نکھہتر لیکن ان دونوں کے درمیان جو اختلاف ہے، اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی سو صفحات کے بعد ایسی معمولی چیز ذہن سے اتر جاتا قرین قیاس ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض ہے کہ مدار اور مویدا کے قول میں تھوڑا سا فرق ہے یعنی مویدا میں افکار کے دو مترادف نکھہ اور نکھوتر دیے ہیں اور مدار میں محض نکھہتر ہے۔

اشارہ وود مویدا سب ہر و بریز و بدہ الخ (۱۱۱: ۱)

دارالفاضل کی ترتیب نو

دار کے اس بیان کی تائید مؤید سے نہیں ہوتی، ملاحظہ ہو:
 "افشار بالفتح بریز وریز نہ وریختن کذا فی شرفنامہ (۳۹:۱)
 اور یہی بیان شرفنامہ کا بھی ہے:

افشار بالفتح بریز وریز نہ وریختن۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ اگر مؤید کے مندرجات سے اصل کا مقابلہ ہو جائے، تو متن و قیح تر اور قابلِ قدر ہو جاتا ہے؛ بحالی موجودہ نہیں کہا جاسکتا کہ صاحب دار نے مؤید کے غلط نسخے سے مطالب نقل کیے ہیں یا خود دار کا اندراج کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔

ام غیلان نام درختی است کہ خار ہاش کثیر باشد و در پنج بخش است، ہند
 جو انسا خوانند و در مؤید است درخت کیکر۔ (۱۲۵:۱)

اس بیان میں جو کچھ پنج بخش کی حوالے سے نقل ہے، وہ زفانی گویا میں مینا موجود ہے۔

لیکن مؤید سے متعلق جو بیان ہے، وہ مؤید کے ملبوم نسخے سے کافی مختلف ہے:

درختی است خار دار کہ خار او گچ باشد ہندش جو انسا گویند کذا فی العقیہ، اما در
 نسخہ ہست درخت خار دار کہ ہندش کیکر و بول گویند۔

دونوں کے مندرجات کے اختلاف کے علاوہ یہ بات واضح ہے کہ دار کے ملبوم نسخے میں
 کثیر غلط ہے؛ دراصل لفظ کثیر ہے جس کی دوسری صورت گچ مؤید میں مندرج ہے۔

انج بروزی رنج بیرون کشیدن و بیرون کردن، در مؤید است از
 ادات و شرفنامہ و فرہنگ فقر تو اس بمعنی بیرونی روی چون بینی و
 زنج و کلمہ و در تختری و در مؤید آن معنی است الخ (۱۳۰:۱)

مؤید میں انج کے ذیل میں ہے:

بوزی رنج بیرون رفتن و بیرون کشیدن کذا فی لسان الشعر و در ادات
 شرفنامہ بیرون روی ہشتہ میں میدا تم شاید این تحریف کاتب باشد کہ
 بجای رفتن روی ہشتہ است الخ

دارالافتاح کی ترتیب

مؤید میں لنج کے ذیل میں ہے :

بیرون روی چون مینی وزنج و مرد دست بیکار معنی اخیر از زفان گویاست
بالفتح بیرون کشیدن الخ

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ مؤید میں لنج کے ذیل میں جو قیاس آرائی کی گئی ہے وہ حقیقت سے دور ہے۔ بیرون روی صرف بیرون رفتن کی تصحیف نہیں ہے، بلکہ لنج خود معصفت ہے۔ صحیح لفظ لنج ہے، جو ملاوہ فرہنگ قواس کے لغت فرس اور صحاح الفرس میں آیا ہے ان تینوں لغات میں لنج درج نہیں ہے۔ مدار میں جو کچھ فرہنگ قواس کے حوالے سے آیا ہے وہ فرہنگ مذکور میں لنج کے ذیل میں ہے، نہ کہ لنج کے ذیل میں۔ اگرچہ فرہنگ قواس معروف تہجی کے اعتبار سے مرتب نہیں ہے اس بنا پر صاحب مدار کے ماخذ کے نسخہ فرہنگ قواس میں لنج کے وجود سے قطعی طور پر انکار نہیں ہو سکتا، اس فرق کے ساتھ کہ بیرونی روی تو جناب مرتب کی غلط خوانی ہے۔ بیرون روی درست ہے، ثانیاً فرہنگ قواس کے موجودہ نسخے کلمہ کا لفظ غائب ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب موصوف پر تصحیف کی نشاندہی کی ذمہ داری تھی۔ انھوں نے نہیں کی۔ صاحب مدار پر تصحیف کے نقل کی ذمہ داری مایہ ہوتی ہے۔ اس لیے قریم فرہنگوں میں لنج اور لنج دونوں شکلیں ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ زفان گویا میں الف کے ذیل میں لنج اور ل کے ذیل میں لنج ہے۔ مؤید کے بیان سے کسی قدر دھوکا ہوتا ہے کہ شاید زفان میں لنج بمعنی بیرون روی نہیں، صرف مرد دست بیکار درج ہے۔ مگر ایسا نہیں۔ اس میں واضح طور پر ہے : لنج بیرون روی چون مینی وزنج و مرد دست بیکار۔

اوشنگ : بوزی ومعنی اورنگ و در فرہنگ فخر قواس است بمعنی آوند و
در مؤید گفتہ کہ می باید، این تصحیف باشد۔

مؤید میں ہے : اوشنگ بالفتح اورنگ؛ اودا اورنگ کے یہی معنی ہیں،

بالفتح تخصیصاً بادخا بان و نام ماشین گلچہر الخ

اولا افاضل کی ترتیب نو

دار کے بیان کا مؤید کے مندرجات سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ دونوں کے بیانات کے بعض حصے غلط ہیں۔ دراصل اوشنگ اورنگ کا مترادف نہیں، بلکہ آدنگ کا مترادف چنانچہ زبان میں ہے: اوشنگ معلق وان اورنگ است۔
مؤید میں آدنگ کے ذیل میں آیا ہے:

رسی کہ بیک سرش بجائی و سر دیگرش بجائی دیگر بندند... و ہندالگنی
نامند... و درادات بدین معنی اورنگ آورده است... و در دستور
ہم بدین معنی آورده است و این خطا و تصحیف است۔

اس سے واضح ہے کہ جو کچھ دار میں فرہنگِ نغز قواس کی طرف منسوب ہے وہ دراصل دستور افاضل میں ہے۔ راقم کے پیش نظر دستور افاضل کا مختصر نسخہ موجود ہے اور اس میں آدنگ کے بجائے آوند ہی درج ہے پس واضح ہوا کہ یہ خود صاحب دستور کی غلطی ہے، کاتب کی نہیں ہے۔

فرہنگِ قواس کے نسخہ موجود میں اوشنگ آیا ہے اور آدنگ کا مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ ادات میں ہے۔ غالباً انھیں بیانات سے مارا اور مؤید میں غلطیاں واقع ہوئیں لیکن قواس میں مندرج اورنگ تصحیف ہے۔ اس لیے کہ اوشنگ کو آوند کے ذیل میں بیان کیا ہے اور آوند کو آوند نہیں قرار دیا جاسکتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اوشنگ آوند کا ہم معنی ہے، نہ اورنگ کا۔ اس سلسلے میں اکثر فرہنگوں کا بیانی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ صاحب دار نے فرہنگِ قواس کو نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کی طرف جو چیز منسوب ہوئی وہ فرہنگِ قواس کے یہاں نہیں پائی جاتی۔

باغ : معروف۔ در مؤید است، این لفظ در فصل عربی نوشتہ و نیز در نقل کرد
باینکہ انواع و نباتی میوہ دار و گل دار و ترکاری و جزآن بود، بخلاف بوستان
و مہستانی و معنی بہشت نیز آید۔

مؤید کے مطبوعہ نسخے کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ اس کا بیانی دار سے بعض وجوہ سے

دارالاماخل کی ترتیب نو

مختلف ہے:

۱ مؤید میں فعل فارسی کے تحت ہے، جب کہ دار میں عربی گروا گیا ہے۔ عربی میں اس کے معنی بالکل مختلف ہیں لیکن مؤید میں یہ عبارت موجود نہیں: این لفظ در فعل عربی نوشتہ۔

۲ دار میں گل کے بعد دار د "فعل آیا ہے، جو غلط ہے، اسم فاعل مرغ یعنی گل دار ہونا چاہیے مگر گل دار کے بجائے گل آور زیادہ بہتر ہے، جیسا کہ مؤید مطبوعہ نسخے میں ہے ۳ و جائیکہ کے بعد در آن، ضروری ہے در پورا جملہ غلط ہو جائیگا؛ مؤید کے مطبوعہ نسخے میں ایسا ہی ہے۔

۴ مؤید کے نسخے میں باغ کے لیے صفت پھول اور پھل والے درختوں کی قید نہیں ہے اس میں یہ ہے:

درختانی سیوہ دار و گل آور و بی بار و خار دار باشند و ریاحین و ترکاری
نیز بود بخلاف گنستان و بوستان الخ

باغ سپید: باغ خاص... کذا فی المؤید۔ راقم کو مؤید کے مطبوعہ نسخے میں یہ لفظ نہیں نظر آیا۔

بان: نوعی از درخت در مؤید و ابراہیمست درخت سہجہ و نیز در مؤید است؛
درختی است، مانند سرو۔ و قیل خوشبوی است سوختنی۔ فارسیان بمعنی
خداوند در آخر کلمہ آرد۔

مؤید میں بان (عربی) کے معنی درخت درج کیے ہیں مگر مؤید نسخہ مطبوعہ، یہ باطنی کے ذیل میں ہے:

اندولی چیزی و پنهان و دانندہ نہای و باطنی اسماء اللہ تعالیٰ و در زان گویا
ست کہ درخت سہجہ را گویند و در قنیا است درختی ست مثل سرو الخ

مدار الافاضل کی ترتیب نو

مگر مجھے زمان گویا میں نہ باطن اور نہ بان اس معنی میں نظر آیا۔ البتہ مؤید میں پان (فارسی) کے ذیل میں مدار میں مندرج بعض معنی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً
پان چہری خوشبوی از عطریای سوختنی و نیز نام درختی کہ ثمر آنرا حب الپان
نخونید الخ

یعنی جو مدار کے مطلوبہ نسخے کے حاشیے میں برہان کے حوالے سے درج ہے، اس کا جزم اعظم مؤید سے ماخوذ ہے۔ بہر حال مدار میں مؤید کے جس نسخے سے استفادہ ہوا وہ مطلوبہ نسخے سے جتنا مختلف تھا، اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بتخالہ: پیسی کہ بر روی برآید و در ابلہ ہی مست؛ و اورا بتخالہ نیز گویند و حصار
مؤید گوید کہ دریں تصحیف جاری است و الحق چنین است و اورا کہ
در بای ابجد نویسنده خطا است۔

مؤید میں بتخالہ نہیں، بتخال و بتخالہ دونوں ہیں، اس میں تصحیف جاری وغیرہ کا مطلق ذکر نہیں۔

بسا: معروف، در شرف نام است بمعنی بسیار، صاحب مؤید گوید کہ الف نماۃ
درست نیست، زیرا چہ (بس) قابلِ ندا نیست۔ الخ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مؤید نے شرف نامہ پر اعتراض کیا ہے لیکن بصورتِ موجودہ شرف نامہ میں الف نما نہیں، البتہ مؤید میں شرف نامہ کے حوالے سے الف نما موجود ہے، مثلاً
بسا بالفتح اے بسیار، و بالکسر اسمائیک کذا فی الشرف نامہ۔ اقول ازین اول معلوم
میشود کہ الف است و لیس کذا لک الخ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مدار میں شرف نامے کے حوالے سے پوری عبارت درج نہیں ہو سکی۔

بستہ: مرغابی کہ ہندش بنوائی گویند... در مؤید است مثبت او در تعیر
دیاست و در قیہ است بر سر درخت، در میان دریا از کوہ بیرون آید

- ...وہر کہ سرخ در گردن بندد از زخم چشم ایمن باشد الخ
 مؤید کے منہ جات سے مقابلے پر حسب ذیل باتوں میں فرق نظر آیا :
- ۱ در قمر دیا کے بجائے مؤید میں قمر دیا ہے جو بہتر ہے
 - ۲ تبرہ درخت غلط ہے۔ برشب درخت درست ہے اور یہی مؤید میں قنہ کے حوالے سے آیا ہے
 - ۳ مؤید اور زنان میں ہندی مترادف ہنوالی ہے و ہنوالی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس لفظ کے بارے میں مشکوک رہے رکھتے ہیں اس لیے کہ برخت کے ذیل میں ہند ہندی مترادف ہنوالی درج کیا ہے۔
 - ۴ ہر کہ سرخ الخ کے بجائے مؤید کی حسب ذیل عبارت زیادہ صحیح ہے :
 ہر کہ مرجان و دل در گردن کوکان بندد از مصرت چشم زخم ایمن باشند الخ
 زخم چشم غلط ہے، چشم زخم یعنی نظر بد درست ہے۔
 ان امور کی ذمہ داری کتنی مولفہ ملار پر ہے اور کتنی معج پر، وہ ظاہر ہے۔
- بسیج : در مویاست بوزن فراخ بآمالہ و نیز گفتمہ و مشہوزیم پارسی است و
 ہمدان نقل کردہ کہ بمعنی ساختن کار و عزیمت و اندیشہ۔
 لیکہ مؤید کے ملبوم نسخے میں جم مری کے ذیل میں صرف اس قلم ہے :
 بسیج بوزن مریخ بآمالہ آہنگ یعنی قصد۔
 ظاہر ہے کہ قلمی نسخہ کی تلاش ضروری تھی۔ تاکہ دونوں بیانات کے درمیان لغات کی حقیقت واضح ہو جائے۔ آمالہ غلط ہے، امالہ ہوگا۔

بشترخ : در مویاست بمعنی پارہ و خوشہ مرغما و انگور
 مؤید کے ملبوم نسخے میں ہے :
 بشترخ ... و قیل بفتح رستی است کہ آنرا اسپرگ گویند و گیاہیست کہ

ملک الافاضل کی ترتیب نو

ریگ سبز دای زلف... و در دستور بمعنی پارہ از خوشہ انگور و خرا۔
 واضح ہے کہ مار میں جو کچھ مؤید کے حوالے سے لکھا ہے، وہ دراصل دستور الافاضل میں ہے،
 اور دستور کے موجودہ نسخے میں یہ معنی موجود ہے۔ البتہ زمان گویا میں آیا ہے:
 بشرخ وزی افشرد اسپرک و آن گیا ہی است کہ جاہا را بدان رنگ کتند

بلبل بوستانی ازاغ: کنایہ از آبی سرد است علی الصلوۃ والسلام کہ زانی المؤید۔
 درجای دیگر آوردہ بمعنی بہشت و مصلح صوفیہ مقام وحدت کہ بغیری
 تنگ نیست۔

مؤید میں بوستانی ازاغ آیا ہے اور اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:
 ای باغ وحدت زیراچہ قول "ازاغ البصر واطعی" شعر برین است کہ
 حضرت رسالت در مقام وحدت رسیدہ، بعدہ میل بمکرر بحور و قصود
 رواست کما زین بہشت مراد باشد۔

واضح ہے کہ جو کچھ مؤید میں مذکور ہے، وہ درست ہے، اور مدار کایاں الجھا ہوا ہے اس لیے کہ
 اولاً اس میں بوستانی ازاغ اور بلبل بوستانی ازاغ دونوں میں خلط کر دیا گیا ہے۔
 بوستانی ازاغ سے باغ وحدت اور بلبل بوستانی سے حضرت رسالت آب مراد ہیں۔ اس
 کے علاوہ مدار کایاں باعتبار ذیل ناقص ہے:

- ۱ مؤید کے حوالے سے جو کچھ ہے، وہ مدار سے غائب ہے۔
- ۲ بلبل بوستانی سے باغ بہشت و مقام وحدت مراد نہیں ہو سکتا۔
- ۳ تنگ نیست کا فاعل محذوف ہے، یہاں عبارت چھوٹ گئی ہے۔

نچ: (مرنی) معرب رنگ معروف و بعضی اجوائن خراسانی را گویند و از قنہ
 و صاقرہ معلوم می شود؛ در تنگ نیست بغیم رخ؛ در مؤید است بغیم رخ
 و بغیم از لسان الشعراء بمعنی آرزو نقل کردہ و لغتہ بدین معنی بصحت

نہ پیوستہ۔

در اصل مؤید میں عربی کے ذیل میں پنج اس طرح آیا ہے:

مغرب بنگ.... و بعضی گویند، اجوائی غلامانی را پنج گویند و از قنیه معلوم

میشود کہ دھاتورہ را گویند الخ

فارسی کے ذیل میں اس لفظ کی تشریح یوں کی گئی ہے:

پنج بوزنی گنج ہماں پنج مذکور کذا فی الشرفنامہ و در زفانی گویا مذکور است

پنج بعنم زرخ و اللہ اعلم۔ شاید این زرخ بازار منقوطہ است کہ آنرا قولول

نیز گویند و در دستور نیز مدین معنی مسطورہ است... و در قنیه منقول از

لسان الشعر از معنی آرز است اما در نسخہ کاتب متروک است۔

دانیع ہے کہ مدار میں پنج کے عربی اور فارسی معنی غلط ملط کر دیے گئے ہیں۔ جب زرخ اور

آرز و قولول قولول کے معنی میں ہیں تو مدار کا یہ قول کہ پنج بمعنی آرز بقول صاحب مؤید

مطابق تحقیق ہے، غلط ہے۔ دراصل مؤید میں صرف اتنا ہے کہ قنیه کے نسخے میں لسان الشعر

کے حوالے سے جو بات درج تھی وہ صاحب مؤید کے ملوکہ نسخے سے خارج ہے، صاحب مدار

نے اسے غلط سمجھا ہے۔

بزخ: بفتحین، رنگ آب و عوگ و در دآب و بندآب، بوزن مرغ نیز، در

مؤید از فرنگ تو اس آدرہ بمعنی رسمہ و رنگ آب

مؤید میں بزخ کے ذیل میں ہے:

بوزن مرغ... نیز رنگ آب کذا فی القنیه و بزخ بعنم یکم و فتح دوم

عوگ و در دستور بمعنی صیرنگ آب مسطور۔

در اصل مؤید اور مدار کے اقوال میں بہت فرق ہے۔ مؤید کے مطبوعہ نسخے میں فرنگ تو اس کا

حوالہ نہیں، بلکہ دستور کا حوالہ ہے اور جو معنی دیے ہیں وہ اگرچہ مدار سے مختلف ہیں، لیکن

دستور کے نسخہ موجود کے عین مطابق ہیں دراصل ایک لفظ بزخ ہے جس کے معنی در دآب

د بند آب کے ہیں اور دوسرا بڑخ ہے، جس کے معنی رنگ آب و عوگ کے ہیں؛ یہی بیان زبان گویا کا ہے۔

تتماج : بحسب و جیم فارسی ... چونی است دراز مانند تیر کہ برای نان پیمیدہ می مانند۔ الخ۔ و در مؤید این لفظ را در فعل ترکی آورد و ماست۔ آبا براسطہ ترکیب لفظ تیرا بد کہ در پازی نویسند۔

لیکن مؤید کے مطلوبہ نسخہ میں تتماج اور تتماج فعل فارسی کے ذیل میں درج ہے اور دونوں کے معنی خود شمشہد ہے۔ جیسا کہ مدار تتماج (جیم تازی)۔ ان بین احتمالات کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

تمرکزک : قرآنی جمید و در مؤید است بہیں معنی بفتح یکم و چہارم و پنجم و کسر دوم۔ مؤید کے مطلوبہ نسخے کی اصل عبارت یہ ہے :

تمرکزک یعنی قرآن جمید کذا فی فرنگ علی یگی و در فرنگ قواس ہم ہیں معنی بفتح یکم و چہارم و پنجم و کسر دوم مرقوم است۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدار میں جو کچھ مؤید کے حوالے سے نقل ہوا ہے وہ مؤید میں فرنگ قواس سے ماخوذ ہے۔ لیکن فرنگ قواس کے موجودہ نسخے سے تمرکزک غائب ہے۔ مؤید میں فرنگ قواس کا نام کئی جگہ غلط درج ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی ایک یادداشت راقم کے ایک الگ مضمون میں شامل ہے۔

جملہ : نوعی از غلہ و در مؤید است معنی مشتک ... و مشتک تصغیر مشت و ہمیں صحیح است۔ و نیز نوعی از بازیا است۔

مؤید میں مشتک نوعی از غلہ و مشتک نوعی از بازی و کتک تین معنوں میں درج ہے اول دو معنوں کے لیے لسان الشعر اور فرنگ فخری کے ترتیب وار حوالے ہیں۔ لیکن

مدار الفاضل کی ترتیب

فرہنگ میار جمالی شمس فخری سے یہ لفظ خارج ہے۔ معلوم نہیں کہ اس فرہنگ سے صاحب مؤید کی کیا مراد ہے؟ خلاصہ کلام یہ کہ صاحب مدار نے مؤید کے اخذ کے بجائے خود مؤید کی طرف معنی منسوب کر دیا ہے۔

چغہ : درد مؤید است یعنی بحیم تازی خوانند الخ
مؤید کے مطلوبہ نسخے میں دوسرے تلفظ کا ذکر نہیں ہے۔

چغہ : صاحب مؤید بحیم تازی و پارسی در باب رای ہملہ بمعنی عموک آوردہ؛
آتشہور برای معجاست۔

مؤید میں چغہ ترسیدک والقات نمودی معنی درج ہے اور چغہ کے ذیل میں یہ ہے:
بالفتح مع سکولی الغین المعجمۃ فیہا، جانود یست آبی کہ آنرا عموک گویند۔
درد ز فانی گویا است کہ چغہ بفتحین ہم دست ترست درد فرہنگی نوشتہ
کہ چغہ آواز و صدای عموک را نماند و نیز ترس و بیم و نال و ناری و نیز
بوہ بگیا ہی۔

اس سے واضح ہے کہ صاحب مدار نے مؤید کا قول صحیح نقل نہیں کیا ہے۔ مؤید میں عموک
معنی کے لیے چغہ نقل کیا ہے نہ چغہ؛ البتہ ز فانی گویا میں چغہ بمعنی عموک و صدای
عموک درج ہے۔

خرف : درد مؤید از قنہ نقل کردہ کہ حیوانی است دریائی کہ آنرا اظفار الطیب
و ہند کہتر خوانند۔

مؤید کے مطلوبہ نسخے میں ہندی مترادف لکھ و نکھوتری درج ہے۔ یہ بات قابل ذکر
ہے کہ مدار میں اظفار الطیب کے ذیل میں ہندی مترادف لکھ ہے، جو یقیناً لکھ کی
تصحیف ہے۔ ڈاکٹر باقر صاحب نے اس نام کی طرف قرار واقعی توجہ نہیں کی۔

دارالفاضل کی ترتیب و نو

بخت : در مؤیدہ بمعنی نیش کر نقل کر وہ اندر !
 نیش کے مطلوبہ نسخے میں ہے : در در فرنگ مولانا فخر قواس بمعنی نیش کر است ،
 ن فخر قواس کے نسخہ حاضر میں زحمت سرے سے غائب ہے معلوم نہیں صاحب
 نیش کی غلط فہمی کی بنیاد کیا ہے ۔ بہر حال مدار میں جو کچھ مؤیدہ کے حوالے سے ہے ، وہ مؤیدہ میں
 اس کے نام سے درج ہے ۔

مارخک : در مؤیدہ است ، کاف فارسی و وزن باریک الخ
 نیش میں کاف تازی اور کاف فارسی دونوں سے آیا ہے ۔ اس کا وزن باریک کے بجائے
 ربک ہے ، یعنی حرف چہارم بای تازی صامت ہے نہ معصوت کشیدہ ۔

ن : در مؤیدہ است بفتح بوزن عج رخ و رخسارہ و بضم سرین و نیز گفتہ
 لغت اخیر از قنیہ است الخ ۔ صاحب مؤیدہ ... از لسان الشعر نقل
 کردہ سنخ و زنی گنج ، سرین ہا ز قنیہ آوردہ سنخ بضم سرین مردم ۔
 نیش کے مطلوبہ نسخے میں عج سرے سے غائب ہے ۔ البتہ قنیہ کے حوالے سے سنخ بمعنی
 سرین لکھا ہے ۔ مطلوبہ نسخہ کے اعتبار سے مدار کا قول بے بنیاد ہے ، اس لیے کہ اس میں
 عج مذکور نہیں ۔ قنیہ میں سنخ ہے ۔ ضمنا عرض ہے کہ زخان گویا میں عج بمعنی رخسار اور
 سنخ بمعنی سرین آیا ہے ۔

شکرک : بحسب نوعی از دیدگی کہ کو در کان را باشد و جامہ بفتح نیز ، و بضم جامہ کہ
 بلای دار و بندہ ۔ صاحب مؤیدہ گوید کہ در فرنگ فرخی بدین معنی و شکرک
 بواو است ۔

نیش میں بحسب و بفتح بمعنی دیدگی بفتح نیز بمعنی دام در ہا ہی بزرگ الخ آمدہ ۔ اس سے
 اہر ہے کہ شکرک کے ذیل میں صاحب مؤیدہ نے جو کچھ لکھا ہے ، اس سے مدار کے قول کی تائید

دارالافاضل کی ترتیب

نہیں ہوتی۔ البتہ درشک و دشرک کے معنی جامع وارو کھے ہیں اور اس میں کسی فرہنگ کا حوالہ نہیں۔ معلوم نہیں فرہنگ فرخی^{۲۵} سے کونسی فرہنگ مراد ہے، شمس فرخی کی فرہنگ مراد نہیں لی جاسکتی، کیونکہ اس میں نہ دشرک ہے نہ دشرک۔ بہر حال مدار وارو اس کے اخذ میں جو اختلاف ہے، اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

شید: در مؤید است و بیای پارسی، روشن و آفتاب و قیل یعنی چشمہ آفتاب مؤید کے مطبوعہ نسخے میں ہے:

بیای پارسی روشنی آفتاب و در زان گویا چشمہ آفتاب مؤید کا یہ قول ڈاکٹر باقر مرتب نسخہ مدارالافاضل نے حاشیے میں نقل کیا ہے، لیکن اسخول نے یہ نہیں بتایا کہ متن حاضر (مدار) غلط ہے، روشنی و آفتاب کی جگہ روشنی آفتاب چاہیے۔

فان: صاحب مؤید نقل کردہ چوبی کہ در درباری خانہ تادرا تبعمیل نتوانند شکست۔ اسدی گوید چوبی کہ در چوب شکافۃ بجہت استحکام نہند۔ مؤید میں ہے:

خانہ .. و در فرہنگ نامہ است خانہ چوبی کہ .. نتواند شکست۔ و اسدی گوید ناد مجاز است یعنی چوبی کہ دو شکافۃ نہند تا محکم کنند۔ کنانی ز فافگرمایا۔

جو کچھ صاحب مدار نے مؤید کی طرف منسوب کیا ہے، وہ دراصل فرہنگ نامہ قواس کے مندرجات ہیں با در فرہنگ اسدی کی جو عبارت مدار میں مندرج ہے وہ خود مؤید سے منقول ہے اور مؤید میں زان گویا سے۔ الفاظ دیگر در صاحب مدار نے اصل لغت دیکھے اور در صاحب مؤید نے۔

۲۵ ممکن ہے کہ اس سے فرہنگ فرخی مراد ہو، جیسا کہ جملو کے ذیل میں لکھا ہے۔

دلائل ناقص کی ترتیب نو

شما سب : چون او کشتہ شدہ جا اسپ حکیم کہ وزیر ادبوں بجائے او نصب کردند
دینی آتش پرستی را آب دلو و در شرف نامہ بیای تازی نیز گفتہ و صاحب مؤید
گوید کہ در نسخہ شرف نامہ کہ درام بیای فارسی است۔

مدار کی اس عبارت میں الفاظ جھوٹ گئے ہیں۔ مؤید میں عبارت بالکل صحیح ہے۔ مثلاً:
جا اسپ حکیم را کہ وزیر ادبوں بجای زرشت نصب کردند، تا اد دینی
آتش پرستی را آب دلو و در لسانی الشعر با بای تازی است کذافی شرف نامہ
تا در نسخہ لسانی الشعر کہ نزد بندہ است، دران با بای پارسی است
اگر اس عبارت سے مقابلہ کر لیا جاتا تو مطبوعہ تن کا نقص دور ہو جاتا۔

مدار میں زفان گویا کے حوالے سے جو چند جرات آئے ہیں، ان میں سے بعض کامتابلہ
زفان کے نسخہ موجود سے کیا جا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ صاحب مدار اپنے ماخذ
کا استعمال کس طور پر کرتا ہے، اور ضمناً بعض مقامات پر مطبوعہ تن کا نقص بھی رفع ہو
جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر باقر صاحب کو زفان گویا کے نسخے کا علم نہیں تھا، اس لیے وہ اس
سے معذور رہے۔

ہم : رود سپر باب و در پنج بخشی است بانگ بلند
زفان کے نسخے میں رود ستر و بانگ بلند دونوں معنی خدج ہیں۔

نخلی : در پنج بخشی است زقار و شادمانی
زفان کے موجودہ نسخہ میں یہ لفظ شامل نہیں۔

خستہ : در زفان گویا بمعنی شاخ افنی یا ماہی کہ او را زال گویند۔
مؤید کے مطبوعہ نسخے میں زفان کے حوالے سے زال کے بجائے زال ہے۔ مگر زفان کے

نفس موجود میں حال ہے، اور کلمہ ماہی والی شعلہ کے یہاں اکھڑ آیا ہے۔ مثلاً انہی کلمے ہے:
از آئینہ بنفشہ بروید ز روی خسارہ سلب
وزین پیشیز بریزد ز پشت ماہی وال

خرودہ و خرمہ: خردوس و جانور دشتی؛ و در ادات بمعنی تاج خردوس و بتان افروز
و در پنج بخشی خود خرودہ بمعنی مذکور۔

اس میں شبہ نہیں کہ زفان میں خود خرودہ کے وہی معنی ہیں جو دار میں آئے ہیں۔ لیکن خرودہ
اور خرودہ کے بھی وہی معانی زفان میں مندرج ہیں، جو دار میں نقل ہیں۔ مگر تعجب کی بات
یہ ہے کہ ان الفاظ سے صرف نظر کرتے ہوئے صاحب دار نے خود خرودہ کا ذکر کیا۔ حال آنکہ
یہ لفظ اصلاً ایک لغت کی حیثیت سے دار میں آیا ہی نہیں ہے۔

زاک: پشکری و اجناس آن۔ و مؤید از طب نقل کردہ، ہندش تاج خوانندہ
و در شرف نامہ است بمعنی زک لغت...

مؤید کا بیان یہ ہے:

زاک یعنی پشکری و اجناس آن و در طب حقایق الاشیاء مسطور است
زاک ہندوی تاج را گویند و در شرف نامہ بمعنی لک است۔

ان دونوں بیانیوں میں چند اعتبار سے اختلاف ہے:

۱ دار میں مندرج تین معنی مؤید سے ماخوذ ہیں۔ حال آنکہ صاحب دار ایک یا زیادہ
بھی زیادہ دو کو مؤید کے حوالے سے نقل کرتا ہے۔

۲ دار میں 'طب' ہے، اور دار میں کتاب کا پورا نام طب حقایق الاشیاء درج
ہوا ہے۔

۳ شرف نامہ کے حوالے سے جو کچھ دار میں ہے، وہ دراصل مؤید ہی سے ماخوذ ہے۔ اس
حصے میں بھی 'زک' غلط ہے، لک 'ہونا' چاہیے۔ مؤید الفصلا میں یہی ہے اور شرف نامہ

میں بھی رک کے بجائے لک ہی پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو جو ڈاکٹر اتر صاحب کی توہم میں نہ آسکی۔

۴ 'رک کے بعد بضم د ثمود میں ہے، نہ شرف نامہ میں۔

۵ مار میں ایک قول تبختری کا درج ہے، جو نہ ثمود میں ہے، نہ شرف نامہ میں۔

زغاره : نان کا قرسی در پنج بخشی است نابکار وزمین سخت۔

زفان گویا کہ نسخہ موجود میں زغاره کے یہ معنی بیان ہوئے ہیں : زغاره نان کا ورسیں و در نسخہ راء معجمہ است۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ مار میں پنج بخشی (زفان) کے حوالے سے درج ہے۔ اس کا اصل نسخے سے کوئی تعلق نہیں۔

زغند : شد بر جستن، در پنج بخشی است و بانگ سخت

زفان کے نسخے میں اصل عبارت اس طرح ہے : بانگ سخت و بر جستن۔

جب تک مار کے نسخہ موجود ہیں پنج بخشی کے بعد علاوہ شدہ "محذوف نہیں سمجھا جائے" اس وقت تک اس میں مندرج معنی ناقص ہیں۔

زلہ : در پنج بخشی است و پرنده و گناہ و آنچه صوفیان از آمدہ برگیرند۔

زفان کے نسخے میں زلہ کے یہ معانی درج ہیں : کمری است کہ در گرمابا باشد و فریاد کند۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ صاحب مار نے جو کچھ زفان کے حوالے سے لکھا، اس کی تائید نسخہ موجود سے نہیں ہوتی۔

سرخوچ : در پنج بخشی است سرخوچ و پادشاه جامکہ زفان زیر دامن افگند الخ

زفان گویا میں ہے، اسرا ی خوچ، سرخوچ کہ بتازی خنارہ گویند۔

ظاہر ہے کہ مدار میں جو دوسرے معنی درج ہیں، وہ نسخہ زفانی سے خارج ہیں۔

سرام : در زفانی گویا است دای ملتی کہ در سر باشد۔
زفانی کے نسخہ معاصر میں ہے : سرام ملتی است یعنی خلل دماغ۔ دونوں سند جات میں جو
فرق ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

شفترنگ و شفرنگ : شفتالو و درخت بخش آلودہ کہ بار درختی است، اتند شفتالو بیشتر
سرخ و سپید باشد۔

زفان گویا میں شفترنگ کے یہ معنی درج ہیں : شفتالو و درخت رنگ نامہ است کہ میوہ است
مثل شفتالو، سرخ و سپید باشد۔

واضح ہے کہ مدار میں جو کچھ زفان کی طرف منسوب ہے، وہ زفان میں فرہنگ نامہ کے حوالے
سے آیا ہے، اور فرہنگ نامہ سے مراد فرہنگ نامہ قواس ہے۔ چنانچہ قواس کے نسخہ موجود میں
یہ معنی درج ہیں۔

شیب : بکرو یا پارسى شیب بمعنی فرو۔ و درختی است مختصر شیب و با و
پارسى فارسی فرود و آشفتن و بمعنی کونیز۔ و درختی بخشى است بیای پارسى و
تازی بمعنی مذکور۔

مگر زفانی کے نسخہ موجود میں یہ ہے :

شیب تازیانہ و فرود چیزى است و در اسدى شیب بپارسى و بپارسى
پارسى... رشتہ تازیانہ۔

مدار اور زفانی کے سند جات میں جو فرق ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ بیای پارسى و تازی کے
بجائے بیای پارسى و بای عربى درست ہوگا۔

فہ : و درختی بخشى گفہ اند، نام داروى است۔

زنان کے نسخہ موجود ہیں یہ لفظ شامل نہیں؛ داروی میں یا ہی تکبیر کا اضافہ ہونا چاہیے۔

قرآخوak، گوشتابہ، در زنان گویا و پنج بخشی این لفظ را در قاف آوردہ و الا در فرنگہای دیگر در باب فاست۔

زنان گویا میں قرآخوak بمعنی گوشتابہ ہے۔ یعنی فاکے ذیل ہی میں ہے۔ دراصل محاسبہ مؤید سے غلطی ہوئی کہ اس نے لکھا کہ در زنان گویا با قاف آوردہ۔

مگر زنان کے نسخہ موجود سے اس کی بخوبی تردید ہو جاتی ہے۔ ضمناً دو باتیں اور بیان کرنے کی ہیں۔ اولاً مدار میں زنان گویا و پنج بخشی سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اس سے دو لغات مراد ہیں۔ ثانیاً مؤید میں قرآخوak کے ذیل میں زنان کی طرف غلط قرأت منسوب ہے یعنی قرآخوak جیسا کہ مدار میں ہے۔

قرآگند: در پنج بخشی آوردہ کہ این زبان بطنی است۔

در اصل زنان کے نسخہ موجود میں قرآگند ہے اور ایک باز بخش پنجم در سخنان آیمختہ از تازی و ترکی و محلی کے ذیل میں اس طرح آیا ہے،

قرآگند لحات و این بطنی است۔

دوبارہ لغات ترکی کے ذیل میں بخش ہفتم میں قرآگند بمعنی لحات درج ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس لفظ کی جو شکل مدار میں درج ہے یعنی قرآگند، کجاگند، کجاگند، کوآگند و کمرآگند، ان میں سے کسی کا زنان میں مندرج صورت سے کوئی تعلق نہیں ہے

داس کالہ، عصای سرکج و داس رزمی پرای، در سکندی و ادات و پنج بخشی

”سرکش“ دیدہ شد۔ و در ابراہیمی و مؤید ”سرکج“ و ہم در پنج بخشی است

و بعضی گویند عصای تبرکش۔

زنان کے موجودہ نسخہ میں ہے:

داس کا، عصای سرکش و داس ز سپرای و بعضی گویند عصای سرکش۔
اس سے ظاہر ہے کہ مار میں زفانی کے حوالے سے سرکش معنی تجویز کرنا غلط ہے، اس لغت میں بالکل وہی معنی مندج ہیں، جو مار میں آئے ہیں۔ سرکش سرکش کی غلط خوانی ہے۔ اس کی قیسم کی ذمہ داری صحیح پر ہے۔

قیداف: نام مردی کہ پادشاہ بردع بود و در شاہنامہ و پنج بخشی ملکہ روم گفتہ و در مثنویا است: نوشاہ را گویند۔

زفانی کے موجودہ نسخہ میں اس طرح آیا ہے: قیداف نام زنی کہ ملکہ بہر دوع فاندلس بود، مثنوی میں زفانی کے حوالے سے صحیح معنی دیتے ہیں۔ اس میں مزید یہ ہے کہ شاہنامہ میں ملکہ روم ہے۔ واضح ہے کہ مار کا بیان زفانی گویا اور مثنوی الفضلہ دونوں سے بالکل مختلف ہے۔

کراہ: بکسر، در مثنویا است بفتح مرغیست سیاہ و در پنج بخشی است: واسب الخ زفانی کے نسخہ موجود میں حرف چہارم 'یا' ہے۔ اور اس کے معنی صرف مرغ سیاہ درج ہیں۔ مثنوی میں بھی کراہ ہے اور اس کے کئی معنی بشمول اسپ و شتر و اجرت کوڑا وغیرہ درج ہیں۔ بہر حال جو معنی مار میں بحوالہ زفانی درج ہے، اس کا نسخہ موجود ہے کوئی تعلق نہیں۔

کنجہ: داروئی کہ عرب آنرا عنزروت خوانند.... و در پنج بخشی است بکسریم پادزہر۔

زفانی کے موجودہ نسخہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

بعض و فتح جیم عنزروت، فانی داروئی است، و در فرنگنامہ است،
کنجہ بکسریم پادزہر گویند آن داروئی است۔

جہاں ہے کہ جو کچھ مار میں زفانی کے حوالے سے لکھا ہے، وہ دراصل فرنگنامہ کے مندرجات ہیں

مارا الا فاضل کی ترتیب نو

اور فرہنگنامہ قواس کے موجود نسخے میں یہ عبارت بعینہ ہائی بھائی ہے۔

کوچ بجوچ : صاحب مؤید مرکب دنداں را گوید یعنی رفتن بتواتر و در سکندری
و پنج بخشی است مرکب کوچ بلوچ و کلمہ دوم بلام و ہر دو کلام بمعنی
مذکور۔

زفانی میں آیا ہے : کوچ و بلوچ مرکب و در ہر دو واو پارسی، دنداں را گویند و مجرد
کوچ احوال باشد و چند و پیارہ و دزد و بعضی بجم عربی گویند۔
مؤید کے مطبوعہ نسخے میں کوچ کوچ ہے۔ اس میں مندرج معنی کا مدار کے معنی سے مقابلہ
کرنے پر معلوم ہوا کہ گوید کے بعد مار میں واو عاطفہ درج ہونے سے مدہ گجھ۔ اسی طرح
زفانی سے مقابلہ سے ظاہر ہے، بلوچ کے بعد مار کی عبارت میں واو زائد ہے، اور ہر
دو واؤ کے بعد پارسی کا لفظ درج ہونے سے رہ گیا ہے

کوک : و پنج بخشی است بوا و تازی و بلوچ پارسی ترہ الیست کہ ہندش
بجائے گویند۔ صاحب مؤید گوید ترہ الیست کہ از خود دل آن خواب
زیادہ شود۔

زفانی کے نسخے میں صرف واو فارسی سے ہے اور ہندی مترادف بختل ہے اور یہی شکل
فرہنگ قواس اور دستور الا فاضل میں بھی ہے۔ مار میں جو کچھ صاحب مؤید کے حوالے
سے نقل ہے، وہ زفانی میں بھی موجود ہے۔ پس اس قدیم فرہنگ کے حوالے کے بجائے
اس سے جدید تر فرہنگ کا ذکر کرنا مناسب ہے۔
بہر حال یہ قابلِ توجہ امور ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب کو غور کرنا چاہیے۔

کار : صاحب مؤید مطلق بیش دنداں ہم آدوہ، در زفانی گویا و پنج بخشی است
بہ دنداں و محوی جثہ و موصو کہ بر سر کردہ باشد۔ اما در ادات بدین معنی

دارالفاضل کی ترتیب نو

بکاف تازی است۔

معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ مدار نے زفانی گویا میں یہ لفظ خود نہیں دیکھا، ورنہ وہ اس طرح نہ لکھتے۔ دراصل زفان میں محاذ کے ذیل میں صرف اس قدر ہے:

محاذیش دندان و موی جثہ،

اسی فرہنگ میں کاز کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں:

صومعہ بر سر کوہ گویند محیسم بکاف فارسی است۔

صاحبِ مؤید نے زفانی کی دونوں عبارتیں ملا کر کاز کی اس طرح وضاحت کی:

در زفانی گویا است کاز پیش دندان و موی جثہ و صومعہ باشد بر سر

کوہ و درادات بدین معنی اخیر بکاف تازی است۔

بظاہر صاحبِ مدار نے مؤید سے نقل کیا ہے، نہ براہِ راست زفان وادات سے۔ اس لیے کہ اس کے مندرجات زفان سے مختلف ہیں مبادادات کے سلسلے میں تو یہ غلطی ہوئی ہے کہ صاحبِ مدار کے نزدیک اادات میں صومعہ کے علاوہ اور معنی کے لیے بھی کاز بکاف تازی ہے، نہ کاز (بکاف فارسی)، حال آنکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ اادات میں فقط صومعہ کے معنی کے لیے کاز اور بقیہ کے لیے کاز ہے۔ یہی مؤید کا بیان ہے۔ مگر مدار کے مطلوبہ نسخے میں تھوڑی سی غلط فہمی کی صورت نظر آرہی ہے۔

گوپال: دوتنج بخشی است: فردوسی گوید سخت آہنین و چوبین۔

زفانی کے نسخے میں ہے: گوپال باوا پارسی گرز واسدی و فردوسی گویند: سخت آہنین و چوبین باشد۔

زفان میں دو فرہنگوں کا ذکر ہے، لیکن مدار نے اس تحت کے حوالے سے صرف ایک فرہنگ کا ذکر کیا ہے؛ ثانیاً سخت، سخت کی مضحکہ خیز تصحیف ہے جس کو بظاہر مولف کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے۔ یہ صریح نسخہ کی غلط خوانی ہے۔ برہان میں سخت کی جگہ سخت اور اوزنگ آہنین و چوبین ہے۔ یہ بھی نہایت مہمل تصحیف ہے۔

مدار الافاضل کی ترتیب نو

گوز: بکاف پارسی بوزن سوز و خود کہ آترا چہار مغز نیز گویند و در پنج بخشی
بمعنی بد و ازین جاست کہ گفتہ اند، بانقران لغزی و باگوزان گودی۔
زنان کے نسخے میں یہ ہے:

گوز: جوز و بدین جاست کہ گویند بانقران لغزی و باگوزان گودی؛
و بمعنی بضم کاف و واو پارسی گویند و بدین لغت نیز بادی مراد است
کہ از دُبر رہا شود۔

یہ ساری باتیں مؤید میں بعینہ مندرج ہیں۔ مگر صاحب مدار نے ان کو ادھورا نقل کیا؛
مطبوعہ متن میں حسب ذیل نقائص ہیں:

(۱) سوز کے بعد واو عطف غلط ہے۔

(۲) خور غلط ہے، جوز ہونا چاہیے۔

(۳) پنج بخشی کے حوالے سے بد غلط ہے، باد ہونا چاہیے اور یہ بامخصوص ہے۔

(۴) 'ازینجا' سے جو سبب شروع ہوتا ہے، وہ تمام تر غلط ہے؛ بد (صحیح باد) کے
جگہ اس کا تعلق جوز سے ہے، جیسا کہ زنان اور مؤید دونوں سے ظاہر

جس طرح زنان گویا تک معجم مدار الافاضل کی رسائی نہ تھی، اسی طرح فرہنگ قواس
کا نسخہ بھی ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ مدار میں فرہنگ قواس کا نام چند جگہ آیا ہے،
لیکن یہ فرہنگ صاحب مدار کے ماخذ میں نہیں تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی دوسرے
ماخذ سے یہ اطلاع حاصل کی گئی ہے۔ اگر ایسے تمام مقامات کی تصحیح فرہنگ مزبور کے
نسخہ موجود سے کر لی جاتی، تو مطبوعہ متن ناقلاً از اور صحیح تر ہو جاتا۔ اس فرہنگ کی نسبت
سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

سارنگ و در فرہنگ قواس بمعنی پشتہ و کند

قواس کے نسخہ مندرجہ (ورق ۲۴ الف) سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'نارد' کے معنی کند کے
ہیں اور سارنگ کے معنی پشتہ؛ نارد اور سارنگ دو الگ الگ لفظ ہیں۔ اس سے ظاہر

کہ صاحب کے ذیل میں نارد کے معنی بھی درج ہو گئے ہیں۔ بہر حال یہ واضح ہے کہ صاحب مدار کی غلطی کسی قدیمی فرہنگ کی غلط خوانی پر مبنی ہے۔

مدار میں صحاح الفرس کے جا بجا حوالے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب سے صاحب مدار براہ راست استفادہ نہیں کر سکا ہے، لیکن بعض قدیمی ماخذوں میں اس کتاب سے استفادہ ہوا ہے۔ اسی بنا پر مدار میں اس کا نام برابر آتا ہے۔ اس فرہنگ کے قلمی نسخے عام نہیں۔ لیکن چار سال قبل یہ ایران میں طبع ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اب سہل الحصول ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے مدار لا فاضل کی تفہیم میں اس سے کام نہیں لیا۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہو سیکے گا کہ صحاح الفرس سے استفادے کی کتنی ضرورت تھی۔

خرابارہ، آنکہ جمعی بایکی... کنند، لیبی، یکی مفاجر بی شرم ناخوشی کہ ترا الخ۔ و

در صحاح فرس و بعضی کتاب لغت بمعنی جمع شدن در کاری آورده اند،

بنائید این بیت استاد : بمدح او و قصد دشمنانش الخ

صحاح الفرس میں فقط معنی اول مع بیت لیبی کے درج ہیں، مگر جو کچھ صاحب مدار نے

اس لغت کے حوالے سے درج کیا ہے، اس سے صحاح الفرس کا کوئی تعلق نہیں۔

دلق : در صحاح گوید، چیزی است چنانکہ کہ آن مرغ صید کنند۔

در اصل یہ لفظ صحاح الفرس میں موجود نہیں۔ صاحب مدار کو غلط فہمی ہوئی۔

ژاژ : در صحاح فرس و بعضی لغت فرس گفتہ کہ گیا ہی است کہ خار ہا بسیار

دارد، و از آن ترہ دوغ کنند و در صحاح طبع شد و در بیشتر مواضع

آز آنکہرہ گویند۔

استاد : حسود بشر دل کہ میبش کنند سزا کہ تشکیبداشتر ژاژ

مدار الافاضل کی ترتیب نو

صاح الفرس کے مطبوعہ نسخے میں یہ ہے :
 ژاژ دو معنی دارد، اول گیا ہی باشد تلخ کہ تره دو رخ از وی سازند یعنی
 ریچال مسجدی گفت : ژاژ داری تو دستند بسی ژاژ خزان الخ : دوم سخن
 ہریان و یا ذہود : فرخی گفت : کسی کہ ژاژ در آید بد گھٹش بنور الخ
 اس سے واضح ہے کہ جو کچھ مدار میں صحاح الفرس کے حوالے سے درج ہے وہ صحاح کے
 مطبوعہ نسخے سے بالکل مختلف ہے ۔

سپنج : اآدر صحاح فرس گفتہ کہ معنی سپنج آرا نگاہ و جای مہمانی است و مستشہد
 این سخن یتی آوردہ از فردوسی :
 گمرا مشب بدین خان یا ہم سپنج نباشد کسی را ز من بیج رنج
 صحاح کے مطبوعہ نسخے میں ہے :
 سپنج آرا نگاہ باشد و جای مہمانی و عارف عاریتی نیز گویند ، فردوسی گفت :
 چنین است رسم سرامی سپنج گہی ناز و نوش و گہی درد و رنج
 ان دونوں بیانوں میں جو اختلاف ہے ، وہ اظہر من الشمس ہے

قلقبائی : در صحاح فرس گفتہ زعم من آنست کہ آن سنگ را غلبان یعنی (مع
 بغین) بمعجمہ باید گفت بجهت آنکہ اورا بر بام می غلطاند و در نیست کہ
 بواسطہ تکرر استعمال قاف یعنی (مع بغین) قرب مخرج بدل کردہ
 باشند ۔

صاح کے مطبوعہ نسخے میں ہے :
 زعم این ضعیف آنست کہ آن سنگ را غلبان بیايد گفت بغین بمعجم ،
 و بعض چہ بعض از زبانہا بام را بان گویند و بقلب بمعجم بہ وزن ، و آنرا
 بر بام می غلطاند و بجهت استعمال قاف بغین مبتدل شدہ بجهت

قرب مخرج۔

دونوں بیانات میں جو بنیادی فرق ہے، وہ بخوبی ظاہر ہے۔

اب تک ان اخذوں کا ذکر ہوا ہے جو باوجود اس کے کہ ضمنی اور ثانوی ہیں۔ لیکن ان سے اصل لغت، معانی اور ابیات استنباط سب کی تعلیم میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بعض ایسی کتابوں کا ذکر ہے جن کے حوالے سے کوئی تاریخی واقعہ درج ہوا ہے۔ معجم نسخہ کا فرض تھا کہ ان مخصوص کتابوں سے حسب ضرورت استفادہ کرتا۔ اس کے متن کی تعلیم میں بڑی مدد ملتی۔ ذیل میں بعض ایسے مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے، جن میں کتابوں کے حوالے ہیں۔ اور اگرچہ یہ کتابیں چھپ کر عام ہو چکی ہیں۔ لیکن معجم نسخہ، مدار نے ان سے استفادہ غیر ضروری خیال کیا۔

۱ : ۵۳ میں التیسرے کے ذیل میں طبقات ناصری کا حوالہ ہے۔ یہ واقعہ طبقات میں (کابل ایڈیشن ۱ : ۳۰۰ پر) موجود ہے، لیکن دونوں میں قدرے تفاوت ہے، مثلاً :

۱۔ طبقات میں التسر ہے، مدار میں التیسر

۲۔ طبقات میں وطواط نام : امام رشید الدین ہے، مدار میں امام الرشید

۳۔ حدائق کا نام طبقات میں کتاب حدائق فی دقایق الشعر ہے، مدار میں حدائق السحر

۴۔ طبقات میں تالیف، مدار میں تصنیف

اگرچہ یہ بنیادی اختلاف نہیں، لیکن مدار نے صاحب طبقات کے اصل اقوال نقل کیے ہیں۔ اس بنا پر یہ جزوی اختلاف بھی قابل توجہ ہیں۔

۱ : ۶۵ میں ادیم کے ذیل میں قبعلثری شاعر کا ایک مکالمہ حجاج کے ساتھ، منقول ہے، اور حوالے کے سلسلے میں ہے، کذا فی المطول الہروی (کذا)

یہ واقعہ مطول میں موجود ہے، جس کا مولف لغت اذانی ہے، اور کتاب عربی میں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مطول کے مولف کے تعین میں مدار کے مطبوعہ نسخہ میں مترج غلطی ہوئی، معلوم نہیں یہ غلطی صاحب مدلی کی ہے، یا ڈاکٹر محمد باقر معجم نسخہ موجود کی۔ الہروی، غلط ہے۔

مدار الافاضل کی ترتیب نو

”لہروی“ صحیح ہوگا۔

۱۲۰، ۱۲۱ میں الفیہ و شافیہ کے ذیل میں مذکورہ دولت شاہی کے حوالے سے طغان شاہ سلجوقی کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ مذکورہ دولت شاہی سے مراد مذکورہ دولت شاہ سمرقندی ہے جو مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ مادریہ واقعہ بھی اس میں شامل ہے۔ اگر معجم کے قلم سے حاشیے میں اس کا اضافہ مع تاریخ طغانی شاہ کے ہو جاتا، تو متن زیادہ ناقص اور قابلِ توجہ ہوتا۔

۱: ۱۲۹ میں انگلیوں کے ذیل میں کشف المحجوب کا ذکر ہے۔ کشف المحجوب چھپ چکی ہے، اگر مدار میں مندرج مطالب کا اصل نسخے سے مقابلہ ہو جاتا، تو بعض غلطیاں اور خامیاں رفع ہو جاتیں۔ مثلاً مدار میں صاحب کشف کی نسبت جلالی دی ہے، جو جلالی کی تصحیف ہے۔ اس کی تصحیح از بس ضروری ہے۔ وضع مانی غلط ہے، وضع مانی ہونا چاہیے۔ رودی کے بعد در زائد ہے۔ فرہنگ سردی کا متن میں توسیع کا اضافہ غلط ہے، یہ نام حاشیے میں درج ہونا چاہیے تھا۔

۲: ۲۰۷ پر چہر زاد کے ذیل میں ایک واقعہ طبقاتِ ناصری کے حوالے سے درج ہے۔ یہ واقعہ طبقات کے موجودہ نسخے (۱: ۱۲۵، ۱۲۶) میں موجود ہے۔ دونوں یہاں کے مقابلے سے اندازہ ہوا کہ مدار کا متن ناقص ہے، اور اس کا نقص مطبوعہ نسخے کے مقابلے سے رفع ہو سکتا تھا۔ متن مدار کے بعض نقائص یہ ہیں :

طبقاتِ ناصری

چون بہمن از دارِ قائل نقل کرد

پسری آمد، طلا نام کرد، بر رسید

ہمای شفعی حالِ ادوی بود چون اورا معلوم شد

دبا د آں را بجلد آورد

سبزان رسید

مدار الافاضل

چون بہمن نقل کرد

پسری آمد دانا نام کرد و بر رسید

ہمای شفعی حالِ ادوی بود اورا معلوم شد

دبا د آں را بجلد بآورد

اسیطان رسید

اس طرح کی مثالوں سے پوری طرح واضح ہے کہ متن کی تصحیح کے موقع پر ان تاریخی کتابوں سے استفادہ ضروری تھا۔

مدارالافاضل کی ترتیب نو

ڈاکٹر محمد باقر صبح مدارالافاضل شعر کی تحریک کی طرف توجہ نہیں کر سکے، حال آنکہ دو درجہ میں تصنیف کا یہ بھی لازمی عنصر ہے۔ اس لیے کہ اس کی بدولت شاعر کا نام معلوم ہو جاتا ہے، کبھی کبھی شعر کی دوسری روایت کا بھی پتا چلتا ہے اور اکثر متن کی تصحیح ہو جاتی ہے۔ مدارالافاضل کے سلسلے میں لغت فرس، سادی، صحاح القس، فرہنگ قواس، شرفنامہ وغیرہ خصوصیت سے قابل توجہ تھے۔ ان میں سے اول دو تو مطبوعہ شکل میں موجود بھی ہیں اور ان سے استفادہ نہایت آسان ہے۔ ذیل میں اس سلسلے کی بعض مثالوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

- ج اول ص ۱۲ البتہ کے ذیل کا شعر شبید کا ہے
 ص ۲۰ آغشیج کے ذیل کا پہلا شعر شمس فخری صاحب معیار جمالی کا ہے۔
 ص ۳۱ آفاذ کے ذیل کا شعر عنصری کا ہے
 ص ۳۳ آفریں کے ذیل کی بیت تاج ریزہ کی ہے
 ص ۳۷ آمرغ کے ذیل کا شعر کسائی کا ہے
 ص ۱۲۸ انبرہ کے ذیل کی بیت خواص کی ہے
 ص ۱۵۴ ایلیا کے ذیل کا شعر اسدی طوسی کا ہے۔
 ص ۱۵۶ باغسہ کے ذیل کا شعر شاہنامہ میں نہیں، اس کا مصنف اسدی طوسی ہے اور یہ شعر مگر شاسب نامہ (ص ۴۰۰) میں موجود ہے۔ متن میں بیت لنگ غلط ہے، بیست رنگ ہونا چاہیے۔
 ص ۱۶۵ بادغر کے ذیل کا شعر ابو شکور کا ہے۔ دونوں میں بیت کی قرأت میں بڑا اختلاف ہے:

مدارالافاضل	صحاح ۷۴
بساخانی وکاشان و بادغر	بسا جایی کا شان و بادغر
بزیز اندر و شادی تویش کرد	بدواندرون شادی و نوش خورد
ص ۱۷۶ بالغ کے ذیل کا شعر عمارہ کا ہے، نہ عمار کا؛ صحاح میں بیت کی قرأت میں اختلاف پایا جاتا ہے،	

مدار کا حاصل فی ترتیب نو

مدار صحاح
 باجنگ سعدیانہ و بالذبح و کتاب
 آمد سحابی چاکر خود خواجہ اصواب
 واضح رہے کہ مدار کے مطبوعہ نسخے میں شعر جس طرح لکھا ہے، یہ بھی معنی ہے۔
 ص ۱۷۸ بالوانہ کے ذیل میں جو بیت مدار میں درج ہے، وہی لغت فرس، صحاح الفرس
 اور فرہنگ قواس میں بالوائہ کے لیے بقید شاعر عنقریب آئی ہے۔ مدار کی قرأت اور دوسری
 قرائتوں سے خاصی مختلف ہے :

مدار میج قرأت
 آب و آتش بہم بریا میزد
 آب و آتش بہم نیامیزد
 بالوائہ ز خاک بگریزد
 بالوائہ ز خداد بگریزد
 ظاہر ہے کہ یہاں میزد غلط ہے، خداد ایک نمکداری چڑیا ہے جس کو غیلواذ کہتے ہیں۔ اس سے
 بالوائہ جو ایک چھوٹا پرندہ ہے، خوف سے گریزاں رہتا ہے؛ اسی کی طرف شعر مذکور میں اشارہ
 ہے۔ مدار کے نسخے میں مطبوعہ شعر یہ معنی ہے۔
 ص ۱۷۸ بالوس بمعنی کافور منشوش کے ذیل میں یہ شعر بغیر شاعر کی تخصیص کے نقل ہوا ہے :
 کافور تو بالوش شد و مشک ہمہ پاک
 آلود گیت در ہمہ ایام نشد پاک
 یہ شعر صحاح فرس اور لغت فرس و حاشیہ میں اس طرح آیا ہے :
 کافور تو بالوس بود مشک تو باناک
 بالوس تو کافور کنی دایم منشوش
 البتہ فرہنگ قواس میں شعر کی صورت مدار سے مشابہ ہے یعنی :

کافور تو بالوس شد و مشک ہمہ پاک
 آلود گیت در ہمہ ایام نشد پاک
 واضح ہو کہ پاک جو مدار میں ہے وہ غلط فاضل ہے، صحیح لفظ پاک ہے، اور ناک ہی کی توضیح
 کے لیے فرنگوں میں آیا ہے۔ ناک مشک منشوش کو کہتے ہیں۔ البتہ شاعر کے نام کے بارے
 میں اختلاف ہے لغت فرس (یعنی) اور فرہنگ قواس میں دود کی کا نام اور لغت فرس (حاشیہ)

اور صحاح الفرس میں کسائی کا نام درج ہے۔

من ۱۹۱ بختہ کے ذیل کا شعر سوزنی کا ہے

من ۲۰۴ برز کے ذیل کا شعر عنبری کا ہے

من ۲۲۵ بشل کے ذیل کا شعر ابو القاسم مودب کا ہے اور لغت فرس و فرہنگنامہ قواس اور صحاح الفرس میں نقل ہے؛ فرہنگنامہ کے قلمی نسخے میں یہ نہایت غلط درج ہوا ہے۔

لغت فرس اور صحاح الفرس میں پہلے مصرع میں "ای عشق باز" کی جگہ "عاشقا" ہے۔ مدار کے دوسرے مصرع میں خیر غلط ہے، "خیز" ہونا چاہیے۔

من ۲۲۵ بشم کے ذیل کا شعر فردی کا نہیں فردوسی کا ہے۔ فردوسی ایک قدیم شاعر ہے جس کے اشعار لغت فرس، صحاح الفرس، فرہنگ قواس، ترجمان البلاغہ وغیرہ کتابوں میں موجود ہیں۔ مدار میں جس طرح شاعر کا نام غلط درج ہو گیا ہے اسی طرح دوسرے مصرعے میں برتنت بھی غلط ہے، صحیح برنشت ہے۔

من ۲۳۱ بلج کے ذیل کے شعر میں اوستہ کی جگہ فی اوستہ صحیح ہے جیسا کہ لغت فرس میں ہے، اسی طرح علم بھی غلط ہے، علم ہونا چاہیے۔

من ۲۳۵ بگماز کے ذیل کا دوسرا شعر سوزنی کا ہے۔

من ۲۵۱ یوبک کے ذیل کے دونوں شعر صحاح الفرس کے مولف کے باپ ہندو شاہ نجوی کے ہیں۔ مدار میں اصل لغت تو بای عربی اور شعر شاعر میں غلط بای فارسی سے ہے مگر صحاح میں دونوں جگہ بای فارسی ہی ہے۔

من ۲۹۵ بہناز کے ذیل کا شعر کسائی کا ہے، مدار کے نسخے میں بہناز غلط چلائی ہے۔

من ۲۸۱ پازہ کے ذیل کے شعر شاہد میں چشم کی جگہ خشم اور اندلان کے بجائے اندرون ہونا چاہیے۔

من ۲۸۳، ۲۸۴ پاتنگ کے ذیل کی بیت ابو القاسم کی ہے۔

من ۲۹۸ پرواز کے ذیل کی بیت حاجی کی ہے۔

من ۳۱۳ پلندیر کے ذیل کی بیت شاکر بخاری کی ہے۔ بیت مذکور میں غلط پلندیر ہے مگر

مدار لافاضل کی ترتیب نو

صباح میں لغت اور شعر دونوں جگہ بلندی (بای عربی) ہے۔
 ص ۳۱۵ پناغ کے ذیل کی بیت سوزنی کی ہے؛ فرنگ قواس میں بناغ ہے۔
 ص ۳۳۵ پیلور کے ذیل کی بیت دوم خاقانی کی ہے۔ دیوان خاقانی اور فرنگ فخر قواس
 میں بای عربی سے ہے۔

ص ۳۳۷ پیوس کے ذیل کی دوسری بیت عنصری کی ہے۔
 ص ۳۵۱ تہوراک کے ملے کی جو بات حاشیہ میں ہے۔ اس کے خانے قوسین میں حکیم
 غناک کا نام درج ہے؛ صباح الفرس میں یہ عمارہ کی طرف منسوب ہے۔

ص ۳۵۱ تیرہ کے ذیل کا شعر منوچہری کا ہے۔ سحر تخطا ہے بختیں ہونا چاہیے۔
 ص ۳۵۲ تتو کی درست قرأت تترلو ہے؛ قواس، مؤید، سرودی، رشیدی سب میں یہی
 ہے۔ مدار میں تتو کے لیے جو بیت شاہد فرنگ سے نقل ہوئی ہے، وہ سوزنی کی ہے۔ دیوان اور
 مدار دونوں میں بیت شاہد میں خاصا اختلاف ہے:

مدار	دیوان
لیکن چو باز گردم از شرم مردان	لیکن باز گردم از شرم مردان
تا در خور تماخرہ و تتوی تو شوم	تا در خور تماخرہ و تتو تو شوم

تماخرہ لفظ سوزنی کی حسب ذیل بیت میں آیا ہے:

از مدح تو تماخرہ و زنج آدم
 ہر چند دوری از رہ زنج و تماخرہ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نہ تتو کی کوئی اصل ہے اور نہ تماخرہ کی۔
 ص ۳۶۱ تماک کے ذیل کا پہلا شعر صباح الفرس میں خسروانی کے بجائے خسروی کی طرف
 منسوب ہے۔

ص ۳۶۲ تزک کے ذیل کی دوسری بیت رودکی کی ہے
 ص ۳۸۱ قنغر کے ذیل کی بیت البواعباس کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں خسروانی کے
 بجائے خسروانی تہی ہے۔

دارالافتاء کی ترتیب نو

ص ۲۸۳ نکش کے ذیل میں یہ بیت شاہ درج ہے :

دیدہ بدخواہ تو چون بزم انگور است سرخ
در لگد کوب عنا بادا جدا آب از نکش

در اصل یہ بیت سوزنی کی ہے اور اس کے دیوان (ص ۲۲۲) میں ایک قصیدے کے ذیل میں ہے، جس کے قوافی ہوس، فرس وغیرہ ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ اس بیت کا قافیہ نکش کے بجائے نکس ہوگا۔ بہر حال کم از کم اس بیت سے نکش کے وجود پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ صحاح الفرس میں نکس ہی ہے۔ تو اس، سوزنی کی اس بیت کا قافیہ نکش لایا ہے، جو بالکل غلط ہے۔ سوزنی کا شعر اس طرح سے ہے :

دیدہ حاسد تو چون غزم انگور است سرخ
در لگد کوب عنا بادا جدا آب از نکس

ص ۳۸۷ تلاح صحاح الفرس کے اعتبار سے فارسی ہے، بیت شاہ کا ناظم لہیان کے بجائے طیان ہے۔ شبہ یز غلط ہے، صحیح شب دیر ہے۔

ص ۳۹۲ تندرہ کے ذیل کی بیت میں ٹکروا نام غلط ہے، ٹکروا نام ہونا چاہیے۔

ص ۴۱۲ تیغ کے ذیل کی بیت شاہ جو کسائی کی ہے، بہار کی تعریف میں ہے۔ یہ نسخہ دار میں غلط نقل ہوئی ہے، مثلاً دوسرا مصرع اس طرح ہے :

زنگ بہ تیغ اندرون شاخ ز دور آرید

صحیح مصرع یہ ہے : زنگ بہ تیغ اندرون شاخ زد و آرید

اگر دار میں زنگ نہ ہوتا، تو سمجھا جاسکتا تھا کہ چھاپے میں حرفوں کے درمیانی فاصلے کی غامی ہے، صحیح کی غلطی نہیں ہے، لیکن زنگ کے بجائے زنگ لانے سے واضح ہے کہ شعر کا مطلب سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ یہاں زنگ بمعنی ہرن، تیغ، سرکڑہ، اور شاخ بمعنی سینگ ہے۔

جلد دوم ص ۲۹۱، ۲۵۱ مجر کے ذیل میں بجم بمعنی کفش کے اشتہاد کے لیے جو بیت نقل ہوئی ہے، اس سلسلے میں صاحب دارالاشتباه کا شمار ہوتا ہے۔ یہ بیت جو مخفیک کی ہے، دراصل شمس کی توضیح کے

لیے لغتِ فرس اور صحاحِ الفرس میں آئی ہے۔ مار میں بیتِ مخلوط نقل ہے، اور دوسرا مصرع خارج از وزن ہے۔ ذیل میں دونوں صورتیں نقل کی جاتی ہیں :

فرس و صحاح

مدار

چند انکہ مدح کردم چندین عذاب دیدم چندین مدح کردم چندین عذاب دیدم
مگر سیم نیست جفت : ججم فرست باری مگر سیم نیست باری جفتی ششم فرست
مار میں جنت میں یا تے تنکیر کے دلانے سے مصرع ساقط الوزن ہو گیا ہے۔ فرس و صحاح میں
ششم میں سیم دوم ضمیر واحد متکلم متصل مفعولی ہے، یعنی مجھ کو ایک جوڑ کفش بھیج۔

ص ۲۶ بحسب کے ذیل میں شاکر بخاری کی بیت کے مصرع دوم میں پاکند کے بجائے پاکند
ہونا چاہیے، یہ چھاپے کی غلطی ہوگی۔

ص ۵۷ چغز کے ذیل کی بیت سوزنی کی پہلا فرہنگ تو اس میں اشتباہاً چغز کے بجائے
بغز لکھا ہے۔

ص ۱۱۷ ختبر کے ذیل کی بیت ابوالعباس کی ہے۔ پہلے مصرع میں سخت ہی نیک، کے
بجائے سخت ہی تنگ یا بستم تنگ ہونا چاہیے۔

ص ۱۲۵ خربوز کے ذیل میں ختار کے شعر کے پہلے مصرع میں روزگار کی جگہ کار روزگار
ہے، جیسا کہ صحاحِ الفرس میں آیا ہے۔

ص ۱۲۷ خرد کے ذیل کی بیت خسروی کی ہے۔

ص ۱۴۵ خشکار بضم طے است کہ عرب استسقاء و نہد جلندھر و جالندھ گویند۔

خشکار اور آمار دونوں کے معنی استسقاء کے ہیں۔ صحاحِ الفرس میں ہے : آمار استسقا
بود رود کی گفت :

آبچی گنجور مشک آمار کرد

تا مراد را زان بدان بیدار کرد

خشکار بمعنی آمار است یعنی استسقاء

در اصل معیار جمالی میں آمار کے معنی کسی قدیمی کتاب کی غلط خوانی کی وجہ سے استسقاء

جگہ استسقا درج ہو گئے، اور اس کے مولف شمس فہری نے اس غلط معنی کے لیے حسب معمول یہ بیت نظم کر دی:

حضور جاہ تو بی آب در تونہ رفتی

مباد جز بہ بیابان فتادہ آمار

لیکن خشکار کے معنی استسقا و تھوڑے لمبے ہی لکھا اور اس کی بیت شاہد یہ قرار پائی:

خدا یگانہ سلاطین کہ روزگار ندید

نظیرش ارچہ بسی مجست و کرد خشکار

منقصر یہ کہ صاحب مدار سے خشکار کے معنی متعین کرنے میں سخت قسم کا تسامع ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مدار میں رودکی کی جو بیت شاہد آئی ہے، اس سے استسقا ہی کے معنی نکلتے ہیں، استسقا کے ہرگز نہیں۔ بیت یہ ہے:

از سرادانی کہ خشکار کرد زان ہنہاں مر مردار بیدار کرد

در اصل یہ بیت وہی ہے جو دراصل تغیر کے ساتھ صحاح میں آمار کے لیے آئی ہے مگر صاحب صحاح سے رودکی کی بیت شاہد کی قرأت میں غلطی ہوئی؛ خشکار جو ایک لفظ ہے اس میں مشک آمار کی شکل میں آیا ہے۔ دراصل رودکی کے شعر کی صحیح صورت یہ ہے:

آننگہی مخمور خشکار کرد

مردار از آن بدان بیدار کرد

غلام کلام یہ ہے کہ اگر معجم شعر کی تخریج کی طرف رجوع کرتے، تو ان مسائل سے ضرور دوچار ہوتے، جن کا اجمالاً ذکر ہوا ہے۔

ص ۱۴۶ خشرک کے ذیل کی بیت رودکی کی ہے۔ مصرع دوم صحاح الفرس اور مدار میں باحلاف درج ہے، مثلاً:

صحاح

مدار

ایا، بلاہمیری کار کرد و پنهان شد ایا، بلاہم اگر کار کرد تو پنهان شد

ص ۱۵۸ خنخ کے ذیل میں خنخ کے لیے بیت شاہد منصری کی ہے۔

ن: ۱۷۲: غنیمت کی بیت، شاہ کے پہلے مصرع میں "بگذر از سالیان" غلط ہے؛ اس کی جگہ بذر د سالیان ہونا چاہیے۔

۲۳۱: دروش کے ذیل کا شعر سوزنی کا ہے، دروش داغ کے بجائے دروش و آغ با داو عاطف، درست ہے۔

۲۵۹: دم کے ذیل کی پہلی بیت نظامی کی ہے۔

۲۶۰: دند کے ذیل کی بیت ابوشکور کی ہے۔

۲۷۰: دوستان کے ذیل کی بیت فرخی کی ہے۔

۲۹۰: دیولاخ کے ذیل کی بیت میں خرمیہ غلط ہے، چرمیہ ہونا چاہیے۔

۳۰۹: ربوہ (ع) ... خوشی از جماع برای معجمہ نیز۔

ن میں برائے کے قبل کام (۱)، ہونا چاہیے؛ رائے مجھ کوئی چیز نہیں؛ زای معجمہ مقصود وگا؛ مگر یہ بھی درست نہیں اس لیے کہ کوئی عربی لفظ زای معجمہ کا حامل نہیں ہو سکتا؛ ظاہر زای تازی مقصود ہے؛ چنانچہ اسی جلد کے ص ۳۶۱ پر ربوہ درج ہے لیکن وہاں یہ تازی لفظ گڑباز ہے۔ ربوہ کو عربی لفظ قرار دینا صحیح نہیں اس لیے کہ خالص فارسی رنگوں میں یہ لفظ آیا ہے؛ اس سلسلے میں فرہنگ تو اس اور زان گویا کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جہاں اس کو بصورت ربوہ درج کیا ہے نہ ربوہ۔ مؤید الفعلا میں ربوہ اور ربوہ دولو یا ہے اور دونوں جگہ فارسی لفظ قرار دیا گیا ہے۔ مگر ربوہ کے ذیل میں اس میں موجود ہے۔ و بزاء معجمہ نیز لغت است۔ بظاہر صاحب دار نے یہ اطلاع یہیں سے حاصل کی تھی جو مطلوبہ نسخے میں رہی معجمہ کی شکل میں ملتی ہے۔ باوجود زاء معجمہ کے لکھنے کے صاحب غوی نے اس کو زای تازی ہی سمجھ لیا ہے۔

۳۷۹: زنگ کی بیت شاہ میں دو لفظ غلط ہیں۔ کیں عزیز چیست کی جگہ کاین غریب چیست ہونا چاہیے۔ دوسرے مصرع میں کرم کے بجائے گرم درست ہے۔

۴۱۵: سام کی بیت شاہ کسائی کی ہے۔

۴۲۰: ساد کے ذیل کی بیت فردوسی طوسی کی ہے۔

ص ۴۷۱ سے کے ذیل کی بیت حکیم فرزدی کی ہے اور فرنگ خواص میں چکا د کے لیے آئی ہے۔

ص ۴۸۱ سکار کی بیت شاہ سوزنی سمرقندی کی ہے، پہلے مصرع میں مار دنیا کے بجائے بار دنیا ہونا چاہیے۔

ص ۴۸۲ سکبا کے ذیل کی بیت دوم عید کی ہے، جو در تعلق کا شاعر سجاد بلوئی، ۱۳۳۱ء ص ۵۰۶ سندل کی بیت شاہ منصری کی ہے، مار میں سندرج مصرع اول وزن سے خارج اور غلط سے پڑ ہے۔ مثلاً :

صحیح صورت

مار

گفتم بجای رسیدی زان مگر فتم بجائی رسیدی زمال

بجائی میں یا ای تنکیر کا حذف غیر مستحسن ہے۔ مار کے مطلوبہ متن میں بالعموم اس طرف کم توجہ ہوئی ہے؛ اس سلسلے کی چند مثالیں غلط المائی کے تحت لی گئی۔

ص ۵۰۶ سنقر کے ذیل کی بیت خاقانی کی ہے۔

ص ۵۱۸ سیام کی بیت شاہ رودکی کی ہے۔

ص ۵۲۷ شاک کے ذیل کی بیت سوزنی کی ہے۔

ص ۵۵۲ شخماسہ کے ذیل کی بیت رودکی کی ہے۔

ص ۵۶۳ شفا کے ذیل کی بیت کسائی کی ہے، فرخی کی بیت اس کے عین مشابہ ہے۔

(دیکھیے، صحاح: ۲۵)

جلد سوم

ص ۱۳۸ خالوک کے ذیل کی بیت خسروانی یا خسروی کی ہے۔

ص ۱۳۹ فارچ کی بیت شاہ شاکر بخاری کی ہے۔

ص ۱۴۷ غراشیدہ کی بیت شاہ علی قرطبی کی ہے۔

ص ۱۵۱ فرزہ کی بیت شاہ ہندو شاہ پدر صاحب صحاح الفرس کی ہے؛ دوسرے مصرعے

میں غلطیاں ہیں؛ بر سپاہ از برتری چوں شیر نر فرزہ باڈ کے بجائے بر سپاہ از فرزہ تو الخ

درست معلوم ہوتا ہے۔

ص ۱۶۲ غلطی کے ذیل کی بیت لمبھی کی ہے۔

ص ۱۶۹ غن کے ذیل کی بیت شاہ میں پہلا مصرع اس طرح ہوگا :

ہر گلی پڑ مردہ گرد زدن دیر الخ

ص ۱۷۲ خوش کی بیت شاہ صحاح الفرس میں خسروانی کے بجائے خسروی کی بتائی گئی ہو

مدار میں مندرج دوسرا مصرع موجودہ صولت میں وزنی سے خارج ہے، دالک کے بجائے

دالک گاہ سے وزنی سے پورا ہوتا ہے، اور یہی صحاح میں ہے۔

ص ۱۷۲ غولت کے ذیل کی بیت رودکی کی ہے

ص ۱۷۳ فرخ کی بیت شاہ کی قرأت میں اختلاف ہے، مثلاً

صحاح

مدار

ای بوالفرخ زادہ ہمیدوں ہمہ فرخ ای بلفرخ سادہ ہمیدوں ہمہ فرخ

نامت فرخ و کینت باب تو بوالفرخ نامت فرخ، کینت ملعون بلفرخ

ص ۱۹۳ فرخ کے ذیل کی بیت ابوشکور کی ہے۔ مدار اور صحاح کی قرائتوں میں

خاص فرق ہے :

صحاح

مدار

بسا کسان کہ برہ است و فرخ برخوانی بسا کسان کہ برہ است و فرخ برخوانی

بسا کسان کہ جوین نان ہی نیابند سیر بسا کسان کہ جوین نان ہی نیابند سیر

واضح ہے کہ صحاح کی روایت زیادہ معتبر ہے

ص ۱۸۲ فردی کے ذیل میں فرخ کی توضیح کے لیے جو بیت شاہ ہے، اس کا ناظم خسروانی

ہے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مدار کو فردن کے لیے کوئی بیت نہیں ملی ماسی لیے اس میں

فرخ کی وہی بیت شاہ درج ہے، جو صحاح وغیرہ میں موجود ہے۔

ص ۱۹۲ فرد کے ذیل کی پہلی بیت ابوشکور کی ہے۔

ص ۲۰۰ فرخ کی بیت شاہ درج ہے، مدار غلط ہے۔

مار مارا ناسل کی ترتیب

ص ۲۰۰ فرغول کی بیت شاہ اسدی طوسی کی ہے۔ چنانچہ مگر شاسب نامہ (ص ۳۱۱) میں موجود ہے، مار میں شاہناہ کی طرف منسوب کرنے میں تسامح ہوا ہے۔ مار میں پہلا مصرع اس طرح ہے جو غلط ہے: بہر کار و پندار بشکول باش؛ اس کی صحیح شکل یہ ہے: بہر کار بیدار و بشکول الخ

ص ۲۰۴ فرناس کے ذیل کی بیت عنصری کی ہے، مار میں مندرج مصرع دوم وزن سے خارج ہے مثلاً من دیوانہ ام نہ فرناسم؛ صحیح صورت یہ ہے: من نہ دیوانہ ام، نہ فرناسم ص ۲۰۵ فرجنگ کے ذیل کی بیت عاقانی کی ہے۔

ص ۲۱۰ ابونصر کی نسبت مردوی غلط، مرغزی ہونا چاہیے۔

ص ۲۲۳ فلج کی بیت شاہ علی قرط کی ہے، قرط غلط ہے۔ دوسرے مصرع کا آخری لفظ رنگ ہونا چاہیے، بد رنگ بالکل غلط ہے۔

ص ۲۲۷ فلج کے ذیل کی بیت منجیک کی ہے۔ مار میں مندرج صورت مشتبہ ہے:

لغت فرس و فرنگ قواس

عجب آید مرا ز تو کہ بھی
چون کشی آن کلان دوغایہ فلج

مار

مجھی آید از تو کہ بھی
چون کشی آن دوکلان غایہ فلج

ص ۲۳۳ فیادار کی بیت شاہ عنصری کی ہے۔ دوسرے مصرع میں اختلاف ہے — مگر مار میں مندرج صورت بہتر ہے۔

ص ۳۱۷ کارج کی بیت شاہ عنصری کی ہے اور صحاح الفرس میں مار سے کافی مختلف نقل ہوئی ہے:

صحاح

مرد را کمر گردن و سر و پشت
کوفتہ سر بسر بکارج و بخت

مار

مرد ترا کشتہ گردن و سر و تن
کو مرا سر بسر بکارج و بخت
مار کی روایت غلط ہے۔

ص ۳۲۶ مبداء کے ذیل کی بیت دقیق کی ہے۔ صحاح الفرس میں اصل کلمہ کبد ہے معیار جمالی

(ص ۹۵) میں کبیدی ہے اور بیت شاہد ہے:

جو طواریت تو لمصق کنند و در از لواط قمر چہ رخ کبد

مگر زفانی، عویۃ و غیرہ میں کبیدی ہے۔ مدار میں اس کے معنی کفسیر (سین مہملہ سے) درج ہے، جو بظاہر غلط ہے؛ شین نقطہ دار درست ہے۔ جیسا کہ خود مدار (۳۸۱: ۲) میں لکھا ہے۔
ص ۳۲۹ کبید چیزے باشد کہ بان چیز یا یونہ کنند و آن د العرب بحیم گوئید؛ استاد:

از آنکہ مدرج تو گویم، درست گویم راست

مرا بکار نیاید سرشیم و نہ کبید

و بدین معنی کبید نیز گذشت و در بعضی فرہنگ است کبد بمعنی گوشت آرد کہ عرب
آن را لیم خوانند۔ اس سلسلے میں چند اشتباہات ہیں۔ مثلاً
۱ بحیم غلط ہے، لیم ہونا چاہیے۔

۲ یہی بیت ذرا سے فرق کے ساتھ کبد کے ذیل میں تین صفحے پہلے گزری ہے، ایک بیت
دو غلطوں کی شاہد بھی ہو سکتی ہے۔

۳ مصرع دوم صحاح الفرس میں منقول صورت سے مشابہ ہے، اس میں نہ کبید کے
بجائے د کبد ہے۔ بخوبی ممکن ہے کہ خود صاحب مدار نے کبد لکھا ہو، جو غلط خوانی
کی بنا پر کبید کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

۴ بجیدا فاحش غلطی ہے، کیدا ہونا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ یہ کاتب یا مصنف کی غلطی ہو،
ذکر مؤلف کی۔

۵ لیم کے معنی گوشت آرد کے بجائے کفسیر نذگری درست ہے۔ صحاح: ۸۲ میں ہے:
کبد لیم باشد کہ بان چیز یا یونہ کنند الخ

ص ۳۴۲ کمت کے ذیل کی بیت فرخی کی ہے۔ مدار میں جہالیان غلط ہے، جہالیان درست
ہوگا۔

ص ۳۴۲ کمت کے ذیل کی عبارت میں بعض خامیاں ہیں:

۱ ترشی است مانند پیر کے بجائے زفان گویا میں ہے؛ ترشی شیر مانند پیر۔

- ۲ ترشی و شیر شل پنیر میں داو ماطہ فلفط ہے۔
 ۳ جنرات را با شیرینی مرکب کنند، نسخہ اصل میں شیر ہے۔
 ۴ ۱۰- پنخوشی کہ از شیر الحہ ؛ تا زاید ہے۔
 کتب کی بیت شاہ فرہنگ قواس میں کسی شاعر کے نام سے ہے جس کا نام اشتباہاً و خیر کا فذ مال لکھا ہے۔ شاید و خیر کے بعد پہلا لفظ قاضی ہو۔

قواس میں شعر کی شکل پوری طرح درست نہیں، لیکن مدار میں تو بالکل غلط منقول ہے :

فرہنگ قواس

مدار

من شکرم، بلی تو شکری من چو شکرم بلب چرا تو کمتی

ازین قلم نہ سرکہ انجی زرین قلمی، نہ سرکہین زنجی

ص ۳۵۴ کمرستون کے ذیل کی بیت زرین کتاب کی ہے ؛ دوسرے مصرع میں مدار میں شاہی غلط ہے، شاہین ہونا چاہیے۔ ترازو کی رعایت ملحوظ ہے، اس لیے کہ کمرستون ترازو کو کہتے ہیں۔

ص ۳۶۰ کردز کے ذیل کی بیت خسروانی کے بجائے صحاح الفرس میں خسروی کے نام سے ملتی ہے۔ مدار میں منقول بیت میں دو واضح غلطیاں ہیں :

کشت فلفط ہے، گشت ہونا چاہیے ؛ اور منشیوں فعلی نہیں کے بجائے منشی درست ہے
 ص ۳۶۱، ۳۶۵ میں کستی اور گشتی کے ذیل میں ایک ہی بیت ذرا سے فرق کے ساتھ نقل ہے :

ص ۳۶۱

ص ۳۶۵

رسمان سجو گشتند و کستی باقند رسمان سجو گشتند و کشتی باقند
 گوہر قند بشکستند و ساغر مانقند گوہر قند بل شکستند و ساغر ساغقند
 معجم نسخہ نہ کستی و کشتی کے فرق کو ملحوظ رکھ سکے، نہ دونوں شعروں کے اختلاف رعایت کی طرف متوجہ ہوئے۔ حال آنکہ چند صفحے پہلے کستی کا ذکر ہوا ہے۔

ص ۳۶۴ کوازد و کوزدہ کی بیت شاہ میں لفظ کوازد ہے، حال آنکہ کوازد و کوازی کی سند دو کا رہتی۔ صحاح الفرس میں بھی بیت گوازی کی سند میں نقل ہوئی ہے۔ دونوں کتابوں میں بیت کافی متضاد

ملارالافاضل کی ترتیب نو

مار	صباح
دوستاں را نیافتی بمراد	دوستاں را بیافتی بمراد
دشمنان را بکوفتی بجواز	سبردشمن بکوفتی بجواز

صباح کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

تفصیلات بالا سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ڈاکٹر باقر صاحب مار کے متن کی تعبیر کے وقت لغتِ فرس، صباح الفرس وغیرہ کو پیش نظر رکھتے تو کتاب کی بیشتر خامیاں رفع ہو جاتیں۔

مارالافاضل کے مطبوعہ متن میں بعض املائی کوتاہیاں راہ پا گئی ہیں۔ یہ کوتاہیاں ایسی ہیں، جن کا فنِ املا سے تعلق ہے، چھاپے کی غلطیاں نہیں ہیں۔ ان میں سب سے قابلِ توجہ خامی ہے، جو بعض الفاظ میں ذال اور زے کے درمیان فرق نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ فارسی میں جن دو مصدروں اور ان سے مشتق افعال و اسماء کے بارے میں اکثر التباس ہو جاتا ہے، وہ گزاشتن یا گزشتن اور گزاردن ہیں؛ گزاشتن سے منسارع گزارد اور گزاردن سے گزاردا آتا ہے۔ گزاشتن بمعنی چھوڑنا، ڈالنا اور گزاردن بمعنی عرض کرنا، پیش کرنا آتا ہے۔ ان میں بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔ اکثر ایرانی مصنفین کی تصانیف میں بھی اس طرح کی خامی دیکھی جاتی ہے۔ مثلاً تاریخِ بیہقی چاپِ دکتربیاض سامنے ہے، اس میں صفحہ ۴۰۲ پر دو جگہ یہ غلطی ہے۔ (س ۲) از آب گنگ گزارہ شد، اس میں گزارہ (ذال سے) درست ہوگا۔ (س ۹) مالی عظیم.... از خراج گزاران بستد، اس میں گزاران کی جگہ گزاران (ز سے) ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر باقر صاحب بھی اس املائی تاج کے شکار ہوئے ہیں۔ مثلاً ج ۱: ص ۱ میں بکتہ گزار غلط ہے، بکتہ گزار درست ہوگا۔ اسی طرح گزارش بمعنی بیان زے سے درست ہوگا، اس لیے کہ یہ گزاردی سے اسم مصدر ہے اس کے برخلاف بعض مقامات پر جہاں ذال درست تھی وہاں زے کا استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے کی چند مثالیں یہ ہیں:

مدار الافاضل کی ترتیب نو

۴۳: ۱ ای صباہر مجزری بر سائل رودارس

۳۳۶: ۲ روزہ گزاری

۴۴۰: ۳ گز نامہ، خواب نامہ یعنی تعبیر خواب و خطی کہ گزربانای و انویسند
مگزرب نامہ بمعنی خواب نامہ درست ہے، اس لیے کہ گزرب بمعنی تعبیر ہے، لیکن گزربانان
ذال سے درست ہے، اس لیے کہ یہ گزربشتن سے بنا ہے۔

۴۴۰: ۳ گزربشت بمعنی جز

۴۴۰: ۳ گزربشت معروف

لیکن اس سے یہ گزرب مقصود نہیں کہ مدار کے نسخہ، مطبوعہ میں گزربشتن سے مشتمل ذال
سے آئے ہی نہیں، بلکہ اکثر ذال ہی سے ہیں۔ صرف بعض جگہوں پر زے سے ہے، جو درست
نہیں ہے۔ مثلاً گزربشتن کی صحیح صورتوں کے لیے ملاحظہ ہوں:

۳۵۸: ۳ / ۵۹۳: ۲ / ۵۸۳: ۲ / ۲۶۵: ۲ / ۲۳۷: ۲ / ۱۹۹: ۱ / ۱۸۳: ۱

دھیسرہ

مدار الافاضل کے نسخہ، حاضری دوسری ماہم المانی کوتاہی ہای غیر محفوظ سے متعلق ہے
ہای غیر محفوظ پر یاے تنکیر، یا نسبت یا یا یا خطاب عموماً 'ای' سے ظاہر کی جاتی
ہے۔ جیسے خام ای، قمش ای یا دیدہ ای، لیکن اضافت یا توصیف کی صورت میں
ہمزہ استعمال ہوتی ہے، جیسے بندہ من، خام خوب۔ مرزا محمد قزوینی نے اپنی بعض
تحریروں میں اس امر کی پوری صراحت کر دی ہے اور یہی طریقہ ایران میں عموماً متداول ہے
لیکن مدار کے مطبوعہ متن میں اس پر یکساں عمل نہیں ہو سکا۔ یا یا تنکیر وغیرہ کے لیے اکثر
ای کا استعمال ہوا ہے، لیکن خال خال جگہوں پر اسے حذف کر دیا ہے۔ علامت اضافت
کبھی ہمزہ سے اور کبھی ی سے ظاہر کی گئی ہے۔ بہر حال چونکہ عمل میں یکسانی نہیں، اس لیے
یہ نظروں کو کھٹکتا ہے۔ ذیل کے مثالوں سے میرے بیان کی تصدیق ہو سکیگی۔

ای مثالوں میں علامت اضافت 'ی' استعمال ہوئی ہے:

رک بیت مقالہ قزوینی، مقالہ رسم الخط (چاپ شرق) ص ۳۱، ۳۲

علامہ افاضل کی ترتیب نو

بیشمہ ی شیر	۵۷:۱	۱۸۳:۲	رہزہ ی ہرچیزی
ستارہ ی نیک	۶۰:۱	۱۸۷:۲	برہنہ ی مادر زاد
خوشہ ی انگور	۱۹۱:۱	۱۹۰:۲	سینہ ی خود
پارہ ی از خوشہ ی انگور	۱۸۳:۱	۱۹۲:۲	ترہ ی معروف
ذخیرہ ی آب	۲۱۲:۱	۱۹۳:۲	قلعہ ی مشہور
خاگینہ ی مرغ	۱۰۷:۲	۱۹۵:۲	آب دیدہ ی گناہکاران
خایہ ی مرغ	۱۱۳:۲	۱۹۷:۲	مادہ ی کبوتر
خرزہ ی خارا	۱۲۸:۲	۱۹۸:۲	جامہ ی پنبہ
نکتہ ی باریک	۱۸۳:۲		دیگرہ

• مندرجہ ذیل مثالوں میں علامت اصناف ہمزہ آئی ہے :

کروۃ تشیں	۵۵:۱	۹۵:۱	سفرۃ عام
خلبۃ موجہا	۵۷:۱	۸۳:۲	سایۃ خودشید
ایضاً طلوعۃ الیشان		۱۹۱:۲	دنبۃ فری
انچہ مذکور	۶۲:۱	۲۳۲:۲	پارۃ زمین
انجمۃ لغت	۶۳:۱	۲۳۳:۲	جامۃ حریر
ایضاً ادویۃ چشم		۲۳۳:۲	پارۃ گوشت
ادویۃ گرم	۶۵:۱	۲۶۷:۲	دودۃ آدم
ایضاً خودۃ انگور		۲۶۸:۲	زمانۃ جفاکار
ایضاً خوشنماو			

• مندرجہ ذیل میں یای تشکیر کا صحیح استعمال ہوا ہے :

سوغاتی و تحفہ ای	۷۹:۱		
توانیم کردی مگر چارہ ای	۱۸۶:۱		کہ بیچارہ ای نیست بتیارہ ای
فلکہ ای کز حلق برغیزد	۱۱۲:۲		

حیالِ افاضل کی ترتیب نو

- ۲۱۹:۲ جامہ ای کہ زیر جامہ باشد
- ۲۳۴:۲ کہ پیدا نشد تحتہ ای برکنار وغیرہ
- حسب ذیل شالوں میں یای تنکیر یا حذوت ہو گئی ہے یا ہنرہ سے آئی ہے:
- ۴۴۰:۱ سراپردہ سبز دیدم بزرگ (یعنی سراپردہ ای)
- ۲۸۱:۱ نشستہ بعد چشم دکاڑہ گرفتہ بچنگ اندوں پاڑہ
- ۳۱:۲ بچہ کہ در شکم باشد (یعنی بچہ ای) وغیرہ
- تیسری المائی خامی بھی یای تنکیر وغیرہ سے متعلق ہے۔ یای تنکیر یا نسبت یا خطاب جب الف یا واو پر ختم ہونے والے الفاظ پر آتی ہے، تو بتکرار لائی جاتی ہے۔ اس بنا پر کہ الف یا واو پر ختم ہونے والے الفاظ میں اصلاً ایک "ی" محذوف ہوتی ہے لیکن جب ان پر یای تنکیر لائی جاتی ہے، تو وہ محذوف "ی" بھی اپنی جگہ واپس آجاتی ہے۔ اس قاعدے کے لحاظ سے روئی دیدم درست، روئی دیدم غلط، مگر مدار میں اس قاعدے پر پوری طرح عمل نہیں ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:
- | | |
|---|------------------------------------|
| <p>۷۷۰:۱ ارنب نیز نام داروی است</p> <p>۱۴۱:۱ انیسو نام داروی</p> <p>۱۹۲:۲ خیار چنبر نام داروی</p> <p>۲۱۷:۲ گدائی کہ از پادشاہ خواست دخت</p> | <p>ان تینوں جگہ داروئی درست ہے</p> |
|---|------------------------------------|
- گدائی درست ہے
- ۲۹۵:۲ نام داروی
- ۵۰۲:۲ نائب تنگری توئی کردہ بہ تیغ ہندوی
- ایضاً
- مگر فتم بجای رسیدی ز مال
- بجائی صحیح ہے
- حسب ذیل شالوں میں یای تنکیر بالکل صحیح آئی ہے:
- ۹۲:۱ نام دریائی
- ۱۸۹:۱ نام دریائی
- ایضاً دریائی است خرد

۵۰۷:۲ سواد الوجہ : سیاہ روئی الخ

• حسب ذیل مثالوں میں یا ای اضافت پر ہمزہ کا استعمال غیر مستحسن ہے :

۵۰۳:۲ یک روئی ہچو کثر دم سنکیز چولی ستہ : اس میں یک روئی درست ہے۔
ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ معجم کا تصور یا تنکیر وغیرہ سے پیدا ہونے والے املائی مسائل کے بارے میں واضح نہیں ہے۔

ایسی غلطیاں جو عموماً تصحیف خوانی کا نتیجہ ہیں، اگرچہ ان میں سے کچھ طباعت کی بھی غلطیاں ہونگی، مطبوعہ نسخے میں کافی پائی جاتی ہیں۔ مدار کے مطبوعہ نسخے کی اس خامی کا کسی قدر اندازہ قارئین کو ہو چکا ہوگا۔ ذیل میں بعض مثالیں جو نمونہ مشقی از خردارے ہیں، درج کی جاتی ہیں :

اصل عبارت	صحیح شکل
۱۵ ص ۳۶ از مبلغ دودی تو	جود تو
ص ۶۵ المطول البروی	المطول للبروی
ص ۱۳۹ حبلائی	جلایی
ص ۱۴۲ قاسم گاہی	قاسم گاہی
ص ۱۵۹ عمارت مملین	عمار ت مملین
ایضاً بیست لنگ	بیسٹ رنگ
۱۷۸ عمار	عمارہ
ایضاً جنگ سعدیانہ	جنگ سعدیانہ
۱۷۹ برون ازین	فزون
۲۶۶ خوناب	خوناب
۲۷۳ صیدیہ	صیدنہ
۲۸۱ اندان	اندرون

عوارض الفاضل فی ترمیمیہ

۲۸۳	زربن	زربین
۲۵	۱۰	ہزربہ
۱۵	جرم گناہ و جرم تن و جرم قبیلہ درین	(تعمیم نہ ہو سکی)
۱۶	روح گناختہ نمایند	روح گناختہ بنامہ
۱۹	گود از تحت	واژگونہ بخت
۲۲	شروط	شرطہ
ایضاً	بخیار این کس	(تعمیم نہ ہو سکی)
۱۰۱	صدہ خارا۱	صدہ خارا
ایضاً	زیر لطف	لطف حذف ہوگا
۱۳۵	قاسم کوہی	قاسم کاہی
۱۵۶	بوصال اند بوم	بوصال اند بدم
۱۷۵	بہ پل غنیور	بہ پول غنیور
ایضاً	"	"
۲۲۲	بکا و بہار	پگا و بہار
۲۹۰	خریدہ	چریدہ
۳۰۱	رازانام فہرہ کہ امام رازی ازا بنجاست	وہ مؤلف کی غلطی ہے، بے مہنا چاہیے
۳۰۳	رادیز	راویز
۳۰۷	رد	رد (مؤلف کی غلطی معلوم ہوتی ہے)
۳۲۳	اصلح	اصلح
۳۸۰	طاۃ	(تعمیم نہ ہو سکی)
۳۹۰	زنجرو	زنجبرو
ایضاً	زندہ پیچی	(زندہ پیچی ممکن ہے، مؤلف کی غلطی ہو)

ملفوظات داخل کی ترتیب نو

۳۹۲	بزار درست وحینی و رامہوی و عراق	نوادراست حینی و رامہوی
		است و عراق
۳۹۹	سحر دلاغ	سحر دلاغ
۴۰۲	بساط عرصہ عزمت کترین زلیو	عزمت صحیح ہے اور اسی سے
		مصرع درست ہوتا ہے، درد اعلیٰ
		وزن نئے خارج ہے۔
۴۰۳	لفظ فرس	لفظ فرس
۴۱۱	وزن باریک	وزن باریک
۴۳۱	شفق صبح و سرخی و سپتاک	شفق و صبح سرخی و سپتاک
		(لف و نشر مرتب)
۴۳۷	ہمسہ تازی اسپان	ہماں تازی اسپان
۴۳۷	ہمسہ تیغ ہندی	ہماں تیغ ہندی
۴۳۷	کتاب سالک و ممالک	کتاب سالک و ممالک
۴۳۷	سیم اندوز	سیم اندوز
۴۴۷	لفظ بخور دم الخ	لفظ بخور دم الخ
۴۷۵	سفیج بمعنی بکی و آن نومی از شراب الخ	سفیج بمعنی سبکی الخ
۵۰۱	شنامند مکر ہمہ ہند و سند الخ	شنامند یکسر ہمہ ہند و سند
		یہ بیت فردوسی کی نہیں، اسدی
		کی ہے، اور گرو شاسب نامہ (ص
		۱۹۶) میں موجود ہے۔ اصل میں مکر
		کی وجہ سے مصرع ماقطالوزن ہے
		پہلا مصرع بغیر اسی کے اضافے
		کے وزن سے خارج ہے۔
۵۳۵	شارہ نہادہ برستانہ	

مارا لافاضل کی حریف نو

۵۶۳	شعا (عربی)	اکثر فرنگوں میں فارسی بتایا گیا ہے موتید میں فارسی کے ذیل میں آیا ہے۔
ایضاً	بغیم و مین معجم	بغیم و مین معجم
۵۶۶	شفقت	اکثر فرنگوں میں بشمول موتید کے شفقت ہے۔
ایضاً	بسوی زمین بین نہ سوی شفقت	بسوی زمین بین نہ سوی شفقت
۵۶۷	کا در سہا	سکا در سہا
۵۸۳	شنبلید و لالہ لغمان	شنبلید و لالہ لغمان
۵۸۷	شنوشہ	شنوشہ
۵۷۷	قاصدان و پیکان استادہ بجہد	قاصدان و پیکان استادہ بجہد
		یا بجہند
		دبہ برنجین
		توان بگری دوان پرگر کے لائے
		اور پیرایہ مصدق کے اضافہ
		سے بنا ہے،
۱۹۳	فردہ	فردہ
۲۲۹	فنودہ	فنود (ضاح)
۰	بعار و عاریتی خویش را چرا فنود	بعار و عاریتی خویش را چرا فنود
۳۲۶	تو بگر	تو بگر
۳۳۱	کالہ کدوی سنگی	کالہ کدوی سنگی
۳۳۸	کاذران	کاذران، نیز دیکھیے ص ۲۱۰، ۲۱۱
۳۵۳	جواہر درویشان	جواہر درویشان
۳۹۱	ماخروہ (ذیل کلن)	ماخروہ

ملفوظات افاضیہ کی ترتیب نو

۲۹۲	خضرچ (باضاد)	خضرچ (با با)
۲۲۳	ماثوره (ذیل کیسنه)	ماثوره
۲۲۶	سوزانی	سوزانی
۲۵۲	هزبر	هزبر
۲۸۹	سخت آهین (ذیل گوپال)	لخت آهین
۲۹۱	خود (ذیل گود)	جوز
۲۹۷	جوهر آیین (ذیل گوهر)	جوهر آهن
۲۹۸	هندش جهاد	هندش جهاد

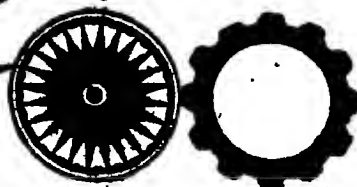
غلامہ کلام یہ کہ دارالافاضل کا متن قننا و قنن ہونا چاہیے تھا، اتنا نہیں ہے۔ منجملہ اور وجوہ کے اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے آخذ سے بجا طور پر استفادہ نہیں ہو سکا ہے اس کے اہم اور بنیادی آخذ لغات کی کتابیں ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ ڈاکٹر محمد باقر مصباح کے پیش نظر تھیں، ان کی مدد سے تصحیح متن کی پوری کوشش عمل میں نہیں آ سکی ہے۔ لغات کے علاوہ اس کے آخذ میں تاریخی کتابیں بھی ہیں۔ وہ کتابیں عموماً مطبوعہ شکل میں ہیں اور عام طور پر ملتی ہیں، مگر مصباح نے متن کی تصحیح و تحقیق میں ان سے کام نہیں لیا۔ اشعار کی ترتیب سے بے اعتنائی کے نتیجے میں اکثر شعر کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ اور بعض جگہ شعر کی تصحیح بھی نہیں ہو سکی ہے۔

ابھی دارالافاضل کی آخری جلد سامنے نہیں آئی ہے؛ اگر معروضات بالا کی روشنی میں نظر ثانی کر لی جائے، تو میں اپنی سعی مشکور سمجھوں گا۔



انہوں نے
آزادی کی جنگ جیتی

آؤ! ہم بھارت کی تعمیر و ترقی
کے انقلاب کو پائپ لائن
تک پہنچائیں



محمد شرف الدین سائل

ناگیور کے اخبار و رسائل

ریاست مہاراشٹر کا مشہور و معروف شہر ناگیور اپنی اعتبار سے اتنا ناوار نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ یہاں ہر دوسری علمی، ادبی اور صحافی کارناموں کی روایت ملتی ہے۔ اس جگہ ہم یہاں کی صحافت کا مختصر تذکرہ در نظر میں کرتے ہیں۔

۱۔ ترجمان (ناگیور کا پہلا ہفتہ وار اخبار) :

یہ اخبار اردو زبان میں ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں قلام عبدالقادر خان زکری کی ادارت میں جاری ہوا۔ بقول ایتق جونہدی (والد شفیق جونہدی) زکری تاریخ نگہ میں وحید عصر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں سے مزاوت تھی۔ اولاً سید عباس علی شہرت ناگیوری سے مشہور کیا اودان کے بعد سید عبدالعلی مآول ناگیوری (ف ۱۳۱۱ھ) سے عادل خود ناسخ کے شاگرد تھے۔ اس اخبار کا صرف ایک ہی ورق دستیاب ہوا ہے جو بہت ہی مشکستہ حالت میں ہے۔ اس پر زکری کے اخبار کے اجراء کے یہ قطعات تائید بخشد ہیں :

لطف سے ایند کے یہ اخبار ہے جاری ہوا (۱۳۰۱ھ)

آج خاص دھام کو حاصل ہے کل عیش و سرور (۱۸۸۴ء)

سالِ سمت یہ کلمہ زکری اہل شوق نے (۲۹۱۱ھ)

نام ہے اخبار کالو ترجمان ناگپور (۱۹۴۵ء سمیت بکری)
 اسی سرمدی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اخبار میں ملازم گزٹوانہ اور اطراف و جوارب کی
 خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔

۲۔ ادیب (ماہنامہ) :

ادیب کے ابتدائی چار شمارے مولوی محمد عبدالغنی ایم۔ اے (علیگ) پروفیسر ماس
 کالج ناگپور کی ادارت میں نکلے۔ آپ عبدالعلی آسی لکھنوی کے فرزند ارجمند تھے، ادیب
 اور شاعر اردو کی ترویج اور احیاء میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ عرصہ دراز تک ناگپور کے
 قدیم ماس کالج میں پروفیسری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انگریزی حکومت کی جانب
 سے شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ وہیں وقتاً
 پائی۔ ان کے بعد ادارت کی ذمہ داری اکتوبر ۱۹۲۰ء سے مولوی محمود علی خاں نے سنبھال
 لی۔ مولوی محمود علی خاں ندوی لکھنوی، مولانا شبلی نعمانی کے شاگرد اور مردہ کے
 دوسرے سال کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے تھے۔ وہ ۱۹۱۰ء میں مولانا شبلی کے حکم
 پر صوبہ متوسط و برار میں اردو کی تجدید اشاعت کے لیے آئے یہاں دیوان بیونی
 نے ان کی جہت آذ بھگت کی۔ بعد ازاں ۱۹۱۶ء میں خان بہادر راجہ ایم۔ ملک نے
 انھیں انجمن سامی اسلام ناگپور میں عربی اور فارسی پڑھانے پر مقرر کر دیا۔ یہ مولانا ندوی
 ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ۱۹۱۸ء کا سالانہ جلسہ نواب مسدود
 ہنگ مولانا حبیب الرحمن خان شرفانی کی صدارت میں انجمن ہال ناگپور میں منعقد
 ہوا۔ انجمن پریس ناگپور بھی انھیں نے قائم کیا تھا۔ اسی پریس سے جون ۱۹۲۰ء (رمضان
 ۱۳۳۸ھ) میں ماہنامہ ادیب شائع ہوا۔ اس رسالے کا صحافی معیار خاصا بلند تھا۔
 خواہ نمبر (جون ۱۹۲۰ء) میں مولوی سید عبدالرزاق صاحب نائب ناظم انجمن حامی ہلام
 ناگپور نے ادیب کے اجرا اور اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے
 حسب ذیل مقاصد بتائے ہیں :

۱۔ ملک متوسط و برار میں اردو ادب کی خدمت۔

۲۔ تہذیب و اخلاق۔

۳۔ تاریخ (جس میں ملک متوسط و برابر کو خصوصیت حاصل ہوگی)

۴۔ علم و ہنر کی اشاعت۔

۵۔ محکمہ تعلیم کی اعانت۔

ان مقاصد کے تحت مندرجہ ذیل عنوانوں پر مضامین شائع کیے جائینگے:

۱۔ ادب ۲۔ اخلاق ۳۔ تاریخ ۴۔ تذکرہ سلف ۵۔ علم و ہنر

۶۔ معاشرت ۷۔ نقد سخن ۸۔ اہم تعلیمی معاملات پر تبصرہ اور علمی خبریں۔

۹۔ محکمہ تعلیم کے ضروری احکامات کی اشاعت۔

اسی شمارے میں حکمائے یونان اور ان کے فلسفہ کی خصوصیات کے موضوع پر ایک جامع مقالہ ہے، مضمون نگار کا نام موجود نہیں ہے۔ یہ مقالہ دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں افلاطون، ڈیمقراطیس، ارسطاطالیس، ارسطو، کوٹا، فیثاغورث، سقراط، ہومیئرشیلی، دارلینوان، ڈیموسنان، امیروت، اگلسند، ہیراقسطیجی مشہور فلسفیوں کی زندگی اور ان کے خیالات کے اختلافات پر پُر زور اور مفصل بحث کی گئی ہے۔

اس کے بعد مقالہ ولی اورنگ آبادی از سید عبدالرزاق ہے (ص ۱۷-۲۱)۔ اس مقالے میں انہوں نے ولی اورنگ آبادی کی شخصیت، حالات زندگی ادبی خدمات اور شاعری پر جامع تبصہ کیا ہے۔ یہ مقالہ تین قسطوں میں شائع ہوا ہے۔

(شمارہ ۱-۲-۳)

علمی و ادبی خبریں (ص ۲۲ تا ۲۷): ان میں سے ایک خبر میں مشہور سائنس دان ہرنی سس، وائے کا ذکر ہے، جنہوں نے اس سال ناگپور میں آل انڈیا سائنس کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ دوسری خبر میں بتایا ہے کہ حضور نظام حیدر آباد نے ایک فرمان کے ذریعے سے قدیم کتب السنہ مشرقیہ کی اصلاح و درستی کے لیے ایک لاکھ روپے کے گرانقدر عطیے کا اعلان فرمایا ہے۔

صفحہ ۲۸ تا ۳۲ عمان الجواہر کے عنوان سے حصہ نظم دیا ہے۔ اس میں اول جناب قمر وکیل غازی پور کی نظم مصلیٰ جہنم (۷ اشعر) ہے۔ اس کے بعد مسام کا کردوی اور ابو الحسن ناظم گلاؤٹھوی کی غزلیں ہیں۔ (ص ۳۰-۳۲)

شمارہ ۲ (جولائی ۲۰۱۹ء) اس شمارے میں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں شمارہ کے مضامین کے بقیہ حصے اس شمارے میں شائع کیے گئے ہیں۔

شمارہ ۳ (اگست ۲۰۱۹ء) ہمارے پاس اس شمارے کا جو نسخہ ہے، اس کے ابواب دو صفحے اور سرمدی غائب ہیں۔ پہلے مولوی عبدالعلیم شرر کا مضمون ہے جو صفحہ ۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ ابتدائی اوراق نہ ہونے کے باعث معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے کب موضوع پر غامد فرسائی کی ہے مضمون کے مطالعے سے البتہ قیاس ہوتا ہے کہ غالباً اس میں مذہب کی تاریخ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اولاً تخلیق آدم اور ان کے جنت سے اخراج کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں حسب معمول تفصیلات انحصار اسرائیلیات پر ہے۔ اس کے بعد حضرت نوح، حضرت ابراہیم حضرت یحییٰ حضرت اسحاق، حضرت موسیٰ، اور حضرت سلیمان کی بعثت اور ان کی قوموں مافرائیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

انبیاء مرسل کی کوششوں سے دنیا میں دینا میں دو معبود الہی تعمیر ہوئے اور انہی کی نسبت سے دنیا میں دین ابراہیمی کے دو اسکول قائم ہو گئے۔ ایک اپنے دین کو خالص دینِ حلیفیٰ ابراہیمی بتاتا اور دوسرے حضرت یحییٰ کی شریعت پر عمل کرنے کے باعث دین موسوی کہلایا مگر مذہب کی تاریخ بیان کرتے وقت ہمیں دنیا کے دیگر مذاہب پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ ہر مذہب کو خدا کے بھیجے ہوئے لوگوں یا خود منہا ہر ایزدی کے ذریعے سے اپنے احکام و شرائع کے ملنے کا دعویٰ ہے مگر ان کی نسبت ہمارا اعتقاد اور خیال یہ ہے کہ انھوں نے شیطان سے جب آدم میں یہ بت پرستی اور ماسوا اللہ کے آگے سر جھکا نہ کا خود ہر اتوا ان کے

عقلانے سلف لے اپنے قیاسات۔ سے ان کی بے اصول صنم پرستی
اور ان کے باطلہ عقائد کو با اصول بنانے کی کوشش کی اور انہیات
کے ایسے مسائل یا قواعد بنا دیے جن کی بنا پر بت پرستی بجائے دور
ہونے کے ایک مہذب دین بن گئی۔۔۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ طرح طرح
کی ریاضتوں کے ذریعے سے ان نئے بتوں کے تصور سے غما کا
تصور مسخ ہو گیا۔۔۔۔

صفحہ ۹-۱۶: ولی اور نگ آبادی (قسط سوم) از سید عبدالرزاق
صفحہ ۱۷-۲۵: ”مجھے بی۔ اے کے بعد کیا کرنا چاہیے“ (افسانہ) از سید حمید
حسین پانی پتی۔

صفحہ ۲۶-۲۹: شنذات (علی وادبی خبریں)

صفحہ ۲۹-۳۶: عمان الجواہر (حقہ نظم)

صفحہ ۲۹: غزلیں مولانا سید اکبر حسین صاحب (لاہ آبادی): ایڈیٹر کے نوٹ
کے ساتھ موصوف کی دو غزلیں ہیں۔ پہلی میں پانچ شعر ہیں اور
دوسری میں صرف تین۔ ان کے مطالعے ہیں:

بٹ اس زندگی پر غافلوں کا فخر کرنا ہے یہ جینا کوئی جینا ہے کہ جس کے ساتھ مرنا ہے
”ہم خدا“ زبان پہ گو ہے خدا کے ساتھ ممکن نہیں خیال خدا مولا کے ساتھ

ص ۳۰-۳۲: عزیز غزلیں ہیں: طرانت آب لکھنوی (۵ شعر)، کلیم لکھنوی
(۵ شعر)، محشر لکھنوی (۷ شعر)، اصغر (۹ شعر)

یہ ادیب کے چہرہ میاری مضامین کی فہرست ملاحظہ فرمائیں:

حضرت کے خاتم النبیین ہونے کا ثبوت از مولوی محمد طہ صاحب متعلم ندوۃ العلماء
میر ۱۹۲۰ء، عشق و ہستی اور انسانی جدوجہد از مولوی عبدالغنی ایم۔ اے (ایضاً)
مدوستان میں پردے کا رواج کس طرح ہوا؟ از منشی وزارت علی (ایضاً) حقائق
خمس میں ادیب بن از جے آر۔ راے جرنلسٹ لاہور (ایضاً) احتساب ادب

از قاضی نامر علی عباسی (جنوری ۲۱ ۱۹۲۱ء)؛ شاہ عمان کو دعوت ایمان از مولوی حفور محمد شہید لکھنوی (فروری مارچ ۱۹۲۱ء)؛ مشرقی فرشتہ از خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت (ایضاً)؛ تقطیر از ابو محمد ثاقب (ایضاً)؛ تحقیقات سائنس (ہوا) از مولوی احمد اللہ گیلوی (اپریل مئی ۱۹۲۱ء)؛ امام از داعی از مولوی ابوالجلال صدیقی (ایضاً)؛ نور جہان بیگم از مولوی انور حسین ندوی (ایضاً)؛ کلام شوق پر ایک نظر از سید علی سجاد گوہر کانپوری (جون، جولائی ۱۹۲۱ء)؛ ساج محل آگرہ از سید ابو محمد ثاقب کانپوری (اگست و ستمبر ۱۹۲۱ء)؛ اکبر (الآبادی) سبز گنبد میں از مولوی حفور محمد شہید (ایضاً)

اس کے علاوہ کلام سہارنپوری، پیارے صاحب رشید، رکن الدین دانا، عزیز لکھنوی، باسط بسوانی، مقتول لکھنوی، جگ موہن ناتھ شوق، اشتات لکھنوی اور ناطق گلاؤنڈ جیسے ممتاز شعرا کی شعری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ افسوس کہ ادیب کو بہت تھوڑی عمر ملی صرف ۴۲ سالہ نکلے تھے کہ مٹا پرنشانی کے سبب یہ بند ہو گیا۔

۳۔ الحق (ہفتہ وار) :

اس کے ایڈیٹر مولوی محمود علی خان ندوی لکھنوی تھے۔ الحق ۱۸/۲/۲۱ء کے بڑے سائز پر ہفتے کی شنبے کے دن ۶ صفحات پر مشتمل چھپتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ دو روپے اولیہ شمارے کی قیمت تین روپے تھی۔ کتابت و طباعت کا معیار بھی بلند تھا۔

الحق کا اجرا ۲۷ ستمبر ۱۹۲۵ء کو ہوا اور یہ ۱۹۲۷ء تک پابندی سے نکلتا رہا۔ پہلے صفحے کے بالائی حصے میں اخبار کا نام علی حروف میں تحریر ہے۔ ایڈیٹر کا ادارہ بالعموم تک ہوتا۔ اس کے بعد اخبار تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔ اس میں شب و روز کی ادبی، سماجی، اقتصادی اور معاشی خبروں کے علاوہ مقامی اور غیر مقامی شعراء کا کلام بھی شائع ہوا کرتا۔ الحق میں غیر مقامی شعراء میں عبد الحمید زنجابی۔ اے کا کلام پابندی سے چھپتا رہا۔ وہ بیشتر نعت لکھتے۔ لیکن کلام میں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں ہے۔

نمونہ کے طور پر چند اہم خبریں ملاحظہ ہوں :

۱۔ دریائے آکس کے متعلق افغانستان کی کامیابی :- بیان کیا جاتا ہے کہ دریائے

نے جزیرہ کا ایک حصہ خالی کر دیا ہے۔ اودا فغانی فوج کی دو بلٹنیں اس میں داخل ہو گئی ہیں۔ مگر روس نے اس خونریز ہنگامے کے متعلق افغانستان سے کوئی معافی نہیں مانگی

(۱۱ فروری ۱۹۲۶ء)

۲۔ بہا ماجہ جموں کا جشن تخت نشینی: گزشتہ ہفتے میں راجہ ہری سنگھ والی جموں کے جشن اورنگ نشینی کے جلسے بڑی دھوم دھام سے ہوئے۔ تقریباً ۳۰ لاکھ روپیہ نیرت، اسودہ، مظاہرات، فوج، تھیٹر اور اسکول و کالج کے طلبہ کو شیرینی وغیرہ خرچ کرنے کے لیے منظور کیا گیا (۱۳ مارچ ۱۹۲۶ء)

۳۔ حکومت برطانیہ نے اپنی سعود کو ملک ابھار تسلیم کر لیا۔ (۱۸ اپریل ۱۹۲۶ء)
۴۔ کلکتہ میں ہندو سما کا افتتاح: پچھلے دنوں کلکتہ میں زیر صدارت ہیر شری ورثی ہندو سما کا افتتاح کیا گیا۔ اب وہاں سنگٹھن کا کام زوروں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

(۱۴ جولائی ۱۹۲۶ء)

۵۔ حضور وائسرائے کا دورہ ناگپور: حضور وائسرائے ناگپور میں ۲۲ سے ۲۵ جولائی تک تشریف رکھینگے۔ ہزار سلفسی لیڈی اردن بھی ہمراہ ہوں گی..... ۲۳ جولائی کو ۷ بجے صبح حضور وائسرائے نئے سائنس کالج (ناگپور) کا سنگ بنیاد نصب کیگے۔

(۱۱ جولائی ۱۹۲۶ء)

۶۔ وائسرائے کا دہلی میں درود: ۱۶ اپریل لاڈل اردن آج ۷ بجے سب دہلی وارد ہوئے۔ آہستہ ہی ۳۱ توپوں کی سلامی سر کی گئی۔ حکام اور معزز اشخاص سے تعارف کے بعد آپ وائسرائے راج تشریف لے گئے۔ لاڈل اردن اپنی ایگزیکٹو کونسل کا پہلا اجلاس ۱۶ اپریل کو شام کے وقت منعقد کرینگے۔ (۱۸ اپریل ۱۹۲۶ء)

۷۔ پنجاب کانگریس کمیٹی سے استعفی: لالہ واجپت رائے، پنڈت کے سنتانم، ڈاکٹر گوپی چند، ڈاکٹر دھن راج، ڈاکٹر پرشوتم لال سوندھی اور لالہ کشن چند بھاٹیہ نے پنجاب کانگریس ایگزیکٹو کمیٹی سے استعفی دے دیا ہے اور مزید استعفیوں کے آنے کا اندیشہ ہے۔

(۱۸ اپریل ۱۹۲۶ء)

۸۔ سعدی و حافظ کے مقبرے : ملہران کے خادسی جریہ وطن نے یہ خبر دی ہے کہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے مقبرے کی تعمیر کے لیے دہ نزار توہان کی ضرورت تھی۔ مرزا ابراہیم خان قوام الملک نے اس رقم کے عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اوصاف یہ کام انھیں کی نگرانی میں انجام پائیگا۔ نیز حافظ شیرازی علیہ الرحمہ کے مقبرے کے لیے مبلغ ۵۰۰ توہان کی رقم جو وزارت معارف کی طرف سے موصول ہوئی تھی، اس کا کام آقلے آموزگار رئیس معارف کی نگرانی میں انجام کو پہنچ گیا ہے۔ (۱۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

۴۔ اردو اخبار (ہفتہ وار) :

اس کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سید سجاد حسین اسرار آبادی تھے۔ اردو اخبار بھی الحق کے سائز ۲۲x۱۵ پر چھپتا تھا۔ البتہ اس میں صرف چار صفحے ہوتے تھے اور فی شمارہ قیمت دو پیسے تھی۔ سالانہ چندو پونے دو روپے تھا۔ یہ اخبار ۶ جولائی ۱۹۲۷ء کو جاری ہوا۔ عبد الحمید خاں زریبا لی۔ اے اور کلیم جلیپوری نے اخبار کے اجرا کی تاریخیں اس طرح نکالی ہیں۔

جس کی سی۔ پی میں ضرورت تھی وہ پرچہ نکلا قوم اسلام کا دسمانہ ہے اردو اخبار دیدہ زیب اس کی طباعت مضامین دلکش ہر طرح مایہ صدناز ہے اردو اخبار

ہے یہی مصرع تاریخ اشاعت زیبا
الحق اسلام کی آواز ہے اردو اخبار
(۶ ۳ ۱۳۱۳ھ)

از سر احسن کہ دو، اے کلیم!
واہ، کیا اسرار کا اخبار ہے
(۳۵ ۱۳ + ۱ = ۱۳۴۶ھ)

(اس قطعے میں کل ۱۶ اشعار ہیں)

اس میں تین کالم ہوتے تھے۔ اول ملک کی اہم خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ ۱۹۲۷ء میں ملک میں شدید سنگسٹن اور تلخ کی سرگرمیاں عروج پر تھیں اسی سلسلے میں

بند و مسلم فساد بھی ہوا تھا، لہذا اس اخبار نے کافی ترقی کی اور یہ گویا ناگپور کے مسلمانوں کے بذات کا واحد ترجمان بن گیا۔ اسی باعث جب تھوڑے عرصے بعد ہندو مسلم کشیدگی تم ہو گئی، تو یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔ اس اخبار میں ایڈیٹر ڈیل فوٹ مشہور اردو شاعر نالین لائوٹھوی لکھا کرتے تھے۔ اس میں کبھی کبھی ملک کے مشہور شعراء کی تخلیقات بھی شائع ہوا کرتی تھی۔

بعض اہم خبریں ملاحظہ فرمائیں :

(۱) اگر انقدر عطیہ : حضرت حضور نظام دام اقبال نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ عثمانیہ سنٹرل ٹیکسٹائل انسٹی ٹیوٹ کے لیے منظور فرمایا ہے۔ (۶ جولائی ۱۹۲۷ء)

(۲) مہاراجہ اور کابل قدر فرماں : مہاراجہ الور نے ماہ محرم میں اپنی ریاست میں یہ فرماں جاری فرمادیا تھا کہ دوران محرم میں ہماری تمام رعایا، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، ہر ایک تعزیر سے اور عظیم کی تعظیم کرے اور جب وہ سامنے سے گزرے تو تعظیماً کھڑا ہو جائے۔ (۲۰ جولائی ۱۹۲۷ء)

(۳) سابق شاہ رومانہ کی وفات کے بعد اب اس کا ۶ سالہ پوتا میکائل اول تخت نشین ہوا ہے۔ اسی کے والد شہزادہ کیرول نے جو دلیہ عہد تھے، اپنی خوشی سے سلطنت سے دستبردار کر لی ہے۔ (۲۷ جولائی ۱۹۲۷ء)

(۴) جزل ٹائر مر گئے : لندن ۲۴ جولائی - جزل ٹائر (جن کا نام امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے ساتھ ہمیشہ یادگار دیسنگا) ایک طویل حالات کے بعد فوت ہو گئے۔

(۲۷ جولائی ۱۹۲۷ء)

(۵) وایان ریاست کا جلسہ : چمبر آف پرنسز (کونسل وایان ریاست) کا جلسہ نئی دہلی میں ۲۸ فروری سے ۲۸ فروری (۱۹۲۸ء) تک ہوگا۔ (۱۳ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۶) مردم فطری : حال میں قسطنطنیہ میں جو مردم شماری کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ کی آبادی سات لاکھ ہے اور استنبول کی آبادی آٹھ لاکھ سات ہزار ہے۔ (۱۳ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۷) کانگریس ورکنگ کمیٹی نے آل انڈیا کانگریس کی ہندو مسلم اتحاد کی تجویز کو عملی جامہ پہنا۔
 کے لیے حسب ذیل ممبران کو شہری کمیٹی کے لیے انتخاب کیا ہے: ڈاکٹر انصاری، مولانا
 ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، ڈاکٹر کچیلو، شرانی صاحب، حکیم اہل خاں، ستیدر قلعی
 مولانا شوکت علی، مولوی محمد شفیع داؤدی، سری نواس آئینگر، بابو بھگوان داس
 بابو شیو پرشاد گپتا، گیش شنکر دیارتھی، مسز سرجنی ٹائیڈو، جے۔ ایم۔ سین گپتا
 سوباش چندر بوس، کے ناگیشور او، موہنی لال نہرو، ابھینگر، بیٹھ گوندواس، سر
 سرندل سنگھ کویشر، اے۔ رگھا سوامی آئینگر، ڈاکٹر مراری لال، راجندر پرشاد، دیوان
 چمن لال، پنڈت سنتانم اور ڈاکٹر مستی پال۔ (۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۸) راجہ صاحب بیکانیر نے ہندو یونیورسٹی کو پچاس ہزار روپے کا عطیہ مرحمت فرمایا ہے
 (۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۹) ترکستان کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ (۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء)

(۱۰) افسوس کہ مسیح الملک حکیم اہل خاں دہلوی نے ۲۸ - ۲۹ نومبر کی درمیانی شب کو بقم
 رامپور انتقال فرمایا۔ (۳۱ دسمبر ۱۹۲۷ء)

(۱۱) راجہ صاحب نانپار نے ایک سو روپیہ ماہوار فوجی محل کو مذہبی تعلیم و تربیت کے
 عطا فرمانے کا حکم دیا ہے۔ (یکم مارچ ۱۹۲۸ء)

۵۔ اُمید (ہفتہ وار) :

امید پہلے ۱۹۳۱ء میں عبدالستار فاروقی کی ادارت میں جاری ہوا، اور ۱۹۳۳ء کی ابت
 تک نکل کر بند ہو گیا۔ اس وقت اس کا سائز ۲۲x۱۵ تھا اور صفحات صرف چھ
 تھے۔ بعد ازاں ۱۹۳۴ء کے شروع میں مشہور ادیب حکیم اسرار احمد کروی (برادری
 ڈاکٹر عظیم کروی، مشہور افسانہ نگار کی ادارت میں اس کا دوبارہ اجراء حکیم اسرار
 انجن حامی اسلام، ناگپور میں اردو اور فارسی کے مدرسے تھے۔ سی۔ بی میں کانگریس ملا
 آپ کی تصنیف ہے تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان میں منتقل ہو گئے تھے۔ اب امید
 سائز ۲۰x۱۵ کر دیا گیا اور صفحات چھ سے بڑھ کر آٹھ بن گئے۔ اخبار کا مصنفیہ

ناگپور کے اخبارات

انی بلند تھا۔ یہ سیاسی اخبار تھا، جو کانگریسی نظریات کا حامل تھا۔ بعد کے بدلتے ہوئے حالات میں اس نے اپنا نظریہ بدل کر مسلم لیگ کی موافقت کی۔ یہ جولائی ۱۹۳۷ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

اہم خبریں :- (مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۳۷ء جلد ۴، شمارہ ۳)

(۱) مسلم لیگ کی موت کا خطرہ : سر محمد یعقوب نے مسٹر جناح کو ایک تازہ صبح کر دیا کی ہے کہ براہ مہربانی مسلم لیگ کے ان ممبران کے متعلق جنہوں نے وزارتیں قبول کر لی ہیں، اپنے فیصلہ میں آئندہ سالانہ اجلاس تک تغیر فرمائیں، تاکہ لیگ انتشار سے محفوظ رہ سکے۔

(۲) کانگریس کی کامیابی : (مسٹر رفیع احمد قدوائی کانگریس امیدوار) اطلاعات منظم ہیں کہ دوسرے دو امیدوار مسٹر رفیع احمد قدوائی کانگریس امیدوار کے مقابلے میں پیٹھ گئے اور مسٹر رفیع احمد قدوائی بلا مقابلہ شمالی برانچ حلقہ سے منتخب ہو گئے۔ یہ جگہ مسلم لیگ کے نمایندے مسٹر اصغر علی کی وفات سے خالی ہوئی تھی۔ مسٹر قدوائی کے آجانے سے ۲۲۸ ممبروں کے ہاؤس میں کانگریس کی میزبانی ۱۲۴ افراد پر مشتمل ہے۔

(۳) قومی مشاعرہ : زیر صدارت مرتضیٰ الشعرار، فصیح البیان، مصوٰر جذبات، صوفی سرمد ثانی، امام الراعیات حضرت مولانا سید امجد حسین صاحب آجندہ مظہر حیدر آبادی، برہنہ مشنبہ ۱۲ صفر ۱۳۵۶ھ (مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۳۷ء) نو بجے شب انجمن ہائی اسکول صدر بازار ناگپور منعقد ہوگا۔

(۴) دربار تاج پوشی کی تقریبوں میں شرکت کی مانعت : (صوبہ بھارتی کانگریس کمیٹی کے نام پینڈت جواہر لال نہرو کا مکتوب) پینڈت جی نے صوبہ بھارتی کانگریس کمیٹیوں سے درخواست کی ہے کہ وہ کانگریسی کارکنوں نیز دیگر اصحاب کو اس امر کی یاد دہانی کرا دیں کہ دربار تاج پوشی کی تقریبوں میں خواہ وہ کسی شکل میں ہوں اور کسی پہلے پر ہوں شرکت کرنا کانگریس کے خلاف احساس کی پالیسی کے خلاف ہے۔ لہذا یہ اپیل کی گئی ہے کہ ان تقریبوں میں شرکت نہ کی جائے۔ (۱۹ مئی ۱۹۳۷ء)

۶۔ آرسی (ماہنامہ) :

یہ صوبہ متوسط و برار کا پہلا نسوانی رسالہ تھا۔ اس کا سائز عام ماہناموں کی طرح ۱۰×۱۰ تھا؛ صفحات ۲۸ قیمت سالانہ ڈھائی روپے اور فی پرچہ چار گانے تھی۔ کتابت، طباعت، کاغذ کا معیار بہت اچھا تھا اس رسالے کا اجرا فروری ۱۹۳۷ء میں حکیم امرا احمد کریوی کی ادارت میں ہوا؛ لیکن ایک شمارہ نکلنے کے بعد ہی موصوف نے اس کی ترتیب و اشاعت کا کام اپنے بھتیجے یعنی ڈاکٹر اعظم کریوی کے فرزند ارجمند آفتاب احمد اسلم کریوی کو سونپ دیا۔

آرسی خواتین کو ان کے جائز حقوق دلانے اور ان میں انسانی خودداری کا احساس پیدا کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ یہ رسالہ برجوش نظمیں، دلدادہ ناول و نتیجہ خیز افسانے، مقالات علمیہ تاریخی مضامین حقیقی معلومات اور ادبی جواہر پاروں سے آراستہ ہوتا تھا۔ اس میں ٹیگور کے ترجمے، ارشد امداد احمد اور حکیم امرا احمد کریوی کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ افسوس صرف چار شمارے نکلنے کے بعد ہی ۱۹۳۷ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔

۷۔ سہ روزہ جمہور (صوبہ متوسط و برار کا ترجمان) :

یہ اخبار ۱۳۳۵ھ سائز پر ہفتہ میں دو بار کامٹی سے شائع ہوتا تھا اس کی سالانہ قیمت چار روپے تھی؛ ایک پرچہ میں صرف چھ صفحے اور قیمت دو پیسے تھی۔ اس کے ایڈیٹر پرنسپل پبلشر مولانا محمد عمر انصاری الطر صاحب تھے۔ یہ ۱۲۵ اپریل ۱۹۳۵ء کو جاری ہوا؛ لیکن معاشی بد حالی کے سبب ایک سال کے اندر ہی بند ہو گیا۔ ہر صفحے میں تین مساوی کالم ہوتے تھے۔ اس میں خبریں، مضامین کے علاوہ بیرونی اور مقامی شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ اخبار کے سرمدق پر اقبال کا یہ مشہور شعر چھپتا تھا:

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے بٹا دو

اور پشت پر شعر ملتے ہے:

از غلطی فطرت آنا دور رسا ممکن تا تراشی خوابِ ابرہین کا فری

جمہور نے اپنی مختصر زندگی میں رسولِ نبیر شائع کیا تھا جو بہت اہم ہے۔ اس میں خصوصیت

کے ساتھ راجہ راجہ ایشاد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ آف تیلو تھو اسٹیٹ کی مالک اور تقریر "رحمت عالم کے اخلاق" بہت بلند پایہ ہے۔ "وحدت مذاہب" پرائیڈ ٹرانسٹر آف انڈیا سٹریٹس سب کا مضمون بھی قابل ذکر ہے۔

اہم خبریں (۱۸ جون ۱۹۳۵ء) جلد ۱۵، شمارہ ۱۵

(۱) لندن: ملک معظم نے ایک مجلس منعقد کی جس میں سر نیچ بہادر سپرو نے پریوی کونسل کے رکن کی حیثیت سے حلف لیا۔

(۲) الہ آباد: یہاں سب سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں یہ افواہ گرم ہے کہ ملک معظم کی جبری کی خوشی میں تمام قیدیوں کی جو ہندستان کی مختلف جیلوں میں اپنی میعاد سزا پوری کر رہے ہیں، قید میں دو دو ماہ کی کمی کی جائیگی معلوم ہوا ہے کہ سیاسی قیدی اور انقلابی سازشوں کے لیے سزا پانے والوں کے ساتھ بھی یہی رعایت کی جائیگی۔

(۳) لندن: اخبارات کا خیال ہے کہ لارڈ ولنگڈن کے بعد لارڈ لنتھگرو ہندستان کے طاقتور اے ہونگے۔

(۴) شملہ: (۱۲ جون) جنرل کارسل کو جنرل آفیسر کمانڈنگ ویسٹرن کمان کا خطاب دیا گیا ہوا ہے کہ لارڈ کے چوتھے روزے میں سے ایک عورت نکالی گئی جس کے پھر سید اہور ہاتھا۔ زچہ اور بچہ دونوں محفوظ ہیں۔

(۵) پیکن: (۴ جون) حکومتِ جاپان نے اب کئی جدید مطالبات حکومتِ چین کے روبرو پیش کیے ہیں۔ چین نے ان کو نامنظور کر دیا ہے۔ جاپان کی بے شمار فوجیں سرحد کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ جنگ کا امکان یقینی صورت اختیار کر چکا ہے۔

(۶) لاہور: تقریباً پچاس معززین شہر نے جن میں پنجاب یسلیٹھو کونسل کے پریسیڈنٹ چودھری شہاب الدین، سر محمد اقبال اور خان صاحب فضل الہی وغیرہ شامل ہیں، یہ طے کیا ہے کہ ۳ جون کو آغا حشر مہرم کی یادگاہ میں آغا حشر ٹرسٹ

منایا جائے۔

شمارہ (۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء) جلد ۲۔ شمارہ ۴۲

(۱) جنگ شروع ہوگئی (اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر دیا : بمباری اور پسپائی) ۳ اکتوبر
گیارہ بج کر بیس منٹ ریوٹر کا جنگ سے متعلق آج پہلا شمارہ پہنچا کہ اڈا اور اطالوی
جہاز نے بمباری شروع کر دی۔ دوسرا شمارہ ۳ اکتوبر گیارہ بج کر چوبیس منٹ کو پہنچا۔
معلوم ہوا ہے کہ بمباری سے اڈا کو بہت نقصان پہنچا ہے۔
اعلان جنگ : اسرارہ ۴ اکتوبر آج اطالوی جرنیل ڈبائونے قاعدے کے مطابق اعلان
جنگ کیا۔

(۲) لندن : ۳ اکتوبر شاہ حبش راس میوم نے جمعیتہ الاقوام کو مطلع کیا ہے کہ اطالوی
فوج نے اڈا اور ڈیگراٹ پر بم پھینکنا شروع کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں کئی
شہری جن میں بوڈے اور عورتیں بھی شامل ہیں، مجروح ہوئے ہیں۔
(۳) اٹلی کا حفاظت خود اختیاری کا بھانا : (جنیوا ۳ اکتوبر) اٹلی نے جمعیتہ الاقوام کو
اطلاع دی ہے کہ اطالوی جرنیل کو حفاظت خود اختیاری میں حبشہ پر حملہ کرنے کا حکم
دے دیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ حبشہ اپنی جنگی تیاریوں سے باز نہیں آنا چاہتا تھا اور
فوجوں کی نقل و حرکت شروع کر دی تھی۔ حبشہ کا احتجاج منظر ہے کہ بمباری سے
اڈا میں بہت اتلاف جان و مال ہوا ہے۔

عام جنگ کا اعلان : (ادیس ابابا، ۳ اکتوبر) عام جنگ کا تمام حبشہ میں اعلان کر دیا
گیا۔۔۔۔

ایگڈن میں جنگ : نیگوس کا ایک تار منظر ہے کہ اڈیگراٹ پر بھی بمباری شروع ہوگئی ہے
اور ایگڈن صوبہ میں جنگ کی پہل چلی ہوئی ہے۔

اطالویوں کی پسپائی : بیان کیا جاتا ہے کہ اطالوی فوجیں جو اگیم کی طرف بڑھ رہی تھیں،
اڈا اور ڈیگراٹ کے درمیان شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئیں۔
اسی طرح مختلف مقامات کے تحت مزید تفصیل خبریں ہیں۔

۸۔ ڈیر سخن (ماہنامہ) :

یہ ماہنامہ بھی جمہور کے مدیر عمر انصاری اہلکار مرحوم نے کامٹی سے جاری کیا تھا۔ اس سے پہلے کامٹی سے کبھی کوئی اخبار یا رسالہ جاری نہیں ہوا تھا۔ جمہور پریس بھی جہاں یہ دونوں پریس چمکتے تھے، ان کی ناتی ملکیت تھا۔ ڈیر سخن ۱۲x۱۲ سائز پر ہر مہینے ۳۲ صفحوں پر نکلتا تھا۔ ایک پریس کی قیمت دو آنے اور سالانہ ڈیڑھ روپیہ تھی۔ عمر انصاری کے ساتھ یادہ انور کامٹی بھی ادارہ تحریر میں شامل تھے۔ یہ پریس ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب آئی۔ ایم۔ ڈی کی سرپرستی میں شروع ہوا تھا۔ لیکن افسوس کہ صرف تین شلوے نکل سکے اور یہ رسالہ بند ہو گیا۔ ہمارے پاس اس کے دو شمارے ہیں۔ شمارہ ۱ (مارچ ۱۹۳۵ء) کے عنوانات حسب ذیل ہیں :

شروع میں ملاحظات کے عنوان سے عمر صاحب کا مختصر طاریہ ہے۔ اس کے بعد ابتدائی ۱۲ صفحات تک باہر کے شعراء کے منظومات درج ہیں۔ ان میں عبدالقیوم شفیق، مولانا البرکس، ناطق گل، ڈاکٹر، مولانا حبیب اللہ خان، فضلہ (ملک)، مولانا خلیل الہدی شارق، قیصر امرواتی اور حکیم مصطفیٰ حسین خاں بلخ آبادی کی غزلیات اور حبیب بلخ آبادی کی نظم جلوہ سحر ہیں۔ اس کے بعد جن مقامی شعراء کا کلام ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں : مولوی محمد عمر انصاری اہلکار، فنی فقیر محمد ناظم کامٹی، انور کامٹی، احقر کامٹی اور شاملہ کی کامٹی۔

حصہ نثر (ص ۱۴ - ۲۹) میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں :

تذکرہ شمس ولی اللہ — مولانا محمد عمر انصاری

ادبیات (قسط اول) "ادب ایک فن کی حیثیت سے" — وقار عظیم ایم۔ اے

حافظ کا ایک شعر — فضلہ ایم۔ اے

بلبل (کیش کی نظم کا ترجمہ)

ارتقاے ابد (قسط اول) — عبدالرزاق خاں بی۔ اے۔ ایل۔ بی۔ (ملک)

لغات (الوکی لغت) از فاضل گو

۹۔ مصور الفاروق (ہفتہ وار) :

یہ ہفتہ وار پہلے ۱۸۳۲ء سن پر نکلا، لیکن بعد کو اس کا سن ۱۹۳۲ء ہو گیا۔ بالعموم اس میں آٹھ سے بارہ صفحے تک ہوتے تھے۔ اسی لیے قیمت بھی ڈھائی روپے سے بڑھ کر چھ روپے سالانہ کر دی گئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر جناب عبدالستار فاروقی تھے۔ موصوف کا مٹی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اُردو صحافت کو ترقی دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ الفاروق سے پیشتر ناگپور سے نکلنے والے متعدد اخباروں میں ان کا مل دخل ہے۔ ان کا ایک دارالمطالعہ بھی ہے جس میں ہمیشہ قیمت اور نادر کتابیں موجود ہیں۔ سیاسی میدان میں بھی سرگرم رہے ہیں۔

الفاروق (ہفتہ وار) ۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو نواب فازی آف گیور دھامیٹ کی سرپرستی میں جاری ہوا۔ قبولیت عامہ کے باعث یہ اخبار صبح معنوں میں ۲۷ سال یعنی ۱۹۶۳ء تک صوبہ کا واحد ترجمان بنا رہا؛ اتنے لمبے عرصے تک یہ اخبار پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس میں دو تین اور چار کالم ہوتے تھے۔ پہلے صفحے کے بالائی حصے میں اخبار کے نام کے ساتھ کبھی کبھی اقبال کا یہ شعر ہوتا تھا:

چینوں کے سایے میں ہم پل کر جاں جو کہیں
خبر ہلال کا ہے قوی نشان ہلال
تقسیم ملک سے پہلے یہ اخبار مسلم لیگ کا موافق تھا۔ بعد کو یہ کانگریس پارٹی کا خاص انگ بن گیا۔ اس کا معیار کافی بلند تھا۔ اس میں ملک بھر کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اس میں مقامی ادیب ہر کے شعراء کا کلام بھی شائع ہوتا۔ علاوہ ازیں مضامین، افسانے اور مقالات بھی چھپتے تھے۔

۱۰۔ جدوجہد (ہفتہ وار) :

یہ اخبار صوبہ متروک و برار میں مسلم لیگ کا ترجمان تھا۔ فروری ۱۹۳۷ء میں مولانا عبدالحق نے تعلق لگاؤ ٹھوکی کی سرپرستی اور نکلانی میں جاری ہوا تھا۔ بعد کو انھیں معلوم ہوا کہ یہ اخبار مسلم لیگ کا نقیب ہے۔ چونکہ وہ خود کانگریس پارٹی سے تعلق رکھتے تھے، لہذا جلد ہی اس سے الگ ہو گئے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر عبدالہادی خاں صاحب تھے۔ ان کے بعد سید ابوالظفر

بھاری ہوئے اقدار میں محمد عبدالعلیم ناکر۔ اس اخبار نے وقایہ منداکیم کی پُر زور مخالفت کی تھی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کے شمارے میں اخبار نے ایک مقدمے پر تنقید کی تھی بعد کو اسی کی پاداش میں حکومت وقت نے اخبارات توہیر پریس سے جہاں یہ اخبار چھپتا تھا، دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی اور ضمانت ادا نہ کر سکنے پر دونوں بند ہو گئے۔

۱۱۔ مسلم (ہفتہ وار) :

آٹھ صفحات پر مشتمل یہ ہفتہ وار پرچہ سیاسی نوعیت کا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ تین روپے تھا اور ایک پرچہ کی قیمت صرف دو پیسے تھی۔ یہ اپریل ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر علی برادران کے تربیت کردہ، جلیپور کے مشہور صحافی تاج الدین صاحب تھے۔ یہ اخبار کانگریسی نثریات کا حامل تھا۔ چونکہ وہ دوسلم لیگ کے سیاسی تسلط کا تھا، اس لیے اسے قدم قدم پر مالی اور دیگر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر یہ مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگا تھا۔

اس اخبار میں بھی اسی مقدمے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی، جس کا اور پڑا ذکر ہوا۔ چنانچہ اس سے بھی دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی اور عدم ادائیگی کے باعث یہ بھی بند ہو گیا۔ اس اخبار میں سیاسی مضامین کے ساتھ پرجوش اور انقلابی نظمیں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ اخبار کے سرمدتی پر اقبال کا یہ شعر لکھا جاتا تھا :

خویریں نہ ہم جس کو اچھے ابو سے مسلمان کو ہے رنگ وہ پادشاہی

۱۲۔ عزیز (ماہنامہ) :

فیض انصاری، قادریازی اور عثمانی اقبال تینوں حضرات نے مل کر ۱۹۳۷ء کے وسط میں بچوں کا یہ پہلا ماہنامہ ناگپور سے جاری کیا تھا۔ اس میں دلچسپ کہانیوں اور افسانوں کے علاوہ شعری تخلیقات بھی شامل ہوتی تھیں۔ افسوس کہ کچھ سات شماروں کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔

۱۳۔ گوہر (ماہنامہ) :

یہ رسالہ مئی ۱۹۳۹ء میں جاری ہوا۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ اور ایک شمارے

کی قیمت دو آنے تھی۔ یہ معمولی معیار کا رسالہ تھا جسے چند فوج والوں نے مل کر بیچوں کے لیے جاری کیا تھا۔ دو یا تین شماروں کے بعد ہی بند ہو گیا۔

۱۳۔ ہفتہ وار مسلم لیگ گزٹ اور ہفتہ وار محوی :

فروری ۱۹۲۷ء میں صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے سلسلے میں عارضی طور پر مخالف دوافع پر دھنڈے کے لیے یہ دونوں اخبار شروع ہوئے۔ اول الذکر کے ایڈیٹر حکیم تاج محمد خان (مشہور ادیب و جامع محمد خاں دکنی پریم نگری کے والد) اور موغلا الذکر کے ایڈیٹر ناگپور کے مشہور و معروف شاعر جناب سلطان احمد خان محوی تھے۔

۱۵۔ شوکت (ہفتہ وار) :

مولانا شوکت علی مرحوم کی یاد میں یہ اخبار یکم جون ۱۹۴۹ء کو ناگپور سے شائع ہوا اس کے ایڈیٹر سید ابونظر بہاری تھے۔ ضخامت آٹھ صفحے، سائز ۲۰×۳۰، سالانہ چندہ ڈھائی روپے اور فی شمارہ قیمت دو پیسے تھی۔ لیکن بہت ہی قلیل عرصے میں معاشی بد حالی کے سبب بند بھی ہو گیا۔ اس کے سرورق پر بھی اقبال کا یہ مشہور شعر چھپا کرتا تھا:

تینوں کسائیے میں ہم لپکے جواں ہوئے ہیں شجر ہلال کا ہے قوی نشان ہمارا

۱۶۔ پرواز (ماہنامہ) :

یہ ماہنامہ بڑے اہتمام سے اپریل ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا تھا۔ کاغذ، کتابت، طباعت ہر ایک چیز معیاری تھی۔ بالعموم ۳۲ سے ۴۸ تک کی ضخامت تھی، سالانہ چندہ چار روپے تھا اور ایک پرچے کی قیمت چھ آنے۔ اس کے ایڈیٹر خیر اہدہ المسلم بی۔ اے تھے اور اُن کے معاون قادیان نازی۔ اسے مقامی ادباء اور شعراء کے علاوہ ملک کے بعض مشہور لکھنے والوں مثلاً محوی صدیقی گھنوی، سر دوش عسکری طباطبائی، نذیر ناسی، بہادر گھنوی، ملّا رموزی، ادیب مالگاؤنی، شفا گواریاوی وغیرہ کا قلمی تعاون حاصل تھا لیکن ناسوس کہ صرف چار خندے لکھنے کے بعد اگست ۱۹۵۰ء میں یہ بند ہو گیا۔ رسالے کے سرورق پر اقبال کا یہ شعر ہوتا تھا:

اے طائر! ہوتی اُس رات سے موت تھی جس نفق سے آتی ہیں ہلاکتیں کوئی

فلمی نقاد (ماہنامہ) :

یہ مدھیہ پریش کا واحد ادبی فلمی معنوی ماہنامہ تھا۔ تقریباً ہم صفحے کی ضخامت میں مضامین، تصویریں اور فلمی موضوعات پر مضمون ہوتے تھے سالانہ قیمت چار روپے اور ایک شمارے کی قیمت چھ آنے تھی۔ اس کے ایڈیٹر حمید صادق (بی۔ اے) تھے۔ یہ سالہ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں جاری ہوا۔ فلمی خبروں اور مضامین کے علاوہ اس میں افسانے اور شعری تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس کے فلمی موادوں میں بعض اصحاب کے نام یہ ہیں: ناطق گل، دھڑوی، فاب غازی آف گپور، نادم بلخی، عظیم آبادی، اے۔ این۔ کیلا، یاد عظیم آبادی وغیرہ۔ ایک سال سے کچھ زائد مدت تک یہ رسالہ جاری رہا۔

۱۸۔ سنگیت (ہفتہ وار) :

یہ مختصر ہفتہ وار (۶ صفحات) بھی حمید صادق صاحب کی ادارت میں اکتوبر ۱۹۵۰ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کی سالانہ قیمت صرف تین روپے تھی۔ یہ سیاسی، اقتصادی اور سماجی پر مرکوز تھا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کو کبھی کبھی مقامی شعرا میں سے کسی کی فول بھی شامل ہو جاتی تھی۔ مالی پریشانی کے باعث یہ اخبار بھی چند مہینوں سے زیادہ نہ چل سکا۔

۱۹۔ تباہ (ماہنامہ) :

تباہ مارچ ۱۹۵۲ء میں حمید آفزا اور بلدیہ دیوان کی ادارت میں ادارۃ اشاعت اردو کے زیر اہتمام شروع ہوا۔ اس میں ادبی اور تنقیدی مقالات کے ساتھ مقامی اور غیر مقامی شعرا کا کلام اور افسانے بھی شائع ہوتے تھے۔ چھ سات شماروں کے بعد اس میں فلمی میکشن کا بھی اضافہ کر دیا گیا، جسے افسانہ نویس قادر نیازی ترتیب دیتے تھے۔ آخری شمارہ مئی ۱۹۵۳ء کا شائع ہوا۔ اس قلیل عرصے میں رسالے نے خاصی معنوی ترقی کر لی تھی لیکن مالی مشکلات کے باعث مجموعہ رسالہ بند کرنا پڑا۔ اس کے پہلے دو شماروں کے محتویات حسب ذیل تھے :

جلد ۱، شمارہ ۱ (مارچ ۱۹۵۲ء)

حصے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "اروگل" اس حصے میں مولانا ناطق

گلاؤٹھوی، لوح ناری، لاد چاند پوری، بہزاد لکھنوی، ماہر نقاد، الم مظفر گری، مکتبہ نادر، نادرش پرتاپ گروسی، ستیہ اختر اور رواں جو پوری کی غزلیں ہیں۔

دوسرے حصے کا عنوان "غزل شاعری" ہے۔ اس میں پہلے سجاد ظہیر کا خطان کی اہلیہ کلام ہے۔ یہ خط حصے کی پہلی حالت حاضرہ پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ پھر "پرتاپ گلاؤٹھا" پر آل احمد سرور کے مقالے کی پہلی قسط ہے۔ اس کے بعد محمد یونس خالدی کا ایک دلچسپ خط ہے، جس میں دنیا کے حالات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

تیسرے حصے (ماہ و انجم) میں دیگر ممتاز شعراء کا کلام ہے۔ چوتھا حصہ (سنگ و آہنگ) اخلاقی، اصلاحی اور سماجی افسانوں پر مشتمل ہے۔ پانچواں حصہ (گرد و پیش) متفرق ادبی خبروں کا مجموعہ ہے۔

جلد ۲ - شمارہ ۲ (اپریل دہائی ۱۹۵۲ء)

حسب سابقہ قاعدہ "میں مولانا طارق گلاؤٹھوی، رئیس امر وہی، طرفہ قریشی، حمید آذر، اور دیگر مقامی شعراء کی غزلیں ہیں۔ اس کے بعد "نور و نثار" یعنی نثری حصے میں حسب ذیل مضمون ہیں:

ہزار گلاؤٹھا۔ از آل احمد سرور (قسط دوم)؛ شاعر تاج از فرید تنویر (سیلاب کی شاعری پر ایک مقالہ)؛ قضیہ نامرغیہ از یونس خالدی۔

اس کے بعد پھر "ماہ و انجم" کے عنوان سے دیگر مقامی اور غیر مقامی شعراء کی نظمیں و غزلیات درج ہیں۔ آخر میں "سنگ و آہنگ" کے عنوان سے بعض مقامی افسانہ نویسوں کے افسانے ہیں اور پھر "گرد و پیش" کے تحت مختلف خبریں۔ اس شمارے میں تین الاقوامی اضطراب" ایک سیاسی مضمون مانوڑ ہے۔

اس کے علاوہ ابراہیم صدیقی کا مقالہ "تقسیم ہند کے بعد غزل کے نئے رجحانات" شمارہ دسمبر ۱۹۵۲ء اور نثار فاروقی کا مقالہ "میر کی سیرت کے بدنام نقوش" (آپ حیات کے آئینے میں) نومبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں خائع ہوا ہے۔

۲۔ سویرا (پندرہ روزہ) :

سویرا کے ایڈیٹر جناب اقبال ہاشمی تھے اور پرنٹر، پبلشر احمد علی ہاشمی۔ یہ پریچہ اگست ۱۹۵۲ء میں نکلا اور سات شماروں کے بعد نومبر ۱۹۵۳ء میں بند ہو گیا۔ اس میں بالخصوص مختصر فن نے اور فزلیں شائع ہوتی تھیں۔ آخر میں فلمی سیکشن بھی ہوتا تھا، جسے قادر نیازی ترتیب دیتے تھے۔

۲۱۔ چاند (ماہنامہ) :

چاند کا دعویٰ تھا کہ یہ حصہ پریش اور حیدر آباد دکن کے بچوں کا واحد علمی، اخلاقی ماحولاتی ماہنامہ ہے۔ فیض انصاری اور شفیقہ فرحت اس کے ایڈیٹر تھے۔ قیمت فی پریچہ پانچ آنے تھی اور سالانہ ساڑھے تین روپے۔ یہ جنوری ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا۔ یہ رسالہ بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کی غرض سے نکالا گیا تھا اور انہیں کے معیار کے مطابق اس میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں نو مشق طلباء، ادبا، شعراء اور افسانہ نویسوں کی تخلیقات کو بھی اس میں جگہ دی جاتی تھی۔

انہیں میں شفیقہ فرحت اور فیض انصاری میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، جس کے باعث فرحت چاند کی مجلس ادارت سے الگ ہو گئیں اور اپنا ذاتی رسالہ کرئیں (ماہنامہ) جاری کیا۔ جون ۱۹۵۴ء میں چاند بند ہو گیا۔ اس میں چند لکھنے والوں کے نام یہ ہیں: قاری سوزی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نریش کارشار، خلیل الہدی شادق، پرکاش بھٹ، منظر حفی، خلیق برہانپوری، ستید اختر، ادیب بالیگاؤنی، ان کے علاوہ مقامی حضرات کا حصہ بھی اس رسالے میں کچھ کم نہیں تھا۔

۲۲۔ گرین (ماہنامہ) :

اس کا ڈاکٹر اوپر ہوا ہے۔ اس کی ایڈیٹر جناب شفیقہ فرحت تھیں۔ اس کی قیمت فی پریچہ چھ آنے اور سالانہ چار روپے تھی۔ کاغذ اگرچہ اخباری استعمال ہوتا تھا لیکن اس کی طباعت نکات بہت عمدہ تھی۔

زین اگست ۱۹۵۴ء میں جاری ہوا اور غالباً ڈیڑھ سال تک پابندی وقت کے ساتھ

نکلتا رہا۔ اس میں افسانے، دلچسپ مضامین اور منظومات شائع ہوتی تھیں۔ رسالے کے آخر میں ملحق حصہ بھی ہوتا، جسے خفیہ فرحت کے بھائی ڈاکٹر محمد اسلم (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس) ترتیب دیتے تھے۔ کرنیں میں موعہ کا سلسلہ بھی جاری کیا گیا تھا۔ لیکن یہ چند ہی مہینوں کے اندر بند ہو گیا۔ سعادت حسن منٹو، اختر انصاری، اکبر آبادی، کرشن چندر، صالحہ حاجہ زلیخا کمار شاو، شفا گوایاری، کوثر چاند پوری، عادل رشید وغیرہ مشہور لکھنے والے کے مضامین اور نظمیں اس رسالے میں شائع ہوئی ہیں۔

۲۳۔ راہی (ماہنامہ) :

اس رسالے کا دعویٰ تھا کہ یہ نئی نکتے رجحانات اور صحت مند ادب کا ترجمان ہے۔ اس کے مرتب ختمزاد اسلم بی۔ اے تھے، حالانکہ اس پرائیڈٹر، پرنٹر، پبلشر کی حیثیت جمال الدین برقی کا نام چھپتا تھا۔ شروع میں قیمت فی پرچہ تین آنے تھی جو بعد ازاں دو آنے ہو گئی۔ اسی طرح زمر سالانہ بھی دو روپے سے گھٹا کر ڈیڑھ روپیہ کر دیا گیا تھا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۴ء میں جاری ہوا؛ یہ ادبی رسالہ اس میں تنقیدی مضامین کے علاوہ مقبول شعرا کی غزلیں بھی شامل رہیں۔ اس میں دلچسپ افسانے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ مارچ ۱۹۵۶ء کے شمارے سے شہزاد اسلم اپنی ذاتی مصروفیات کی بنا پر راہی سے علیحدہ ہو گئے۔ اب ثاقب انجان نے ان کی جگہ سنبھالی۔ بالآخر شمارے شمارے نکلنے بعد یہ مئی ۱۹۵۶ء میں معاشی پریشانیوں کا شکار ہو گیا۔ راہی میں حصہ لینے والے مشہور مضمون نگار یہ ہیں :

ناطق گلخانوی، شارق ایرایانی، معراج لکھنوی، نور لکھنوی، شفا گوایاری، ضیاء سرور بھوپالی، ستونت کوریڈی، قادر نیازی، فیض انصاری، شاکر ادنیٰ آبادی۔
۲۴۔ شفق (ماہنامہ) :

اس رسالے کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر مجید تیزی صواب تھے۔ اس رسالے کا مقصد درمیانے درجے کا تھا۔ ایک پرچہ میں بیس سے چوبیس صفحات تک ہوتے تھے۔ سالانہ صرف دو روپے تھا۔ دراصل یہ پرچہ چند با ذوق نوجوانوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

ستمبر ۱۹۵۵ء میں جاری ہوا تھا۔ ادبی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ اس میں نظمیں، غزلیں، قطعات اور فلسفے شائع ہوتے تھے۔ اس میں مضمون نگار بھی زیادہ تر مقامی حضرات ہی تھے۔

۲۵۔ خیال (ماہنامہ) :

یہ وسط ہند کا بہترین ماہنامہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر پرنسپل پبلشر سب کھنڈن انصاری مرحوم تھے۔ فیض کا ابھی پانچ سال شب جمعہ ۷ مئی ۱۹۷۱ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ ۱۹۶۳ء سے انجمن ترقی اردو علاقہ دور بھکے جنرل سکرٹری تھے۔ ناگپور کی صحافت کی ترقی میں ان کی خدمات بھولنے کی نہیں۔ وہ ہمیشہ اردو کی حفاظت اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ آل انڈیا اردو کانفرنس ناگپور (جنوری ۱۹۷۳ء) انہیں کی کو خلیا کا نتیجہ تھی جس میں ملک کے مشاہیر نے شرکت کی تھی۔ ان کی غیر مطبوعہ کتاب مسی پی کی موتی اپنے موضوع پر واحد تصنیف ہے۔ اس کتاب میں صوبہ متوسط اور برار کے شعراء کرام (قدیم و جدید) کا تذکرہ مع تصاویر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وسط ہند میں اردو کی عہد بہد ترقی کا تاریخی جائزہ بھی شامل ہے۔

خیال اپریل ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا اور بہت ہی قلیل عرصے میں اردو کے جیڑی کے پرحوں میں شمار ہونے لگا۔ پہلے اس رسالے کے نائب مدیر یا سٹرٹیم الدین تھے۔ بعد کو عرصہ ملازمت زیر رضوی اس کے مدیر اعزازی رہے۔ رسالے کا صحافتی معیار کافی بلند تھا۔ اس میں ہندوستان کے صوبہ اول کے مصنف اور شعراء حشر لیتے تھے لیکن انہوں نے یہ پرچہ بھی معاشی پلٹ اینڈ کی بحیثیت چڑھ گیا۔ آخری شمارہ دسمبر ۱۹۶۱ء کا تھا۔

خیال کے میعاد کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے چند منتخب مضامین کی فہرست ملاحظہ کیجیے جو اس کی حیات مختصر میں شائع ہوئے۔

اکبر خٹوط کے آئینے میں از انصار اللہ انصاری (اپریل ۱۹۵۷ء)؛ اردو زبان کا مستقبل از قاضی عبدالغفار؛ موسیقی کی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی (ستمبر ۱۹۵۹ء)؛ مٹوان دیند و مٹواند تخلیق کوہلا کر ب از نسیم سہارنپوری (اکتوبر ۱۹۵۹ء)؛ شاہر صدیقی از عرض سعید راہ

بات سے بات از فیض انصاری (نومبر ۱۹۵۹ء)؛ دام لال اور اس کا فن از دینندہم (مارچ ۱۹۶۰ء)؛ شاہ باقر از نصیر الدین ہاشمی (اپریل ۱۹۶۰ء)؛ پہلے ادیب اور ادب از اکرام ادیب (جون/جولائی ۱۹۶۰ء)؛ ادیبوں کے مسائل از کوثر چاند پوری (نومبر ۱۹۶۰ء)؛ تاج سعید (اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۰ء)؛ منظر ہام از شہزاد منظر (نومبر ۱۹۶۰ء)؛ محسن زیدی از خواجہ مقبول احمد و ابو نواس از تمکین کاظمی (فروری/مارچ ۱۹۶۱ء)؛ میکے کا چراغ (عزیز عظیم آبادی اور ان کی رباعیات) از ڈاکٹر علی اکبر نقوی (دسمبر ۱۹۶۱ء)

اس کے علاوہ خیال میں اس عہد کے تمام شعراء کا کلام بالائزہام شائع ہوتا رہا۔
۲۶۔ تاج (ماہنامہ) :

یہ پرچہ جون ۱۹۵۹ء میں نواب غازی آف گیور دھا اسٹیٹ کی سرپرستی میں جاری، لیکن افسوس کہ چار شماروں کے بعد ہی بند ہو گیا۔ اس کے ایڈیٹر ظہیر القریشی تھے۔ میں تنقیدی مضامین اور شعری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر شفا گویا، محو مدنی، لکھنوی، فراق گودکھیری اور مولانا ناطق گلاؤٹھوی جیسے مشہور شاعروں کا اس رسالے میں شائع ہوا ہے۔

۲۷۔ ذہن جدید (ماہنامہ) :

ادارہ بزم اردو ناگپور کی جانب سے ایک قلمی مجلہ "پیام نو" کے نام سے نکلتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں کارکنان بزم نے اسی کو "ذہن جدید" کا نام دے کر ماہنامے کی شکل میں نکالنے کی کوشش کی۔ مگر افسوس کہ یہی ایک شمارہ اول و آخر ثابت ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مصباح الحسن تھے۔ رسالے کی قیمت ۷۵ پیسے تھی۔

۲۸۔ مدنی تجلیات (ماہنامہ) :

ریاست مہاراشٹر کا واحد مذہبی رسالہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر غلام محمد خان تھے۔ ابتدا میں قیمت فی پرچہ ۵۵ پیسے تھی، بعد ازاں ۶۰ پیسے ہو گئی۔ سالانہ چندہ ۷ روپے پچیس پیسے تھا۔ پیچھے کی ظاہری شکل و صورت بھی اسی تھی۔ طباعت و کتابت

ناگپور کے اہلِ دہائی

اھاس میں کا قدمہ سفید استعمال ہوتا تھا۔ یہ پرچہ جنوری ۱۹۶۶ء میں نکلا تھا۔ دو سال کے اندر ہی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس میں علمائے اہل سنت کے مضامین کے ساتھ نعت، سلام اور منقبت وغیرہ بھی شائع ہوتی تھیں۔

۲۹۔ تاج (ہفتہ وار) :

جناب ظہیر افروز کی ایڈٹری میں اس پرچے کا پہلا شمارہ ۳ جولائی ۱۹۶۶ء کو شائع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ پرچہ آج تک جاری ہے۔ اس میں شب و روز کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ مقامی اور غیر مقامی شعراء کا کلام بھی اس پرچے میں چھپتا ہے۔

۳۰۔ اُمنگ (پندرہ روزہ) :

اس پرچے کے ایڈٹرز، پرنٹرز، پبلشر شمیم فیضی اور مدیر معاون مقتول داری ہیں۔ یہ دو برس یعنی یکم مارچ ۱۹۷۰ء سے جاری ہے۔ اس میں زیادہ تر سہاسی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ عوام کا دیاک ترجمان ہے۔

ان اخبارات و رسائل کے علاوہ طلباء میں ادبی ذوق پیدا کرنے کو یہاں کے اُردو مدارس اور کالجوں سے بھی سالانہ اردو رسائل نکلتے رہے ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں :

- ۱۔ مرتبہ انجمن : انجمن ٹیچرز ہائر سیکنڈری اسکول، ناگپور
- ۲۔ تہذیب الکلام : مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول، ناگپور
- ۳۔ گستانِ ربانی : ربانی ہائر سیکنڈری اسکول، کامٹی
- ۴۔ نورائے سبحانیہ : سبحانیہ ہائی اسکول، ناگپور
- ۵۔ نقوشِ قدسائی : قدسائی ہائی اسکول، ناگپور

۶۔ رائنس کالج میگزین، ناگپور

۷۔ ناگپور مہادویالیہ میگزین، ناگپور

۸۔ ایس۔ ایف۔ ایس۔ کالج میگزین، ناگپور

ناگہان کے خبر دہائی

ہم نے یہاں حتی الوسع ناگہان کے تمام اردو رسائل و جرائد کا تذکرہ پیش کیا ہے اس بات سے آج تک یہاں سے جتنے پرچے نکلے ہیں انہیں حاصل کر کے ان کے بارے میں صحیح مکمل معلومات دینے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اخبار یا رسالہ نادانہ شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔

فراہمی مواد کے دوران میں بعض اصحاب سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں یہاں سے مندرجہ ذیل پرچے بھی ضائع ہوئے۔

۱۔ پیام کو (ہندو رسدہ) - منشی واعدلی کی ایڈٹری میں یہ پرچہ ۱۸۹۹ء میں جا ہوا۔ اس میں چار کالم ہوتے تھے۔ اس میں مذہبی، اخلاقی اور سیاسی خبریں ہوتی تھیں ایڈیٹر منشی واعدلی خود کاتب بھی تھے اور ان کا ذاتی پریس تھا۔ یہ ایک سال بعد ہی ہو گیا۔

۲۔ تجلی عرفان (ہفتہ وار) - مولوی کرم اللہ اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ پرچہ ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں مذہبی معلومات زیادہ ہوتی تھیں۔

۳۔ خلافت (ہندو رسدہ) - یہ سیاسی اخبار تھا۔ ۱۹۰۶ء میں نکلا۔ اس کے ایڈیٹر اکرام صاحب پہلے تحریک خلافت کے کارکن تھے، بعد کو مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے۔ یہ اخبار بمبائل سے چھپ کر آتا تھا۔ بعد کو اس کا نام بھی تبدیل ہو گیا تھا۔

چونکہ یہ تینوں پرچے ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ اس لیے ہم ان سے متعلق مزید مطالعہ مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔

نقد و نظر

”ادب، فکر اور سماج“ راجندر ناتھ شیدا کے تنقیدی مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل دس مقالے شامل ہیں:

ادب، فکر اور سماج (تمہیدی)؛ میراٹیس اور ان کا فنی؛ اردو کی ایک شاعری؛ اردو کی رزمیہ نظموں پر ایک نظر؛ پارسی اور تھمپٹر پر ایک طائرانہ نظر؛ جگر مراد آبادی؛ اردو تنقید کی نئی راہیں؛ حدی رایتز ترمی خواں؛ جائسی کی پداوت پر ایک نظر؛ محروم کی نظمیں۔ شیدانے تمہیدیہ میں بعض بہت اچھی اور فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ دیکھیے:

۱. ”ادب کے تاج فکر کا سماج پر اثر انداز ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے نقاد کے فرائض میں ادب کی سماجی قدروں پر نظر ڈالنا بھی شامل ہے۔“

۲. چونکہ کسی قوم کا ادب اس کی تہذیبی خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور قوم کے تہذیبی معیار پر اچھے بُرے اثرات ڈالتا ہے۔ اس لیے ادب کی طہارت و صحت پر توجہ کرنا بھی اہم قومی، بلکہ انسانی فریضہ ہے۔ اس میں تنقید کا نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ ادبی تنقید بالواسطہ ہی سہی، تہذیب کے ارتقاء کی ایک بڑی محرک ہوتی ہے۔“

۳. ”نقاد کا سب سے پہلا فرض زیر نظر ادب کا عمیق نظر ہے، اور جہاں تک ممکن ہو، خالی الذہن

”ادب، فکر اور سماج“ از راجندر ناتھ شیدا؛ ص ۲۲۳؛ طباعت، کتابت عمدہ؛

قیمت ۱۲ روپے؛ ایٹیا پبلشرز، دہلی

تقدیر و نظر

جگر مراد آبادی سے متعلق دو مقالے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جگر کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور اردو کی غریب شاعری میں اس کا مقام متعین کیا جائے جگر کو بھی ایک الزام و تعریف کا شمار ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے جرأت (اور مومن) کے سلسلے کا چوہا پائی کا شاعر کہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اسے دورِ حاضر کے بہترین غزل گو شعرا میں شمار کرتے ہیں۔

در اصل جگر کی شاعری کے دو دور ہیں۔ پہلے دور میں مائخول نے حسن و عشق کی داستان بیان کی ہے۔ رشید ا صاحب نے نزدیک یہی ان کی پندرہ شاعری کا رنگ ہے۔ وہ لکھتے ہیں: مختصر یہ کہ جگر کی غزلیں ہمارے روزانہ کے معاملات، حسن و عشق سے بہت قریب کا تعلق رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے ملک کے ہر طبقہ میں مقبول ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اس فقرے کی عمومیت محلِ نظر ہے۔ اس میں مان کے بعد کے کلام کے فکری عنصر کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کا جو کلام آتش گل میں محفوظ ہے، اس کی گہرائی اور فکری گیرائی سے انکار کرنا نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ جہاں ہم ان کا قدیم کلام پڑھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، وہیں اس آخری زمانے کے کلام کا بھی کما حقہ مقام متعین کریں۔

پرداد سے متعلق مضمون اپنے اختصار کے باوجود کامیاب ہے۔ اس میں مختصر پرداد کا تعارف ہے اور اس کے تراجم کی فہرست، اس کا آخری پر ابھی جہاں کچھ اور تراجم کا ذکر ہے۔ پہلی فہرست میں شامل کر دینا چاہیے تھا۔

بحیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ مقالہ نگار کی تحریر میں متانت اور سنجیدگی ہے ان کا دلوں کی بات کہہ دینے کا انداز قابلِ ستائش ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے سے قاری کے ادنیٰ ذوق کی شکلیں ہوتی ہیں، اور اس کی پردہ نش بھی ہوتی ہے۔ ان مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ شیدا صاحب نے ادب کو اپنا اول صناعہ سمجھنا بنالیا ہے۔ یہ بات دوسرے نقادوں کے لیے بھی قابلِ تقلید ہونا چاہیے۔

وقیات

یوسف ظفر، محمد یوسف

یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کو کوہ مری (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ غلام رسول کامیاب تاجر تھے اور ان کا عائدہ شہر میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ گویا ظفر صاحب کو شاعری دلانے میں ملی۔

یہ ابھی زیر تعلیم تھے کہ طویل علالت کے بعد ۱۹۲۹ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ مزید المیہ یہ ہوا کہ ظفر سے بڑی ایک جھیش تھیں، وہ والد کی وفات کے وقت پاس کھڑی تھیں۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں؛ ان کی لاش دیکھ کر ان کے دل کی حرکت بھی بند ہو گئی۔ یوں گھر سے بیک وقت دور و جنازے نکلے۔

ظفر صاحب اس وقت ساتویں درجے میں زیر تعلیم تھے۔ پندرہ برس کی عمر اور دو ایسے شدید صدمے، غریب کی دنیا تاریک ہو گئی۔ شدید جذبات نے شعر کی صورت اختیار کر لی۔ انھوں نے اپنی پہلی نظم اسی موقع پر لکھی، جو گویا مرثیہ تھی۔

۱۹۳۱ء میں بی اے پاس کیا اور اگلے برس ۱۹۳۲ء میں تلاش روز گار میں دلی پہنچے۔ اسی زمانے میں جوش ملیح آبادی نے چٹوڑ بلوڈنگ سرپرستی میں ماہنامہ کلیم جاری کیا تھا۔ ظفر کی ان سے

لغات ہو گئی۔ یہ بہت پریشان حال تھے۔ پوری کوشش کے باوجود انھیں کہیں کوئی کام نہیں ملا تھا۔ انھوں نے بیرونگاری کے کام میں دیواروں پر اشتہار چسپاں کرنے کا کام کیا تھا اور اس کی ابرو سے پیٹ بھرنے کو روٹی کھائی تھی۔ جوش نے انھیں کلیم کی مینجری کی پیشکش کی۔ لیکن یہاں فہم نہ سکی۔ چند ماہ بعد وہ مستعفی ہو کر لاہور واپس چلے گئے۔ یہاں انھوں نے محکمہ انہار میں کلر کی اختیار کر لی اس دفتر میں وہ پانچ برس رہے۔ ۱۹۴۲ء میں میاں بشیر احمد (مدیر ہائیوں) نے انھیں اپنے یہاں بلا لیا۔ یہ زمانہ ان کا سب سے اطمینان اور فن کے پہلو سے کامیاب گذرا۔ لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کا علم ہوا اور انھیں شاعر کی حیثیت سے شہرت بھی ملی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی اور وہ اس میں منسلک ہو کر راولپنڈی چلے گئے۔ ۷ مارچ ۱۹۷۲ء بوقت شب راولپنڈی ہی میں انتقال ہوا۔

ظفر بے حد حساس طبیعت کے انسان تھے۔ اگرچہ وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن والد کی طویل بیماری نے نہ صرف ان کا کاروبار تباہ کر دیا، بلکہ علاج معالجے کے اخراجات بھی ختم کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد ماں اپنی ادھر باری کی ذمہ داری ان کے کمزور کندھوں پر اٹھائی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مرنی ویاس کا عنصر بہت نمایاں ہے۔

شروع میں غزل کہتے تھے کلیم سے تعلق کے زمانے میں جوش کے زیر اثر نظم کہنے لگے۔ لاہور گئے تو احسان دانش اور میراجی کی معیت میں یہ رنگ پختہ ہو گیا۔ آخری دو ایک سال میں پھر غزل کی طرف مائل ہو گئے تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کے جوہر غزل کی بجائے نظم میں زیادہ کھلتے تھے۔ اس میں ان پر اختر شیرانی اور فیض کا کافی اثر تھا۔ اور کچھ زمانے سے اب فطرت پر بھی خصوصی توجہ تھی۔

وہ بزرگوں کو نہیں کہے جاسکتے لیکن جید و مدبر و فروغ دہنے۔ نڈان اور ذہر خندہ و مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

باقی صدیقی، محمد افضل

راولپنڈی (پاکستان) سے کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک مختصر سا قصبہ بہرام ہے، وہیں ۱۰ دسمبر

وفیات

کو پیدا ہوئے۔ اگرچہ یہ خاندان قریشی تھا لیکن باقی نے صدیقی نسبت کو ترجیح دی۔ ابھی اسکول میں زیر تعلیم تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اسی باعث تعلیم دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کم عمری میں تلاشِ روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا؛ اور کہاں کہاں کچھ کنوئیں نہیں جھانکے! پانچ سال دیہاتی مدارس میں بچوں کو پڑھاتے رہے۔ جب بالکل ماہر آگئے، تو قسمت آزمائی کو بھی پہنچے کہ شاید غلام میں کچھ کام ملے۔ عین برس یہاں رہے۔ دو ایک جگہ کام کیا، لیکن کوئی مستقل صورت نہ نکلی۔ اتنے میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی، تو فوج میں حوالدار کلک بھرتی ہو گئے۔ دو سال بعد جنگ ختم ہوئی، تو اب بعض اور فوجی محکموں میں ملازمت مل گئی۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں والدہ کی وفات نے یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا؛ وہ استعفیٰ دے کر گھر آ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ادبی محاذ پر کوشش شروع کی۔ شروع میں چندے راولپنڈی کے ہفتہ وار ”راہ و منزل“ میں ملازم رہے۔ سال بھر بعد ۱۹۵۱ء میں ریڈیو میں جگہ مل گئی۔ یہاں دو سال کام کیا تھا کہ تخفیف میں الگ ہونا پڑا۔

آغازِ شعر گوئی میں چندے سید عبدالحمید مدد سے اصلاح لی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ استاد کے لالہ الیاد پن کے باعث یہ سلسلہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں؛ (۱) جام جم۔ یہ گوشہء ادب، لاہور نے شائع کیا تھا؛ اس میں نظموں کا انتخاب ہے۔ (۲) دار و رسن۔ یہ قومی کتاب خانہ، راولپنڈی کے اہتمام سے چھپا۔ اس میں نظم و غزل دونوں اصناف کا کلام ہے۔

مارچ ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی میں رحلت کی۔

اشیم خیر آبادی، سید امیر احمد

شاعرین میں سید محمد مسکری ترمذی و سیم خیر آبادی کا نام ایسا غیر معروف نہیں کہ کسی تعارف کا محتاج ہو۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید حسین اصغر غلط امام چہارم زین العابدین حجاز سے ملتا ہے۔ سید حسین اصغر کے خاندان کے ایک صاحب سید علی مدینہ سے ہجرت کر کے ترمذ (اوزبکستان) میں جا بھرتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ ان کی اولاد میں سید احمد نام کا

کام امیر ناصر الدین بیکتگین کی سامبرادی شاہزادی گوہر تاج دینی سلطان محمود غزنوی کی ملا ہمیشہ سے ہوا تھا۔ امیر بیکتگین کی وفات (ف ۶۹۹) کے بعد تیدا احمد لہا اپنے خاندان ادا عزہ و اقارب کے ساتھ ہندستان چلا گئے اور پنجاب میں مقیم ہو گئے۔ یہاں اقبالیہ کے لیے خاندانی کام سادات ترمذ مشہور ہو گیا۔ تلوں بعد تیدا احمد زائد کے وڈا میں تیدا مہر علی شاہ قلند پنجاب سے نکلے اور خیرآباد (ضلع سیتا پور، یوپی) میں بس گئے۔ انھیں کیلا وادی میں وسیم کے والد سید محمد مہدی تھے یہ شعر بھی کہتے تھے؛ ہمگین تخلص تھا۔

وسیم ۱۸۷۷ء کی مشہور فوجی شورش سے پہلے پیدا ہوئے؛ بچیک سال معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ خہر کہا کرتے تھے کہ اس بچکے کے وقت میں سن شعور کو پہنچ چکا تھا۔ وسیم نے شہر گونی وڈے میں پائی تھی۔ انھوں نے کلام پر اصلاح امیر مینائی (ف اکتوبر ۱۹۰۰ء) سے لی۔ وہ مدقول تار کے ساتھ رامپور میں رہے۔ امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں وہ امیر کے دست راست تھے استاد کو ان کی زبانی اور فنی مہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اکثر اپنے مبتدی شاگردوں کو ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ امیر اللغات کے ملا وہ نو اللغات کی ترتیب میں بھی ان کا حصہ کچھ کم وقیع نہیں تھا۔

وسیم تسلیم کی تکمیل کے بعد اولاً انگریزی حکومت کی ملازمت میں داخل ہوئے لیکن جلد ہی اس سے مستعفی ہو کر ٹوکل علی اللہ خاندان میں ہو گئے۔ جب ۱۸۹۰ء میں جونپور کے رئیس راجہ بری ہریت سنگھ دو بے رنگین ان کے شاگرد ہوئے، تو انھوں نے اصرار کر کے انھیں اپنے پاس بلایا اور اپنی زندگی بھر اپنے سے جدا نہیں کیا۔ جونپور کے دورانی قیام میں انھوں نے یہاں سے ۱۸۹۲ء میں گلدرستہ گلچین ہماری کیا تھا۔ یہ پرچہ بعد کو خیرآباد اور لکھنؤ سے شائع ہوتا رہا، پھر بند ہو گیا۔ ایک زمانہ بعد انھوں نے اسے جنوری ۱۹۱۷ء میں سیتا پور سے شائع کرنا شروع کیا تھا، ادب اس میں نظم کے ساتھ نثری مضامین کا اضافہ کر دیا۔

جب ۱۸۸۱ء میں مولوی سبھاں اللہ خانی رئیس گورکھپور کے بلکے ہوئے میاں خیرآباد گورکھپور گئے، تو موصوف کے ایما پر میاں نے وسیم کو بھی وہاں بلایا۔ وسیم رفتے میں میاں نے

وفیات

ہینوٹی تھے۔ وسیم یہاں مولوی سمان اللہ خان کے کتابخانے کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ یہ قیمتی کتابخانہ مولوی سمان اللہ خان کی وفات کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دے دیا گیا تھا اور آج کل آزاد لائبریری کا ایک حصہ ہے۔ اسی زمانے میں وسیم کے ایک اور شاگرد نے تحفہ خوشتر کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا؛ وسیم اس کی تربیت میں بھی شریک ہے۔ بالآخر ۱۹۲۸ء میں خاک خیر آباد کی کشش نے وسیم کو وطن بلالیا۔ یہ سفر آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا کئی مہینے کی علالت کے بعد ۷ مارچ ۱۹۲۹ء (۲۳ رمضان ۱۳۴۷ء) کو راجپورے عالم جاودانی ہوئے۔ اپنی قیامگاہ محلہ شیخ سراے کے مقفل کی مسجد مسکری میاں کے صحن میں سپرد خاک ہوئے۔ یہ مسجد بھی خود انھیں کے نام سے شہود ہے، اگرچہ اسے ان کے جدامجد نے تعمیر کرایا تھا۔

سید امیر محمد اشیم انھیں وسیم کے خلع اکبر تھے؛ یہ جنوری ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان سے بڑی ایک بہن وارث فاطمہ تھیں اور چھوٹے ایک بھائی سید غلیل احمد۔ یہ دونوں بھی شہر کہتے تھے۔ وارث فاطمہ کا تخلص منور تھا اور غلیل احمد کا اشیم۔ افسوس کہ اشیم نے مین عنقوانی شباب میں ۲ نومبر ۱۹۵۲ء (۱۳ صفر ۱۳۷۲ء) کو انتقال کیا۔ اشیم نے بھائی کی تاریخ وفات کہی: اس لمحہ میں بسے اشیم بہشت (۱۳۷۲ء)۔ اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں محو خواب ابدی ہیں۔ ولادت فاطمہ کا سنہ ۱۲۷۱ء میں مقدّم ہوا تھا۔ وہیں ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کو لاؤ لڈ فوت ہوئیں۔

اشیم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ جب استعداد قابل لحاظ ہو گئی تو مدرسہ نیاز، تیرہار میں بھیج دیے گئے۔ یہاں فقہان کا دل پسند موضوع تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد منبعیہ الطبہ کالج، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ دو سال تک یہاں تحصیل کی تھی کہ یہاں ایک حادثہ ایسا پیش آیا جس سے اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شاید وہ طب کی تکمیل نہ کر سکیں۔ ہوا یہ کہ ان کے والد وسیم صاحب کسی کام سے راجہ صاحب محمود آباد کی ملاقات کو لکھنؤ آئے، تو ان کے دیکھنے کو منبعیہ الطبہ کالج پہنچے۔ وہاں گفتگو میں کسی مناسبت سے انھوں نے بیٹے کے کسی شعر کے معنی پوچھے۔ برقمستی سے یہ تسلی بخش جواب زدے سکے۔ اس پر وسیم بھرپور گئے؛ بہت برہم ہوئے۔

وفیات

فرمایا کہ یہاں تم ترقی معکوس کر رہے ہو۔ یہ کہا اور انھیں کالج سے الگ کر کے اپنے پاس واپس خیر آباد لے گئے۔ چندے بعد لوگوں کے بیچ بچاؤ سے انھوں نے انیم کو معاف کر دیا اور واپس لکھنؤ چلے گئے۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء میں طب کی تعلیم مکمل کی اور درجہ اول پاس ہوئے۔ پھر اگرچہ انھوں نے خیر آباد میں یونانی دوا خانہ کے نام سے اپنا مطب قائم کیا لیکن خود نسخہ بہت کم لکھتے تھے؛ زیادہ تر مشہور مقامی حکیم انوار حسین صاحب کے ان کے پاس آتے تھے، جس سے اچھا خاصا کام چلتا رہا۔ بعد کو یہ مطب بھی بند ہو گیا۔ جب وسیم نواب سبحان اللہ خان کے بلاوے پر گورکھ پور گئے، تو انیم بھی والدہ ساتھ تھے۔ اس زمانے میں یہاں ریاض اور وسیم کے قیام کے باعث گورکھ پور گویا شعرو کا مرکز بن گیا۔ انیم بھی وہاں کسی مقامی کالج یا اسکول میں اردو اور فارسی کے مدرس ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں وہ گلچین اور تحفہ خوشتر کے بھی معاون مدیر رہے۔ جب زمانے نے گورکھ پور کی باطل الٹی، تو انیم اولاً صوبہ بہار گئے۔ جب وہاں قدم نہ جم سکے حیدرآباد دکن کی راہ لی۔ ایک زمانہ بعد ۱۹۴۹ء میں وطن واپسی ہوئی۔ ۱۹۵۰-۱۹۵۱ء سال تک وہ مدرسہ نیازیہ، خیر آباد میں فارسی کے مدرس رہے۔ پھر جولائی ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک مدرسہ اشاعت العلوم، خیر آباد میں بھی سہ شغل رہا۔ خیر آباد سے اس زمانے جمال الدین اسیر انصاری کی ادارت میں ایک رسالہ کاروان شائع ہوتا تھا۔ انیم بھی اس کے تحریر میں شامل ہو گئے۔ جب کاروان نے دم توڑ دیا، تو یہ کانپور پہنچے اور وہاں مدرسہ میں مدسی کر لی۔ دو سال بعد ۱۹۶۲ء میں وہیں کے ایک اور مدرسے احسن المدارس میں قیام ہو گئے۔ کانپور سے ایک رسالہ جھلک نکلتا تھا۔ مدسی کے ساتھ یہ اس کی ایڈیٹری فرارکن بھی سرانجام کرتے رہے۔ مدتوں اس رسالے کی پیشانی پر انیم کا یہ شعر چھپتا رہا تھا

جھلک دکھا کے محبت سکھائی جاتی ہے
یہ آگ خود نہیں لگتی، لگائی جاتی ہے

آخری زمانے میں قیام بیشتر کانپور ہی میں رہا۔ اگرچہ خیر آباد کی ادبی سرگرمیوں میں بھی لیتے رہتے تھے۔ مثلاً ۱۹۵۷ء میں خیر آباد میں ایک انجمن ادب قائم ہوئی، تو وہ اس

وفیات

صدر بنائے گئے تھے۔ یہ انجن زیادہ دن نہ چل سکی اور سال بھر بعد ختم ہو گئی۔
۱۳۹۰ء میں رمضان کی چھٹیاں گزارنے کو وطن آئے۔ یہاں احباب اور بچوں کے اصرار پر کانپور کی واپسی ملتوی کر دی۔ اتنے میں بیمار ہو گئے۔ خدا خدا کر کے مہینوں بعد بخار نے پیچھا چھوڑا، تو اب اسہال کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ عمر در اس پر اس موزی مرض کا حملہ، کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ چند دن میں سوکھ کر کاٹا ہو گئے۔ علاج معالجے کے باوجود حالات بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ۱۰ مئی ۱۹۷۲ء قبل دوپہر سو گیا رہ نیچے کے قریب جان بحق ہو گئے۔ آخری الفاظ تھے: "اول اللہ، آخر اللہ۔" نماز جنازہ درگاہ مخدوم شیخ سعد میں ان کے دوست سید نجم الحسن رضوی نے پڑھائی اور بعد مغرب انھیں اپنے والد وسیم کے قریب مسجد عسکری میاں کماٹے میں دفن کر دیا گیا۔ مولوی نثار احمد فاروقی عارف خیر آبادی کے قطعہ تاریخ وفات کا آخری شعر ہے:

برلوح مرقد، عارف! ایں سالِ وفاتش کن رقم
”روح ادب، کانی صفا، سید امیر احمد انیم“
(۱۳۹۳ھ)

اولاد جسمانی میں دولڑکے (یقین احمد عرف انس میاں اور مشیر احمد) ان سے یادگار ہیں۔

انھوں نے کلام پر اصلاح اپنے والد وسیم مرحوم سے لی تھی، اور خود درجہ استاد ی ماحصل کر لیا۔ س دود کے اکثر رسائل و جرائد میں ان کا کلام ملتا ہے۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی بہت لکھا اور ان میں بھی کسی سے پیٹے نہیں تھے۔ خوشنویس بھی اچھے تھے۔ تلامذہ کی بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ افسوس کہ مجموعہ کلام خیر مطبوعہ نہ گیا۔ تمام اصنافِ سخن میں وافر کلام ان کے رزق کے پاس موجود ہے۔

یہ خیر منظر نگری، محمد عبید اللہ صدیقی

کی ولادت ۱۹۱۳ء کو ضلع مظفر نگر کے قریب ایک قریہ حسین پور میں سیڑھ میں ہوئی

وفیات

اصل میں لفظ بسیرا ہوگا، جو مریدانہ سے دیہاتیوں کے بگاڑ و کرب و بے بنیادیاں ان کے والد جناب محمد عرف (۱۹۵۵ء) مدنی پیشہ تھے؛ وہ ساری عمر مختلف مقامات پر صدر مدرس رہے۔ علیم صاحب نے ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول مظفرنگر سے دسویں درجہ کی سند حاصل کی۔ آگے تا ۱۹۴۶ء میں باری رکھنے کے وسائل مفقود تھے، اس لیے تلاش معاش کی فکر ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں ایک مقامی زمیندار کے یہاں کارندے مقرر ہو گئے۔ تین سال بعد ۱۹۴۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، تو فوجیوں کی ضروریات مہیا کرنے کی خاطر حکومت نے کھل بانی کے کارخانے قائم کر دیے۔ یہ کام بہت وسیع پیمانے پر ہوتا تھا۔ منڈی ساولن کی خرید سے لے کر کھل کے منبنے تک کا سارا کام سرکاری ملازموں کے ذمے تھا۔ علیم صاحب اس تحکمے میں پچیس روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ اس سلسلے میں وہ مظفرنگر، نرپڑا، امر وہہ، جالٹھ، کیرانہ وغیرہ مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔ افسران مجازان کے کام سے مطمئن تھے اور یہ خود بھی سکھاتے تھے کہ اب ستر روپیہ مشاہرہ ملتا تھا۔ لیکن اواخر ۱۹۴۱ء میں بہتر ملازمت مل جانے کی وجہ سے یہ نوکری چھوڑ کر جنرل اسٹور کا پور چلے گئے۔ یہاں سے کٹنی تبادلہ ہوا اور وہاں سے ناگپور جانا پڑا۔ ناگپور میں تھے کہ یرقان کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر سولہ مہینے کی طویل رخصت ملتی لینا پڑی جس کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا۔ ۱۹۴۶ء میں تندرست ہونے کے بعد وہ دلی آئے، تاکہ یہاں کنٹرولر جنرل کے دفتر سے دوبارہ ملازمت کا حکمانہ حاصل کر سکیں مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بسر اوقات کے لیے دلی کے قیام کے زمانے میں یہاں کے مختلف رسائل میں صفائے حق و احق کا وقت کام کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۴۸ء میں مستقل طور پر اہنامہ شمع کے دفاتر میں ملازم ہو گئے۔ اس ادارے کے دونوں پرچوں شمع اور شبستان کی تقسیم و شانت اور دفتر سے متعلق قانونی کام کا ج انھیں کے ذمے تھا۔

پار سال (۱۹۷۱ء) میں ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسپتال میں چند ہفتے نہ گھر آ گئے، کہنے لگے یونہی ڈاکٹروں نے ڈرایا اور ہلکا کیا، محض فشار دم کا عارضہ ہے۔ لیکن یہ محض نفس کا دھوکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے احتیاط سے ہو گئے۔ دوسرا حملہ بھی لپانک ہوا اور

وفیات

سہی جان لیوا ثابت ہوا۔

جمعہ کے دن ۲۱ اپریل صبح حسب معمول دفتر گئے۔ بچا یک سینے میں درد کی شکایت کی۔ ہمدرد رنگ ہوم دفتر کے پڑوس میں ہے۔ وہاں پہنچا گیا۔ بیوی بچے بھی پہنچ گئے! ان سے بات چیت کرنے لگے۔ معاملے کی نزاکت کا کسی نے احساس ہی نہ کیا۔ باتیں کرتے دوپہر کے قریب روح نفس منبری سے پرواز کر گئی۔ اللہ وانا الیہ راجعون۔ اسی شام درگاہ باقی اللہ میں تدفین عمل میں آئی۔

اولاد میں چار لڑکے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے عظیم اختر حکومت خندک کے محکمہ اطلاعات میں ملازم ہیں، چھوٹے تینوں ابھی زیر تعلیم ہیں۔
شعبہ انجمن تلمذ المظفر نگری (ف مئی ۱۹۶۹ء) سے تھما، اگرچہ زیادہ تر استفادہ سیاب اکبر آبادی مرحوم سے کیا۔ کلام کا مجموعہ ”کھت گل“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے (دلی ۱۹۵۷ء)۔ اس پر یوپی حکومت نے انعام بھی دیا تھا۔ ایک مختصر سا مجموعہ قطعات (مصور) بچوں کے لیے ”پھول پتے“ کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں خود شائع کیا تھا، جس میں سہل اور سادہ زبان میں سبق آموز قطعات شامل ہیں ایک مجموعہ ”منعت النواہرم“، بچوں کے لیے دوسرا مجموعہ منظم گل بوٹے“ اور ”بوسے جمال“ (دیوان غزلیات) مرتب شدہ وغیرہ چھوڑے۔

میں انھیں پچھلے ۱۵-۱۶ برس سے جانتا تھا۔ بڑے مجلس اود بے یاد دوست تھے حال آج بھی مذہبی آدمی، اور صوم و صلوة بلکہ اوراد و وظائف تک کے پابند اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (ف ۱۹۵۷ء) سے بیعت تھے لیکن طبیعت میں عبوسیت، نہیں تھی! اس کے برعکس ان کی گفتگو میں شگفتگی اور بذلہ سنجی کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ میں نے انھیں کبھی میاوی کی حالت میں بھی نگاہیں اور گرفتہ خاطر نہیں دیکھا۔ دعا ہے کہ اسی طرح خوشی خوشی وہ اپنے خالق کے حضور بھی حاضر ہوں۔ آمین!

اعجاز صدیقی نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ وفات میں ان کی پوری سیرت بیان کر دی ہے،
اکیس اپریل، جمعہ، ظہر کا وقت طے بہ محبت کیا عدم کا سفر

کر گئی آکے خود اذانِ مرگ بے نیازِ رکوع و سجود دوسر
صرف بچاؤ و ہشت سال تھی عمر زندگی اس کی سچی مثالِ شرر
دوبل نے کچھ ایسی کروٹ لی کمر کے کچھ نہ اس کے چارہ مگر
شاعرِ نغز گو، ادیبِ شہیر مابعدِ خوش مذاق و نیک سیر
خوب ہنستا رہا، ہنساتا رہا اپنے غم کی نہ دی کسی کو خبر
دل کے ہاتھوں ہی لٹ گیا، اعجاز!
”شاعرِ دل زدہ علیم اختر“
(۱۹۷۲ء)

ظفر، سراج الدین ظفر

ظفر دراصل ان کا تخلص نہیں تھا، بلکہ جزوِ علم تھا۔ ان کا نام خاندانِ مغلیہ کے آخری تاج
سراج الدین ظفر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ جب بعد کو انھوں نے شعر کہنا شروع کیا، تو
کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو جہلم (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔
خاندانِ لکھنؤ کا ہے۔ ان کے دادا لکھنؤ کی شاخِ اسکندریہ کے شیخ تھے۔ کہا جاتا ہے
لکھنؤ قومِ ایرانی الاصل ہے۔ واللہ اعلم۔ ان کے والد محمد عبدالقادر صاحب ریل کے محکمے پر
تھے۔ ان کی والدہ مسز (زینب) عبدالقادر اردو حلقوں میں افسانہ نگار کی حیثیت سے
مشہور ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے ناول رامیہ، صدائے جرس، وادی آ
لاشوں کا شہر وغیرہ خاصے مشہور ہیں۔ والد نے کا مذاق بدل جانے کے باوجود آج
پڑھ جاتے ہیں۔ انھیں تصنیف کا شوق اپنے والد مولوی فقیر محمد (یعنی ظفر کے ابا)۔
ملا۔ مولوی صاحب موصوف دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی دینیات سے متہ
متعدد مصنفات موجود ہیں۔ کوئی پچاس برس تک وہ ایک پرچہ سراجِ الاخبار
کھالتے رہے تھے۔

ظفر نے ۱۹۳۳ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے دو سال بعد وکالت کی سند ایل۔

وفیات

حاصل کی (۱۹۳۵ء) اور اولاً وکالت ہی کا پیشہ بسا وقات کے لیے اختیار کیا۔ لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے اسے ترک کر کے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں فوج کے ہوائی شعبے میں ملازمت کر لی۔ وہ اگرچہ یہاں دس برس رہے، لیکن یہ ملازمت بھی بھاری پتھر ثابت ہوئی۔ اب سب طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے ۱۹۵۰ء میں تجارت کی طرف رخ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا لاہور اور کراچی کے مشہور ناشر کتب مولوی فیروز دین (صاحب فیروز سنز) کی صاحبزادی (البشیرہ) سے نکاح ہوا تھا۔ مولوی صاحب موصوف نے ان کی ڈانٹوں ڈول حالت دیکھ کر انھیں اپنے ادارے میں جگہ دے دی، جس سے ان کی معاشی تک و دو اور پریشانی کا دور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد خاصی کامیاب زندگی بسر کی۔

جس علمی و ادبی ماحول میں وہ پیدا ہوئے، اس میں ان کا تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہونا قدرتی امر تھا۔ وہ بہتے ابتدا میں شعر کہنے لگے تھے۔ اگرچہ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس میں کسی سے مشورہ نہیں کیا، نہ کسی سے اصلاح لی۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ شروع میں انھوں نے فروری سیلاب اکبر آبادی سے اصلاح لی۔ ممکن ہے، بعد کو چھوڑ دیا ہو۔ شعر کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ افسانوں کا مجموعہ ”آئینہ“ کے عنوان سے چھپ چکا ہے (۱۹۳۲ء)۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ ”زمزم حیات“ (۱۹۳۶ء) میں شائع ہوا اور دوسرا ”غزال غزل“ فیروز سنز کی طرف سے مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے کسی زمانے میں بچوں کی دس کتابیں بھی خاصی تعداد میں لکھی تھیں۔ سنا ہے کہ وہ انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے، اگرچہ یہ میری نظر سے نہیں گزرے۔

۶ مئی ۱۹۷۲ء ہفتے کے دن کراچی میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کیا۔ جہانی اولاد میں ایک صاحبزادہ (طارق ظفر) اور ایک صاحبزادی (ناہیدہ) ان سے یادگار ہیں۔

سماج وادی جمہوریت ہی

صحیح معنوں میں جمہوریت ہے۔

قوم کا ہر طبقہ معضیہ اپنے ہر امکان مفادات کے لئے ہی نہیں بلکہ سبھی کی
فلاح و بہبود کے لئے کام کرتا ہے۔ یہ قدیمہ ایسے حالات پیدا
کر سکتا ہے جہاں میں بنی نوع انسان کی تمام قوتیں اس کی مزید
ترقی کے لئے سہمہ دے سہارا لائی جاسکتی ہیں۔

— سری ارونند



© 1964

بھارت کے دفاع و ترقی میں شرکت کیجئے

ساتھ ہی
7 1/4 %
منود کا سچے

و سٹاک مریٹ کے لئے

3 سالہ کٹ 7 % ، 1 سالہ کٹ 6 %

ان کے لئے یہ اس طرح کی تالیفیں پیش کی گئیں و
چند لاکھ روپے 1000 روپے تک کی رقمیں

خاص کر ان کے لئے جو پانچ لاکھ روپے تک کی رقمیں
پیش کی گئیں ان کے لئے یہ رقمیں پیش کی گئیں

1947-48

۱۹۷۲

شماره: ۴

جلد ۶

جوش ملیانی

شخصیت اور فن

مترجم،
مالک رام



جوش ماسیانی
۱۹۷۱ء



جوش ماسیانی

۱۹۳۶ء

جوش ملیانی

شخصیت

اور
فن



ابوالفصاحت جوش ملیانی

شخصیت اور شاعری

۱۔ شخصیت

حضرت ابوالفصاحت (پدم شری) چندت لمبھو رام جوش ملیانی کے شاعری کش احوال، حوصلہ سوز حالات اور حیرت انگیز کمالات کے لحاظ سے آپ کی ذاتِ بابرکات کو ایسے عجیب و غریب کرشموں میں شمار کیا جاسکتا ہے جنہیں قدرت کی فوق العادت کار فرمایاں کبھی کبھی حسیب سے شہود میں لا کر ایک عالم نیرنگ پیش نظر کرتی ہیں جس صاحبِ اجتہاد نے پنجاب کے ایک کوردیہ میں پیدا ہونے اور اب بھی تیس سال کی عمر ہو جانے تک یہاں ہی علاقے ہی میں قیام رکھنے کے باوجود فصیح الملک داغ دہلوی کی انتہائی فصیح اور دوپٹے معنی کو اپنی مسلسل جلاکاری سے اردمٹے بجائے کھلانے کا مستحق بنادیا اور شعر و سخن میں حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کے علاوہ بعض خاص انفرادی خصوصیات کی بدولت اپنے بیشتر خواجہ ماشوں مثلاً بنجود بایوئی، ریخود دہلوی، جگر شاہجہا پٹواری، جگر گولیاری، فوج ناردی، آسن مارہردی جیسے مستند اہل زبان اساتذہ کی ہمسری بلکہ ان میں سے کئی پر فوقیت حاصل کر لی اُسے بھونہ روڈ گا رکھنا بھدات، آفتاب آندلیل آفتاب "ایک ایسی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے جس میں کسی قسم کی تشکیک دخل نہیں پاسکتی۔

جن مجتہدوں کو وقتاً فوقتاً معاشرے کے مختلف النوع شعبوں کی اصلاح اور ان کے کاروباری کردار انسانی کے لیے سمجھا جاتا ہے وہ خدا کی طرف سے ان تمام غیر معمولی صفات اور خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جن کے بدلنے کا وہ اپنے بغیر انقلابی عہد آفرینی کا قوت سے فعل میں نامحسوس طرح ممکن نہیں ہوتا۔ ان کے فطری امیال و عواطف کی نفسیاتی تحلیل ان کی چند

خصیت

درجہ شعوری اور غیر شعوری تحریروں اور بیچ در بیچ عقود کی وجہ سے طغیلت ہو گیا، جوانی اور کجولت کے زمانے تک کبھی طبیعت کے ساتھ تکمیل پذیر نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ عام لوگوں کے درمیان بالکل طلوع سے تو نہیں پائے جاتے، لیکن جلیقہ اعتبارات سے بہت ہی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کا مزاج دشوار پسند ہوتا ہے۔ وہ ہر مشکل کو سہل سمجھتے ہیں ان کے کردار میں ایسی زبردست طاقت جو شرمزں رہتی ہے جو کہ ہمارے گزرنے والے زمانہ کے بعد طوفان خیز دریا کی طرح حامل راہ مضائقہ و موانع کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتی ایسے اصحاب کے فذوقی حل کا کچھ اندازہ میرے اس شعر سے ہو سکتا ہے:

کیا جانتا ہوں منزل دشوار اس کو میں

منا نہیں ہے جادو دشوار تر مجھے

قدت نے حضرت ابوالفصاحت کو اردو زبان کی اصلاح اور شعرو سخن میں تنزیہ و طہارت کا معیار بلند کرنے کا جو کام تفویض کیا تھا، اس کی انجام دہی میں انہوں نے وہ کچھ کیا جو کوئی منظم جماعت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لحاظ سے انہیں ایک ادوارہ لفظی شکل فرد کہا جاسکتا ہو۔ وہ اب بھی وہ کہن سالی کے باوجود اپنے پیش ہنر و خاطر کی تکمیل بالائے تکمیل میں مہمک رہتے ہیں اور کہوں نہ رہیں کہ ان کی تخلیق سے خالق کائنات کا مقصد اور مدعا بھی یہ تھا آپ سالہا سال سے ہندستان کے عظیم شاعر اور مصلح زبان تسلیم کیے جا چکے ہیں۔

آپ نے جنوری ۱۹۱۱ء میں اپنی ایک تازہ ترین رباعی بھی بھیجی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے اندر فکر اور اسلوب بیان میں کوئی کمی گمائی کی بجائے خوش فکری اور خوش گوئی حسب معمول بڑھ رہی ہے۔ رباعی ملاحظہ کر کے میری رائے کی تصدیق فرمائیے:

میری میں طبیعت کی جوانی کیسی!

شکر سے مہلے خون میں روانی کیسی!

امید نہ رکھ، زور بیان کی مجھ سے

طاقت ہی نہ ہو، تو پہنلوانی کیسی!

یہ رباعی ہر لحاظ سے تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔ اس کے قافیوں میں خوف واد کے

کچا... گاؤں کے بہت بڑے ہونے کے باوجود اسکول صرف پرائمری
 تک تھا۔ پانچ سال وہیں تعلیم پائی۔ جس چار پانچ آنے سے زیادہ دیکھی
 جو برداشت ہوتی رہی۔ ٹل اسکول چار میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں
 داخل ہوا۔۔۔ پیدل جانا اور پیدل آنا تھا۔ سڑک نامہوار اور بعض
 جگہ ریتلی تھی۔ جو تا بھی نصب ہو جاتا، کبھی نیگے پاؤں چلنا پڑتا تھا۔
 پڑھنے کے لیے مشعلہ کتب خرید لی جاتی تھیں، مگر یہ کفایت بھی
 گھر کے ضروری اخراجات پر باقی تھی۔۔۔ میرا لباس بہت مختصر ہوتا
 تھا۔ کھادی کے ایک کرتے، کھادی کے ایک پاجامے اور کھادی کی ایک
 چادر میں موسم سارا بسر کرتا رہا۔

جس گاؤں کے صرف ایک فی صد باشندوں نے تیسری یا چوتھی جماعت تک اردو پڑھی تھی وہاں
 حضرت ابوالفضل صاحب کا نامساعد اقتصادی حالات کے باوجود مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش
 طرح طرح کے سختیاں برداشت کرنا اور پیشانی پر بل دلاتا اس امر کا بدیہی ثبوت ہے، کہ
 قدرت آپ سے کوئی عجز و عقول کام لینا اور آپ کو علم و فضل اور شعور و سخن کے بلند ترین
 درجے پہنچانہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ بھی اپنے معمروں کی طرح زیادہ
 سے زیادہ پانچویں جماعت تک تعلیم پالینے کے بعد مقامی طور پر کسی ایسے دھندے میں لگ
 جاتے جس سے دو دو وقت کی دال دہنی بہم پہنچنے کے لائق یافت ہوتی رہتی۔

پرائمری تعلیم کے زمانے میں فارسی کی تدریس جو تھی جماعت ہی سے شروع ہو جاتی تھی۔
 ان کی طبیعت کہ اردو اور فارسی نظم سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ انھیں پانچویں جماعت
 میں گلستان کی بہت سی آیات اور محمد حسین آزاد کی بعض سالم اردو نظمیں ازبر ہو گئی تھیں۔
 تھے تو کس، لیکن اردو اور فارسی اشعار کی تہہ تک پہنچ کر ان سے لطف اندوز ہونا ان کے
 لیے ذرا بھی وقت طلب نہ تھا۔ ایک دن ٹل اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور اسٹکٹ سٹکٹ بیدی
 نے جو اردو اور فارسی لکھی پڑھاتے تھے، دودھانی تدریس میں ذوق کا شعر
 تشنگہ تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قائل کے ابلیس جو دل پر ہانک کو مارا، کو کیا مارا

فطرت

ہر کمان سے پوچھا: کیا مارا؟ تو فوراً جواب دیا: "نیر ادا مارا"۔ میری صاحب اس
اب سے ہاتھ کی غیر معمولی ذہانت اور نکتہ رسی دیکھ کر حیران رہ گئے۔

بڑے میں انھوں نے شعر گوئی شروع کر دی، حال آں کہ وہاں کے احوال میں ایک عجیب
یا شخص دھتاجو شعر کا مفہوم سمجھنے کی استعداد رکھتا ہو۔ ان کا سب سے پہلا شعر یہ تھا:

امیر وہ نہیں جس کا کہ دل فقیر نہیں

فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

یہ سلسلہ نڈل کی تعلیم ختم ہونے پر، اچھی دستی اور تنگ حالی کے باعث منقطع ہو گیا۔ ابھی
۵ سال کے لگ بھگ اٹھ کر والد کی وفات ہو گئی۔ بکر معاش نے جان پر بنادی۔ چچا
اپنی دکان پر زون تیل بیچنے کے لیے بلالیا۔ مگر چچا کا گاؤں بہت چھوٹا تھا اور وہاں علی
اکبری شوق کی بجائی اور درقرادی غیر ممکن نظر آتی تھیں، اس لیے یہ دہاں سے لمبیاں
آئے اور پچھتر سال تک سبیل معاش کی تلاش میں ادھر ادھر ٹنگ لٹے، اسے پھر بکر
پریشاد حالی میں ہی اہدیش ڈالی، شوگر کے واسے اس انھوں نے میان کو خراب آباد ہونے کی
سے چھوڑ دینے کا ہتہ کر لیا۔ اب ابھی اس گاؤں کو خراب آباد کہتے ہیں ان کی ایک غزل کا مطلع یہاں

کیا کر دے گئے جو شش ام جا کر دہاں

لمبیاں اب بھی خراب آباد ہے

بنا چاہتا ہے کہ ترتیب خراب آباد کی بھل داد دے کر آگے بڑھوں۔ خواب اور آباد
تضاد الفاظ ہیں جو جگہ خواب ہو، اس پر آباد کا؛ اور جو آباد ہو، اس پر خواب کا اطلاق
ہو سکتا۔ مگر حضرت ابو الفصاحت نے ان اعضاء کو جمع کر کے ایک نہایت عمدہ
ترکیب شاعری۔ اجتماع ضدین بحال ہوتا ہے، مگر یہاں ممکن ہو گیا۔ بحال کو ممکن کو
ماجن قبض اور جن بیان کے بغیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھے یاد ہے میں نے دس سال
پہلے خیمہ بچا ہی کی فتویٰ نیرنگ عشق پڑھی تھی اور جب اس میں شعر

ابھی اید غمت خون در حبلہ گئی

مرشد آباد چشم آباد تر گئی

خصیت

پڑھا تو ترکیب سرشک آباد دیکھ کر جھٹکے لگا تھا۔ اس غور کرتا ہوں، تو غراب آباد کو
سرشک آباد کے مقابلے میں برابری بیخ تر پاتا ہوں۔ سرشک آباد نہایت عمدہ ترکیب ہو
لیکہ اس میں وہ استعجاب انگیز ندرت کہاں، جو غراب آباد کا اجتماع نقیضین رکھتا ہے۔
خار کی نظم و نثر میں دیباذ آباد کا تو کمی جگہ دیکھی، مگر غراب آباد نظر نہیں آیا۔ غراب آباد
کا بدل ٹھیکہ اردو میں اُجاڑا ہستی ہو سکتا ہے جو نقد و امکان اس کا صحیح ترجمہ ہونے کے
باوجود غراب آباد کی ندرت سے کوئی نقیض نہیں رکھتا۔ غراب آباد سے لطف اندوز ہونا
کے لیے اعلیٰ درجے کی محنت بھی اور دقیقہ رسی شرط ہے۔
آپ کا بیان ہے!

۲۰ سال کی عمر تک ہی آشوب و غم رہا۔ اس آشفتمند حالی میں شاعری
کا جو ہر اکسائی ہوتا تو ضرور مٹ کر رہ جاتا، مگر وہ دہی اور خلاد
تھا۔ یہ وہ چراغ تھا جسے اندھوں کے رستے میں رکھ دیا گیا تھا۔
اس کا شعلہ صبر و تحمل اور اُردو گریزا نہیں۔

حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے:

شاعری کی ابتدا البینہ ایسی ہوتی ہے، جیسی شطرنج کی ابتدا ہوتی ہو
میں کی طبیعت کو شطرنج سے لگاؤ ہوتا ہے اس کو وہی چاروں میں
بادیک اور بگڑی چالیں سمجھنے لگتی ہیں اور شطرنج میں اس کو ایسا حرا
آتا ہے کہ وہ کھانا پینا اور سونا سب بھول جاتا ہے۔ جن لوگوں کی
فطرت میں شاعری کا ملک ہوتا ہے ان کی طبیعت ابتدا ہی سے ملہ دینے
لگتی ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، تو طبیعت
کا اقتضا ان کو جبراً اور کھینچ کر لاتا ہے۔ ... ان کو اپنی توجہ بغیر
پہلوں و ماحول و ماحول سے ہٹا دیتا ہے۔ وہ اپنے کلام کی برائی اور بھلائی کا بغیر اس کے
کو کسی سے مشورہ یا صلاح لینا تک اعداد کو کہتے ہیں۔

عقاب کا ادبی، مطبوعہ، ماحول، شمارہ جنوری ۱۹۸۰ء

ہیں آؤ اور عالی نظم جو بدیہی میں منڈھے چڑھا چکے تھے حضرت ابو الغضائف نے
نصف عالی میں چند حسب حال نظمیں لکھیں۔ ایک نظم میں جس کا عنوان "غریبوں کی دنیا"
رہا ہے:

غریبوں کی حالت سنہلے نہ دیکھی قضا ان کے بایں سے ملی نہ دیکھی
کبھی پھانس غم کی نکلتے نہ دیکھی کبھی نبض صحت سے چلتے نہ دیکھی
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

نک کے ایام میں ایسے صاف رداں، مڑوٹا اور پختہ اشعار اعلان کر رہے تھے کہ یہ نو خیز
گئے چل کر فصیح اردو کے مستند شعرا کا سمایہ قرار پائے گا۔

بکے شعرا نے اردو کے صحیح ذوق و ذوق کی پابندی کا خیال بہت کم کیا ہے۔ اگر حضرت جوش
ای دیگر چلنا پسند کرتے، تو سنہلے، ملتے، انکلتے اور چلتے کی جڑ سنہلے، ملتی، نکلتی
قلمبے مائل نکھارتے اور انکو کوئی حرف گیری کرتا (اور حرف گیری کرنے والا تھا ہی کو)
دیتے: حالت، قضا، پھانس اور نبض ٹوٹت ہیں، اس لیے افعال، انیت کی شکل میں
ٹے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح غالب کی طبیعت میں فارسی دباں کے اصول ابتدا
سے رچ گئے تھے، اسی طرح اردو کا فصیح و دوزخہ جناب کی زبان پر چڑھ گیا تھا۔

سال تلاش معاش میں سرگرداں رہنے کے بعد وہ پیشہ تدریسی اختیار کرنے کی غرض سے
اسکول میں داخل ہو گئے۔ یہاں وظیفہ ملتا تھا۔ جب امتحان کا نتیجہ لکھا تو وہ تمام
دھڑوڈیٹن کے کامیاب ہونے والوں میں اول رہے۔ آپ کو جلد ہی جائزہ سرچھا دنی کے
اسکول میں ملازمت مل گئی۔ یہاں کا ماحول ان کے علمی اور ادبی ذوق کے لیے ساگرا
ما۔ اتفاق سے نسیم بھٹو ری شاگرد حضرت اے ڈی کے والدین ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے
یہاں شروع سے انکو تکرار کرنا نسیم سے خواہاں بن کر آغا کر دیا۔ نسیم نے انکو بڑے جوش و ہمت
میل کے ساتھ دینے کے علاوہ ان کے اشعار کی تعریف بھی کر دی۔ نسیم کی ادارتی غیر معمولی صلاحیت
کہ حضرت فصیح المصاحف صلحہ لینے کا شروع کیا اور وہ انسانی کی شکل میں اپنی سندس سے مل کر

شخصیت

فرض آپ ۱۹۰۲ء میں حضرت فیض الملک کے شاگرد ہوئے، مگر فروری ۱۹۰۵ء میں استاد کا انتقال ہو جانے سے یہ شاگردی اور اتادی کا تعلق جلد ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی اور خود ہی ذاتی ذوق و وجدان کی سلامتی پر بھروسہ کر کے اپنے کلام کی تعمین و تہذیب کرتے رہے

حضرت جوش نے داغ کو جو پہلی غزل اصلاح کے لیے بھیجی تھی اس کے ابتدائی حاشیہ ہیں:

بدۂ ہر بلب ہوں میں شناسا خواں تیرا دل میں رکھتا ہوں منتقل غم نہاں تیرا
زندگی کچھ بھی نہیں سوزِ محبت کے بغیر آگ اس دل کو لگے جو نہیں خواہاں تیرا
قلہم عشق کے طوفان سے بچنا معلوم لے دل زار! اب اللہ نگہاں تیرا
کیوں مل ترک میں آئینے سے تشبیہ دوں اس میں آتا ہے نظر چہرہ خداں تیرا

اگر آپ کو حضرت داغ سے کچھ فائدہ پہنچا، تو وہ محض برائے نام ہی ہوگا۔ داغ کے شاگردوں کی تعداد دوسرا سے متجاوز بتائی جاتی ہے۔ مگر بہرحکم شاگرد ایسے تھے جنہیں داغ اصلاح کہا جاسکتا تھا۔ میں نے ان کے ایسے متعدد شاگرد دیکھے ہیں جو اردو سنجی جانتے تھے، شعر گوئی کا سلیقہ رکھتے تھے۔ ان کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر شاگردوں کا اصلاح طلب کلام اپنے کہنِ مشتق اور حاضر باشِ تلامذہ کے حوالے کر دیتے، اور ان کی دی ہوئی اصلاحیں سن لیتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں شاگردوں کی رونما فزوں کثرت اور خط و کتابت کے بڑھتے ہوئے سلسلے سے تنگ آکر کہا تھا: یہ لوگ مجھ پر کیوں جھکے پڑتے ہیں۔ کیا میں ہی سارے ہندوستان میں ایک استاد رہ گیا ہوں۔ امیر ہیں، جاہل ہیں، ظہیر ہیں، تسلیم ہیں۔ اُن سے کیوں فیضیاب نہیں ہوتے؟

حضرت جوش نے استاد کے چار دیوانوں کلز اردو، آفتاب داغ، آفتاب داغ، یادگار، اور ان کی شغوی فریاد داغ کی زبان اور روزِ مرتے کا خاٹن مطالعہ کیا اور ان کے متنوع کی بدولت بہت جلد خاٹن المرام چمکے۔ اس امر کا خود انھوں نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

ذی الذوق اور دیوانِ غالب کی امتیازی خوبیاں زیرِ غور ہیں۔ خالص

شخصیت

اُمید و مصلحت میں شاعری ہی شاعری دیکھی۔ فرق صرف یہ ہو کہ دوزخ و جہنم
بھرنے بالکل بے نیاد ہے۔ حضرت داغ کے چاروں دیوان اور امرینائی
کے دو دیوان دیوان بستے شوق سے مطالعہ کیے۔ مگر زبان کا ریاض حضرت
داغ جی کے کلام بلاغت نظام سے ہوتا رہا۔ سب سے زیادہ راہنمائی انھیں
کی زبان نے کی۔

حضرت داغ کے شاگرد ہوئے، ادھر بڑی جماعتوں کی مدرسہ کی شرط قابضہ پڑی
لے لیے ٹریننگ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ لاہور کی علمی اور ادبی فضا میں ان کا شوق
نی خوب ابھرا۔ انھیں پہلی دفعہ مشاعرہ دیکھنے اور اس میں شرکت کرنے کا موقع نہیں ملا۔
سے فارغ ہونے کے بعد ملازمیت کے تعلق سے پھر تحصیل ننگر، ضلع جالندھر میں پہنچے
ابھر کوئی پڑی اگر دیہاتی ماحول کی سابقہ سب سالہ شوگر اور موجودہ سیفکری نے
داخلہ نہ دیا۔

سب علم و فن

بتا دینا ابھی سب نے ہو گا کہ آپ کے زمانہ طالب علمی میں اُردو نڈل کا نصاب تعلیم کیا۔
معتاد اور کیلا فقار وقت آج کل کے لباس کے نصاب پر بھی کئی درجے فوقیت رکھتا
سب مستقلاً نیکو دریں اقامت کریں ہو گئے تو اب تمام توجہ اکتساب علم و فن پر مرکوز
وہ اپنی خداداد فطری ذہانت اور ترقی طلبی کی بدولت فارسی میں ششی فاضل اور
محل کے امتحانوں کی تیاری کر لے گئے۔ اس زمانے میں ششی فاضل اور دین فاضل کے نصاب
ادق کتابیں شامل تھیں جن پر عبور رکھنے والے فی الواقع منتہی پہنچتے تھے۔ آپ نے ان
ممالک میں نہایت قابل تعریف کامیابی حاصل کی اور گویا بی بیوں میں نہایت
میں ان کے جماعت کمال کے شوق کا اعجاز وہی امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جہاں
نات کے اکثر دیگر شعرا علم عروض سے ناواقف تھے (ادب ابھی ہیں) اور اسے
ریاست کے لیے مولانا دیو کا شعر

انہم فاعلاتن فساہلات
شعری گویم بہ از قند و نبات

مختصیت

بطور دلیل پیش کرتے ہیں وہیں آپ نے ذاتی ریاضت سے اس علم میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ آپ کو متحدہ پنجاب میں بے بدل عروض تسلیم کر لیا گیا۔

یہاں مول پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاعر کے لیے عروضدان ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ نریش کا شاد مرحوم نے بھی مجھ سے ایک مرتبہ ایک انٹرویو لیتے وقت پوچھا تھا، "کیا آپ عروض سے واقف ہیں اور عروض کا جاننا شاعر کے لیے ناگزیر خیال کرتے ہیں؟" جواب میں میرے الفاظ یہ تھے میں نے عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔ عروض: جانتا نہ جاننے سے بہ حال بہتر ہے۔ لیکن جو شخص نظم ناموزوں طبع نہ ہو اس کو عروض پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً لاہور میں ایک بزرگ فارسی اور عربی کے لیم اے کلاسوں کو ۵۰ سال تک عروض پڑھا کے باوجود ناموزوں اشعار کہتے تھے۔ عروض جاننے کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ اس کی مدد سے ناموزوں اشعار کہنے والے کو اس کی غلطیاں بدھی طور پر ثابت کر کے قائل کیا جا سکتا ہے، حضرت چوشت نظم ناموزوں طبع ہونے کے باعث علم عروض کی تحصیل کے محتاج نہ تھے، لیکن تکمیل علم و فن کی خاطر آپ نے اسے نظر انداز کر دینا پسند نہیں کیا۔

میں نے جنوری ۱۹۷۰ء میں عروض کے بارے میں آپ کی اسے معلوم کرنی چاہی تھی۔ میرے مکتوب کے جواب میں آپ نے یہ تحریر فرماید جو بھول غالب، متفق گوید مد سے بولنی بارے میں ہے۔

کب کا یہ غلطی درست ہوا میں اس سے متفق ہوں کہ عروض نہ جاننے کے باوجود صحیح قسم کی موزونی طبع ہر بحر میں چل سکتی ہے۔ موزوں طبع شخص کو کبھی تقطیع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ناموزوں مصرع اس کی زبان پر آتا ہی نہیں اور آجائے تو ہونٹوں سے باہر نہیں آ سکتا۔ لیکن اگر کوئی غلط ٹوٹ کہ دے کہوں شعر میں سکتا ہے، یا وہ ساقط البحر ہے، تو عروض کی واقفیت کے بغیر اس کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔

عروض پڑھنا مگر اس کے قواعد اور اصول یاد نہ رکھنا عروضی دھانے کے برابر ہے۔ پروفیسر محمود خیرانی بہت بڑے محقق تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ میرے پاس عروض کی جتنی خطی اور

مطلوبہ کتابیں ہیں، اتنی دنیا بھر کے کسی فرد واحد کے ذمہ و کتب میں نہ ہوتی۔ یہ دعویٰ غلط
 رہتا۔ میں نے قیس کی مٹھ اور رشید الدین دہلوی کی حدائق التحریر سے لے کر بحر الفضا اور
 اس کے بعد تک کی ساری کتابیں ان کے مکان (فلہنگ روڈ لاہور) میں دیکھی تھیں۔ خیرانی
 صاحب کو سالم بھڑوں کے نام اور اراکان تو زبانی یاد تھے، مگر مزاحف بھڑوں کے نام اور اراکان
 دیکھنے کے لیے انھیں کتاب کالنی پڑتی تھی میں ایک دن ان سے ملنے گیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ
 عروض کی دس بارہ مطلوبہ کتابیں ان کے سامنے رکھی ہیں۔ میں نے پوچھا: ”باب کیا اہتمام
 ہے؟“ ان انھیں ان کی بے انتہا شفقت کے باعث ان کے بیٹے اختر شانی کی طرح بابا کہتا تھا
 انھوں نے فرمایا: ”سید سلیمان ندوی نے اقبال کے ایک شعر پر عرضی اعتراض کیا ہے۔
 عبد الحمید سالک اور محمد بن تاثیر جہ سے اعتراض کا ہنکا اچا ہتے ہیں۔ یہ کتابیں اسی فرد
 سے نکالی گئی ہیں۔“

حضرت بخش کو تمام و کمال عروض اور ہر مثلاً اگر آپ سے ایک سوال کیا جائے کہ بحر
 کی دو چار پارچے مزاحف شکلیں کیا ہیں، جو ایک غزل میں آسکتی ہیں اور ان کے نام کیا ہیں تو
 آپ کتاب دیکھ کر بغیر فوراً ان کے نام مع اراکان تقطیع بتا دیں گے۔

آپ کو علم عروض و قافیہ کی طرح فارسی اور اردو کے قواعد صرف و نحو بھی حفظ ہیں۔ خان رند
 نے امام جمال الدین سیوطی کی عربی کتاب ”مذہر“ کے مقابلے میں فارسی علم اللسان پر مبنی
 تھی جو اپنی قسم کی پہلی کتاب تھی خان موصوف نے اس ایک کی فصل میں یہ سوال اٹھایا ہے
 کہ کیا شعر نے ایران سے اپنی زبان فارسی کے استعمال میں غلطی ہو سکتی ہے یا نہیں اور پھر خود
 ہی اس کا جواب دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح کبھی کبھی ہم ریتے ہیں وزن شعر، قافیہ اور
 ردیف کی قیدوں کی وجہ سے استعمال الفاظ میں، وزن قرعے کی غلطی ہو جاتے ہیں اور قواعد
 صرف و نحو کا پورا خیال نہیں رکھتے، اسی طرح اب ایران بھی بعض اوقات جادو مستقیم
 اور جادو ہر جاتے ہیں۔ حضرت بخش کو غیر اہل زبان اردو کی قواعد صرف و نحو کی طرف
 سے بے پروائی بعض اوقات انہیں بڑی شکل میں ڈال دیتی ہے اور وہ معمولی سے سوال کا
 جواب دینے سے قاصر رہتے ہیں۔

شخصیت

مضمون رسالہ آج کل میں شائع ہوا ہے، وہ میں نے پڑھا ہے۔ گیارہ کے ایک شعر میں لفظ
مگر انبار لفظ راقانیوں کا ہے:

ہنسل ہے عشق مجھ کو مگر انبار دیکھ کر آپ نے اس لفظ پر توجہ نہیں کی۔ مگر انبار تو
عورت کو کہتے ہیں؟ انھیں علم تھا کہ اثر صاحب کی نگاہ سے عداوت ہے۔ تاہم آپ نے
ان کو وہیں ذوق کے یہ دو شعر سنائے دیے ہیں۔

کیوں اتنا گراں بنا ہے جو رخت سفر بھی اے راہرو ملکِ عدم اٹھ نہیں سکتے
اے ذوق! کیا کہوں میں گراں باری گناہ کشتی میں ہوں تو بوجھ سے لنگر کو توڑ دو
یہ سن کر اثر نے کہا "اچھا" آپ لغت کی کتاب ضرور دیکھیں "آپ نے فرمایا "اگر لعنت
کی کتاب میں یہ مفہوم بھی لکھا ہے، تو وہ نہایت فقید المثال ہے"

میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر گراں اس کا حقیقی معنی کے برخلاف مجازی معنی میں حاملہ
کے لیے مستعمل بھی ہے تو اثر صاحب کو یہ بھی تو دیکھنا چاہئے تھا کہ قائل مرد ہے اور
کو حل نہیں ہوتا۔

اپنے کلام میں آئے ہوئے کسی لفظ یا اصطلاح کے صحیح استعمال کی سند دنیا تو شاید اکثر شعر
کے لیے ڈسوار نہ ہو، لیکن دوسروں کے مستعلات کو اساتذہ کے کلام سے استناد کہو کے بجا
ثابت کرنا اسی شاعر سے ممکن ہے جس نے زبان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک اصطلاح
پر ڈیمے ڈال رکھے ہوں۔

پنجاب میں اردو

پنجاب میں اردو اور انگریزی سرکاری زبانیں تھیں اور پنجاب یونیورسٹی میں بی اے تک
اردو کی تعلیم کے علاوہ اردو کے ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات بھی ہو
تھے، لیکن پنجاب کے اردو شاعروں نے اہل زبان کے روزمرے انہی شعر اور علم عروض سے
عدم واقفیت کے باوجود اپنی استعداد میں کوئی کمی محسوس نہیں کی اور شاعری کے ان لوازم
کو غیر ضروری سمجھا۔ اگر بات یہ نہیں کہ رہتی، تو درگزر کی جاسکتی تھی؛ مگر ان لوگوں نے غلط
دمنے ہوئے انہیں بائیں شاخیں کر کے اور بھی مضرب کو دیا۔ یہاں دھانہ کی چند مثالیں

تخصیص

پیش کی جاتی ہیں۔

۱۹۱۲ء میں اقبال کے ایک دوست مجھے ان سے ملانے لے گئے کچھ دیر تک رمی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر اقبال کے دوست نے ان کی نظم شکوہ سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اقبال بڑی خوش الحانی سے پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر آئے:-

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں معبود تھے پھر کہیں معبود شجر
تو نے کہا دوسرے مصرع میں وہ نقص رہ گئے۔ ایک یہ کہ لفظ "تھے" جہاں آنا چاہئے
تھا وہاں نہیں آیا؛ اور دوسرا یہ کہ معبود اور معبود تو ہم دونوں اور عربی کے الفاظ ہیں لیکن
پتھر اور شجر میں یہ بات نہیں۔ اگر یہ مصرع یوں ہوتا "کہیں معبود تھے پھر کہیں معبود شجر تو
لفظ "تھے" اپنی جگہ پر آجاتا۔ اما اس کے تلفظ میں بڑی آتی اور تھر اور شجر بھی معبود سمجھا
طرح ہوزن ہو کر پورے مصرع کو متعجب کر دیتے۔ اقبال نے یہ سن کر ٹھٹھانہ بند کر دیا۔ پھر وہ
تین منٹ خاموش رہ کر بولے: "یہ ایسی دقیق فنی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ یہ آپ ہی کو مبارک
ہو۔ آپ میرا پیغام سمجھنے کی کوشش کیجیے۔"

ظفر علی خاں کی ایک نظم کے یہ دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں:-

بڑھا امرتسری قمی کے بل پر سیل لاشی کی دکھا اے اسب بازی تو بھی اپنی خوشخیزی کو
مسلمانوں سے پوچھو، مستندوں سے پوچھئے کیا مری شیوا بیانی کو، مری جادو کلائی کو
ظفر علی خاں روزانہ صبح کے وقت ال دو ڈلا ہو رہے ہر تک میر کیا کرتے تھے۔ ان سے میری تلقا
وہیں ہوتی تھی۔ میں نے ان سے کہا: "آپ کی نظم کے ہر شعر میں دو لفظ (کو) حشو ہے"۔ وہ بولے:
"میں اسے حشو نہیں مانتا۔ اس میں کیا قیامت ہے؟"

ان سے محاورے کی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ انھوں نے ایک نظم میں "بچیں کھل گئیں" لکھ دیا
"بچیں پھٹ گئیں" لکھ دیا تھا۔

عبد الحمید ماسک کی ایک نظم کے پہلے شعر کا دوسرا مصرع یہ تھا: "جس سے نبی کا بول ہو بالا وہ کام"
اس پر انھارہ "دیرینہ" مجھ کے مدیر چدر جلالی نے اعتراض کیا کہ محاورہ بول بالا ہونا ہے۔ محاورہ
میں تعریف یا الفاظ کی تقدیم و تاخیر نا جائز ہے۔ پھر مولیٰ جلالی میں ذمہ کا پہلو بھی ہے۔ بول

خصیصہ

عربی میں پنجاب کے لیے متعلیٰ ہوتا ہے۔ سالک سے اس احراض کا جواب تو بنا نہیں،
مگر انھوں نے "انقلاب" میں جس کے ایک مدیر وہ بھی تھے، بدرجہا لال کا نام جہدِ بلائی لکھ کر
انھیں بہت سی صلوٰۃ تسنادیں۔

شمیلے کے ایک مشاعرے میں ایک شخص نے حنیفہ جالندھری کو محاورے کا غلط استعمال کرنے
پر توجہ دلائی تو انھوں نے کہا: "محاورہ ہی تو غلط ہے، اور تو کوئی بات نہیں۔ پھر اگر الکاہلی
کا مطلع پڑھ دیا۔"

ہنگامہ برپا کیوں ہے، تھوڑی سی جو چکی ڈاکا تو نہیں مادہ، چوری تو نہیں کی ہو۔
میں نے حضرت جوش سے ایک مرتبہ خط لکھ کر دریافت کیا کہ آپ کو پنجاب کے شاعروں کی
عام روش کے برخلاف اہل زبان اساتذہ کے سانی متبع کا خیال کیونہو نہ ہو۔ جواب میں
آپ نے قلمبر فرمایا!

میں نے پنجاب کے شاعروں میں یہ نمایاں کمی دیکھی کہ انھوں نے حسنِ طبعیت
کے باوجود زبانِ ادب و فن کی تحصیل پر بہت کم توجہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں
کوئی بھی درجہ استناد حاصل نہ کر سکا۔ میں نے مشقِ سخن کے ابتدائی
اور وسطی زمانے میں صحتِ زبان اور حسنِ بندش پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز
کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل زبان اساتذہ کے سوا اور کوئی میری نگاہ
میں نہیں چھا۔

یہ آپ کے فطری ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح ہی کا تقاضہ تھا کہ آپ نے علمِ زبان میں کامل
دستگاہ بہم پہنچانے کی شکلات کو یکسر نظر انداز کر کے سہل اچھا روی کی بجائے حرقرِ بڑی
حفاظتِ اتنی کو ترجیح دی اور اردو کے مذہمے اور محاوروں کا درست استعمال نہ کرنے کے
شاعروں کے ذمے میں شامل ہونا گوارا نہ کیا۔ درحقیقت آپ نے اردو زبانِ ادبی میں کمال
پیدا کرنے کی جیسی کوشش کی ویسی کوئی غیر اہل زبان نہیں کر سکا۔ اس لحاظ سے آپ
فردِ فرید ہیں۔ کسی غیر اہل زبان کا زبانِ ادبی میں اہل زبانِ فصحا کے برابر ہونا غیر ممکن تو

قصیدت

نہیں، لیکن مجددِ شہزاد ضرور ہے۔

پنجاب نے مجددِ یگانہ گیری کے بعد سے اب تک تین باکمال ایسے پیدا کیے ہیں جن میں سے دو کو خدا کی کے اہل نبیاں اساتذہ میں اور ایک کو اردو کے ممتاز شعرا کا بہتر تہ تسلیم کرنے میں کوئی ہمتی نہیں پرکھتا۔

۱۔ داسہ ایان اسندرام مخلص ابن راجہ برہم داس ساکن سودھوہ (پریگنہ وزیر آباد) پنجاب۔

۲۔ دیوان ریا کوٹلی مل دارستہ سیالکوٹی۔

۳۔ حضرت ابوالفصاحت جوش ملیح آبادی۔

مخلص مجددِ شہزاد ہی میں وزیرِ اعظم قوام قرادین خاں کے وکیل اور بادشاہ کے دربار میں اُن کے نمایندہ تھے۔ اُن کی تصانیف دیوانِ مخلص، برۃ الصالح (دُغت)، بدائع و قانع (چشم دید و اشاعت کامیان)، ایک مجموعہ رباعیات، دو مثنوی فقہ ہمامہ عشق اور کارنامہ عشق ایک مجموعہ رُفقات اور مرقع مخلص ہیں۔ اُن کا دھوے تھا کہ میں نے اپنی نظم و نثر میں کوئی مفرد یا مرکب لفظ ایسا نہیں لکھا جس کی سند اساتذہ ایران کے کلام سے نہ مل سکوں۔

جب نادر شاہ ہندوستان سے واپس چوتے ہوئے انکھ کے پاس پہنچا اور جاؤں نے اُس کے شکر کا سامان رسد لوٹ لیا تو اُس نے محمد شاہ کو ایک مژدہ بھیج کر دیکھی کہ اگر میرے نقصان کی تلافی نہ کی گئی تو میں پھر ہندوستان پر حملہ کر دوں گا۔ محمد شاہ نے مستعد نامہ راجا پور سے نادر شاہ کے مژدہ کے مژدہ کا جواب لکھایا اور مخلص کی تحریر جو مضمون اور عبارت کے لحاظ سے بہترین تھی، نادر شاہ کو بھیج دی۔

دارستہ دیوان دارستہ، مطلع السعدین (مدفن شعر) صفات کائنات، شہزادہ فیروہ کے مصنف اور فرنگ مصطلحات شعرا کے مدون تھے۔ اُن کی تحقیق دقین سے دس ایک چند بہتہ ایسے متاخر ہوئے کہ انہوں نے فرنگ مصطلحات شعرا جو بہارِ نجم کی مدون کے وقت تیار ہوئے تھے، بہارِ نجم میں شامل کر لی۔ دارستہ نے خان آملہ جیسے علیل القدر شاعر اور محقق کی بعض ابیات اور تصنیفات لغت برہمت برنگیری کو نے کے علاوہ اُن کے تعلیقات کے مد میں جو خلیفہ موصوت نے حاکم لاہوری کے دیوان کے حواشی پر رقم کیے تھے، ایک رسالہ ”مہربانی“ بھی لکھا تھا۔

شخصیت

حضرت ابو الفصاحت کو ایک مستند عربی لغت کے مؤدوں جوہری سے بھی فیہدہ دی جاسکتی ہے۔ جوہری بھی الاصل ہونے کے باوجود عربی زبان پر ایسا قادر تھا کہ عرب عرب با بھی اُسے عرب سمجھتے رہے اور اسی مخالط کے باعث اُس کا کھاج ایک ممتاز عرب قبیلے میں چوگیا۔ جوہری کی زبان دانی کے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس نے مدت مدید تک عرب میں رہ کر عربی زبان کے رذقب اور محاذ سے پر قدرت کاملہ ہم پہنچائی تھی۔ اُس کے برعکس حضرت ابو الفصاحت کو دہلی میں رہنے اور اہل زبان فصحا کے فیض صحبت سے بہرہ یاب ہونے کا موقع کبھی نہیں ملا۔

آپ ۱۹۲۰ء سے بہت پہلے مسلم الثبوت استادانِ یلے گئے تھے اہل آپ کی شہرت پنجاب سے ماہر ہندستان کے اردو دان موبوں میں پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں کچھوڑ تھلے کا سالانہ مشاہیر شیخ سر عبد القادر کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی چشم دید کیفیت پندت ہری چند اختر مرحوم نے لکھی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جوہری سے اس مشاعرے میں نہیں آسکے تھے۔ سر عبد القادر نے کچھوڑ تھلے پہنچے ہی دریافت کیا کہ اتنا بڑا استاد اس علاقے میں موجود ہے اور آپ اسے نہیں بلا سکے۔ بعد کو انھوں نے خاص آؤمی بھیج کر بوڑ کا دے انھیں مشاعرے میں آنے کی دعوت دی

ایک طرح کا ایک واقعہ یہاں ہستہ لسانی نے تحریر کیا ہے :

"شیلے میں پریس آف دیلزمینا میں مشاعرہ ہوا تھا۔ شیخ سر عبد القادر کو کسی صدارت پر تشریف فرما تھے۔ جب اچھے اچھے شاعر کلام سننا چکے تو پندت جلی کے نام کا اعلان ہوا۔ سر عبد القادر نے اٹھ کو خاص طور پر ان کا تعارف کرایا۔ جب انھوں نے قول پڑھی تو سماں بندھ گیا۔ ایک ایک شعر باد باد پڑھوایا گیا۔ سر عبد القادر مجھ مجھ کو شہر ہر اسے تھے ۔

ایسی مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے :-

"۱۹۳۳ء کے مشاعرے کا وہ منظر بھی مجھے اب تک یاد ہے جب شیلے

شخصیت

کے "ڈیوی کو" ال میں سید سر رضا علی کی صداقت میں مجلس گوم تھی۔

حضرت انکو مراد آبادی مرحوم کے بعد پٹنٹ جی کی باوی آئی۔ انھوں نے

ایک غزل سانی جن کا مطلع تھا،

سوزِ غم میں دیدہ تر کام آسکتا نہیں یہ وہ آتش ہو جسے پانی بجھا سکتا نہیں

یوں تو اس غزل کے ہر شعر کی خوب پذیرائی ہوئی لیکن ذیل کے شعر نے تو

قیامت پر پا کر دی،

میری رسوائی کا حال ہے اور غمِ سوزِ بچھ میں بھری فصل میں یہ تقدیر نامکن نہیں

جب یہ غزل ختم ہوئی تو مزید کلام کا مطالبہ ہوا اور انھوں نے ایک اور غزل

پڑھی جس کی زمیں تھی: دنیا، ایک اور، دوسرے زیرِ ایک اور۔ اس غزل

کا یہ اثر ہوا کہ اس کے ختم ہونے پر حاضرین نے ایک زبان ہو کر: ایک اور،

ایک اور کا شور مچا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں تیسری غزل بھی سانی پڑی:

اصلاحِ زبان

حضرت جو شمس نے زبانِ دانی اور قاعدہ الکلامی میں اہل زبان اساتذہ سے اپنی بلند مرتبتی

تسلیم کو ایسے کے بعد حضرت داغ کی اردو کو اور زیادہ مانجھے اور نکھالنے کی ضرورت کا

احساس کو کے بعد اسی "آرامتین سرور پر استن است" ایسے الفاظ تو ایک کا استعمال

ترک کر دیا، جنھیں ساخت کے لحاظ سے غلط یا فادِ سیت کا منہ یا بول چال کے خلاف پایا

گیا۔ آپ نے اپنے مژدکات کی فہرست میں اُن الفاظ تو ایک کے علاوہ جو حضرت داغ

کے زمانے سے مژدوک چلے آتے ہیں، بہت ایسے مفرد اور مرکب الفاظ جمع کیے ہیں جن

کے استعمال سے احتراز واجب ہے۔ یہ طویل فہرست آپ کے دوسرے مجموعہ کلام مجموعہ

پوش میں دی گئی ہاں سکتی ہے۔ مگر اس فہرست کی اس لحاظ سے نامکمل سمجھنا چاہیے کہ اُن

کے مژدوکات کا سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے۔

میں یہاں صرف چند ایسے الفاظ کے نمونے پیش کر دیتا ہوں جنھیں آپ ہمارے ترک کیا ہے۔

جہاں میرا نقطہ مدد چھا، دہاں میں حضرت فصیح الملک کا شعر بھی لکھ دیتا ہوں تاکہ یہ امر بخوبی

شخصیت

دافع بھانے کو آپ نے اصلاح زبان کے میدان میں کس خشک قدم اٹھے بڑھایا ہے۔
آپ نے الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کے ترک کیے جانے کی توجہ بھی کر دی ہے، جو افادیت
کے اعتبار سے بہت ضروری تھی۔

چاہت: چاہ ہندی الاصل ہے۔ اس کے ساتھ تائے مصدری محبوب ہے۔

چلتے ہیں، انھیں غیروں کی چاہت ایسی ہوتی ہے
خدا کی شان ہے، ایسوں کی حالت ایسی ہوتی ہے (دراغ)

رنگت: یہ فہرست مترکات میں درج نہیں ہے۔ غالباً سہو اندراج سے رہ گیا۔ یہ بھی
چاہت کی طرح میوب ہے۔

شبنم سے شب، بحر کی قلت نہیں جاتی
سوشوب پڑیں تو بھی یہ زحمت نہیں جاتی (دراغ)
صورت، یعنی مانند بغیر ترکیب فارسی۔

بزمِ دُخسن میں نہ کھلتا گلِ ترکی نمودت
جاؤ بکلی کی طرح، آؤ تکر کی صورت (دراغ)

غزل میں دیوان، عرفان وغیرہ قافیے ہوں تو مطلع میں سامان، ارمان کا قافیہ۔ ان
قوافی میں عربی کے عرب اقبل حلق نہیں ہیں۔

ہوا ہے جب سے شہر و اس حد سے دین و ایمان کا
کوئی دل چیر کر دیکھے عقیدہ ہر مسلک کا (دراغ)

کابِ حلت: یہ فارسی ہے۔ اُرود کی بول چال میں مستعمل نہیں ہوتا۔ صرف کابِ ہلا
کابِ مناجات اور کابِ صلہ استعمال ہوتے ہیں۔ (کابِ حلت کے ترک کے بارے
میں لوحِ ناردی نے آپ کا مشورہ مان لیا تھا)

قصیں غریبوں کیوں کو کر لیا جو آسمان کی یہ رقم نہ اٹھ سکتی، نہ یہ افتاد ہوتا

طرح (سلکون ثانی): ایک وجہ ترک تو یہ ہے کہ تراکن ہو تو طرح، بنیاد کے معنی دیتا
ہے۔ دوسری وجہ کہ بول چال میں سب کو متحرک ہوتے ہیں۔ (آپ نے طرح کے بعد

صحیت

’ٹٹے کو ذرا اُترادیا ہے،
آئے بھی، تو وہ سُکھ کو چھپاتے مرے آگے
(د آغ) اس طرح سے آئے کہ آئے مرے آگے
تقابلِ ردیفین:

سُنا ہے ہم نے تیرے بھی دہن ہے
(د آغ) جو ہو تا تو کہ صحرانا، کہیں گے
فادہ دہنِ اعلیٰ الفاظ کی اردو جمع میں کی تخفیف۔ مثلاً سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم۔
حرفِ جاہِ آجائے کے بعد مضاف الیہ اور علامتِ اضافت۔ مثلاً محبت میں ان کی غفلت
سے اُن کی۔
نادر: بھی آتش بے ترکیبِ فادہ کی۔ مثلاً نار و دہن کی۔
دکھا، پکھا (بے تشدید)،

فادہ معمولہ آٹھ دس اشعار میں صرف ایک بیان لانا ہوتا ہے۔ اُستِیاضہ، خواندہ،
زمانہ، طاقِ زحمہ میں خُدا، کیا، طاق، پادِ سادہ، طاق و توانی کی بھرمار درست نہیں جب
لن حرفِ روی ہے تو اعلیٰ حرفِ روی کس طرح درست ہو سکتا ہے۔
میرا خیال ہے کہ آپ کی طویل فرست متروکات میں الفاظ کی خاصی تعداد درج ہونے
سے وہ جتنی ہے کہ آپ نے ابھی شعوری طور سے ایسے الفاظ کا جائزہ نہیں لیا،
جیسا کہ شعوری طریقے سے ترک کر دیا ہے۔

آپ ترتیبِ الفاظ اور سخنِ بندش کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ جن زمیوں میں ردیف
مُضاف ہوتا ہے، وہاں آپ مضاف الیہ اس کے بالکل متصل لاتے ہیں مثلاً
۱۔ تجھ کو معلوم ہے سب حال ہمارا ساقی۔ ۲۔ دم بھر اُکرتے ہیں سب شیخ و برہن میرا۔
۳۔ کئی دن سے خوشامد کو رہا ہے آسمان میری۔

تسکین اور سطر: یہ ایک عروضی رعایت ہے مگر اس سے وصفِ مصرع و اہل نہیں
دہتا بلکہ غیر مترحم بھی ہو جاتا ہے۔ مضافِ قول کی ذمہ دہن سے قفس کے سانسے جلتا ہے آجیاں لپٹا

تخصیص

..... اس میں یہ مصرع بھی آیا ہے، سوائے آتش ہے کون ہزباں اپنا۔

و اپنے تکیوں اور سطرے کبھی کام نہیں لیا۔

قبیض و اذالہ: بحر متقارب سالم، بحر متساوی سالم اور بحر ہزج سالم کے مصرعِ اول کے آخر میں نوں جُختہ کے سوا اور حروف بطور قبیض و اذالہ نہ لائے جائیں۔ **خلاف**

نہ ابرار باقی رہے ہیں نہ احسرا

شکستِ ناروا

اگرچہ شکستِ ناروا کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، مگر تمام مستند شعرا فارسی و اردو اس سے اجتناب کیا ہے۔ آپ نے ایک طویل مفعول میں شکستِ ناروا کی قیامت پر بڑی وضاحت سے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ آپ رقم طراز ہیں:-

”بعض بحر میں ایسی ہیں کہ ان میں ہر مصرع دو برابر حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ترنم اور موسیقی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حصہ مفہوم کے لحاظ سے مکمل یا قریب قریب مکمل ہو۔ شکستِ ناروا کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً:-

- ۱۔ اجزائے فعل کا ایک جزو پہلے نصف میں اور دوسرا جزو دوسرے نصف میں ہو۔
- ۲۔ جملہ و مجرد میں مجرد کا ایک جزو ایک نصف میں رہ جائے اور دوسرا جزو دوسرے نصف کے شروع میں آجائے۔

۳۔ مضان اور مضان الیہ میں سے مضان الیہ اور حرفِ اضافت ایک نصف میں آئے اور مضان دوسرے نصف میں جا پڑے۔ (اس کی قبیح تر صورت یہ ہے کہ حرفِ اضافت بھی دوسرے نصف کے شروع میں لایا جائے۔

- ۴۔ ایک لفظ کا کچھ حصہ پہلے نصف میں اور باقی دوسرے نصف میں ہو۔
- ۵۔ مرکبِ عطفی کا معطوف الیہ پہلے نصف کے آخر میں اور معطوف دوسرے نصف کے شروع میں آئے۔

۶۔ نبرا اور متاد نے میں حرفِ نبرا پہلے نصف کے آخر میں اور متاد نے دوسرے

شخصیت

نصف کے شروع میں لایا جائے۔

۷۔ فارسی اصناف میں مضاف کے بعد مضاف الیہ دوسرے نصف کے شروع میں ہو۔

۸۔ فارسی عطف میں پہلا نصف حرف عطف پر ختم کیا جائے۔

حضرت جوش کو شکست نارد کے بارے میں پہلی بار استقصا کو کے مفصل بحث کرنے کا اثر حاصل ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اُن بکروں کی مراحت کو دی ہے جن میں شکست نارد کا اسکان ہوتا ہے اور بکروں کے نام تحریر کرنے کی بجائے ان کے ہوزن شعر لکھ دیے ہیں تاکہ جو لوگ عربی سے واقفیت نہیں رکھتے وہ بھی باخبر ہو جائیں۔

جب جوش صاحب کا یہ مضمون رسالہ اچکل میں شائع ہوا تو شعرا کے طبقے میں تہلکہ مچ گیا۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنؤ نے ان کے فرزند ارجمند جناب جوش ملیانی سے کہا: آپ کے والد صاحب نے شکست نارد پر اتنا مبسوط مضمون تو لکھ دیا، لیکن اتنی پابندیاں کون گوارا کر لیا؟ یہ سن کر جناب جوش ملیح آبادی جو ان دنوں آجکل کے ایڈیٹر تھے، بولے: ”میں اس مضمون کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔ حسن بندش کا یہی تقاضا ہے کہ جن بکروں میں یہ احتیاط لازم ہوتی ہے ان میں اس کا پورا لحاظ رکھا جائے، ورنہ مصرع کا وزن پورا کر دینا عجیب طبیعت کے مترادف ہو گا۔“ یعنی شعرا نے آپ کو اس مضمون پر مبارکباد دی تھی اور تسلیم کیا تھا کہ آپ نے شکست نارد کے قسم سے سب کو آگاہ کر دیا۔

مختلف فیہ الفاظ

میں نے حضرت جوش سے ایک خط لکھ کر مختلف فیہ الفاظ کے بارے میں آپ کا مسلک دریافت کیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا:

”میں نے مختلف فیہ الفاظ کے بارے میں خواہ وہ تلفظ سے تعلق رکھتے

ہوں، یا معنی سے، یا ترکیب و تانیث سے، ایک اصول اختیار کر رکھا ہے؛ مثلاً شعر کے سکون، ثانی اور ثانی سے مستند تلفظ ہیں، مگر میں یہ نقطہ ہمیشہ سکون ثانی ہی سے لکھتا ہوں۔ مجھے یہ روش پسند نہیں کہ

تخصیص

..... اس میں یہ مصرع بھی آیا ہے، سوائے آتش ہے کون ہزباں
(آپ نے تسکین اور مطاعے کبھی کام نہیں لیا۔)

قبیخ و اذالہ: بخیر متقابل سالم، بخیر متبادل سالم اور بخیر مزاج سالم کے مصرع آوا
آخر میں فون غنہ کے سوا اور صوت بطور قبیخ و اذالہ نہ لائے جائیں۔ مثلاً
نہ ابرار باقی رہے ہیں نہ احسار

شکست نادرہ

اگرچہ شکست نادرہ کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، مگر تمام مستند شعراے فارسی و اردو
سے اجتناب کیا ہے۔ آپ نے ایک طویل مضمون میں شکست نادرہ کی قیامت
وضاحت سے اظہار خیال فرمایا ہے۔ آپ رقم طراز ہیں:-

”بعض بحر میں ایسی ہیں کہ ان میں ہر مصرع دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا
ہے۔ ترنم اور موسیقی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حصہ مفہوم کے لحاظ سے مکمل یا
قریب قریب مکمل ہو۔ شکست نادرہ کی کوئی صورتیں نہیں۔ مثلاً:-

- ۱۔ اجڑا اسے فعل کا ایک جُود پہلے نصف میں اعداد سرائی دو حصے نصف میں ہو۔
- ۲۔ جلد و مجرود میں مجرور کا ایک جُود ایک نصف میں رہ جائے اور دوسرا جُود
دوسرے نصف کے شروع میں آجائے۔

۳۔ مضان اور مضان الیہ میں سے مضان الیہ اور حرفِ اضافت ایک
نصف میں آئے اور مضان دوسرے نصف میں جا پڑے۔ اس کی قبیح
ترصورت یہ ہے کہ حرفِ اضافت بھی دوسرے نصف کے شروع میں لایا
جائے۔

- ۴۔ ایک لفظ کا کچھ حصہ پہلے نصف میں اور باقی دوسرے نصف میں ہو۔
- ۵۔ مرکب عطفی کا معطوف الیہ پہلے نصف کے آخر میں اور معطوف دوسرے
نصف کے شروع میں آئے۔

۶۔ نذر اور منادے میں حرفِ نذر پہلے نصف کے آخر میں اور منادے دوسرے

شخصیت

نصف کے شروع میں لایا جائے۔

۷۔ فارسی اصناف میں مضاف کے بعد مضاف الیہ دوسرے نصف کے شروع میں ہو۔

۸۔ فارسی عطف میں پہلا نصف حرف عطف پر ختم کیا جائے۔

حضرت جوش کو شکست نارد کے بارے میں پہلی بار استقصا کو کے مفصل بحث کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ان بکروں کی مراعت کو دی ہے، جن میں شکست نارد کا امکان ہوتا ہے اور بکروں کے نام تحریر کرنے کی بجائے ان کے ہوزن شعر لکھ دیے ہیں تاکہ جو لوگ عربی سے واقفیت نہیں رکھتے وہ بھی باخبر ہو جائیں۔

جب جوش صاحب کا یہ مضمون رسالہ اہلک میں شائع ہوا تو شعرا کے طبقے میں ہتکڑیاں لگیں۔ نواب جو علی خاں اترکھنوی نے ان کے فرزند ارجمند جناب جوش ملیح آبادی سے کہا: آپ کے والد صاحب نے شکست نارد پر اتنا مبسوط مضمون لکھ دیا، لیکن اتنی پابندیاں کون گوارا کر لیا گا؟ یہ سن کر جناب جوش ملیح آبادی جو ان دنوں آجکل کے ایڈیٹر تھے، بولے: ”میں اس مضمون کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔ حسن بندش کا یہی تقاضا ہے کہ جن بکروں میں احتیاط لازم ہوتا ہے، ان میں اس کا پورا لحاظ رکھا جائے، ورنہ مصرع کا وزن پورا کر دینا عجزِ طبیعت کے مترادف ہو گا۔“ یعنی شوالے آپ کو اس مضمون پر مبارکبادی تھی اور تسلیم کیا تھا کہ آپ نے شکست نارد کے قسم سے سب کو آگاہ کر دیا۔

مختلف فیہ الفاظ

میں نے حضرت جوش سے ایک خط لکھ کر مختلف فیہ الفاظ کے بارے میں آپ کا مسلک دریافت کیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا:

”میں نے مختلف فیہ الفاظ کے بارے میں خواہ وہ تلفظ سے تعلق رکھتے

ہوں، یا معنی سے، یا ترکیب و تانیث سے، ایک اصول اختیار کر رکھا ہے، خلاصہً شعر کے سکون، ثانی انداز سے مستند تلفظ ہیں، صحر میں یہ نقطہ ہمیشہ سکون ثانی ہی سے لکھتا ہوں۔ مجھے یہ روش پسند نہیں کہ

شخصیت

یہاں سکونِ ثانی کی گنجائش ہو، وہاں سکونِ ثانی سے ادبِ جہاں فتح
ثانی کی کھٹ جڑ وہاں فتحِ ثانی سے لکھ دوس۔ اسی طرح کا فرجِ بروے لغت
فت کے زیر سے صحیح ہے، عام بول چال میں فت کے زبر ہی سے استعمال ہوتا
ہے، میں نے بھی یہی صورت پسند کی ہے۔ تذکرہ تائینت کے متعلق بھی
میری روش یہی ہے۔ سانس، طرز، فکر، غور، فہم مختلف فیہ میں گر میں
طرز، فکر، سانس کو ہمیشہ مونث لکھتا رہا ہوں۔ سانس کے متعلق ذوق کا
مصراع مثال ہے: سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد یہ غور اور
فہم کو نذر لکھتا ہوں۔ فہم کے متعلق میں نے کیفی و بلوی مرحوم دیندیت برج
موسن دتا تیرہ سے پوچھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اب اس کا استعمال تذکرہ کی
طرت جھکتا جا رہا ہے۔

حضرت جو ش نے ایسی صورتوں میں جو پابندی اپنے اوپر عائد کوئی ہے، وہ آپ کے اصول
اخذ و ترک کی، مقبولیت کے علاوہ آپ کی ہوا و پندی پر مبنی دلالت کوئی ہے۔
حضرت و آغا نے خضر سکونِ ثانی اور فتحِ ثانی دونوں سے، طرز تائینت سے، سانس اور فکر تذکرہ
سے لکھا ہے مثلاً:-

آبِ بقائے گرچہ بہت روک نظام کی	پیری چلی نہ خضر علیہ السلام کی
اگاہ ہے سبز و کیسا حوض کے گرد لے ساقی!	خضر آئے نہ ہوں چشمہ کچھ کو آبِ حیاں کا
داعِ معجز بیاں ہے کیا کہنا!	طرز سب سے جدا نکالی ہے
دیکھنے کو ترے اک سانس لگا رکھا ہے	ورنہ بیادِ غم، بجز میں کیا رکھا ہے!
شکوہ نہیں عدد سے ملاقات کا مجھے	تم جاننے ہو فکر ہے جس بات کا مجھے

جہاں تک مجھے علم ہے حضرت و آغا کے شاگردوں میں فوجِ ناردی اور حضرت جو ش کے
سوائے کسی نے سانس کو مونث نہیں لکھا۔ اسی ذوق کی سند تو اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ
فکر کے کلام میں بھی جسے ذوق کا ساختہ و پروا نہتہ کہا جاتا ہے، قلمِ دھامہ، کہیں تذکرہ کہیں مونث
آپا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مقدم اور متاخر کے لحاظ سے ذوق کی سند کے مقابلے میں ذوق کی سند

شخصیت

وہ معتبر بھی جائیگی۔ بہر حال یہ ایک مجتہد زبان کی ذاتی پسند کا معاملہ ہے؛ اس میں چون چلا

ن ہو!

طاب ابو الفصاحت

بے اس استفسار پر کہ آپ کو خطاب ابو الفصاحت کب اور کہاں سے ملا، آپ نے یہ جواب
مال فرمایا:

”حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حفیظ جانندھری کے نام کے ساتھ ان کے مخلص
اصحاب نے ابو الاثر استعمال کو نا شروع کر دیا، اسی طرح میرے اکیچ ہندو ہزار ام
نے میرے نام کے ساتھ ابو الفصاحت کی شاخ لگا دی۔ آہستہ آہستہ یہ
لفظ بہت پھیل گیا اور جناب مہر گواریا اور جناب دل شاہ جاپوری بھی اپنے
خطلوں کے سرناموں میں بالالترام لکھنے لگے۔ برادر معظم و مقرر جناب مہر نے
اپنے دیوان ”شعاع مہر“ میں یہ اقطو تاویفی شائع کیا، تو یہ اور ایسے ہی لو
بھی اعز ازہی الفاظ استعمال کیے۔ ان کے بعد جب جناب نوح نادروی نے
بھی میرے نام کے ساتھ ابو الفصاحت لکھنا شروع کیا تو میں نے موصوف
سے اس کا جوڑ پوچھا۔ انھوں نے اس کی سند دس بارہ سطروں میں لکھ کر
دستخط اور ہرے مزیں کو کے بھیج دی اور خط میں لکھا کہ جب بھائی مہر اور حضرت
دل اس لفظ کا استعمال برحق سمجھتے ہیں تو میں کیوں نہ اس کی تائید کروں۔
یہ سند میرے پاس محفوظ ہے، مگر میں نے اس کا تذکرہ ہوا تک نہیں لگائی اور بھی
یہ لفظ اپنے نام کے ساتھ استعمال نہیں کیا، حال آنکہ دوسرے شعر لپٹنے
نام کے ساتھ اعز ازہی الفاظ عموماً استعمال کرتے رہے ہیں۔ مثلاً حضرت
دآغ نے نوح نادروی کو ناخدا مئے سخن خطاب دیا۔ اکبر الہ آبادی نے بھی انھیں
سربشاعرہ فصیح العصر کے الفاظ سے ڈاڈا۔ نواب سائل دہلوی نے حضرت
دآغ کی جانشینی کی سند میں جناب مہر گواریا، جناب نوح نادروی اور
جناب بارخ سنجلی کو لکھ کر دیں اور یہ اصحاب بھی طور پر خطاب اور جانشین

تخصیص

حضرت خواجہ اپنے نام کے ساتھ لکھتے رہے۔ اسی طرح جناب دول نے خطاب اعتبار الملک کو اپنے نام کا جو قرار دے دیا تھا۔ مگر میں نے ہمیشہ جو شمس لسانی لکھنا پسند کیا۔ اس کی وجہ طبیعت کا انکسار اور صرف انکسار ہے۔ میرے ایک مقطع سے میرے اس میلان طبع کا اظہار ہوتا ہے، خاکساری نے مجھے پاک بنایا، اے جوش!

ایک بھی داغِ رحمت مرے دامن میں نہیں
میں نے خطاب ابو الفصاحت کی مدد یا بی کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا
مداح، معروف، معتقد اور شاگرد

آج حضرت جوش ہندستان اور پاکستان میں رہا نہ ان کا دل اور شاعر مسلم اللہ سے ملے جاتے ہیں۔ ان کے تذمرات کی تعداد کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ جہاں اور وہ ان طبقہ ان کی حالی مرتبی کا قائل نہ ہو۔ بلند پایہ شاعروں، ادیبوں ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے۔

اُن میں ہندو برج موہن دتتا، تیرہ جوی، بخود جوی، ریاض خیر آبادی، گنگا جی، ناطق گلا دھوی، جگر مراد آبادی، ذاب اثر بھنوی، نیاز فتح پور، احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا غلام رسول ہر کے نام خاص طور پر قابل ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد تین سو سے تجاوز ہے۔ صرف پنجاب میں بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ پاکستان میں بھی ہیں اور ان کی زبان اور طرز بیان کی پیروی اُن کے لیے ہنر نہ جوہر یا ان ہے۔ میں سے جن کا کلام سنا اور پڑھا ہے اُن میں کمال کوٹہ، پوری، نسیم ذر جلی، جالندھری، ساسو سیالکوٹی، ہمارا زوی وغیرہ کو خوشگونی کے لحاظ سے متاذا ہے۔ حضرت جوش کے فرزند ارجمند جناب عرش لسانی نے اگرچہ ان سے کبھی اصلاً اس کے باوجود انھوں نے آپ کی روایات کے مطابق سخن طرازی کو کے ہندو میں بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی ہے۔ اصلاح نے اپنے کی وہر خاں

شخصیت

شقانہ کلام والد ماجد کو دکھاتے ہوئے جواب آیا۔ حضرت جوش نے آج سے بیس سال
یہ ملاقات میں مجھ سے فرمایا تھا، "موشش نے مجھ سے اصلاح نہیں لی، لیکن وہ میری
نام تحریریں بغور پڑھتے رہتے تھے جو میں اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے سلسلے
ازر کو پیش کرتا تھا۔ وہ میری انھیں تحریروں کے مطالعے سے خوش فکری اور خوش
کلامی سے بڑی واقف ہو گئے۔"

انگریزی نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی۔

در نظم جو بلند نامی کہیں ختم شد است بر نظامی
انظامی کی تقلید میں جوش سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ جوش کے دوست
ن کے کچھ ابتدائی اشعار سن کر جان گئے تھے کہ وہ ایک نہ ایک دن شعرو سخن میں
بیدار کیسے گئے۔ انھیں اپنے واحد فرزند کی شاعری اور سعادت مند پوجا فرما رہے۔ ایک
کے مسئلے میں لکھا ہے:

پر ہے جوش اتم کو فرزند چاہیے ایک ہو یا سپر، تو ایک بھی کچھ کہیں
حافظیہ، ابھینندن گزنتھ اور اسرار

حکومت ہند نے ۱۹۵۲ء میں ممتاز اور گہن سال شرفیہ اور دو کو ادبی وظیفے دینے
لیے، تو آپ کا نام نامی بھی وظیفہ یابوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ چنانچہ آپ کو
سترہ سو روپے کی طرف سے دو سو روپے ملا دیتے رہے۔ اس کے کئی سال بعد حکومت پنجاب
نے آپ کو اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں ایوارڈ دیا، جو ساراٹے، خلعت، گیارہ سو
روپے نقد کی تحفہ اور ایک مختصر سے ابھینندن گزنتھ پر مشتمل تھا۔ ۱۹۷۱ء میں حکومت ہند
نے آپ کو کمالات کی قدر شناسی کے طور پر پدم شری کا اعزاز دیا ہے جو میرے خیال میں آپ
تاریخی سے بدھما فرد تھے۔ اب آپ نے حکومت کو لکھ دیا ہے کہ ان کا ادبی وظیفہ
دیا جائے کیوں کہ آپ کو اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۹۷۷ء میں آپ کی شاعری کی ستر سالہ سال کی ہوئی، تو آپ کے شاگردوں معترفوں
عقد مندوں نے آپ کی خدمت میں ایک کتاب المناقب (ابھینندن گزنتھ) پیش

نتیجہ

کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض کے لیے دہلی میں مرکزی وزیر پنڈت گوندملہ پنپت مرحوم کی زیر صدارت ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں سربراہ آدرہ ادیب، حکومت ہند کے وزیر، پارلیمنٹ کے ممبر، علی گڑھ یونیورسٹی کے سینکڑوں شہید اریان اور دوسرے پنڈت پنپت نے آپ کو ایک ضخیم اچھیندن گزرتھ پیش کیا۔ اس میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے مقتدا اکابر کے علاوہ بہت سے شعراء و ہائیکو تصنیفی شخروں میں آپ کے کمال شاعری و زبان دانی پر کئی اعلیٰ درجے کے مقالے درج ہیں۔

تصانیف

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ بادہ سرخس، پہلا مجموعہ کلام، سال اشاعت ۱۹۴۱ء
- ۲۔ چوں و بوش، دوسرا مجموعہ کلام، سال اشاعت ۱۹۵۲ء
- ۳۔ فردوس گوش، تیسرا مجموعہ کلام سال اشاعت ۱۹۶۱ء
- ۴۔ خسرخ دیوان غالب (معدود) اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔
- ۵۔ دستور القواعد فارسی

۶۔ اقبال کی خامیاں

۷۔ دعوتِ عمل (نوی نظیں)

۸۔ آئینہ اصلاح (شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں مع توجہیں)

۹۔ مجموعہ رباعیات (یہ نیز ترتیب ہے۔ اس میں تقریباً دو سو رباعیاں ہوں گی۔

آپ نے ایک مکتوب میں مجھے بتایا ہے کہ ادبی مضامین نثر کے دو مجموعے ڈھائی ڈھائی صفحات کے خوش صاحب کی تحویل میں ہیں، جن کی اشاعت کی نوبت شاید اردو دشمنی کے اس دہر میں گھبی نہ آئے۔ کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی تھا، مگر ان بیاضوں کو دیکھ ایسی ہی طرح چاٹ گئی کہ دماغ کاغذ کا ٹکڑا بھی نہ بچ سکا۔ تیسرا مجموعہ کلام فردوس گوش کی اشاعت (۱۹۶۱ء) کے بعد جو اشاعت کے ہیں، ان کی تعداد دو ڈھائی سو کے درمیان ہوگی۔

مشاعر میں

انہوں نے ہندستان کے بیشتر شہروں کے مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ وہ شاعرے میں ٹھیک وقت پہنچ جاتے ہیں اور شعر اور سامعین کو اپنی آمد کا شدید انتظار نہیں کراتے۔ میں نے بار بار دیکھا ہے کہ آپ اپنے کیرئرن اور پایہ محنوری کو کیر نظر انداز کر کے سطح کی کسی عزیز نایاں جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں مگر دوسرے شعراء و منتظم مشاعرہ جلد ہی انہیں اٹھا کر کاؤتیکے کے سہارے صدر میں بٹھا دیتے ہیں۔ پھر جو لوگ آتے ہیں وہ آپ کو مؤدبانہ سلام کر کے غالی ہنگہوں پر بیٹھنے کے بعد آپ کی نہایت سادہ وضع قطع دیکھ دیکھ کو حیران ہوتے رہتے ہیں۔

مشاعرے کے آداب کا ہمیشہ پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ آجکل ایک بہت بڑی بد تیزی یہ چل رہی ہے کہ اکثر فحش، نیم فحشہ انداز ناچنے حضرات اپنا کلام پڑھنے کے بعد مشاعرے سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی غرض محض اپنا کلام سنانا ہوتی ہے، اور انہیں دوسروں کا کلام سننے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ غور کیا جائے تو یہ لوگ جو اپنا دھول پیٹ کر مشاعرے سے چلے جاتے ہیں، دراصل ان لوگوں کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں جن کے پڑھنے کی ذمت اس وقت تک نہیں آئی ہوتی۔ حضرت جوش ان مشاعروں میں مگر جن میں بڑے بڑے اساتذہ مثلاً، محمود دہلوی، سائل دہلوی، کھنٹی دہلوی، سائر دہلوی، فوج ناروی، دل شاہ جہانپوری وغیرہ شامل ہوتے تھے، اپنا کلام فصاحت و انعام پڑھنے کے بعد اختتامِ مشاعرے تک وہاں سے نہیں اٹھتے تھے۔ اب تو آپ کو آدابِ مشاعرہ کے علاوہ اس وجہ سے بھی آؤتھک بیٹھنا پڑتا ہے کہ شاہیر اساتذہ میں آپ ہی کا وجود مسعود باقی رہ گیا ہے اور ہر شاعرے میں آپ ہی کا کلام مقطع سخن ہوتا ہے۔

البتہ کل کے مشاعروں سے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ یہ مشاعرے نہیں، تماشا گاہ ہیں۔ میں بھی اس احساس میں ان کا شریک ہوں۔ میں نے پُرانے مشاعرے دیکھے ہیں۔ شعرا ایک سطحے میں بیٹھتے تھے اور سطحے کے گرد اور سامعین کے لیے جگہ رکھی جاتی تھی۔ پڑھنے والے شاعر کے مخاطب شعراء ہوتے تھے۔ وہی اس کے سخنِ حقیر اور سخنِ بیان کی داد دیتے تھے۔ اب کیا ہوتا ہے؟ ایک ایسیج بنائی جاتی ہے جس پر ایسے بیکر بڑی معنی کلام پڑھنے والوں کے نام کا اعلان

شخصیت

ہوران کا تعارف کوئے والا شخص سب سے آگے بیٹھتا ہے اور اچھے برے سب شامل اس کے پیچھے کچھ فاصلہ پر ایک صف کی شکل میں بیٹھ جاتے ہیں، اسٹیج سکرٹری شاعر کا نام پکارتا ہے اور شاعر سامعین کو جو اینٹوں اور پتھروں سے کچھ زیادہ سوچھ بوجھ نہیں رکھتے، خطاب کر کے کلام سُنا تا ہے۔ شعر اور سلی پھلی صفوں میں کھسک کر باتیں کرتے ہیں یا لیٹ جاتے ہیں۔ میں نے ایک مشاعرے میں ایک پختہ گوشاوار سے کہا کہ آپ ذرا آگے آکر بیٹھیں تو انھوں نے جواب دیا: یہیں اچھا ہوں۔ آگے بیٹھنے پر داد دینے پڑ گئی :

حضرت جو ش اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ روح ناردی نے ایک جگہ لکھا ہے :
 "اس زمانے میں شعر اکلام کے عیوب پھیلنے کے لیے ترم سے کام لیتے ہیں
 مگر میری طرح یہ (روح ملیانی) بھی ترم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے !
 تحت اللفظ میں اپنا کلام سُنا تے ہیں۔ سامعین اور حاضرین اُن کے
 تحت اللفظ کو سن کر ترم کی ذرا پروا نہیں کرتے :

داد دینے کا طریقہ

حضرت جو ش اچھے شعری داد دینے میں کبھی بھل سے کام نہیں لیتے اور دو ستر نام نہاد شاعروں کی طرح خاموش رہنا پسند نہیں کرتے۔ آپ جدیدوں کے بستے لگے اور بھل کلام سے بیزار ہیں ! مگر اُن کی تصنیفات سُنے اور چُپ رہتے ہیں۔ مجھ سے بعض بر خود غلط شاعروں نے کہا کہ جو ش ملیانی صاحب ہمارے کلام کی داد نہیں دیتے۔ میں نے جواب دیا کہ جب آپ کے اشعار میں لٹیٹی ہوئی راہیں، سہمے ہوئے سائے، سیگوں خاموشیاں کی سی ترکیبیں آئیں اور آپ ایسے اشعار لکھیں، جیسا یہ ہے :

رات دُگ جاتی ہے جب ذہن پریشاں کے قریب

درد کے بھول چکے ہیں رُگ جاں کے قریب

تو حضرت جو ش آپ کو دودے کو زبان، فن اور خوش خدائی کا خون کیلے گوارا کر سکتے ہیں ؟ کبھی کبھی آپ کی داد میں پڑی پُر لطف معنویت بھی ہوتی ہے۔ اس قسم کی دلو کی مثال پیش کرنے سے پہلے ایک واقعہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میرے نانا اور پرانا نانا فارسی زبان ولاد

شخصیت

جید عالم ادغاسی سخن طرازی میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ جب میں پندرہ سال کا تو میرے نانا نے مجھے چار پانچ لغت کی مستند کتابیں باہم اشترے تیسے تہمت تک دے جانے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ جن الفاظ کے معانی تمہیں معلوم ہیں، انہیں بھی پڑھو۔ اس پر میں نے فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی، بہارِ نجم اور فرہنگ آئندہ راج دھڑالیں، ان لغتوں میں سے ایک میں لفظ عذرا کے متعلق لکھا تھا: "نام مشوقہ عرب عالم لیسے" وغیرہ۔ مجھے لفظ "عالم" نے بید لطف دیا۔ "اگر دُنِ قسَم یاقبیل لکھتا تو بتا ہی رہتی لیکن جو خوبی "عالم" میں تھی، ہرگز پیدا نہ ہوتی۔ ایک شاعرے میں ایک شاعر جو اپنے آپ کو روح القدس کا ہنر بان سمجھتے تھے، بالکل غیر مربوط اور بہت بے ٹکے اشعار تھے۔ جو شخص صاحبِ چپ بیٹھے رہے، مگر جب انہوں نے آغوشِ شرمات بٹھا ہوا ہی قدر اچھا پڑھا، تو آپ نے فرمایا: "وہ کیا صحت مند شعر پڑھا ہے"۔ مجھے یہ تو معلوم میں کہ اور لوگوں نے لفظ "صحتمند" کی معنویت کا لطف دیا یا نہیں، مگر میں دل ہی دل میں دیر تک اس کی داد دیتا رہا۔ اب بھی یہ لفظ یاد آجاتا ہے تو مجھ سے مگن ہوں۔ جو خوبی مستند میں ہے، وہ صبح میں کہاں۔

عروں میں جیسا کلام پڑھا جاتا ہے تو اس کے بہتر تھے سے آپ کی طبیعت کا منقض جانا قدرتی امر ہے۔ آپ کی ایک غزل کے یہ دو شعر آپ کے احساس کا اظہار کرتے ہیں: "یہاں ہم سخن میں بھی ہو اسے مشکل بد مزہ صحبتِ یار ان کہیں ایسی تو نہ تھی"۔ ہے جو کچھ بھی نکل جائے بجا ہونے لگتا

طرحِ بازی

نہ طرح بازی نہیں آتی۔ میری اہلیہ نے مجھے سکھانی چاہی تھی، لیکن میں نے اسے دبا لیا کہ کچھ کو سکھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے جناب شیش چند طالب دہلوی سے جو بہت اچھے طرح یاد میں، حضرت جوش کی بڑی تعریف سنی ہے۔ طالب صاحب کا بیان ہے کہ آپ ہندستان اور پاکستان میں نہایت سرمد آوردہ طرح بازی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لذت ہری چند اختر مرحوم نے لکھا ہے: بار بار دیکھا گیا کہ آپ ایک صبح سے دوسری صبح تک

تخصیصیت

شطرنج کھیلنے رہے اور اُسے بھی تو صرف اس مجبوری سے کہ دنیا اس انہماک کو دیکھ کر کہنا
 کیسی؟ آپ نے شطرنج کے متعلق ایک بیاض میں بہت سے مشکل مشکل نکتے درج کر کے
 ان کے حل بھی بتائے ہیں۔ آپ کے بعض اشعار میں شطرنج کی اصطلاحیں اور تشبیہیں بڑی
 عربی سے استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً

بکھتے خوب تھے ہم شاطر دروں کی جاؤں کو مگر نقشہ بڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں
 مجھ سے جاننا ذکر غربت ہے بساط شطرنج جو نہ پلے نکلیں واپس وہ پیادہ میں ہوں
 طالب صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے فرزند عبدالعزیز عرش مسیانی صاحب بھی شطرنج
 کی طرح شطرنج بازی میں بھی کمال رکھتے ہیں اور کوئی شطرنج کھیلنے والی جاتے تو اُن کے
 ساتھ تین چار بازیاں کھیلے بغیر نہیں اٹھتے۔

حلیہ، لباس، خوراک

آپ کا ہر ہر آدمیائی، رنگ کھانا ہوا بچپنی اور قد درمیانہ ہے۔ کہن سالی کے باوجود
 آپ کی کمر نہیں ٹھکی۔ آپ لباس میں خاص طور پر گھر کے معمولی کپڑے کی سفید گہری سفید
 قمیص اور سفید دھوئی کو کافی بکھتے ہیں اور عام طور پر اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ سردیوں
 میں کپڑے فروز اور ڈھلیٹے ہیں۔ آگے کوٹ اور پاجامے کو دفتر کی وردی بکھتے ہیں، لیکن کبھی
 کبھی کبھی موسمِ سالات سے مجبور ہو کر معمولی بندھے کا کوٹ اور پاجامہ پہن لیتے ہیں۔ سردیوں
 میں جواہروں کے دو جوڑے کفایت کرتے ہیں، اودان کا استعمال بھی دورانِ سفر میں ہوتا
 ہے۔ بوٹ کبھی نہیں پہنا، ہمیشہ ویسی جوتا ہی پہنتے ہیں۔ کھانے پینے میں تکلف کا قطعاً
 دخل نہیں۔ جوں جاتا ہے خدا کا شکر کر کے کھاپی لیتے ہیں۔ عمر بھر گوشت اور شراب کو
 چھوٹا نہیں، درحالے کہ پنجاب کے برہمن دوسرے صوبوں کے برہمنوں کے برعکس
 گوشت اور شراب برسرِ عام کھاتے اور پیتے ہیں۔ سادگی اور بے تکلفی آپ کی زندگی کے
 تمام پہلوؤں پر چھائی ہوئی ہے۔ آپ دستار، رفتار، گنبد اور کردار کے لحاظ سے ایک
 سیدھے سادھے دیہاتی نظر آتے ہیں۔ تنہا کوئی آپ کا مرغوب مشغل ہے لیکن وہ بھی
 حد اعتدال تک۔ آپ ایک با صبح دوسری بادشام اور تیسری ہادرات کو حقہ پیتے ہیں۔

شخصیت

آپ نے پچھلے سال مجھ سے فرمایا تھا: میں حقہ پینے کی عادت ترک بھی کر سکتا ہوں۔ آپ
میں کو انیس سو تہائی لکھتے ہیں۔ اس کے متعلق آپ کی ایک غزل کے یہ تین شعر قابلِ دید

ہے:

نارِ صبح سے پہلے نہ کی تدبیر تھی کی تمہارے گھر میں فریادی رہی تقدیر تھی کی
ہمارے مولوی صاحب بھی دیکھتے ہیں حقہ کا دھوئیں کے ساتھ اڑ جائیگی اب تکفیر تھی کی
میر لکھنؤ کا اس پر خوشبو خوش کی بیچے میں بلائیں لے رہا ہے خطہ کشمیر تھی کی

صحت

خدا کے فضل و کرم سے آپ کی صحت ہمیشہ اچھی رہی ہے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ
بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔ ایک شاعر کے اختتام پر جب آپ ایٹم سے اترنے لگے
تو میں نے سہارا دیئے کے لیے آپ کا بازو دھکا۔ آپ نے فرمایا: ”آپ مجھے سہارا دیں۔
میں آپ کو سہارا دیتا ہوں۔“ اسی وقت میری زبان پر یہ شعر آیا ”جو میں نے اس لیے نہیں
پڑھا کہ اس میں حضرت یا جناب کا لفظ آپ کے غلصے سے پہلے نہیں آیا تھا۔“

کیا صحت جو شہسپائی دیکھی پیری کے لباس میں جوانی دیکھی
میں نے ایک خط میں آپ کو لکھا تھا کہ میں آپ کو جوانوں سے جوان کر رہا ہوں۔ اس جواب
میں آپ نے تحریر فرمایا:

میر سے ایک مقامی شاگرد بلونت کمار ساگر اپنے بھائی سے ملنے فیض آباد
گئے، تو انھیں خیال ہوا کہ لکھنؤ بھی دیکھنے چلیں۔ وہ لکھنؤ میں آج لکھنؤ
اور آج لکھنؤ سے ملنے کے بعد پٹت آنند نائن لٹری کو ملے گئے۔ اُن
دونوں صاحبِ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ملا صاحب نے وہ ان لکھنؤ میں
پوچھا: آپ جو شہسپائی صاحب کو جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا: ”میر
اُتار دیں۔ اس کے بعد میری صحت کے متعلق دریافت کیا، تو اس نے کہا
طلب صاحب کی لاٹھ پرستے میں دم لیے بغیر چڑھ جاتے ہیں۔ یہ سُن کر
ملا صاحب بہت سنبھلے اور کہا: آپ نے صحت کا معیار غُوب بتایا۔ اس

شخصیت

میں شک نہیں کہ ستر سال کی عمر میں میری صحت ایسی ہی رہی۔ طلبِ حکمت کی لالچ پر پی اواقعہ دوبارہ ہوا، دم لینے بغیر چوٹی پر پہنچا۔ دو جوان عزیزوں کی رفاقت تھی۔ واپس آیا، تو دیکھا، وہ دونوں آدھا آدھینڈے کے دم لے رہے تھے۔

آپ کے سفر میں ایک بھی دانت نہیں ہے۔ دوبارہ مصنوعی دانت لگوائے، مگر پندرہ آنے کی وجہ سے نکال کر پھینک دیے۔ آپ کے سٹوڈنٹ اتنے سخت ہو گئے ہیں کہ دانتوں کا کام دیتے ہیں۔ آپ کا بلڈ پریشر (فشارِ خون) ۱۷۲ ہے جو عمر کے لحاظ سے درجہ اعتدال ہے۔

خلقِ عظیم

آپ اخلاقِ حمیدہ کا ایسا مجسمہ ہیں جس کی نظیر بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ وسیعِ اقلی، کوہِ انفسی، پاکِ مشربی، عقلِ جمودِ انحار کا آپ کی طینت میں جو رہا ہو، اسے دیکھ کر آپ کو فرشتہ بقالبِ انسان تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنے بایہ کال اور عالمگیر شہرت سے بے خبر نہ بننے کے باوجود ایسے دکھائی دیتے ہیں، جیسے دنیا کے آپ کو بیغزورت ایک بلند ترین مقام و مرتبہ دے دیا ہو۔ آپ جو اژدہاں سے بھی جو عمر کے اعتبار سے آپ کے نواسوں کے برابر ہیں، اپنی بزدلی کا مطلق خیال نہ کر سکتے ہو، ہمسازہ طریق سے ملے ہیں اور انھیں یہ احساس نہیں ہوتا دیتے کہ اس عہد کا عظیم شاعر اور مصلحِ زبان اُن کو طوطے سے فروتر سمجھتا ہے۔ میں نے دلخ، امیرِ تسلیم، علی اور جلال کے بڑے بڑے نامور شاگردوں کو دیکھا ہے، لیکن جو صفات آپ میں پائیں وہ اُن میں سے کسی میں نظر نہیں آئیں۔

میں نے پچھلے سال ایک خط لکھ کر آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ وہلی تشریف لائیں، تو مجھے مطلع فرمائیں، تاکہ میں آپ کے فرزندِ ارجمند کے دولکے سے پرستش کو کچھ دیر آپ کی خدمت میں بیٹھا کی سعادت حاصل کر دوں، آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا: "میں نے آپ کا بتایاداشت کے گناہ میں کچھ لیا ہے۔ جب آؤ گھا، آپ کو اطلاع دوں گا۔ میری دختر کا مکان ساؤتھ ٹیلنگر میں ہے۔ جب وہلی جاتا ہوں، تو وہاں بھی ضرور پہنچتا ہوں۔" اس

شخصیت

رات سے میں یہ سمجھا کہ آپ ماڈل ٹاؤن کی بجائے مجھے ساؤتھ ٹیلنگ ٹریڈنگ، ہوائی سٹیل
تربیب ہے۔

میں ۱۲ اگست ۱۹۷۰ کو دو پہر کا کھانا کھا کر لیٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد گھنٹی بجی، تو
مے ملازم نے مجھ سے کہا: "بوش ملیانی صاحب تشریف لائے ہیں؟ میں تیسری منزل
نہ اتر آؤں کیا دیکھتا ہوں کہ آپ دشوار گزار زمینے کے کمرے دوسری منزل پر پہنچ گئے ہیں۔
آپ کی پیشانی حرق آلود تھی اور نہ آپ کا سانس جلد جلد جل رہا تھا۔ آپ مجھے دیکھ کر
بے لب کمرائے۔ میں غم سے زمین میں گر پڑ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آپ
قدم و بھر فرمائی کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔

وقت انتہائی تیز و خوب اوج میں ہوا کی وجہ سے مجھے نہایت شدید تھی۔ آپ چھتری
ماہنیں لائے تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کا ایک سعادت مند دوست تھا۔ اس عزیز نے
ایک ہم ایسٹ ٹیلنگ ٹریڈ میں اُس طرف سے داخل ہوئے، جس طرف سے یہ مکان بہت
دست ہے۔ میں نے ملازم سے کوکا کولا لالے کو کہا، تو آپ کے ذمے لے اسے روک دیا اور مجھ
سے کہا: "آپ ان کے سامنے ایسی چیزوں کا نام بھی نہ لیں، یہ سُن کر مجھے معلوم ہوا کہ آپ
اری سروبات کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔

ذی باتیں ہوئیں۔ پھر آپ نے مجھ سے کلام سننے کی فرمائش کی۔ میں نے دوسرا لیں سنائیں۔
میں نے بعد مجھے آپ کی زبان مبارک سے آپ کا بید پر لطف کلام سننے کا شرف حاصل
ڈالا۔

میں آپ نصحت ہونے لگے، تو میں نے ساؤتھ ٹیلنگ ٹریڈک شایعت کوئی چاہی مگر
پہلے بہت اصرار فرما کر مجھے روک دیا۔ بہر حال میں مکان کے دروازے سے دس بارہ
ہم آپ کے ساتھ چلا اور آداب عرض کر کے پانچ سات ہی قدم گھر کی طرف واپس چلا
تھا کہ آپ نے مجھے آواز دی۔ جب میں آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے فرمایا: "میں ایک
یہاں آدمی ہوں۔ آپ میری بچھڑی، تمہیں اور دھوتی دیکھیے۔ اسی طرح یہاں چلا
یا۔ میں نے کہا: "حضرت سلامت! آپ نے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا ہے۔ اب

شاعری

میں کہوں، تو کیا کہوں؟

آپ کے تشریحات لے جانے کے بعد مجھ پر دیگر تک عالم حیرت طاری ہوا۔
 اگرچہ آپ کی شخصیت کے کئی پہلو ابھی تشدد تحریر شدہ گئے ہیں، مگر میں بغضاً کو قدر نظر
 رکھتے ہوئے یہیں قلم کی مددائی روک دینے پر مجبور ہوں۔ آئندہ صفحات میں آپ کے کمال
 سخنوری کا جائزہ دیا جائیگا۔

۲۔ شاعری

حکیم رکن تاج کاشی اپنے زمانے کا بہت بڑا حکیم و طبیب، بہت بڑا عالم اور بہت بڑا
 شاعر تھا۔ اس کے تعلق کہا گیا ہے کہ اس کی حکمتِ طبیعت پر اور شاعری حکمت اور طبیعت
 دونوں پر پردے ڈالے رہی۔ جامع کمالات حضرت ابو الفصاحت بھی کمالِ جامعیت
 کے اعتبار سے عہدِ حاضر میں منفرد ہیں، لیکن آپ کے کسی ایک کمال نے دوسرے کمالوں
 پر پردہ نہیں ڈالا۔ آپ کی طبیعت، زبانِ ادبی اور شاعری پر پردہ غایتِ تابانہ و درخشاں
 نظر آتی ہیں، اعدیہ ایسا حسنِ اتفاق ہے جس کی مثالیں دنیا کے علم و فن میں بہت ہی
 کم ملتی ہیں۔

طبیعت اور زبانِ ادبی کا تعلق اکتا بجے ہے۔ ان میں کمال پیدا کرنا مشکل و ضرر ہے لیکن
 دشوار ہرگز نہیں بشرطِ کہ حصولِ مقصد کے لیے عرقِ ریزی اور جانفشانی میں ذرا کمی نہ کر دے
 اٹھا رکھی جائے۔ ان کے برعکس شاعری اکتا ب سے نہیں آتی۔ اس کے سحر انگیز ہونے
 کی اساس خداداد ہوتی ہے۔ یہ دیکھی سے سیکھی جاسکتی ہے، اعدیہ کوئی سکھا سکتا ہو۔ حسن
 الفاظ کا نظم کرنا سیکھ لینے یا سکھا دینے کو شاعری سیکھ لینا یا سکھا دینا نہیں کہا جاسکتا۔
 حضرت ابو الفصاحت کا ملکہ شاعری وہی اور عطیہ الہی ہے۔ آپ نے اعدیہ شاعری کو
 حسنِ نقل و حسنِ بیان کے لحاظ سے جس مقام پر پہنچا دیا ہے اس کی برتری آپ کی
 مختلف انواع استعداد میں غنی کو دی گئی تھی۔ اگرچہ آپ نے حضرت فصیح الملک
 کی شاعری پر ہمیشہ فرمایا ہے۔ مگر دراصل یہ تعلق برائے نام ہوا۔ آپ کا معنوی اثر اور

شاعری
قابل اعتراض نہیں سمجھے جاتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ اچھے لوگ
پیتے تو کھانا تناول ہونے کے باوجود زبان باز اداری سے معاشرت کرتے تھے، جس کا علم اُن
کے اقربا اور حکومت کے اربابِ نظم و نسق کو ہوتے ہوئے بھی انہیں اس روش سے باز نہیں
رکھ سکتا تھا۔

حکیم مومن ایک مریضہ کی بغض دیکھتے وقت اُس پر عاشق ہو گئے اور انہوں نے اپنے
اس معاشرے کے موضوع پر ایک مثنوی لکھ ڈالی۔ اس میں ابتدا سے عشق کا واقعہ یوں
بیان کیا گیا ہے:

کیا نگاہ دستِ دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ
اسی طرح نواب مصطفیٰ خاں سرتی و شفیقہ نازول کی ایک رند ہی راجنامی پر شیعہ تھے۔
انہوں نے اپنے تذکرے گلشنِ بختار میں اس کا ذکر بڑی بیباکی سے کیا ہے۔
حضرت ضعیف الملک کی مثنوی فریادِ غم میں اس کے معاشرے کا نقشہ ہے، بارہا شائع
ہوئی اور ترز بانا اور شیریں بیانی کے باعث انتہائی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ اُن کی
معشوقہ کلکتے کی ایک رند ہی مہمانِ حجابِ قلعہ تھی، جس کے جوڑ و صل کی کیفیت انہوں
نے بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس معاشرے کے زمانے میں ان کی عمر ۵۰ سال کے لگ
بھگ تھی۔ انہوں نے حجاب کے قصے کی تعریف یوں کی ہے:

۱۔ وہ چمکتی ہوئی کمر آ آ
وہ اُٹکتی ہوئی نظر آ آ

۲۔ رقصِ طافِ باغ سے اچھا
شوقِ لطفِ داغ سے اچھا

اور تو اور انہوں نے وفات سے چند سال پہلے اُسے کلکتے سے حیدر آباد بلایا اور اس سے نکاح
کرنے کی ٹھان لی۔ اگر اُن کی لے پالک بیٹی لاڈلی بیگم اور اماد نواب سراج الدین احمد
سائل دہلوی کی طرف سے متواتر در اندازیاں نہ ہوتیں، تو سترے بہترے قوہِ ضعیف الملک
بہادر نظام کی اجازت سے درج پہلے ہی حاصل کوئی محو تھی، اسے ضرور اپنی بیگم بنا لیتے۔
امیر مثنائی نے جو مولوی مفتی اور دارالقصا کے صدر تھے، غالباً زبانِ بلا اداری سے عشق

بے ہوشی کی شکایت کیا کریں ^{اتحاد بکلام}
 توہم کر سکتا ہوں، لیکن کیا کروں
 اپنا دوا داری بھی اک الوام ہے
 پار سائی بھی بہت بڑا نام ہے

جلانے اے فلک، تو نے چھا خزاہ و انجسم بھی
 بظا کا ہے اندھیرا پھر بھی تیرے شاطی میں
 اٹھیں گی اٹھیاں اے جوشس، ہرگز بزم میں تم
 چلیں گا پار سائی کا نہ سگہ اس زمانے میں
 ہم ماہِ شرمیں چل نہیں سکتے کوا کے ساتھ
 رہتے ہیں آدمی کی طرح آدمی کے ساتھ
 چہرہ کا کس قدر ہیں محبت کے سلسلے
 دور و ز بھی نہیں کسی کی کسی کے ساتھ

خدا ہی قسم ہے، تمھاری قسم
 صداقت تو یہ ہے، صداقت نہیں
 بہت ہیں چھن آشیاں کے بے
 خدا ہی کسی کی وراثت نہیں

تار کا کوئی بسحق کا مدعا نہ ہے
 خدایا پرست بھی کہنے لگے، خدا معلوم
 کہنے کے مسائل و چھیز، اے خدا!
 مری نظریں تو معلوم بھی ہے نامعلوم
 دُجواں تو دو دُجواں تھا، لیکن ہم محفوظ آتے
 تو کس گل کے آتے ہی پر لوٹ بھی گلو ادوں میں
 بول گلوے فصل بہاری! کہتے ہیں تو کہتے دے
 لیکن یہ تاکید ہے تجھ کو گل نہ کھلیں گلو ادوں میں

بھگوا آج بھی ہے کل جو تھا سچ و برہن میں
 بختے رات دن پیدا کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے
 یہاں ہے تمھاری آنکھ ہر میاں کے حق میں
 مگر آکھ خود و بیاد کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

پی لوگے تو اسے شیخ! ذرا گوم رہو گے
 ٹھنڈا ہی نہ کر دیں تمہیں جنت کی ہوائیں
 وہ غلط بھی کچھ کہیں گے، تو وہی بجا رہیگا
 جو کل گیا زبان سے، وہ کھل گیا زبان سے
 شرفی صبی نے کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو
 در در زنج پہ رو کے گئے، جنت کیسی
 میں نے کہا تو یہ تھا کہ تقصیر موعاف۔

اس کے جواب میں بڑھاپا کچھ نہ پوچھیے
 سہ پردہ نشیں! دیکھیہ دن رات کچھ۔
 میں گڑ تو نہیں ہوں۔ ترے کوچے کی زمین کا
 باتوں باتوں میں جو کچھ میں کہہ کر گیا
 تنہا کے ذرا نہ گئے مسیبات ہے

مجھے آپ کے اس بیان سے اختلاف ہے۔ ان اشاری زبان حضرت فصیح الملائک
 کے عمومی کلام کی زبان سے نہ روایتی عبارت ہے، مگر پردہ دارانہ اور یہ ایسا بیان آپ کے اپنے
 ہی میں۔ غزل کی زبان محدود ہوتی ہے اور شاعر اس محدود زبان کے استعمال کو سنہ
 پر مجبور ہوتا ہے جس سے مشابہت کی وجہ سے سوتیلی بھتیجی آتی ہیں معلوم ہوتا ہے
 آپ نے جوش عقیدت میں اگر مندرجہ بالا بتائے شاعر کے ہیں۔ حضرت فصیح الملک نے
 پہلی جوش و شمع میں اپنے اتار و ذوق سے منزلوں آگے بھل گئے تھے، چور لغ سحری ہو جانے
 کے زمانے میں لکھ دیا تھا:

یہ بہار دماغ ہے کھنڈ اور بار۔ میر کی
 ذوق کہتے ہیں بہار، انہیں اس بات کا

ذوق اور حضرت فصیح الملک کا کلام ایک دوسرے سے جتنا مختلف ہے، اس کے بیان
 کی ضرورت نہیں۔ بہر حال ان خواہاں تھیں سے حضرت فصیح الملک اور حضرت

شاعری
ابوالفصاحت کی احساس شناسی اور محسن پرستی کی وہ شریفانہ صفت ظاہر ہوتی ہے جس کا عہد حاضر میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ سچ کل ایسے لگ بکثرت ملیں گے جو استادوں سے سالہا سال اصلاح لینے کے باوجود اپنے آپ کو ان کا شاگرد ماننے سے مطلقاً انکار کر رہے ہیں۔

حضرت ابوالفصاحت خدا کے گھر سے پاکیزہ طبعی لے کر آئے ہیں اس لیے انھیں شرف اور شائستگی کا ہمیشہ خیال رہتا ہے جس طرح ان کی زندگی تہذیب و طہارت کی مثالی زندہ گئی رہی ہے، اُسی طرح ان کا عاشقانہ کلام بھی آواز سے آخر تک افلاطونی معیار عشق کے مطابق تمام کمزوریاں سے مبرا اور متحرک رہا۔ آپ نے اس جام دستان کی بازی میں کبھی مات نہیں کھائی، بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ وہ تلوار کی دھار پر چلنے رہے مگر پاؤں کو گز نہ پہنچنے دیا۔

انھوں نے غیر فصیح الفاظ و تراکیب ترک کرنے کے ساتھ ہی ناشائستہ، اخلاف تہذیب و تراکیب اور متبذل مضامین بھی جو اردو ادب و ادب میں عام تھے اور وہ اپنے دائرہ کلام کے اندر نہیں آنے دیے۔ میں یہاں اس قسم کے مضامین کا ذکر کرنے کے ساتھ حضرت فصیح الملک کے اشعار سے (جو مجھے یاد رہ گئے ہیں) مثالیں بھی دوں گا۔

بوسہ اور بوسے:

دل کی قیمت ایک بوسہ ہے صنم	آگے جو آئے ترے ایمان میں
ہیں رُخِ نازک پر گنتی کے نشان	کس نے بوسے تیرے گن گئے کیے

سینہ:

یہ سیر ہے کہ دوپٹا اڑا رہی ہے صبا	وہ جب چھپاتے ہیں سینہ، کمر نہیں چھپتی
کس طرح لیکھا بلائیں کوئی اسودہ خاک	کچھ نہ پہنچے ترے گیسو جو کمر تک پہنچے

زلف :-

جال زلف سیاہ نے مارا	تیرا کف و گماہ نے مارا
----------------------	------------------------

گیو۔

تم کو آشفۂ مرہوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کوڑیٹھ موندے گیسو
جو بن:

ادھو بن پہ قیامت کی جوانی آتی
ہاتھ میرا جو ترے سینے پہ اکڑ
ہم آغوشی!

شوق میں ایک فتنہ قامت کے
ہم گلے مل گئے قیامت کے

عروانی!

بڑا ہی لطف ہو خلوت میں ہوں لپکا رہا
ہمارا ہاتھ سینے پہ تھا اور ہاتھ گود
رکا کھٹا!

تم کو ہے وصل غیر سے انکار
اور جو ہم نے اُکے دیکھ
ابتدال!

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو ردا ہے شمار
ہر جانی معشوق!

سو گھر وہ پھر کرتے ہیں اس گھر سے نکل کر
کیا پاؤں نکالے دل مضطرب سے
بدکردار معشوق!

کیا رہیں ہم کہ ترا چال چلن
پاس رہ کر نہیں دیکھ جاتا

بے وقور معشوق!

نکل کر تم بھی آغوش سے اس حال کو پہنچے
کہیں سے پہل فیاد امن کہیں سے کیا
مڑے کا حکم!

مر گیا میں تو نہ سمجھو کہ بلا سے چھوٹے
بندہ پرور! یہ محبت ہے محبت
خلو!

عکس بھی لٹنے میں چار گھردی بعد آیا
بڑھ چھٹی حد سے سوال کی نزاکت
بے غیرتی! لے شب وصل غیر بھی کافی
تو مجھے آزما لیتا کب تک؟ (ہو)

شاعری
اس سے ظاہر ہے کہ آپ کا تفریل دوا تھی ہونے کے باوجود کس حد تک مدد مل سکتی ہے۔
حضرت فصیح الملک کے متاثرہ گزروں میں سے کسی نے اس قسم کے اصلاحی اقدامات نہیں
کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ ابتذال اور رکاوٹ کی بھرمار سے لگتا
اور یقیناً نہ ہو کر رہ گیا۔

حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کے متعلق ابنِ خلدون کی بحث سے مستفاد ہوتا ہے کہ انشا پر دازی کا
ہنر نظم و نثر میں صرف الفاظ سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ الفاظ اصل ہیں اور معانی ان کے
مائع۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، اس لیے ان کے لیے کسی ہنر کا اکتساب ہی ضرور
ہیں۔ اگر ضرورت ہے، تو اس امر کی کہ معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا جائے ان الفاظ
کو پیرا اور پانی سمجھو پانی کو چاہو سونے کے پیرے میں بھر لو اچا ہونسی کے پیرے میں پانی
کی ذات میں کچھ فرق نہیں آئے گا، مگر سونے کے پیرے میں اس کی قدر بڑھ جائیگی۔ اگلیج
معانی کی قدر ایک فصیح کے بیان سے بڑھ جاتی ہے، اور غیر فصیح کے بیان سے گھٹ جاتی
ہے۔

حضرت ابوالفضل احمد کے ایک شعر سے لوگوں کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ آپ حسنِ بیان کو پہلے
دیکھتے ہیں اور حسنِ تخیل پر بعد کو غور کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے۔
مقدم جانتے ہو، جوش، اتم اک حسنِ معنی کو
مگر ہم دیکھتے ہیں شعر میں حسنِ بیان پہلے

آپ نے مجھے دد ان گفتگو میں بتایا کہ شعر میں حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کا امتزاج بحدہ دمسالہ
ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی ارشاد کیا کہ میں صرف زبان کے خزانے کو دیکھتا ہوں اور عقلاً نہیں سمجھتا۔
میرے نزدیک زبان اور بیان کی خوبی کے ساتھ مضمون بھی عمدہ ہونا چاہیے، جو شعر نقل کیا
گیا ہے اس کے مخاطب دراصل جدید شاعری کے علم بردار ہیں جو علمِ بیان سے قطعاً ناواقف
ہونے کے باعث اپنے خیالات کے اظہار کے لیے خلافِ عمل الفاظ استعمال کر کے شعور
اہل پیدا کرتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ جہاں عمدہ اسلوبِ بیان کے بغیر عمدہ
اپنی جگہ دیک نہیں دکھا سکتا اور بہت مضمون میں ملندی نہیں آتی، دامنِ محض عمدہ

شاعری

اسلوب بیان پر شعر کی خوبی کا انحصار نہیں ہوتا۔ سعدی نے خوب کہا ہے:

جامد از دینقی و دیبا نسترد بر عروس نازیب

آپ کا سارا کلام پڑھ لیجئے جن تغزل اور حسن بیان ہر جگہ شیر ذکر نظر آئیگا اور وہ میں نہایت قابل تعریف قدرت اور جدت ملیں گی۔ اور د شاعری میں اس کی ابتدا اب تک مضمون کے بیان پر سبھاری اور بیان کے مضمون پر بوجھل ہونے کی مثال دیکھنے میں آتی ہیں جن سے انھیں شعر کو شدید گزند پہنچا رہا اور پہنچتا ہے۔ آپ میں یہ قباحات کہیں نہیں پائی جاتی۔ آپ کا ذوق سلیم اور وجدان صحیح شعر کو رٹا ڈھالتا اور کاٹنے میں تولتا ہے اور اگر اس میں کہیں ذرا بکلی کو کرکسرہ جاتی ہے آٹک کر دینے میں ذرا بھی مضائقہ نہیں کرتا۔ آپ قوت متخیلہ کو ہمیشہ قوت میسرہ دیکھتے ہیں اور یہ ایسی بات ہے جو دنیا کے بڑے بڑے سحر نگاروں اور معجز طراز ادب کسی سے نہ ہو سکی۔

آپ کو مضمون اور بیان دونوں کی بچیدگی اور نامموازی سے ہمیشہ اجتناب رہا۔ فرماتے ہیں:-

مجھ سے کس بات پر اچھینکے جو یگان سخن!

میں نے الجھا ہوا مضمون بھی باندھا ہی نہیں

دوچہلہ مضمون سے ایسا مضمون مراد ہے جس کا سر رشتہ گم ہو اور جو کوشش دکاوشہ سمجھ میں نہ آئے بعض لوگ ایسے بے سرو پا مضامین بیغ کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کیا ہوتی۔ ہاں ہر ایک شاعر نے فصاحت اور بلاغت کے موضوع پر گفتگو مجھ سے کہا کہ فصاحت یعنی طویل اور بلاغت پنجابیوں پر ختم ہے۔ وہ حضرت سے بے خبر تھے کہ فصاحت کے چراگان ہیں ان میں ایک رنگہ بلاغت بھی ہے حضرت ابوالفضل احمد بلند سے بلند مضمون ایسی سادگی اور صفائی سے باندہ شعروں میں پہلی المیخ کی صفحہ پیدا ہو جاتی ہو۔ غالب بھی جن کے کلام کا بقدر حصہ فادیت اور غفلت کی وجہ سے اردو اور ترے کے مطابق نہیں رہا،

شاعری

فصیح شعری کو بلیغ سمجھتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان کو حضرت فصیح الملک کا یہ شعر بوجھ پسند تھا۔ اسے بار بار پڑھتے اور دہرہ کرتے تھے،

اس کے جلوے کا تو کیا کہنا مگر دیکھنے والے کو دیکھا چلیے
سادگی (جس میں تکلفی اور بیاضی شالی ہیں) کے متعلق آپ کا ارشاد ہے:

شعر میں یہ سادگی لے جوش پھر یہ دلکشی

آپ کی بے رنگیاں بھی رنگ ہیں تصویریں

مگر آپ جس سادگی کے حامی ہیں وہ فصحا کی زبان کی سادگی ہے۔ آپ نے اس سادگی کو کمال
سادگی سے کبھی خلط ملط نہیں ہونے دیا۔ یہی خوبی آپ کے روزمرے اور محاورے کے استعمال
میں ہے۔

آپ تشبیہ اور استعارے کو مدور و سخن کا زیور تسلیم کرتے ہیں مگر اس پر ضرورت سے زیادہ
زیور کا بار نہ رکھتے ہیں ڈالنے یعنی زیور کے حسن کو قبح نہیں ہونے دیتے۔ آپ کی تشبیہوں اور
استعاروں میں کہنگی اور مفرودگی کی بجائے مازگی اور نوکداری ہوتی ہے جس سے زبان اور
بیان کا میدان وسیع اور پُر جہاد ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک حدیث زبان اور چیت بیان
شاعری کے لوازم میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اکی بنا پر آپ نے فرمایا ہے:

زبان درست، بیاں چیت جب نہیں لے جوش!

وہ شعر کیا مجھ غزل کیا، وہ شاعری کیا ہے؟

آپ صاف، سلجھا ہوا، فوراً سمجھ میں آ جانے والا اور پُر لطف شعر پسند کرتے ہیں۔ شعری
سادگی، صفائی، سرسبز لفظی اور لطف انگیزی کے باب میں آپ نے ذوق اور حضرت
فصیح الملک کی روایات صرف برقرار رکھی ہیں، بلکہ انھیں نکھا کر اور زیادہ چمکایا ہے۔

تہذیبی جن کا نام اہل فن کی اصطلاح میں ابجا ہے، اسے اخلاص بھی کہتے ہیں۔ اس میں یہ
ہوتا ہے کہ شاعر مضمون شعر کے بیان میں کچھ ناطق نقطہ مقدار رکھ دیتا ہے، یا جو بات کہنا
چاہتا ہے اسے سچ دے کر ایسے سلیقے سے کہتا ہے کہ شعر میں گہرائی پیدا ہو جانے کے علاوہ
حسن بیان میں بھی بہت اضافہ ہوتا ہے۔ یہ انداز کلام فارسی سے اردو میں آیا ہے، جسے

شاعری

میر و سودا نے کم اور غالب، مومن، شبلی و سہیل نے بہت فروغ دیا۔ ایجا
حضرت نصیح الملک کے کلام میں بھی ملتا ہے مگر وہاں اس کی ایک مناسب حد معین ہے
سے شعر کے سرخی الفہم ہوئے ہیں غزل نہیں پڑتا۔ میں ایک سیدھے سادے اور تہدار
کی وضاحت کے لیے ایک شعر حالی کی جدید غزل سے جو ان کی قدیم غزل کے برخلاف
سے بالکل خالی ہے اور ایک شعر نظیری کا پیش کرتا ہوں:-

تیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنو سار میں
خیر ہو نہ ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص (حالی)

صد قرن بر محبت لیے گزشتہ است
بے داد بر قسید مجزوں نگر دس (نظیری)

ان دونوں شعروں کا مضمون متحد اور انداز بیان مختلف ہے جس سے دونوں کے م
زمین اور آسمان کا فرق ہو جانا ناگزیر تھا۔

چند سال پہلے پنجاب سے باہر کی ایک یونیورسٹی نے مجھے اُن امیدواروں کی قابلیت
کرنے کے لیے طلب کیا جنہوں نے اردو فکری کی اساتذہ کے لیے درخواستیں بھیجی تھیں
ساتھ دو روزہ شخص اسٹوڈیو لینے کی غرض سے نکال دیے گئے۔ اُمیدوار پانچ تھے۔ ان میں:-
پی ایچ ڈی تھے اور تین کے پاس ایم اے فرسٹ کلاس کی ڈگریاں تھیں۔ میں نے ا
کے لیے فردا فردا کی بجائے سب کو ایک ساتھ بلایا اور انہیں دو شعر لکھوا کر ان کا م
بیان کرنے کی غرض سے پانچ منٹ کی مہلت کا اعلان کر دیا۔ شعر یہ تھے:

کیونکر مجھے گناہ زینما یقین آئے
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز (مومن)

کیوں بڑھاتے ہو خلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی (حالی)

مجھے تحریری جواب ملے تو میں نے دیکھا کہ دو امیدواروں نے دونوں شعروں کی توجہ

شاعری

نثر کو دی تھی اور تین سے اتنا بھی نہیں ہو سکا تھا۔ خیر میں نے ان سب کی آگاہی کے لیے
مومن کے شعر کا مطلب انتہائی اختصار سے کام لے کر بتا دیا، جو یہ تھا کہ عاشق یوسف کو
لجواظ حسن معشوق سے کمتر اور خود کو بہ اعتبار عشق ذلیل سے برتر سمجھنے کے باعث یہ باور ہی
نہیں کر سکتا کہ ذلیف کا عشق میں اس کے اپنے عشق سے زیادہ رلودگی اور بے اختیار
تھم، جس کے باعث اُس نے یوسف کا دامن لپی لپی سے پکڑ لیا کہ وہ کش کش میں
بھٹ گیا۔

جو اشعار تہدار ہوتے ہیں ان میں ایک شق پہلو دار یا ذومعنی کہلاتی ہے مثلاً

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (غالب)

پہلوانی سخن فہموں کے قحط میں جو گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی جاتا ہے، شعر میں اتنی ہی تہدار اور
انتاہی پہلو مستحق ہے جو مطلب کے سمجھنے میں اشکال پیدا نہ کرے۔ مثلاً

اب وہ یہ کہ رہے ہیں مری مان جائیے

اللہ تیری شان کے قربان جائیے (داغ)

کیا دل ہو بعد مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد

بھولے ہمیں کہ تجھ کو بھولایا نہیں ہنود (حالی)

عبد محمد شاہی میں ایک نود اور ایرانی شاعر نے خان آرزو سے کہا تھا کہ شعر دو قسم کے ہوتے

ہیں:

(۱) با معنی اور (۲) یعنی۔ یعنی سے اُس کی مراد ایسے شعرے تھے جس کا مطلب نیم میاں لہو
نیم نہاں مواد جس کی شرح کرتے دقت لفظ یعنی استعمال کو ناچارے۔ یہ سُن کر خان آرزو
نے کہا کہ ہم قہر یعنی کے شعر کو لایم سمجھتے ہیں۔

حضرت ابوالفصاحت کے کلام میں جو تہدار اشعار دیکھے جاتے ہیں ان میں سے کسی میں ایسی
تہدار لایا پہلو نہیں ہے جو فصاحت کا محتاج ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ ایسے
اشعار میں معنوی غور رکھتے ہیں لیکن اس تک پہنچنے میں دشواری پیدا نہیں کرتے۔

شاعری

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابوالفصاحت نے ناشائستہ اور مخرب اخلاق مضامین سے غزل کو پاک کر دینے کے ساتھ ہی اس میں بقا خائے وقت بہت سے نئے مضامین داخل کر کے اس کا میدان بہت وسیع کر دیا ہے۔ نفسیاتی تجربات اور دروں بینی کے نتائج جتنے آپ کی غزل میں ملتے ہیں اتنے ادیبوں میں نہیں پائے جاتے۔ یہی کیفیت حکمت و دانش، عرفان ذات و عرفان الہی وغیرہ سے متعلق مضامین کی ہے۔ اگرچہ آپ نے دیگر اصنافِ سخن میں بھی اپنی قادر الکلامی کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں لیکن غزل آپ کی محبوب صنف رہا ہے۔ آپ اپنے تغزل کے متعلق فرماتے ہیں:

کیوں تغزل کا نگہاں نہ ہے فن میرا

یہی پوچھی ہے مرزا اور ہوا دھن میرا

چونکہ نظم ایک مکمل اکائی ہوتی ہے، اس لیے اس کے جتنے جتنے اشعار سے شاعر کے خیال کی اوجہ ارتقا اور استہانتہ رتبہ معلوم نہیں ہوتی اور پوری تصنیف سے لطف اندوز ہونا محال ہو جاتا ہے۔ نظریات میں ممتاز نظموں کا متن نقل کرنے کی بجائے ان کے عنوان کھدو گنگا جالی، آدم اور کیمیل کی نظموں کو چھوڑ کر اکثر لوگوں کی نظموں میں ربط اور تسلسل نہیں پایا جاتا جس کا باعث مجز طبع کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ آپ کی نظمیں مربوط، مسلسل، فصیح، بلیغ اور تاثیر آفریں ہوتی ہیں اور انھیں خوبوں نے ان کو مقبول خاص عام کر دیا ہے۔

رباعی نظم میں تو شمار نہیں ہوتی، لیکن اس کے چاروں مصرعوں کا قوام ایسا ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک اکائی مقصود ہوتی ہے۔ میرزا نظم سے ایسی رباعیاں بکثرت گوری ہیں جن کے پہلے دو مصرعے پچھلے دو مصرعوں سے بالکل الگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بہت بڑا نقص ہو۔ آپ نے جتنی رباعیاں نظمیں ہیں ان میں چاروں مصرعوں کا ربط حد انتہا کو پہنچا ہو ملتا ہے اور چوتھا مصرعہ بالخصوص ایسا دردناک ہوتا ہے کہ اس سے پہلے تینوں مصرعوں کو پر دے پڑے پر دال لگ جانے ہیں۔

اگرچہ تاریخ گوئی نفسِ شاعری سے تعلق نہیں، مگر یہ ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اچھا ادیب کبھی کبھار اس عمدہ اسلوب سے نظم کو نافرمان شاعر سے ہر گز ممکن نہیں۔ تاریخیں تقریباً تمام مسائل نے کھیں ہیں لیکن ان میں ایسے کم ہی تھے جنہوں نے تاریخ گوئی میں مکمل دکھایا۔ حضرت فصیح اللہ

شاعری

بھی عہدِ فرین شاعر ہونے کے باوجود بچے تاریخ گو نہیں ٹھہرتے۔ انہوں نے اپنے شاگرد احسن مارہروی سے اپنی سوانح عمری جلوہ دہخ لکھوائی اور خود اس کی ساری تاریخ طبع یوں لکھی۔
زندگی کے مری آجی نے سوانح لکھے عمر کے باغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو
داغ نے مصرعہ تاریخ کہا جیتہ جلوہ دہخ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو
ادۂ تاریخ میں الفاظ یہ آنکھ سے ”بھرتی ہونے کے باعث بہت بری طرح کھٹکتے ہیں اور پہلے دو مصرعوں کی بندش بھی مست ہونے کے ساتھ ہی خسو و دائسہ سے خالی نہیں۔

حضرت ابو الفصاحت نے شاعری کی طرح تاریخ گوئی میں بھی اپنے اوپر چند پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ مثلاً آپ تعبیہ اور تخریج کی رعایت سے فائدہ نہیں اٹھاتے، پورے مصرعے میں مادہ ہائے نکالتے ہیں، مادہ تاریخ کا عین مطابق واقعہ اور محل ہونا تاریخ گوئی کی شرط اول سمجھتے ہیں، اداسے نظم کرنے میں فصاحت، زبان اور لطافت بیان میں خلل نہیں آنے دیتے۔ یہ کہنے میں غدا بھی مبالغہ نہیں کہ عہدِ حاضر میں آپ جیسا تاریخ گو نظر نہیں آتا۔ میں بخوف طوالت پورے قطعات تاریخ نقل کرنے سے احتراز کرتے ہوئے صرف چند بے مثل مادہ ہائے تاریخ لکھ دینے پر اکتفا کر دنگا۔

آپ نے مزاحیہ اشعار بھی کہے ہیں جن پر مزاح کے حقیقی معنی کا اطلاق ہوتا ہے۔ مزاح ایسی بات کہنے کا نام ہے جس سے سننے والا ذہن لب لبث متہم ہو جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام بھی کبھی کبھی مزاح فرماتے تھے۔ چنانچہ مزاح بشرطہ کہ مزاح ہو، شریعت میں جائز ہو۔ آج کل بیشتر نام نہاد مزاح نگار تمسخر اور پھکڑ بن کو جس میں ناشائستہ الفاظ اور گالی گلوچی سے بھی اجتناب نہیں کیا جاتا، مزاح سمجھتے اور اس پر ہامیوں اور برقیوں سے قہقہے لگو کر خوش ہوتے ہیں۔ میں نے علی گڑھ کے ایک شاعر سے ایک مزاح نگار کا کلام سنا تھا، جس کا ایک مصرعہ لکھا ہوا:

یہ گلی تیرے باپ کی تو نہیں

آپ کی تمام شاعری کے متعلق خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ نہ صرف شاعرِ عظیم ہیں بلکہ شعر و سخن لادار و چابودار اعلیٰ اصلاح میں بھی اپنا عدیل و نظیر نہیں رکھتے۔ فصاحت آپ کی سخن طرازی

شاعری

کا خاص الحاح جو ہر ہے، جس سے آپ کے بلخ مضامین بلخ تر ہو گئے ہیں۔ یہ ایک شعر ہو گیا جو نقل کیے دیتا ہوں:

نصیحانِ زمین پر کام کر جاتی ہے انہوں کا
کلام لہ الفصاحت میں فصاحت ایسی ہوتی ہے

اب نمونہ بنائے کلام مع تنقید ملاحظہ ہوں۔

(الف) تغزل

۱۔ مظلوم کی آہوں کا اثر ہو کے رہیگا

باخیر تو ممکن ہے، مگر ہو کے رہیگا

شعر کے عالمگیر رد و قبول میں عقیدہ عامہ ہمیشہ بالادست رہا ہے اور رہیگا۔ سعدی کے متعدد اشعار صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک روئے زمین کے تمدن حصے پر حاکم رکھتے ہیں۔ ان میں آفاقیت یعنی عالمگیر مقبولیت کی غیر معمولی صفت پیدا ہو اس نکتے میں مضمر ہے کہ ان دونوں شعرا نے اس قسم کے اشعار کی اساس انسانیت کے عام پرکھی تھی۔ اگر وہ بعید از عقل مضمون آفرینی اور خلاف قیاس خیال آرائی کو ان کا منقب کلام تمام بڑی بڑی ادبی زبانوں میں ترجمہ ہو کر اقصائے عالم تک پہنچتا زہدہ جاوید ہو جاتے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو شعر حسن بیان کے حامل ہوگا، اس کا مضمون عقیدہ عامہ کے عین مطابق ہونے کے باوجود ہدف میں تو کیا خود شاعر کے محدود ماحول میں بھی اثر انگیزی سے قاصر رہیگا۔

زیر نظر شعر میں جہاں مضمون خواص و عوام کے غیر استدلالی مطلقوں سے پوری رکھتا ہے، وہیں حسن بیان میں بھی معجز نمائی سے کم نہیں ہے۔ مشہور رکھادت: ہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں، اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ حضرت ابو الفصاح اس مضمون کے صرف ایک پہلو کے بیان میں سید زہدہ بھڑا ہو۔ میں اس کی دوگو پر تبصرہ کرنے سے پہلے ایک فارسی شعر نقل کرتا ہوں:

بترس از آہِ مظلومان کہ ہنگام دعا کو کن احباب از در حق بہر استغیا

شاعری

شعر کے عمدہ ہونے میں کلام نہیں۔ اس کی ساری خوبی کا ادھر ہمارا اس جدت طرازی پر ہے کہ خود احباب دعا کے استقبال کے لیے آتی ہے۔ شاعر کا مقصد ظالم کو ڈرا کر ظالم سے باز رکھنا ہو، مگر اس کی جدت طرازی سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کوئی ظالم ایسے ادعا سے کہ ادھر مظلوم نے بد دعا کی، اور ادھر احباب اس کے استقبال کے لیے درخت سے چل پڑی، ہرگز نہیں ڈر سکتا۔

حضرت ابوالفصاحت نے شعر میں دو گونہ معنویت یہ رکھی ہے کہ ظالم کی تخفیف اور مظلوم کی تسکین کا اہتمام بیک وقت کر دیا ہے جہاں ظالم کو تینہہ کی ہے کہ اسے ظلم کی سزا ضرور ملے گی، چاہے ایسا ہونے میں کچھ دیر لگ جائے، وہیں مظلوم کو بھی دلاسا دیا ہے کہ اس کی آہوں کے موثر ہونے میں تاخیر تو ہو سکتی ہے، لیکن ان کا اثر ہو کے رہے گا۔

حکیم ارسطو طالس نے کتاب بوطیقا میں بلاغت کا انحصار الفاظ قلیل اور معانی کثیر پر رکھا ہے، جس کے مصداق اسی قسم کے بلیغ اشعار ہو سکتے ہیں۔ پھر پہلے اور دوسرے مصرعے میں ایسا قوی ربط اور امتزاج ہے کہ پورا شعر ایک مصرعہ یا ایک جملہ معلوم ہوتا ہے اور پڑھنے وقت طبیعت ایسا محسوس کرتی ہے جیسے کسی قدر اندازنے کی امان کی ایک کٹا دے دو تیر چھوٹے ہیں جن کی سننا میٹیں باہم مل کر ایک آواز کی طرح کان میں آتی ہیں۔

فصیح البیان شاعروں کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ نظم بقدر امکان شعر سے قریب رہے۔ حضرت ابوالفصاحت کا کمال قابل دید ہے کہ آپ نے یہاں نظم و شعر کا فرق یکسر مٹا دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس نظم کو شعر میں تبدیل کرنا چاہے، تو اس کی سہی تحصیل حاصل ہنرمندی کہوں کہ شعر کے الفاظ کی ترکیب غوی نظم و شعر میں یکساں ہے۔ سوزن شعر، قافیہ اور ردیف کی قیدوں کے باوجود ایسا فصیح شعر اور وہ بھی مطلع کہ دنیا جس میں ردیف کی تکرار سے دعوے کی توثیق مکر رہوتی ہے حسن ابلاغ کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔

۲۔ یہ غلط ہے، اب وہ یاد آتے نہیں

خود فراموشی انہیں کی یاد ہے

ہر حق تحقیق کی طرح شعر کی عمر کے بھی تین درجے ہیں؛ عمدہ، عمدہ تر، عمدہ ترین۔

شاعری

جو شعر آخری درجے کی سطح سے بھی بالاتر ہو جاتا ہے اسے شعر کی اصطلاح میں
ہیں۔ کسی کا عجاذہونا اس امر پر موقوف ہو کہ وہ سننے والے یا پڑھنے والے کی طلب
غیر معمولی یا غیر معمولی انقباض یا غیر معمولی استعجاب پیدا کر دے۔ میں یہ
دیر تک غرق حیرت رہا۔ اردو کے اکثر دہشتزدادین میں اس کتبے کے اشعار بہ
ہیں۔ یہاں عاشق نے اپنی مدامی خود فراموشی کو معشوق کی دائمی یاد سے تعبیر کر
نفسیاتی لکھنے کی شرح کر دی ہے کہ جب عاشق خود فراموشی کے عالم میں اپنی ذات
احساس سے محروم ہو جاتا ہے تو معشوق کی یاد اس نائیل شدہ شعور کی جگہ لے لیتی
یہ شعر ذوقیات اور وجدانیات کے عالم سے تعلق رکھنے کے باعث ایسی نفاست ا
کا پیکر بن گیا ہے، جن کا معرض اظہار میں آنا ممکن نہیں اس لیے میں قوت متخیلہ
کے سن لامحدود کو محدود کر دینے کی غلط کوششی سے اعتراف کرتا ہوں۔

میں نے ۱۹۲۵ء میں اپنے ذاتی مطالعے کے لیے تیسرا غائب، مومن، شیفتہ، حالی ا
دو ادین کا انتخاب نہایت سختی سے کیا تھا۔ اسے ایک ماہ تک زیر غور رکھنے اور بلا
کے مطلق جانچنے کے بعد مجھے بہت سے اشعار اسقاط کر دینے کی ضرورت محسوس
بھماہ گر رہا ہے مزید کاٹ چھانٹ کی گئی۔ اگرچہ اس آخری انتخاب میں مارش
کم رہ گئے، مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ باقی ماندہ ہر شعر اعجاز تھا۔ اگر اس زما
یہ شعر مل جاتا، تو میں اسے بھی انتخاب میں شامل کر کے بطور تعلیقی حاشیے پر لکھ
معشوق کی دائمی یاد کا مضمون سائلگ شاگرد غالب نے بھی باندھا ہے۔

اس علوئے شان کی کیا انتہا

وہ کبھی اترے نہ نہری یاد سے

اس کی ساری خوبی "علوئے شان" اور یاد سے کبھی نہ اترے، کی صفا ہی ایک محدود

۳ پہلے تو نقابی چہرے کو اٹھائیں کچھ دیکھ لیجئے کتنی تھیں

یہ آپ نے پردہ چھوڑ دیا یا اور اک پردہ چھوڑ دیا

یہ مضمون کہ معشوق کا بے نقاب چہرہ بے انتہا ناہناک ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھا

شاعری

بکثرت شاعروں نے باندھ لیا، لیکن جیسی حمد کی سے یہاں بندھ گیا ہے، وہ شاید کمپا
اپنی مثال ہو۔

لود برق ترقی پر وہ رُو ہے بے محابش را
یہ بیضا بکوشش برنیا انداز نقابش را (نازل شیرازی)

جب وہ جمال و لغز و صورت ہر نیم روز
آپ ہی ہونظارہ سوز، پردے میں منہ پھپھکے ہو
شعری چار برہر جتنوں میں تقسیم اور حسن بندش تو ضرور قابلِ تعریف ہے، لیکن منطق جو با انشا
شعر کش ہوتی ہے، مضمون کی خوبی اور طرزِ بیان کے لطف میں غفل انداز ہو گئی۔

کیوں جل گیا تاب رخ یار دیکھ کر
جنا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر (غالب)

یہاں قوتِ تخیل، قوتِ بزمِ مکتا ہے باہر ہو گئی، معشوق کے چہرے کی تابانی کا نظارہ کرنا
مسموع بھی ہے اور ذہین قیاس بھی؛ لیکن دیکھنے والے کا سزا پا چل جانا، مسموع نہ نہ تو یہ
قیاس اگر بلا مصرع یوں ہوتا:

کیوں جل گئی نظر رخ یار دیکھ کر

تو تخیل میں بے اعتدال دہوتی اور طاقت دیدار کو قصور دار قرار دینے کا جو از بھی بہم
پہنچ جاتا۔

وہ بے اور نہیں دیکھا جاتا
دیکھیں کیوں کر نہیں دیکھا جاتا (داغ)

اس میں کلیدی لفظ اور ہے جس سے مضمون کی صراحت ہو جاتی ہے۔

صحتِ الہی انصاحت کا شعر کیا حسن خیال اور حسن بیان کے لحاظ سے اور کیا سادگی اور
پُرکار کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔ آپ معشوق سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔
آپ کے حسن کی نظر سوز تابانگی نقاب کی بدولت محض ہلٹے نام چہرہ دیکھنے کو دیتی تھی مگر
اب نقاب اُتر جانے سے میری آنکھوں پر ایک اور ایسا پردہ پڑ گیا جو قطعاً مانع دیدار ہو۔

شعری

تیرہ چھوڑ دیا، ایک جگہ پر وہ ترک کر دیا اور دوسری جگہ پر وہ ڈال لیا کے معنی یہ تو خوں سے استغاثی ہوا ہے کہ زبانِ قلم کو اس کی تو صیغ میں اعتراف بھڑکرنے کے نہیں۔ علاوہ بریں الفاظ کی نحوی ترتیب ایسی ہی ہے جیسی نثر میں ہونی چاہیے بالکل کمال ہے۔

۴۔ اگر رسمِ دفا ہم سے نہیں نصبتی تو کیا ہم ہیں
اگر قدرِ دفا تم کو نہیں سکتے تو کیا تم ہو

۵۔ جو کہ سکیں نہ ہم، وہ کہا ہی نہیں ابھی
جو سن سکو نہ تم، وہ سننا یا نہیں ہنوز

۶۔ نہیں ہوتا کسی سے چارہ وحشت نہیں ہوتا
نہیں جاتی ہماری چاک دامانی نہیں جاتی

۷۔ ان کی حادث کہ دفاؤں پہ ہوں چسپیں بچیں
اپنی عظمت کہ جفاؤں کا بھی شکوہ نہ کریں

۸۔ اک اک جھگڑا اُٹھانا یاد کر لیتے ہیں وہ
اک نہ اک شکوہ نیا ایجاد کر لیتا ہوں میں

۹۔ ایک تم ہو، جو مرے دل پہ بنا دیتے ہو
ایک دل ہے جو مرے دم پہ بنا دیتا ہے

۱۰۔ اک طرف عشق، اس قدر معصوم
اک طرف حق، اس قدر متعاق

شاہی

۱۰ اشعار میں مصرعوں کے متقابل نے ہر شعر کو دو شاخہ بنا دیا ہے۔ فصاحت زبان، فصاحت بیان اور مراعات کلام پختہ ہیں۔

۱۱۔ سجدوں سے ہو بڑھ کر سر تسلیم کا جھکنا

طااعت کی جگہ میری اطاعت کوئی دیکھے

توفیق میں تسلیم درخشا کو جب زندہ داری، سنجہ گردانی اور سجدہ گزاری پر جو فوجت دی ہے وہ محتاج بیانی نہیں۔ سر سجدوں میں جھکتا ہے اور تسلیم درخشا کے لیے بھی خم ہوتا ہے۔ سجدوں میں اس کے بار بار جھکتے اور تسلیم درخشا میں ایک یا زخم ہو کر ہمیشہ خم ہی رہنے سے لوں کا فرق محراب سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ سجدوں میں سر جھکا کر یا بائی بھی سکتا ہے۔ اس کے برعکس سر تسلیم خم ہونے میں ریا کا ذرا کجی شاید نہیں ہوتا۔ یا ایک اور دلیل یہ، طااعت (یعنی عبادت) پر اطاعت (بر معنی عبودیت) کے قاتی ہونے کی۔ عت اور اطاعت ہر دو سے لغت ہم معنی الفاظ ہیں، طااعت کی جگہ اطاعت اور اطاعت جگہ طااعت استعمال کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ حضرت فصیح الملک کا شعر ہے

نہیں ہوتی بندے سے طااعت زیادہ

بس اب خدا آباد دولت زیادہ

غرض حال انفعالی نے ان دونوں لفظوں کے معنی میں عمل استعمال کے لحاظ سے اختلاف لگانے کے ساتھ ہی ایک قابل داد خوبی یہ رکھی ہے کہ ایک طااعت کے بعد دوسرے طااعت، شروع میں الف کے اضافے سے ایسا آجنگ پیدا ہو گیا ہے جو ستارہ بجنے کے دوران میں (برہنہ) گٹنے پر سبب نواز ہوتا ہے۔

۱۲۔ فردا نگی عشق و محبت کوئی سبھے

دیوانگی دانش و حکمت کوئی دیکھے

جواب ہو اس حسن بندش اور تقابل مصرعین کا جو حضرت فصیح الملک کے اس شعر میں ہے۔ نیز جی انداز صنم کو کوئی سبھے دانش برادرانِ خب۔ اکو کوئی دیکھے

شاعری

۱۳۔ حال دل اک دن سنا بیٹھے تھے ہم

وہ جو اقصیٰ کہ اب تک یاد ہے

شعورِ انتہائی صفائی اور عینِ تہمدادی ہے۔ اس ایجا پر ہزار لطائفِ قرآن ہے۔
ہیں۔ قصہ بیان کرنے کے باوجود اس کے مالذو اعلیٰ کا دانشگاہِ اطہار کر دینے
ہو تو ایسا ہو۔

۱۴۔ تیرا دیدار گو نہیں ارزاں

جانِ دل کے عوض گواں بھی نہیں

یہ کہنا کہ شعر میں الفاظِ ارزاں اور گواں نے صنعتِ تضاد پیدا کر دی ہے اور محض
بیان کی خوبی سمجھ لینا قصورِ فہم ہو گا۔ اس بیان میں کہ تیرا دیدار ارزاں تو نہیں ہے،
جانِ دل کے عوض اسے گواں بھی نہیں کر سکتے، حسن اور عشق کا بلند ترین معیار جس ادا
بتایا گیا ہے اس کی تعریفیں زبان سے کھڑکانا نطقِ الگن ہی ٹھہرے گا۔ ایسے نصیب
اشعار حضرت فصیح الملک کے شاگردوں اور مقلدوں کے کلام میں تقریباً نایاب یعنی
کیا ہیں۔

۱۵۔ سخن جو ہر باں، یہ ممکن ہے

مگر ایسا کبھی ہوا تو نہیں

پہلے مصرع میں اثبات اور دوسرے مصرع میں نفی ہے۔ نفی سے اثبات کا عدم ہو گیا
کے معنی شاعر نے امکانِ قیاس کی نفی کا اثبات یا عداوت ہم پہنچا دیا۔ اس قدر
اور بلیغ بیان کا لطف خود لینا تو ذوقِ جو جان سے ممکن اور غیر کو اس کا اندازہ کرنا
کے لیے محال ہے۔

۱۶۔ حاجت کے لیے بھی کوہنی کر لوں گا

پہلے دنیا کی مصیبت کے لیے تیرے ڈھولوں

انسان کی فطرت ہو کہ وہ، بنوی مخلوق کی ذمہ داریوں کو مقدم اور حاجت کے قرار
معرض رکھتا ہے۔ اور جب دنیا کے کام کاج کے لیے درگاہِ فرصت نہیں دیتے، تو حاجت

شاعری
 بکلمنے کی تھیں کہنے والے سے جھجھکا کر کہتا ہے کہ پہلے یہاں کی مصیبت سے چٹکا پاؤں
 وہاں کے لیے بھی کسا لاکٹ لٹکا۔ کوہ کنی کڑنا اور پتھر ڈھونا ندنوں عماروں نے
 شاعر میں روزمرے کی انتہائی صفائی کے ساتھ بندھ کر ایک معمولی مضمون کو آسمان
 پہنچا دیا ہے۔ کوہ کنی اور پتھر ڈھونے میں جو لفظی رعایت ہو اس کی بیا خشکی کا کیا کہنا!
 اس شعر کو ناموزوں لوگوں کی طرح پڑھا جائے اور دونوں مصرعوں کے درمیان وقفہ
 رکھا جائے، تو یہ شعر جو جائیگا۔

۱۷۔ کیا تو نے اپنی مرضی سے چھوڑا ہے دنیا والوں کو

یا دنیا والوں نے تجھ کو اے تارک دنیا چھوڑ دیا

حقیقت تارک دنیا اکثر بد بشر دی لوگ ہوتے ہیں جنہیں دنیا کا کارہ سمجھ کر ان کی طرف
 بالکل بے پروا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے بڑے معنی سوال کو فنِ مباحثہ کی اصطلاح میں
 ال منوال المقصود کہتے ہیں

۱۸۔ آپ رہے جس سے بہت بخیر
 یعنی آج اس کی خیر آگئی

روزِ روزمرے میں خبر کا ناموت کی خبر آنے کے معنی میں استقبال ہوتا ہے۔ 'خبر رہے'
 خبر آگئی اے حسن بیان کچا رچا نہ لگا دیے ہیں۔ روزِ روزمرے پر لکھی تہ رت آج کے
 ہے۔

مطلب کا جو تھا حرفِ ازباں پر نہیں آیا

مطلب یہ کہ تقریر میں خاموش رہا ہوں

مثنوی کو تقریر کا نعم البدل تو بہت سے عالی رتبہ شاعروں نے قرار دیا ہے مثلاً شکسپیر
 نے ایک جگہ لکھا ہے۔

جہاں تقریرِ شاعرت نہیں کرتی وہاں خاموشی سے کارِ برآی ہو

جاتی ہے۔

بے اپنا شعر تو یہاں پیش کرنا نہیں چاہیے مگر ہزار ہزار عدد کے ساتھ نقل کیے

بلند آہنگ ہے فریاد دل کی

فغان بے صدا سے خاموشی میں

حضرت ابوالفصاح کا تقریر کرنے کو خاموش رہنے کے معادی ثابت کر دینا اور لفظاً مطلباً کا دعویٰ میں استعمال کرنا قوتِ تخلیق اور قوتِ بیانہ کے عمدہ ترین معنوی اور لفظی تصرفات کی نادر مثال پیش کرتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان تصرفات کی بدولت مضمون میں ایک انوکھی جدت پیدا ہو گئی۔

۲۰۔ یارب! کبھی تسلیم نہیں کی ہیں خطائیں

تیری ہی طرح میں بھی خطا پوش رہا ہوں

خدا کے اسمائے صفاتی میں ایک اسمِ ستائش یعنی خطا پوش بھی ہے۔ حضرت موصوف نے خطا پوشی کی صفت اپنی اور خدا کی ذات میں قدرِ مشترک ٹھہرا کر خدا سے ایسی بُری بکھافت خوشی کی ہے جس کا جواب نہیں۔

۲۱۔ اس دُور میں اے شرمِ گنہ! خوف ہی کیا ہے؟

جو جہاں جگہ جو ہو گا، تو وہ ہو گا کوئی دن کا

بد کا دلگ کچھ مدت تک تو غروبِ بدنام رہتے ہیں، پھر امتدادِ وقت کے باعث دوبارہ ان کی بد اعمالی کا پھر چاکر ناچھوڑ دیتی ہے اور وہ معاشرے میں اپنی کھوئی ہوئی غریب دوبارہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ عوام نے جن دُریوں کی بدایاں کے خلاف شورش کر کے انھیں آزادی کی مندر سے اُتر دیا، کچھ وقت محوِ رجائے کے بعد انھیں کو بار پہنائے اور ان کا جلوس بڑی دھوم دھام سے نکالا۔ حضرت ابوالفصاح نے انہی نال کے حاکمِ نظم پر چوٹ ماری ہے اس سے زیادہ بھی طعنے خیال میں نہیں آتی۔ بیان کی لطافت ناقابلِ جہل ہے۔

۲۲۔ ادھر تو نزع میں کم ہو رہی ہے دل کی چھپنی

اُدھر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صحت ہوتی جاتی ہو

شاعری

عمرہ مضمون اور عمدہ بیان کے علاوہ یہ اب بھی قابلِ غور ہے کہ عاشق نے معشوق کی غلط فہمی پر غور نہیں کیا کہ وہ ڈال کر اسے نا فہمی اور گافانی کے الزام سے بچالیا۔ شریعتِ عشق میں ایسے فعل کو من جزلہ و جبات ٹھہرایا گیا ہے۔ نظیری کے شعر کا مضمون اس سے مختلف تو ہے، لیکن اس میں بھی وجاہتِ عشق کی بجائے ادوری کو نظر امداد نہیں کیا گیا، کہتا ہے:

ما منفصل ز رخس بر بار ہمیش

کی آدم احتراش گستاہ بنو دہدا

۲۳

۲۳۔ وہ جھلک اپنی دکھا کر خود بھی پہناں ہو گئے
اور مجھ کو بھی مری نظروں سے چننا کر دیا

۲۴۔ وہ تو خلوٰ خواص میں بھی جا پہنچے

چشمِ مشتاق مری محو تماشا ہے ابھی

اس مضمون اور بیان کی داد دی جائے۔ عالمِ تخیل کی کیفیت جس ڈھنگ سے دکھائی گئی ہے وہ بجائے خود نہایت حیرت انگیز ہے۔ یہاں فصاحت اور بلاغت کی انتہا ہو گئی ہے۔

۲۵۔ میں قیدِ ندگی سے مانوس ہو چکا تھا

یادِ بامری رہائی کس جرم کی سزا ہے؟

جرم کی سزا میں جرم کی نوعیت کے لحاظ سے قید بے شکقت بلکہ خفتِ قید با تعینت کا قید ہے۔ یہاں قیدِ بامری سے رہائی پانے کا ہر قیدی آزاد مند رہتا ہے۔ یہاں قیدِ بامری سے رہائی کو کسی نامعلوم جرم کی سزا سمجھ کر خلا سے شکایت کی ہے کہ جرم بتائے بغیر اسی سزا کو دے دی گئی ہے۔ درحقیقت ہر شخص عمرِ روزانہ کا طالب اور نوحہ سے غافل رہتا ہے۔ مگر خیال کو ایک عجیب بچہ دے کہ وہ شکایت پیدا کر لینے کے ساتھ خدا سے

شاہری
ایسی پلٹن شوق کی گئی ہے۔ جس کی مثالیں اردو شاعری میں بہت کم ملی ہیں۔ حضرت
قصیح الملک کے کلام میں شوقیوں کی بڑی کثرت ہے۔ مگر وہ زیادہ فرشتوں کے مقابلہ
میں ایک اور عوامی قسم کی پھیر چھاؤ پر مشتمل ہیں۔ حضرت ابوالفضل صاحب جہاں شوقی کہنے پر
کہتے ہیں وہاں تقابلیت کی حد سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتے۔

۲۶۔ بنگالی کی بھی حادث ہے زمانے کو بہت

بھوکو اچھا دیکھو گے تو یہ اچھا ہو گا

مشتوق سے کہا گیا ہے کہ ان زیادہ حادثات بنگالی ہیں۔ اگر تم مجھے اچھا کہو گے تو مجھ سے
تعلق خاطر عوامی جانیے جو تھاری رسوائی کا باعث ہو گا۔ پس یہی مناسب ہو کہ تم مجھ
پر اکتے ہو۔ مشتوق کی غیر ذہنی کی فرض سے دنیا عاشق اپنی برائی سنا کر اس کا رسکتا ہے
جس کا عیار عشق بہت بلند ہو۔ بڑا کہنے کو اچھا کہنا معنی خیز ہونے کے علاوہ لطف دیا
اللہ میں بیان کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔

۲۷۔ گلہ نہیں ہے اگر آپ مجھ کو بھول گئے

میرے خدا کو بھی حادث ہو بھول جانے کی

ماثور نے مشتوق سے عاشقانی گلہ کرنے کے باوجود گلہ نہ کرنے کا ادعا جس انسان سے
ہے، اس کی خوبی قابل ستائش ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ کہنا کہ خدا جو تمام مخلوق کا دھیاں رکھتا
ہے، مجھے حادث ہو کر رہا ہے، مشتوق کو شرمندہ ہونے کا درد بھی موقع نہیں دیتا۔ مضمو
ادب بیانیہ لطف و اغتلاص صاحب کا امتزاج اس خوبی کے ساتھ کم دیکھا گیا ہے۔

۲۸۔ ناخدا خاقل ہو نہیں تنہا، موحیں ہو خاک

وہ تو قسمت تھی کس حل پر سینا آگیا

یہ مضمون کچھ سے کچھ جوتا رہا۔ سب سے پہلے سعدی نے لکھا۔

از در طشہ ما خبر نداد

آسودہ کو پر کنار دریا سفا

اور نقل محل کے مطابق ابکا سے کام لے کر بغایت کی ایک بہت عمدہ مثال پیش

شاعری

اس کے بعد حافظ نے انتخاب بچا کر کے اصول الفاظ قلیل و معانی کثیر کی خلاف ورزی کی
شب تا ایک دہیم موج دگر دابے چنیں حاصل

کجا دانند حال با سبکباران ساحلها

اس کا مقصد یہ ہوا کہ الفاظ کی کثرت کے باوجود معنی کی عمدگی میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی پھر
غالب کی باری آئی۔ انھوں نے وہ کسر پوری کوئی جو حافظ سے بھٹی تھی۔ ان کا شعر ہوا،

ہوا مخالفت و شب تا و موج طوفان خیر

گستہ سنگر گشتی و ناخدا خفست

ظاہر ہے کہ مضمون اصلیت سے بعد بعد رکھنے کے باعث ناقابل پذیرائی ہو گیا۔
اس شعر کے متعلق حالی نے یاد کا بغالب میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہو کہ کھنڈ
کے ایک لائق شخص نے حافظ کے شعر پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے دوسرے مصرعے میں بھی
دیے ہی خطرناک حالات بیان کئے جانے کی ضرورت بتائی، جیسے پہلے مصرعے میں مذکور
ہیں اور کہا یہ ایک بڑی کمی رہ گئی۔ مگر جب اُسے غالب کا یہ شعر سنایا گیا تو وہ پھر ہلکا اٹھا۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کو بھی اس شخص کی رائے سے اتفاق تھا۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ہو مخالفت، شب تا و موج طوفان خیر اور گستہ سنگر گشتی تو ٹھیک
ہیں مگر ایسے حالات میں ناخدا کا میٹھی نیند سوتے بھنا کیوں کو باور کیا جاسکتا ہے! ایسی
مضمون آفرینی جو یقیناً تو درکنار گمان کے لیے بھی کوئی وجہ ہو اندر نہ رکھتی ہو شاعری کا
خون کو دیتی ہے۔

حضرت ابوالفضل صاحب نے نفس مضمون میں تبدیلی کو کے ناخدا کی غفلت اور ہواؤں
اور ہولناک موجوں کے باوجود کشتی نشینوں کی خوش قسمتی سے سیف کا ساحل پر پہنچ جانا
اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ سفیلوں کو بھی چوں دچرا کوئے کی جرات نہیں ہو سکتی۔
یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ ناخدا کو فاضل بتایا گیا ہے، سوتا ہوا ظاہر نہیں کیا گیا۔ یہاں
فاضل سے خطرات کے بارے میں فاضل رہنا مراد ہے اور اس کی غفلت کو اس کے ناگزیر ہونے
کا دہونے پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ یہ تاویل سیاق عبارت سے ذرا بھی منافات نہیں رکھتی

کیوں کہ یہاں فاضل کا اور کوئی مطلب ہو ہی نہیں سکتا۔ خوفناک اور ہولناک دونوں ہم معنی اور ہوزن الفاظ ہیں۔ ان میں سے ہولناک کا انتخاب کرنا ذوقِ سلیم کا بڑا ثبوت ہے۔

۲۹۔ تم سے بیدار کو چنگیز خانی کون کہتا ہے
ترے ڈر سے تجھے قتلوں کا بائی کون کہتا ہے

یہ مطلع فصاحت اور بلاغت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ انتہائی بیدار کے امکان کا جیسا دہشت انگیز تصور لفظ چنگیز خانی استعمال کر کے کرایا اچھا ہے دیا کسی اور اعتبار سے سے ہونا غیر ممکن تھا۔ کون نہیں جانتا کہ چنگیز خاں نے تاتار سے لٹل کر دجوانب میں کشتوں کے پٹے لگا دیے تھے اور متعدد ملکوں کو پامال اور برباد کر کے ہر اس پیدا کر دیا تھا۔ یہ مضمون لاکھوں بار بندھا ہوا لیکن جس خوبی اور خوشلا سے یہاں باندھا گیا ہے، اس سے نظم و نثر میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔

۳۰۔ حضرت داعظ، تمہارے منہ سے کیا بھڑنے بیچ ل

تم تو دوزخ کو بنا ڈالو گے جنت کا جواب
اس پر طعنے شرمی اور دد کشی بیان میں یہ نکتے غور طلب ہیں،

۱۔ داعظ خود را نصیحت و دیگران را نصیحت کا مصلوق ہونے کے باعث
دوزخ میں ڈالا جائیگا۔

۲۔ جنت مخلز اور ہمیشہ بہاؤ ہے۔

۳۔ داعظ کے منہ سے بھول پھرتے ہیں (منہ سے بھول جھوٹا ناشریں زبانی
خوش کلائی کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہو۔ مگر یہاں عاویہ کے الفاظ حقیقی معنی میں استعمال ہوئے
۱۱۔ داعظ اپنی کل انسانی سے دوزخ کو جنت بنا دے گا۔

ایک شعر میں اتنے نکتے اتنی صفائی اور تر زبانی سے ادا کر دینا اور داعظ پر ایسی کار
لگانا فصاحت اور بلاغت کی معراج ہے۔

۱۲۔ یہی صلہ ہے وائوں کا تو میں بادشاہ بس اب معاف، کیا اپنا پالیا میں۔

شاعری

وہ ذمہ کی زبان میں محاورے کا خوب ٹھوک کر بٹھایا اور پیش پا افتادہ مضمون کو بلند کر دیا داد سے مستثنیٰ ہے۔

۲۲۔ یہ جی میں ہے کہ تکلم بھی آزاد دیکھوں

نخوشیوں کو بہت آزما لیا میں نے

عاشق معشوق کے سامنے تمت مدیت تک اس امید میں چپ سا دھے رہا کہ اس کی خاموشی ہی تکلم کا کام دے جائیگی، مگر جب وہ بری طرح ناکام رہی، تو اسے خیال ہوا کہ تکلم کو بھی آزما کر دیکھ لیا جائے۔ تجربے کا نتیجہ یا مثبت ہوتا ہے یا منفی، جب ایک تجربہ منفی کا مطلب ثابت نہیں ہوتا، تو دوسرے تجربہ پر کیا جاتا ہے۔ انسان کی فطرت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ حسبِ اوجہ و نشانہ برا بد ہونے کا یقین نہ رکھنے کے باوجود اضمادات کی آزمائش کیے بغیر نہیں رہتا۔ تکلم بھی آزما دیکھوں، میں لفظ ”بھی“ سے ظاہر ہے کہ عاشق کو تکلم پر بھی اعتماد نہیں تھا، ہم وہ تمت اور مائی کہنے میں کوئی کسر اٹھا رکھا نہیں چاہتا، شعر کا مضمون ایک نفسیاتی تحریک سے تعلق رکھتا ہے جس کے بیان کے لیے اس سے بہتر اسلوب نہیں ہو سکتا۔

۲۳۔ اے اجل! بہر خدا، تھوڑی سی جہالت دے دے!

اک تمنا کے بر آنے کی تمنا ہے ابھی

اک تمنا کے بر آنے کی تمنا قابلِ کوا جن سے گوا گوا کر جملہ انکسے چھوڑ کر دیتی ہے۔ اس کے نفسیاتی بحران کا اظہار جس عمدگی سے کیا گیا ہے، وہ مصور کے قلم سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ذیل کی تعریف سے عہدہ بر آؤنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

۲۴۔ یوں تو مجھ کو بھی ہے کھوکھنے کی جہالت، لیکن

دو دنوں آنکھوں سے نیچے کوداؤں تو کہوں

یہ شعر اس غزل کا ہے، جو حضرت فیض الملک کی غزل پر بھی لکھی تھی، حضرت بو صوفی نے لکھا اتحاد

دل میں جو کچھ ہے، وہ کہتے ہوئے حق ڈرتا ہے

گنگا لوں تو کہوں، پاؤں دہاؤں تو کہوں

شاہی

اس کی رلاکت اور عوامی ظاہر ہے مگر لوگوں نے اسے بہت پسند کیا اور بیت الغزل دیا تھا کیوں کہ اس زمانے کے معاشرے میں ثقافت بھی ابتذال کو کم ہی مانپند کرتے تھے۔ حضرت ابوالفصاحت نے یہی تافیر بڑی ثقافت اور متانت سے باندھا ہے آپ ہم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں جیسی ہمیں میری بات سننے کی جلدی ہے، ویسی ہی دیکھی کہ دالنے کی عجلت ہے، مگر میں کیلئے کو جو کھانا بنا رہے، دالوں ہاتھوں سے خوب د کے بعد ہی کہہ سکو گا۔ یہ چند بڑی عمیق معنویت رکھتا ہے، جس نے فصاحت کے سانچے ڈھل کر بیان میں ایک عجیب لطافت پیدا کر دی ہے۔

۳۵۔ پوچھتا ہوں کہ تمہیں پاس دعا ہے کہ نہیں؟

کچھ کہو بھی، جو کھا جمنے مست ہے کہ نہیں؟

مدینے زمین غزلی کو مشکلاخ بنا دیا ہے۔ اس میں ایسے تیور اور گرم گھٹاری رکھنے مطلع کمال لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ روز قرے کی صفائی نہتے کمال پہنچے۔

۳۶۔ آدمی بھی ہے خدا سے دل لگی کرنے میں۔

آدمی سے بھی خدا کی دل لگی کچھ کم نہیں

اُوی اہم جنس ہے۔ جہاں لوگ اوپری دل سے خدا کی عبادت کر کے اس کے ساتھ دعا کرتے ہیں وہاں خدا بھی انہیں نودس اور چودہ قصور کا دلخوش کن فریب دے گا کہ دل لگی کرتا ہے۔ بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے، بندے کا خدا سے کیا مطالبہ! اس باوجود بندے اور خدا کے درمیان دل لگی کرنے کی صفت کا اشتراک ثابت کر کے دونوں کو ایک ذیل میں رکھنے سے مضمون میں غیر معمولی جدت پیدا ہو گئی اور سلاسل اور انداز بیان نے اسے نہایت دل آویز بنا دیا۔

۳۷۔ مقصود مجھے رحمت، مطلوب تجھے طاعت

کچھ میں بھی سوالی ہوں، کچھ تو بھی سوالی ہے

اس میں شک نہاد ان کا باعث مجھے بچنے کے لیے شر کو چھوڑ دینا بھی غوی ہے۔ تقسیم کر دینے کہ ہر جہت سے نئے خود مکمل ہو گیا۔ مضمون میں خدا سے بڑی باخوشی

شاعری

گئی ہے جو خوشی ہونے کے باوجود متانت سے خالی نہیں۔ ایک طرف رحمت کی خواہش اور دوسری طرف طاعت کی طلب لے قائل اور خدا دونوں کو سائل ثابت کر دیا یہاں اتر گیا۔
کاہیک وقت مشورے اور متین ہونا عجائب سخن میں شمار ہونا چاہیے۔

۳۸۔ دہخ دل چکا، تو غم پیدا ہوا

یہ اندھیرا صبح دم پیدا ہوا

اور شعر نے استعارے اور تشبیہ سے بہت کم کام لیا ہے۔ بیان کی ایک بہت بڑی نوعیت
ہی جب کسی مضمون کے کما حقہ بیان کرنے میں بول چال کی زبان رو دیتی ہے، تو استعارے
اور تشبیہ سحر و سنوں کا کام کر جاتے ہیں۔ میں جس زمانے میں اپنے نانا کی ہدایت کے مطابق
ایران کے شعراء متاخرین کے خطی اور مطبوعہ دواوین کا وسیع اور دقیق مطالعہ کر رہا
تھا مجھے جلالائے آئیر شہرستانی کا شعر:

در دل از سستی فضاں غم کردہ ایم

بلبلے در آستیاں غم کردہ ایم

بہت پسند آیا اور اب بھی جب یاد آ جا رہا ہے تو میں اس کے لطف میں کوئی کمی نہیں پاتا۔
اگرچہ فارسی اور اردو کے ان شعروں کے مضمون بالکل مختلف ہیں، لیکن استعارے کے
بلج استعمال اور حسن بیان کے لحاظ سے دونوں لطف انگیزی میں مساوی اور میزان سخن میں
ہموزن پاس جاتے ہیں۔

۳۹۔ بھر گیا آہ چراغ دل بسوزاں میرا

گور میں باد فضا، بعد فضا بھی آئی

مضمون میں حقیقی اور عالیٰ اصلیت اور ہونے کے باوجود الفاظ اور فضا کے حصول
ماتق ہوئے ہے جو مخاطب انگیز صوتی توافقی پیدا ہو گیا ہے، اس ضمن میں یہ کہ بھی یاد رکھنے
کے قابل ہے کہ اگر مخاطب انجمن صوتی توافقی پیدا کرنے والے الفاظ کے درمیان ایک لفظ بھی
آ جا یا تو توافقی کو خراب ہو کر مرض وجد میں نہیں آگئی۔ حسرت اور انصاف نے جو حسرت
حزینہ کی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ قائل کے مرنے کے بعد گونہ شہنشاہ کی طرف سے

شاعری

کھوئے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ شعر سخن طرازی کے ابتدائی زمانے کا ہو گا۔
۴۰۔ کہتا ہے وہ ظالم مری فنیس یاد کو سن کر

مے طاقت فریاد، خستہ اوں زیادہ

گلے پر چھری پھیر دینے والا شعر کہہ دیا ہے۔ عاشق کی ناقابلِ بہداشت باطنی اذیت اور مسلسل فریاد اور معشوق کی میر جی اور ستم ظریفی کا ایما میں اظہار سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا کار سے داد۔

۴۱۔ کچھ پاس کر اس ضعف کا، لے رحمت باری!

اٹھتے نہیں اب دست دعا اور زیادہ

اس میں ہتھ دار معنویت ہے۔ فرماتے ہیں۔ میری ساری عمر متواتر دعائیں مانگتے میں گزر گئی! حتیٰ کہ ضعف طاقت پر غالب آگیا جس سے اب دھلکے لیے ہاتھ اٹھانے تک کی سکت بھی نہیں رہی۔ لے رحمت باری! تو اتنی بے لحاظ کیوں ہے؟ اب تو میری ناچاری کا کچھ پاس کر۔ اس بلیغ بیان میں دو کاشف الحجاب لفظ "ضعف" اور "اب" ہیں جن سے جملہ مقدمات برہن ہو جاتے ہیں۔

۴۲۔ میری ہی زندگی کی قسم کھائی آپ نے

جوابات کی خدا کی قسم پایدار کی

میر نے لڑکپن میں کسی کا یہ مطلع کہیں نہ پایا تھا تھا

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی

جوابات کی خدا کی قسم لا جواب کی

مجھے پہلا مصرعہ بڑا درد دلا اچھا لگا۔ پہلے مصرعے میں بعید از عقل واقعہ بیان کیا گیا تھا اور دوسرے میں دردِ فہم کی بڑی صفائی تھی۔ گمانِ غالب ہو کہ زیرِ نظر شعر انشا کرتے وقت حضرت ابو الہدٰی صاحب کے ذہن میں نہ کہ نہ بالا مطلع تھا حضرت بھٹن کا ذو معنی شعر نہایت فصیح اور بلیغ ہے۔ مگر میری نظر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ عاشق معشوق کی تعریف کو کہہ رہے کہ آپ نے بہت سے عاشقوں کے ہوتے مجھے میری ہی بنا ستم کھائی، ستم کے سچے اور بھلے ہونے میں کوئی شک

شاعری

نہیں کہوں کہ قسم ایمان یا کسی ایسے شخص کی کھائی جاتی ہے، جو عزیز ترین ہوتا ہے۔ پھر خود بھی خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ آپ نے اپنے شیوہ راسخہ کے مطابق یہ پایدار یعنی مبنی بر خلوص بات کر کے میرے ساتھ اپنا پیش از پیش تعلق خاطر واضح کر دیا ہے۔ یہ تو ہوا ایک مطلب اب دوسرا مفہوم دیکھیے جو اس سے زیادہ لطیف اور سترتا ستر ہے۔ عام مضمون ہے کہ جس شخص کی جان کی جھوٹی قسم کھائی جاتی ہے وہ مرجاتا ہے۔ اسی بنا پر عاشق معشوق سے کہتا ہے کہ آپ نے اور سب کو چھوڑ کر میری سی ناپائیدار زندگی کی پایدار کو (بمعنی ناپائیدار و دروغ) قسم کھائی ہے جس کا نتیجہ جلد ہی میری موت کی شکل میں نکل آئیگا۔ واللہ، آپ کی ہر بات تہداد ہوتی ہے۔ قسم کو جھوٹی سمجھنے کا قرینہ مصرع اول کے الفاظ میں موجود لیگا، بشرطے کہ اسے طنزیہ لہجے میں پڑھا جائے۔

۴۲۔ میرے دہنے پر بھی شکوہ ان کے لب پر آگیا

کہ رہے ہیں کیوں تمھاری آنکھ میں پانی نہیں

آنکھ میں پانی نہ ہونا محاذِ دہ ہے جو بشری اور حیوانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس شعر میں محاذِ دہ کے الفاظ نے بیک وقت مجازی اور حقیقی معنی دے کر بیان میں دو گونہ لطف پیدا کر دیا۔

۴۳۔ داد و ستار ہوں تجھے، یا رب! میں اس شخص کی

ہر باں سب کے لیے، ناہر باں میرے لیے

خدا سے دور درگشت کایت کرنے کی بجائے ہنسی ہنسی میں شواہ کو کے خوشی کی انتہا کر دی ہے۔ لطف زبان اور حسن بیان سچان اللہ۔ خدا سے ایسی طنز آمیز شوخیوں یا غالب کرتے تھے یا حضرت ابراہیمؑ صاحت کرتے ہیں۔ دونوں مصرعوں میں الفاظ کی بندش اور طرزِ خطاب کا نکھار قابلِ دید ہے۔

۴۴۔ موت کی زد سے بچ گیا جو کوئی

اس کو عمرِ دراز نے مارا

موت انسان کو بے مارے نہیں چھوڑتی اور عمرِ دراز اسے مدت تک مرنے سے بچائے

شاعری

کہتی ہے۔ یہ ایسی صداقت ہو جسے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر یاد
مضطرب اور دامن دنیا میں قید و طویل کے شکار ایک کو نظر انداز نہ کیا جائے تو اتنا پڑیگا
کہ جو شخص موت سے لفظ نہیں مڑتا اسے عمر دما دمنا مردہ کہہ دیتی ہے۔ گویا زندگی اور
موت دونوں باعث ہلاکت ہوتی ہیں۔ میں نے لڑا کچن میں نظامی گنجوی کی مثنوی شیریں
خسرو پڑھی تھی۔ اس کے یہ اشعار اب تک یاد ہیں،

نشا اب عمر باشد تا بہ سی سال
چو چل آید، فردرید پر وبال
پس ادب چہ نہ باشد تندرستی
بصر گندی پزیرد، پایے سستی
چو شخصت آید نشست آید بد یار
چو ہفتاد آید، افتد آلت از کار
بہشتاد و نو دچوں سن رسانی
بود مرگت لبشکل زندگانی

لفظ نامہ کے حقیقی اور مجازی معنی میں استعمال سے لطف زبان میں بہت اضافہ ہو گیا۔

۴۶۔ نقاب رخسے اٹھادی، مگر کمال یہ ہو

مری نظر کا بھی پردہ اٹھا لیا کوئی

یہ بلیغ مضمون رفیع و وسیع بھی ہے اور عمیق و دقیق بھی۔ اس کے بارے میں کچھ نہ کہنا سب
کچھ کہہ دینے کے برابر ہوگا۔ جب ہا بھارت کے ددوؤں میں کرشن نے اوجن کو اپنا درواڑا روپ
دکھایا تو اسے ان کی لامحدود ذات میں ہر سہ عالم ایسے نظر آئے جیسے بحر بیکراں میں پانی
کے تین قطرے گم ہوں۔ ذہب مصطفیٰ خان حسرتی دہلیفٹہ کہتے ہیں،

وہ شخصیت شخصی بھی جاتی رہی
کنارہ ایٹھے بھی جلباب کا

اس میں حضرت ابوالصباح کے شعر کے متعدد پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو دکھایا

۲۷۔ ان سے تو قیر محبت نہیں ہوتی، نہ سہی

اتنی تحقیر محبت تو خدا ارادہ کریں!

عاشق جس کا عشق بے تمنائی کی بدولت بلندی معیار کی حد آنسو پر پہنچا ہوا ہے، تو قیر محبت نہ ہونے کا شاک نہیں ہوتا، لیکن تحقیر محبت پر اسے معشوق سے کہنا ہی پڑتا ہے کہ وہ برائے خدا انتہائی تحقیر محبت تو نہ کرے۔ درحقیقت جس کی محبت اتنی بلند پایہ ہو، اس کا تحقیر محبت پر تملنا جانا قدرتی امر ہے۔ بہر حال التماس میں جو مجھ رہے وہ جزو نفس پر غالب نہیں آیا۔

۲۸۔ وہ ہیراں نہیں، نہ سہی، طفت تو ہیں

اُن کا ستم بھی ان کی عنایت سے کم نہیں

عاشق کو معشوق کا صرف التفات دے گا رہے۔ اسے ہیراں اور ناہیراں کی فرق سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ستم اور عنایت کو ایک ہی درجے میں رکھتا اور سادگی سمجھتا ہے۔ مضمون زبان ادبیان تینوں کی خوبی یکجائی صولت میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

۲۹۔ اتنی خوشی ہوئی ہے ترے التفات کی

عمر گزشتہ مانگ رہے ہیں خلعت سے ہم

یہ بھی التفات کے مضمون پر ہے۔ معشوق کے التفات سے زیادہ دیر تک لطف امداد نہ ہونے کے لیے خدا سے عمر گزشتہ کی بازیافت چاہنا انتہائے احتیاط کا اظہار جس عمدگی سے کرتا ہے، وہ کسی ادیب پر ایسے بیان سے نہیں ہو سکتا۔ نظیری کہتا ہے:

از عین زمانے کہ یہ قیصر تو بنو دم

در خود بفضیب بنیم و بر تو بہ تا شرف

یہ شعر حضرت ابو الفصاحت کے ارشاد سے اہل میں متجاس اور فرخ میں متوالف ہے۔ اس کا مفہوم مقدمات کے باوجود بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ تاہم میں زرا کھول کر بیان کیے دیتا ہوں:

اے معشوق تیرے عشق میں گرفتار ہونے سے پہلے جو عمر اچھا لگتی، اس کے نقصان کا خیال

شاعری

کہتے تھے اپنے اوپر غصہ آتا ہے رک میں اپنے آپ کیوں گرفتار نہ ہو گیا
افسوس ہوتا ہے (کہ تو نے مجھ کو اتنی مدت تک قید کی لذت سے محروم رکھا)
مومن نے جو شعر کہا ہے 'وہ حضرت ابوالفصاحت اور نظیری کے مضمون سے بالکل
ہونے کے باوجود مدت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ ملاحظہ ہو:

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے

اس کا نہ دیکھنا بجز التفات ہے

بہر حال حضرت ابوالفصاحت کے تغزل کی تہذیب و معنویت اور بیان کا حسن و بیش
کاستی ٹھہرتا ہے۔

۵۰۔ اہل لک کی دوستی نے لکھا یا ہے یہ سبق

غیردوں کی دشمنی بھی غایت سے کم نہیں

تہذیب و شعریہ۔ یہ بیان کرنے کے لیے کہ اپنوں نے بے انتہا آزادی سے اور بے شمار
غیروں کی دشمنی کو غنایت کہنا غایت، بلیغ اسلوبِ اِطّلاخ جو جس سے اندازہ کیا
کہ اپنوں نے وہ کچھ کیا ہو گا جو غیروں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ یہی مضمون کسی قدر
آتش مکنوی نے یوں باندھا تھا!

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر

دل سے دشمن کی عداوت کا کٹھن حب تارم

شعر اچھا ہے اگر بیان میں وہ بلاغت کہاں ہے جو حضرت ابوالفصاحت کے ارشاد
جاتی ہے!

۵۱۔ مجھے رات بھر یاد کس نے کیا ہو

سحر ہو گئی ہچکیاں آتے آتے

یہ اس غزل کا شعر ہے جو حضرت فصیح الملک کی غزل پر لکھی گئی تھی حضرت فصیح
شعر ہے:

مجھے یاد کہنے سے یہ مدعا تھا نکل جانے دم ہچکیاں آتے

شاعری

اے مضمون آفرینی کون کہیگا۔ یہ تو مضمون تراشی ہے اور وہ بھی زبردستی کی۔ اس پر بحث کرنے کے ضمن میں ابر تفتیح طلب یہ ہے:

سوال ۱۔ کیا جس شخص کو یاد کیا جاتا ہے، اسے ہچکیاں آتی ہیں؟

سوال ۲۔ کیا ہچکیاں آتے آتے دم نکل جاتا ہے؟

سوال ۳۔ کیا معشوق عاشق کو ہلاک کر دینے کے لیے اسے یاد کرنے کا حربہ استعمال

کرتا ہے؟

سوال ۱۔ کا جواب یہ ہے۔ مظلون عام کے مطابق یاد کیے جانے والے شخص کو ہچکیاں

آتی ہیں۔

امیر مینائی لکھتے ہیں ۵

سا لہا سال ہوئے ہیں نہیں آئی ہچکی

مجھ کو غربت میں عزیز زمانِ وطن بھول گئے

مگر ایسی ہچکیاں دو چار، بیانِ سات یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ آتی ہیں۔ انہی ہچکیاں آنا کہ ان سے دم نکل جائے قطعاً بعید الوقوع ہے۔

سوال ۲۔ کا جواب یہ ہے۔ علمِ طب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب بزرگے ماؤف ہو جانے سے چند در چند جھپکریاں پیدا ہو جاتی ہیں، تو ہچکیوں کا تانہ اس بندھ جاتا ہے، جسے طبِ علامتِ لدی کہتے ہیں اور مریض دن رات ہچکیاں لیتے لیتے بالآخر دم توڑ دیتا ہے۔

سوال ۳۔ کا جواب یہ ہے۔ کوئی معشوق عاشق کو ہلاک کر کے کچے لپے اسے یاد نہیں کرتا اور بغرض حال کرتا ہے تو اس کی یہ حرکت انتہائی حماقت ہوتی ہے۔

ان امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ معشوق پر جو افترا باندھا گیا ہے اسے کیوں یاد کیا جائے۔ بشر میں کسی خوبی کے بجائے متعدد نقائص ہیں۔ ایسے نقائص کا باعثِ اعمامِ دو دو گئی اور بس یاد کوئی ہوتی ہے۔

حضرت ابو الفصاحت نے فی الواقع ایسی مضمون آفرینی کی ہے، جو چار پہر تک علی التوہر ہچکیاں کرنے کے متعلق کہیں نہیں دیکھی گئی۔ کسی کو شام سے صبح تک ہچکیاں اسی صورت میں آ سکتی

شاعری

یہ کہ اسے یاد کرنے والی بات بھر یاد کرتا رہا ہو۔ آپ نے یہ شعر پوری کو کے شعر کو خوب
اور محسن بیان کے بلند ترین درجے پر پہنچا دینے میں کمال کر دکھایا ہے۔ بد حقیقت اب اس
زمین میں یہ قافیہ کسی لطافت اور لطافت سے بندھنا ممکن نہیں۔ پھر یہ امر بھی قابل
ہے کہ معشوق کا نام اس کی رسوائی کے خوف سے نہیں لیا گیا۔

۵۲۔ مدت ہوئی کہ باب اثر بند ہو گیا

میں نے دعا سے ہاتھ اٹھایا نہیں ہنوز

باب اثر بند ہو جانے اور دعا سے ہاتھ نہ اٹھانے کے درمیان جو بعد زمانی واقع ہے اس
اندازہ ایسی صورت میں کرایا جاسکتا تھا کہ پہلے مصرعے کا پہلا لفظ "مدت" اور دوسرے
مصرعے کا آخری لفظ "ہنوز" ہوتا۔ تنویدیت سے مغلوب نہ ہونے والی رجا بریت ہو تو آ
ہو۔ ہاتھ اٹھانا محاذ ہے جسے اہل زبان حسب موقع کسی پر حملہ کرنے یا کوئی کام یا اور
ترک کر دینے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ جو فاء ہی کے محاذ سے ترجمہ ہو کر "دود کا جود"
گئے ہیں ان میں ہاتھ اٹھانا (دست بردار شدن یا دست برداشتن) بھی شامل ہے۔ اس
شعر میں محاذ ہے کے الفاظ اصولاً مجازی معنی میں استعمال ہونے ہیں۔ اگر ان کے حقیقی معنی
لیے جائے گا محاذ سے کا خون ہو جاتا۔ میر جہدی مجروح (شاگرد غالب) نے اس محاذ
کو حقیقی مفہوم میں برت کر شدید غلطی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

حرف تم اپنی نزاکت پہ نہ لانا ہرگز

ہاتھ بے داد و ستم سے نہ اٹھانا ہرگز

ہاتھ اٹھانے سے نزاکت پر حرف ہی صورت میں آسکتا ہے کہ ہاتھ جو جسم کا ایک حصہ ہے
لہذا واقع اٹھایا جائے۔ بیداد و ستم ترک کر دینے سے نزاکت پر حرف آنا ہرگز ممکن نہیں
حضرت فصیح الملک کا شعر ہے:

دلف آہستہ چپکے! مجھے ڈر لگتا ہے

آپ کے ہاتھ کا جھکانہ کمر تک پہنچ

یہاں کوئی محاذ نہیں باندھا گیا۔ الفاظ کا استعمال ان کے حقیقی معنی میں ہوا اور خوب

شامی
 فاس ہے گو یہ دوسری بات ہے کہ رلف اور کر کے مضمون باندھنا اب شائستگی کے خلاف سمجھا
 جاتا ہے۔

۵۱۔ اسے شیخ! کس جگہ کو تیرا مقام سمجھیں

تو کچھ زمین پر ہے، کچھ آسمان پر ہے
 شیخ جو ادھر مخلوق میں شامل اور ادھر خالق سے واصل ہونے اور محراب بین العالمین کی حقیقت
 رکھنے کا مدعی ہے اس کا خوب مضحکہ اڑا رہا ہے۔ پھر مصداق سوال میں جو روشنی ہے اس کا
 لیا کہنا۔

۵۲۔ ہر خوشی قربانی کی تھی میں نے کس پر، آپ پر

میری ہر خواہش کو ٹھکرایا تھا کس نے، آپ نے

اس حال جواب سوال کے طور، الفاظ کی بندش اور زبان کی روانی نہایت لطف انگیز ہیں۔

۵۵۔ کہیں دریا سے محبت ہی نہ طوفانی ہو

دوبلی جاتی ہے مری آج طبیعت کیسی

اس زمین اور مقام پر درویش میں حضرت فصیح الملک کا شعر ہے:

آپ ہی جو رکویں، آپ ہی پوچھیں مجھ سے

یہ تو فرمائیے، ہے آج طبیعت کیسی؟

دونوں شعروں میں مضمون کی متانت اور روشنی کا فرق ظاہر رہا ہے۔ حضرت ابوالفصاحت

نے عین دردن میں سے کام لے کر جو نفیاتی نتیجہ نکالا ہے، اس کی بلحاظ دقیقہ سی کیا تعریف ہو!

بیت: دوبنا کا در ہے۔ طبیعت ڈوبنے کے متعدد ابواب میں سے دریا سے محبت کے طوفانی

لے کو سبب قرار دینا ایسی لطیفیت ہے جو تشکیک آمیز ہونے کے باوجود حکیم ابوعلی سینا کی

بعض مشہور بحالہ تشبیحات سے ہرگز کم نہیں۔

۵۶۔ اس تند خو سے شکوہ بیدا کیا کریں

کچھ اپنی جان سے تو مجھے دشمنی نہیں

مضمون غالباً غالب کے اس شعر سے سوجھا ہے:

شاہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی تھی

یہ شعر غالب کے نہایت عمیق، دقیق اور لطیف اشعار میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اس
برسبیل ریکارڈ حافظہ مقدر رکھے ہیں، وہ عیالت میں مذکور قرآن پر غور کرنے سے!
دھتے اور سارا غلا پڑ کر دیتے ہیں۔ یہی مضمون اسی انداز سے مگر ایک بار ایک فرق کے
حالی نے یوں باندھا ہے:

حباں بھتی نظر نہیں آتی
غیر الفت بہت جتانے لگے

حضرت ابو الفصاحت کے ارشاد میں بھی تہذاری ہے، جسے بلاغت کی جان سمجھنا چاہیے
یہ جہر ایسی نہیں کہ غواص کو اس تک پہنچنے کے لیے اپنے جسم سے بہت بھاری پتھر باندھ
خوٹ لگاتا ہے۔

۵۷۔ نصیبی بد نصیبی ہے، مگر اتنی بھی کیسا!

کوئی دن، کوئی ہینا، کوئی سال اچھا نہیں

وہ انی، انتہائی روانی، صفائی، انتہائی صفائی اور جزالت، انتہائی جزالت ہے۔ اس
اعتراض ہو سکتا ہے، مگر اعتراض کوئی سخن فہم ہی کر چکا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ جب کوئی دن اچھا
نہیں کہ دیا، تو پھر کوئی ہینا، کوئی سال کہنا نظویل لاٹا ہے۔ اس اعتراض کا جواب
یہ ہے۔ سال کے بارہ ہینے اور چار ہینے کے تیس دن ہوتے ہیں۔ تمام اول سے بد نصیبی
شکایت کا مطلب یہ ہے کہ کسی سال کا کوئی ہینا اور کسی ہینے کا کوئی دن اچھا نہیں ہوتا۔
سادہ عمر چالی میں گئی ہے، اور جو باقی رہ گئی ہے وہ بھی اسی طرح گئی۔

۵۸۔ کچھ تلخ تو ضرور ہے یہ، اے جناب شیخ!

ہینے کے بعد اس کا مزا، کچھ نہ پوچھیے

یہ شعر حضرت فصیح اللک کے اس شعر کے پلے کا ہے:

لطف ہے تجھ سے کیا کہوں ز ابراہیم کم نجات! آنے ہی نہیں

شاعری

حضرت مصروف کے شہر میں شراب پینے تلخی کا ذکر نہیں آیا، حال آنکہ شراب کا تلخ ہونا لازمی ہے جس کے باعث اکثر طبائع شراب نوشی سے متجنب رہتی ہے۔ حضرت ابو الفصاحہ نے یہی نہایت عمدگی سے پوری کر کے شعر کو پی لینے کی ابر دست ترغیب دی ہے۔ فصیح روزمرہ اپنا جواب نہیں لکھتا۔

۵۹۔ تاکر وہ گناہی میں گرفتار ہوا ہوں

اب دیکھیے اس جرم کی مٹی ہے سزا کیا!

یہ شعر کلاوی سے پہلے برطانیہ کی استبدادی حکومت کے قہر و غضب اور جو دہنم کی مثال بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ خیر اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس شخص کے ذہنی کرب کا کیا عالم ہے جو بیگناہی کے جرم میں ماخوذ ہو کر عقوبت کی نوعیت سے قطعاً بیخبر ہے اور جسے طرح طرح کے ہشتناک خیالات نیم مردہ کیے دیتے ہیں۔ فصاحت نے نظم و نثر میں حیرت انگیز نگرانی پیدا کر دی ہے۔

۶۰۔ خون کی شان یہی ہے کہ وہ فاتح ہی ہے

تم کو زیبا ہمیں مغلوب غضب ہو جانا

نکتہ آفرینی اسی کا نام ہے۔ معشوق کو درد دہاں سببات پر غضبناک ہو جانے سے باز رکھنے کے لیے کیا لامعاب منطقی استدلال کیا ہے اور اس کو ناقابل تردید بنا دینے کی فرض سے کیسے موزوں اور مناسب الفاظ استعمال کیے ہیں!

۶۱۔ سیرت کے ساتھ خفیہ میں صورت بدل گئی

پوشیدہ خود وہ ہو گئے دل کے مہربان

یہی مضمون حضرت فصیح الملک نے بھی باندھا ہے،

نقشہ بگڑا رہتے رہتے خشناک

کھنکھنی قاتل کی صورت ہو گئی

مجھے فقط کھنکھنی بہت بڑی طرح کھنکھاتا ہے کیوں کہ کھنکھانا اور کھنکھننا کتے اور کتیا کے لیے لے لے جاتے ہیں اور اس شرمناک نقلی نے معشوق کو جس شکل میں دکھایا ہے، اس کے نہایت فصیح ہونے میں

شاعری

دعا بھی شک نہیں۔ اس کے برعکس حضرت ابو الفصاحت نے مشق کی صورت کو بدل گئی ہے، دل کے فبا میں پوشیدہ ہو جانے سے عبارت کے پاکیزہ گوئی کی حد

۶۲۔ اسرار حقیقت کے سمجھ نہیں فرماتے

تکصیر تو ان کی تھی، مارے گئے دیوانے

دنیا کا دستور عجیب ہے۔ قصود فہم فرماؤں کا ہوتا ہے، اور اس کی سزا دیوانہ ہے۔ مقصود راہِ قس تبریز کے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ صعب کو معلوم ہے۔ حال کہا ہے:

سخن حق کی داد لوں کس سے !

سن چکا ہوں فائدہ منصور

حضرت ابو الفصاحت نے یہ مضمون جس انداز سے بیان کیا ہے، وہ آپ ہی کا "مارے گئے" کی معنویت اور فصاحت روزِ قمرے کے استعمال کا بہترین نمونہ۔ نواب مصطفیٰ خاں حسرتی و شیفتہ کے شعر کا مضمون اس کے بالکل برعکس ہے:

صد گونہ اعتراض بر گفتارِ بعلیست

تقریض۔ مگر طریقہ، بجنوں نکرہ کس

ہر مسئلے کے کئی کئی پہلو ہوتے ہیں، جنہیں مختلف لوگ زادِ یہاں سے نظر سے دیکھ کر الگ کہتے ہیں۔ حضرت ابو الفصاحت جس خیال کے حامی ہیں اس کے مؤیدوں کی کثرت رہا ہے اور رنگی۔

۶۳۔ مزائیں سوزِ محبت کی لدا ہی ہیں مجھے

لگی ہوئی ہے تمھاری یہ دل لگی کیا ہو

ایسی ہی پاکیزہ زبان کو اب کوثر سے دھلی ہوئی زبان کہا جاتا ہے۔ "دل کی لگی" سے دل لگی کا لطف دہانے سکتے ہیں، جنہیں روزِ قمرے کے حسبِ استعمال

۶۴۔ کوئی ہے دیر کا بد خواہ، کوئی کہے کا

ہم دعا کہتے ہیں آباد رہیں گھر دونوں

شاعری

جو ان اللہ مذہب و ملت کے اقتیاد سے بالاتر ہونا اور ہر محبت اور ہر فرستے کی خیر خواہی
کو ناہی صحیح معنوں میں آزاد خیالی ہے۔ یہ شعر اس مسلک کی توضیح کرتا ہے، جس پر حضرت
ابوالنصاحت عمر گھگھڑا کرتے رہے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی میں ایک شعر ہے
جس کا مخاطب خدا اور مخاطب حضرت ہوئی ہیں :

تو براے وصل کو دن آمدی

لے براے فصل کو دن آمدی

۶۵۔ حریم ناز سے باہر نکل کچھ داد دے اُن کو

تو دے دیک جو آ بیٹھے میں منزل آ بیٹھے ہیں

"منزل آ بیٹھے ہیں" جہاں استعمال کیا ہے اور جس خوبی سے استعمال کیا ہے اس کی کیا داد
دی جائے۔ محاورے اور روزمرہ کا ایسا انزعاج حضرت ابوالنصاحت کی بے نظیر اور نکلائی
کی شہادت دیتا ہے۔

۶۶۔ دل کو سوداغ مرے عہد جوانی نے دیے

شبِ تاریک میں روشنی یہ سپہ خانہ ہوا

جوانی دیوانی مشہور کہادت ہو۔ عہد جوانی میں انسان کو کچھ بھلا بڑا نہیں سوچتا۔ گویا
عہد جوانی تانہ ناعاقبت اندیشی ہوتا ہے۔ اس سن میں عشق کا سودا اچھلتا ہے، اور اپنے بیک
بد کی کچھ خبر نہیں دیتی۔

بقول حضرت فصیح الملک :

دل اندھا دھند سی آتا ہو، جب بھلا تا سوداغ !

چھان بین اس میں نہ کچھ چھان بھٹک ہوتی ہو

حضرت ابوالنصاحت نے عہد جوانی کو شبِ تاریک اور دل کو سپہ خانہ کہہ کر استعاروں کا
ایسا عمدہ استعمال کیا ہے جس کی تعریف کا حق ادا کرنا آسان نہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ
عہد جوانی میں کئی خوش حالوں کے عشق میں مبتلا ہوا مگر اُن کا قرب حاصل نہ ہونے سے میرے
دل میں دماغِ حسرت پڑ گئے۔ ان دماغوں کے جلنے کی روشنی سے شبِ تاریک (عہد جوانی) میں

میرا یہ خانہ (دل) روشن ہو گیا۔ ایک شعر میں اکٹھے دو استعارے لاکر زبان کو
لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

۶۷۔ سکون دل تو جہاں میں کہیں نہیں لے جو شہلا
پھر اس سکون کے لیے اضطراب کیا آئی؟
منطقی استدلال بالعموم شعر کش ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں اس شعر میں جان بھی پڑ
شہلا سالک شاگرد غالب نے دکھایا ہے۔

کچھ تغیر مرے احوال پریشاں میں نہیں
ایسے عالم میں ہوں جو عالم الگ میں نہیں
شعر زیر بحث کا سارا لطف اسی منطقی استدلال کا رہیں منت سمجھنا چاہیے۔ سکون
کے تضاد کی غویٰ محتاج بیان نہیں۔ جو شے معدوم ہو اس کو موجود خیال کر کے
رہنا ایسا ہی ہے جیسے

بار بار آمد مہما در دام ما
باز سردا دیم و عنقا خواستیم (غالب)
۶۸۔ جب جو سے عقل انساں اور سوائی ہوئی
ہر شناسائی سے پیدا نا شناسائی ہوئی

عرفی میں ایک مقولہ العلم حجاب الاکبر لسانی زبان سے ترجمہ ہو کر بہت مشہور۔
کو اسی کی تفسیر سمجھنا چاہیے۔ حضرت ابوالفصاحت کے ارشاد کا مطلب یہ ہے
پہلے ہی سودائی کئی اسرار کی کریہ میں اور بھی سودائی ہو گئی اور اس پر جو کچھ آگیا
انھوں نے حقیقت پر اور بہت سے پردے ڈال دیے۔ دواہل انسان کے علم پر
ہوتا جاتا ہے اس کے باعث جبل میں اتنی ہی بیشی ہوتی جاتی ہے۔ عرفی کہتا ہے
ہر کس نہ شناسندہ رازست و گزند
ایں ہما ہمہ رازست کہ معلوم معلوم است
مطلب یہ ہے کہ مخلوق جو اسرار کو منکشف خیال کرتی ہے وہ بدستور مشتربہیں۔

شاعری

اسے دیکھی ہوگا۔

پلاکے جگہ پر اپنا ایک شعر برسیل پیش نقل کیا ہے۔ اب پھر
ایک اور شعر نکلتا ہوں:

رو نہ آگئی پر گامزن ہوں

تجلا سے چراغ آگئی میں

اب الفصاحت نے عقل کا سودا لی جو ناادب شناسائی سے نا شناسائی لازم آتا کہ کر
یاد کو چا دھا چاند لگا دیے ہیں۔

۶۹۔ دل پر وہ ترے ستم، تیری جفا، تیرا غضب

عمر بھر یاد رہا، یاد رہی، یاد رہے

صنعتِ بندِ شعر محکوسِ الترتیب پر لطفِ زبان کا مستزاد ہو نا فراموش نہیں ہو سکتا۔
جامعِ الھک نے بھی کہیں کہیں ایسے اشعار ایسی ہی خوبی سے کہے ہیں۔

۷۰۔ دیکھنا اُمیدِ راحت کے کوشش سے دیکھنا

مجھ محمّی ہے شمع، پھر بھی روشنی کچھ کم نہیں

ول اور کیا بیان دونوں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ دردِ نبی اور تجزیہٴ نفس کا اس
نمود کیا ہوگا۔ ایک نفسیاتی حقیقت کہ اُمید مٹ جانے کے باوجود نہیں مٹتی۔ گو یہ
بات ہے کہ شعوری طور سے اس کا احساس نہیں ہوتا۔ معدوم کا موجود ہونا بظاہر ممکن
لیکن جہاں تک انفیات کا تعلق ہے عدم اور وجود کے سامنے رہتے ہیں۔ یہ کہنا کہ
مجھ محمّی ہے، مگر اس کی روشنی باقی ہے، قوتِ تخلیق کی نادرہ کاوی ہی کہی جائیگی۔
لی سر ہندی نے بھی اسی انداز کا ایک مطلع کہا تھا جس کا مضمون شیر زیر بحث سے مختلف
کے باوجود تمدتِ طرازی کا ناقابلِ انکار ثبوت پیش کرتا ہے:

خاکِ گزِ دیدیم دمی رقصِ ہنوز افغان

قلمِ شکستِ آئینی ریزہ ہے جو شانِ ما

یہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ناصر علی کے مضمون کی بنیاد ایک بے بنیاد دوا چاہیے اور حضرت

شاعری

ابوالفصاحت نے ایک تختِ اشوری احساس کو شعور کی سطح پر لا کر آتش کار کر دیا ہے، تو آپ کے مضمون کی فوقیت تسلیم کرنے میں ذرا بھی تاثر نہیں ہوتا۔

۱۔ - علم کا اتنا بوجھ یا رب! کیا سمجھ کر رکھ دیا
آدمی پر زندگی کا بوجھ ہی کچھ کم نہیں

مضمون کی لطافت اور زبان کی فصاحت دیکھنے کے ساتھ ہی آپ کی عمر کے ابتدائی مسائل کی فلاکت اور زلزلوںِ حالی کا خیال کیا جائے، تو محسوس ہوگا کہ شیرِ زیرِ بحث اگرچہ اس زمانے کی تصنیف نہیں، مگر اسے انہیں آیام کی غنائی کے لحاظ سے حسبِ حال کہا جاسکتا ہے۔
آپ کا بیان ہے:-

عیرِ الحالی میں بار بار ایسا معلوم ہوا کہ اسِ خاطرِ گرا بخانی بن گئی اودما میرِ مینائی کا
یہ شعر ماہِ بازبان پر آیا۔

عزمِ اٹھانے کو بہت تھکے ترے بندِ یارب!
کیا کمی تھی، اگر انکِ مجھ کو نہ پیدا کرتا

بیس سال کی ایک مسلسل فلاکت اور زلزلوںِ حالی میں بچپن کے کھیل تماشے خواب و خیال رہے
ادبِ غنوانِ شباب میں بھی رنگینیِ صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

امیرِ مینائی کے شعر سے ظاہر ہے کہ انہیں اپنے غم کا تو غم ہے مگر باقی بندگانِ خدا کے غموں سے
کوئی سروکار نہیں۔ یہ روشِ انسانی ہمدردی اور حسنِ خلقی کے منافی ہے۔ اس کے برعکس حضرت
ابوالفصاحت نے انسانیتِ بزرگبری کے ہر فرد کی تکلیف پیش نظر رکھی ہے۔ تمام لوح کی من
حیثِ المجموع وکالت کی سہ اور زندگی کے بھاری بوجھ پر ایک اور بوجھ رکھ دینے کو خلافِ انصاف
بتایا ہے۔

۲۔ مجھ کو سحرِ لذت دیدار رہنے دیجیے
دل اگر دہریں تو آنکھیں چاہ رہنے دیجیے

لے غبارِ کارِ طالع، مطبوعہ آج کل، شمارہ جنوری ۱۹۶۱ء

شاعری
اس کہتا ہے کہ یہ مطلع نوح ناردی کا مطلع دیکھ کر کہا گیا ہو گا۔ نوح کا مطلع ہے:

مجھ کو محو لذت آ کر اور رہنے دیجیے

میری گردن پر ورا تلوار بنے دیجیے

یہ میں نے ۱۹۱۹ء میں خود ان کی زبان سے سنا تھا۔ جب میں سن کہ خاموش رہا تو انہوں نے میری خاموشی کی وجہ دریافت کی۔ اس پر مجھے بادل ناخوار سے اپنا خیال بوضاحت بیان کرنا پڑا جس کا لٹ لباب یہ تھا کہ لنت آزار میں محو رہنے کے لیے امتداد وقت ضروری ہے۔ آپ نے لفظ "بہتر" کی جگہ لفظ "دور" لکھ کر شعری معنویت بھرج کر دی۔ وہ بے آپ نے مجھے اس نقص کی طرف متوجہ کر کے بہت اچھا کیا۔ اگر میرے اس پہلے دیا ان کے دوبارہ شائع ہونے کی نیت آئی، تو میں یہ تبدیلی کر دوں گا۔ خدا نصف مزاج نوح کو فوق رحمت کرے! بخود دہلوی میں ایسی انصاف پسندی نہیں تھی۔ ان کے ایک شعر کا پہلا مصرع تھا: ع

دشمن نے پاس رہ کے بجا دیں سب عاداتیں

میں نے ان سے کہا کہ اپنے صین کو الف وصل کی طرح تلم کر دیا تو وہ چپک کر ملے، صین بول چال میں اس طرح بولا جاتا ہے۔

حضرت ابوالفضل کا مطلع: مضمون کی لطافت اور بیان کے حسن کا بہت اچھا پیکر ہے۔

۷۳۔ کس طرح میں نے بسر کی ہے تراغم رہ کر

ساخنہ بیٹھ کے اب زہر بھی کھالوں تو کہوں

اس کی دلدینے کے لیے یہ فی البدیہہ مصرع کافی ہے ع۔

مارٹا، مارڈالا، باے، باے

۷۴۔ وہ بشر تھا جس نے جنگ فہم گو اور اکو لیا

ورنہ اس کی چوٹ پھر بھی اٹھا سکتے نہیں

چوٹ اٹھانا عاودہ ہے حمد کے لطف زبان دو چند کر دیا۔ حسن بیان اور دودھ ترے کی صفائی قابل دید ہے۔ غالب کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا ہے:

رنگ جنگ سے ٹپکتا وہ ابو کہ پھر نہ ٹھنٹا جیسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شہزاد ہوتا

شامی
 یہ شعر بحرِ مدّی مشکلِ لید ہے۔ اس دو مصرعے کے پہلے حصّے فعلاتِ ماضی کے الفاظ صحتی
 کے ہیں جنہیں محض وزن پورا کرنے کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔ بہر حال مضمون اچھا ہے، گویا ان مشکل
 سے خالی نہیں۔

۷۵۔ اس نالے میں تو رہن بجائے پڑھو یہ باعد

بھولے بھکون کا کوئی راہنسا ہے کون نہیں!

یہ شعر ان دنیوی اور دینی رہنماؤں پر لٹھی غلات چڑھا ہوا مآذیانہ ہے، جو صدق و صدا کا جا
 پہن کر خدا کے سادہ لوح بندوں کو اپنا آلہ کار بناتے اور خوب کائی کرتے ہیں۔ مضمون اتنا
 بلیغ اور بیان فصیح ہے کہ سنسنے یا پڑھنے والے کی زبان سے شکرِ ادواء نکلتی ہے۔

(ب) رباعیات

تقدیر جب آبِ زر سے منہ دھوتی ہے آلودہ وہ مگر دغم سے کب جوتی ہے
 نذرانے گھوٹ میں رنج و غم ہنستے ہیں تادار کی دنیا میں خوشی روتی ہے

بقصص میں کلیدِ گنج قرار دیں نہ سہی تاجِ سہراؤں و فریادوں نہ سہی
 لے بھر کرم! کچھ تو عطا کر مجھ کو قطرہ ہی سہی، فرات و جیہوں نہ سہی

ہر ایک کے دل میں کب سہرہ ہستی دیکھا ہر ایک کے دل میں شہرِ مستی دیکھا
 پانی نہ کہیں خدا پرستی ہم نے ہر ایک میں دلمبِ خود پرستی دیکھا

مشکل کا یہ اصرار کہ اب کام دکھ مقصد کی یہ تاکید کہ آرام نہ کر
 اٹھ بانہ لے بہت کی کمرے نادانانہ آواز کو سر مندہ انجم نہ کر

شاعری

یہاں میں جسے کسبِ کمال آتا ہے دولت ہی سے قدر و منزلت پاتا ہے
ارکے عیب میں بھی ہے حسنِ قبول بے زر کا ہنر بھی عیب ہو جاتا ہے

یہ رہو تا تو دور کر آرایشِ دل پاکیزگیِ دل سے ہے زیبائشِ دل
ایشِ تن کا خط ر کھنے والے! آرایشِ تن، نہیں ہے آرایشِ دل

ح (نظمیات)

میں قطعاً، مشنویات، محضات اور مسدسات شامل ہیں، جن سے آپ کی شیریں ذہانت،
پریائی اور قاصداں لکھائی حسبِ معمول نہایت نمایاں طور سے آشکارا ہے۔ میں اور بابِ ذوق کو
نظمیوں کی طرف خصوصی توجہ دلا نا چاہتا ہوں ان کے عنوان یہ ہیں:
یہ کلام کو الوداع؛ دعوتِ عمل؛ معراجِ انسانی؛ انقلابِ زمانہ؛ مفلسی دیے جاوے گی؛
مہم جوئی؛ آئینہ قومی انتشار؛ مفلس کی عید؛ غلامی؛ فسادات؛ دستِ کاڈ؛
ہمدانِ وطن؛ یومِ آزادی؛ تیرا دیوانہ؛ خدا کس جگہ نہیں؛ غریبوں کی دنیا؛
شش طلب؛ ابناءِ وطن کا حالِ زار؛ ان مینت؛ ابلا کا جلال؛ بہادر
مادہ نگار؛ قومی جھنڈا؛ مبارک یومِ آزادی؛ جہاتِ گاندھی کی عظمت؛ ہفت
طن۔

د (تاریخیں)

ہاں چند مادہ ہست تاریخ نقل کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ تاریخ گوئی میں مادہ تاریخ ہی قابلِ داد
ہوتا ہے۔ ہر مادہ تاریخ پورے پورے مصرعے میں ہے جس میں بھرتی کا کوئی لفظ نہیں آیا۔
۱۔ تاریخ وفات حضرت فصیح الملک داغ دہلوی؛

شاہی
بیل بند دستاں آج اپنے گلشن میں نہیں
۱۳۶۲ ہجری

۲۔ تاریخ تیا چھ ہریت بند
اہل وطن کا طوقِ غلامی اتر گیا
۶۱۵۵۰

۳۔ تاریخ وفاتِ شاعرِ غلامِ ملک
مکہ اٹھ گیا ہے شاعرِ مجزبیاں میگور حفا!
۶۱۹۴۱

۴۔ تاریخ وفاتِ حضرت فرحت
فرحت نہیں گلشنِ جہاں میں
۱۳۶۲ ہجری

۵۔ تاریخ عید مبارک
نورِ خرمی و خردہ عیش و نشاط آمد
۱۳۳۷ ہجری

۶۔ تاریخ طبعِ دلیرانِ شعاع ہر
حسنِ مثنوی کی غنچہ نظر آئی کیا کیا!
۱۹۹۴ ہجری

۷۔ تاریخ شاعرتِ گلستاں
جو کہا، وہ خوب ہے، مرغوب ہے
۶۱۹۳۲

(۵) مزاحیہ اشعار
۱۔ پھمکالی کا میں ولدا وہ نہیں ل ساقی اڈا میڈا اگر ہے تو بتا کر نہی ہے!

- شاعری
- ۲۔ تپش دل میں ہے آہِ سرو کے ساتھ
ہینا جون کا ہے جندری میں
- ۳۔ شعروانی ہنوائے چنگ ہے
داد لینے کا یہ اچھا ڈھنگ ہے
- ۴۔ فرنگی کا نگہ ہر بات پر کیوں
طوطی کی بلا بند کے سر کیوں
- ۵۔ اپنا ہے عورتوں نے مردوں کے نشان
مردوں پر بھی عورتوں کا ہوتا ہے گمان
آیا کس کو کھینکے، آئی کس کو
کچھ اس کا جواب دیں مجھے، اہل زبان
- ۶۔ اسیرِ حرص نہ کیوں ہو حریفیںِ طولِ اہل
وہ چاہتا ہے کہ رشتی دراز ہو جائے
اے شیخ! اگر نہیں ہیں کوئی ذی شعور ہم
اتنا تو جانتے ہیں کہ تم بے شعور ہو
- ۸۔ ٹوٹ پر یہ ٹوٹ کر دو جو ششِ تم
دولت اب کا فدا کا ٹکڑا رہ گئی
- ۹۔ حسینوں کی طرف تو پیٹھ ہو گئی
دھرا کیا ہے فتن کی تو کمری میں
- ۱۰۔ دل لے کے کہتے ہیں کہ زشت اس کی دیجیے
ایسا نہ ہو کہ بعد میں جھگڑا کرے کوئی
- ۱۱۔ دماغِ اتری بے ربط کہانی کو سننے کو نہ
یہ اینٹ کہیں کہے، تو ردِ اسے کہیں کا

۱۱۔ جنگ پر موت ہو سکوں مرنے والوں کا شمار
اس کے عالم میں بھی مانس رہا کچھ کم نہیں

۳۔ خاتمہ

مجھے نہایت افسوس ہے کہ اس مقالے میں حضرت ابوالفصاحت کی شخصیت اور شاعری کے بہت سی باتیں چھوڑ دی گئیں اور میں ان کی شخصیت سے بھلا دیکھانے سے بھی قاصر رہا۔ درحقیقت کتاب کی شخصیت اور شاعری دو قلم ہیں نہ پیدا کرتا رہن کی سہا
لیک کر دے میں ہونی امر میاں تھی۔ اگر آپ پر ایک مبسوط کتاب بھی جاتی، جس میں چھاس
ساتھ باب ہوتے اور ان کی توجہ بجا جہاد اہل اسلام کے جہاد بیان پر موتوں کے کھ کر عمل
میں آتی، تو یہ دونوں موضوعات کی شکل کے شاکی نہ رہتے۔

میں شرم میں کچھ چکا ہوں کہ آپ کو قدرت کی طرف سے تصفیہ زبان دیا اور تذکرہ
شعر و سخن کے کارہائے عظیمہ کی انجام دہی کے لیے عالم وجود میں آئے تھے آپ ان اہم فرائض
سے جس غیر معمولی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہمہ براہ ہوئے ہیں اس کی نگاہ
داد نہیں دی جاسکتی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے جو کارہائے دشوار آپ کو تفویض کیے وہ کسی اہل زبان
کے سر کوں نہ ملے؟ اس کے جواب میں یہ کہ اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ قدرت کا ملہ بعض
اوقات ہفت خواں طے کرنے کے لیے ایسے افراد تخلیق کرتی ہے، جو ظاہر بہت حقیر اور
باطن بڑے صاحب تدبیر ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پنجاب کے ایک دیہاتی اور
خواجہ بہمن خانان کے گھر کا سوانح آفتاب کی طرح حال حاضر نہ ہوتا۔

پچھلے صفحوں میں آپ کے جن حیرت انگیز کلمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہاں تک

فخاری

اصل کر ہے میں کہ بیوی صدی کی تاریخ اور دین زبان کی اتنی تعبیر اور مضامین کی ایسی
تحریر کہ آپ کے کلام میں نظم و نظام کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ اگر میں مومن کے ان دو فقریہ
شعروں میں خفیف مالتقرن کر کے "میری" اور "میرے" کی جگہ "ان کی" اور "ان کے" لکھ دوں
تو کیا آپ کے لطف زبان اور قلوب مضامین پر ایسے چپاں ہو سکتے ہیں جسے فی الواقع آپ ہی
کے اشعار و زنا کے متعلق رقم پیر ہوئے تھے:

ماننے ان کی تر زبانی کے نطقِ الکن حدیثِ بھائی
اللہ کے گوہر تمام نا سفتہ ان کے یا قوت سب بدخشی
اکثر شعراے کبار نے اپنے کمالِ سخن پر تلافی کرنے میں شکستہ از لپچہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً:
گوہر میں ندرتِ بہر اندر کے گوید و بیت
لا فرم دار القمار مسجدِ اقصاے من (خاقانی)

دردمانِ شعر دا از من محرمی تر زنا
جوہر میں کرد روشن گوہر آبا سے من (عرفی)

ایک عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا سر مایا ہوا (میر)

مومن! اسی نے مجھ پردی برتری کسی کو
جو بہت فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا (مومن)
مگر آپ کو اپنے فطری انکسار کے باعث بھی خود ستانی کا خیال تک نہیں آیا۔ آپ نے
اپنے کلمات کے متعلق حرف اٹھا کہا ہے:
انکار کیجیے نہ کا لاف جو خوش سے کم گو سہی، مگر وہ سخند و ضرور ہے
لہذا وہ تمام ایک جگہ تھا۔ مہ آبا سے آبا سے معنوی یعنی شعر لے معنوی مراد ہیں۔

شاعری
 آپ نے ہمدردی کی پابندی کی وجہ سے لکھا تھا، مگر میں نے ہمدردی کے ذریعہ
 زندہ ہمارے ہمدرد کے لیے اپنی مطلق کے صیغہ واحد خاص کی جگہ حال کا صیغہ
 خاص تک کر فال بد کا ازالہ کر دیا ہے۔ آپ کم گو کیسے کہے جاسکتے ہیں۔ عظیمہ ادا
 جنوں دہش افروزش اور مجبوراً باعیاات (زیورچہ) کم گوئی پر دلالت نہیں
 آپ اپنے کبر سن اور اس اردو کش زمانے میں سخن نہیں کا قحط ہونے کے وجود حسبِ معمول
 فیض و بلخ اشعار کہے جاتے ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہے:

کوئی جو ہری، جو شخص! ہو یا نہ ہو

سخنور جو اہر اگست رہے

اب میں آفریں آپ کی پیشانی شاعری کے متعلق ہندوستانی اور پاکستان کے تمام اہل
 ادب میں جہانی اربابِ ذوق کی ایک شعر میں نظم کیے دیتا ہوں۔

شاعری جو شمسِ لبانی کی

ہے نوا ساز آسمانی کی

کلام جوش ملیانی

سرسری جائزہ

جوش ملیانی شعرا کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں باقیاتِ صالحات کے نام سے پکارا جائے تو بجا نہ ہو گلاں کا کلام از اول تا آخر نکسالی ہے؛ اور اس میں جو صلاحیت، پختگی اور اثر افزائی ہے وہ شعری ذوق کی تمام تبدیلیوں کے باوجود ہم سے خراجِ تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتی۔ یہاں میں شروع ہی میں اس ادب کی جانب اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جوش کی غزلیں ان کی نظموں پر ہر طرح سے فوقیت رکھتی ہیں؛ اور ان کے خواندے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا ذہن اور شعری مزاج جس طرح غزل کے مقررہ سانچوں میں اپنے لیے اظہار کی نئی راہیں نکال لیتا ہے، وہ ان کے لیے نظر کی نسبتاً آزاد فضا میں ممکن نہیں۔ اس سے جہاں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ غزل کی آگوست ہمارے شعرا پر اتنی مضبوط ہے، کہ ان کے لیے اس سے کسی حال میں غفر ممکن نہیں؛ وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے رموز و علامتیں تحریر کے مختلف پہلوؤں کی طرف لطافت و ذوق کے ساتھ اور طبع انداز میں اشارہ کرنا ممکن ہے۔ جوش کی نظمیں عموماً ذوقی دلچسپی کے موضوعات سے متعلق ہیں؛ یہ سببِ طبع کے جذبات سے متاثر ہو کر کبھی گئی ہیں۔ اس لیے ان میں قدر تا شاہدے اور تجربے کی اندرت؛ یا ہم ہی کی کمی ہے؛ خیال اور احساس کی جدت سمجھائی بھی خال خال ہے؛ جس سے تاوی کی نظر ان نظموں پر چستی ہونی سہل ہے

کلام میں مسیحا

ہے اور زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتی۔ لیکن اس کے برعکس ان کی خواہش کا معاملہ اس سے
بیکر مختلف ہے۔ رنگ غزلوں کا بھی بیشک پُرانا ہے، لیکن اس پر آنے والے ائمہ میں ایک
بھراؤور کیفیت ہے۔ دروں میں غزل کی نمایاں خصوصیت یہ ہے، اور غزل گو شعرا
شاہدے اور تجربے سے کہیں زیادہ تخیل کی جبر پر داذی پر بھروسہ کرتے رہے ہیں، اگر
کہ ان کے نزدیک حقیقت کے داخلی پہلو اس کے خارجی پہلوؤں کی بہ نسبت زیادہ
وقع ہیں، یا یہ کہنے کی جلدی مشاہدات اور جتنی تجربے اس وقت تک وضع بن ہی
سکتے جب تک کہ اندرون کی آگ میں تپ کر ان کی قلب باہت نہ ہو جائے، لیکن
چونکہ ہر کیف ہم خامی کے دنیا سے اپنا تعلق یکسر قطع نہیں کر سکتے، اور حشر و محبت
اور ہر طرح کے انسانی جذبات کی آماجگاہ انسان کا وہ باطن ہے جو اس خارجی
کائنات میں پیوست ہو۔ اس لیے ہر ائمہ نے اپنی کہ باوجود خارجی حقیقت کی چھوٹ
اس باطنی کائنات پر وہ رہ کر پڑتی ہے۔ اسی باعث غزل گو شعرا پر یہ الزام کہ وہ
کلپنا اپنے تخیل کی دنیا ہماری سانس لیتے ہیں صیح نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور صیح ہے
کہ اندرونی کائنات ہی وہ نقطہ آؤکا زہ ہے جس کے ذریعے سے ہم ان کے فکر
فن کی جہت کا تعین کر سکتے ہیں۔

اوپر میں نے کہلے کہ جوش مسیحا کی شاعری کا رنگ پُرانا ہے۔ اس سے دراصل یہ اثنا
کرنا مقصود تھا کہ ان کی آواز اور شعری لب و لہجہ فانی، اصغر، جگر اور حسرت سے
بھی پہلے کے شعرا کے مماثل ہے۔ کیونکہ ان چاروں شاعروں کے یہاں بھی ہمیں
ایک حد تک نئے دور کی آواز کی تحریر اہل محسن ہوتی ہے۔ فانی اور حسرت اس
نما کا سے زیادہ ممتاز ہیں۔ فانی نے تو خاص طور پر اظہار بیان کے سانچوں میں
یعنی تالیف کی پابندی کے باوجود اپنے صوتی تجربات سے ایسی جھکاؤ پیدا کر دی کہ
ان کی شاعری ایک مخصوص انفرادیت کی حامل بن گئی۔ اسی طرح حسرت بھی
پہلے ہوتے ہوئے بھی بھج کچھ نئے معلوم ہوتے ہیں جوش مسیحا کی غزلیں ہمارے
یہ دفعتاً امیر اور اس کی یاد آوازہ کر دیتی ہیں۔ جن کے یہاں محاورے اور بندش

کلام جوش لمبانی

جوشی ہر مقدم پر ہوا و تحسین طلب کرتی ہے۔ یہاں کوئی آواز چاؤ نہیں، نہ خطابت کی جگہ کو پائی۔ نہ یہاں فکر اور نگاہ کے کوئٹے پکٹتے ہیں۔ یہاں شاعر اور اس کے محبوب کے درمیان مفاہطہ کے اظہار میں کوئی طنز یا عنصرت نہیں ملتا۔ آپ کو یہاں استاد فرد کی کیفیت ملتی ہے، نہ محبت کی اس داد و ادب میں کسی کشمکش، اضطراب اور تلوؤ کے اظہار کا عکس نظر آتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ جس تہذیبی پس منظر میں یہ غزلیں کہی گئی ہیں، اس میں محبت کے کاہل و بار میں عاشق اور محبوب کے مٹھب اور مٹھلا پہلے سے متعین اور مقرر ہیں۔ مثلاً عاشق کا مقدر یہ ہے کہ وہ فراق کی جانگھل آگ میں جلتا، تڑپتا رہے، اور اس کے باوجود اپنے جذبات کا ہر یہ انتہائی فردنی کے ساتھ عاشق کی بارگاہ میں پیش کرتا رہے، اور محبوب کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ انتہائی شیرینی اور بلے نیازی کے ساتھ اس پورے معاملے پر زیر لب مسکاتا رہے، اور مانی حفاظ اور دم شہادیں کو باقی رکھتے ہوئے عاشق کو ذمہ اتھاڑ اور نفسیاتی پراگندگی کی کیفیت میں مبتلا رکھے۔ دراصل اس پورے لین دین پر جاگیر داماد معاشرے کی چھاپ پوری طرح مرتسم معلوم ہوتی ہے۔ یہاں گفتگو اور مکالمہ دو ایسے افراد کے درمیان نہیں ہے، جو کسی تجربے میں ہر اری کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، بلکہ یہاں عاشق ہمیشہ نور و ظلم و ستم و تناس ہے، اور ہمیشہ ناکام بھی، اور محبوب کا تخیل اور اس کی بے اعتنا کسی نہ کسی دامادی اور ملک ٹوک کے بغیر جاری رہتی ہے۔ یہی یہاں سارا معاملہ یک طرفہ ہے۔ بلکہ یہاں محبوب کی تصویر بھی پورے طور پر ابھرنے نہیں پاتی۔ وہ ایک جامداد و رجول اکائی کی طرح سامنے آتا ہے۔ نہ ہم اس کے خد و خال کی تشکیل دے سکتے ہیں نہ اس کے عجوبی برتاؤ کی گے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں نہ کوئی کردہ خود اپنے احساسات اور رد عمل کے آئینے میں کبھی پیش ہی نہیں کیا جاتا۔

ایسا اور معاذ کی خسر و دایت جس کے جوش لمبانی زمین اور دات معلوم ہوتے ہیں اپنے اندر یہ وصف کتنی ہے کہ وہ جذبات اور احساسات کے اظہار میں کسی تعقید اور تعین کی محتاج نہیں ہے۔ بلکہ واضح اور مبہم دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

کلام خوش لیاں

دو مہل پہ دونوں شاعروں کو کشش کی ایک کڑی ہیں جس کا مرکز و محور زمان کی اصطلاح
 ہی نہیں بلکہ اس کی تطبیق اور توسیع بھی تھا۔ دونوں شاعر مطلقہ بندی کے پے نہیں چڑھے
 مشہور ہیں، جو جو ماحاطی اس کی ایک ہندب شکل ہے یعنی اس میں ایک چو پھلا، ایک
 چھیر اور دل لگی، ایک طرح کی آنکھ چولی پائی جاتی ہے۔ ایمر اور داغ دونوں ہی کے
 یہاں ایک طرح کی طاری اور دھول دھپا بھی ملتا ہے۔ داغ کے یہاں یہ رنگ بہت
 فروغ و شگفتہ ہے۔ ایمر بھی اپنی نئی زندگی میں اتفاق کے باوجود شاعری میں کھل کھینٹنے
 سے باز نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ دونوں کے یہاں (اور داغ کے یہاں ایمر کی نسبت
 کہیں زیادہ) زبان اور محاورے کی سادگی چستی اور صیقل بہ رجز اتم ملتا ہے۔ خوش لیاں
 کو بھی لپافہ و بیان پر جو قدرت کا طرہ حاصل ہے، ان کے سر آئینہ پنجاب کی پیداوار
 ہونے کی وجہ سے، واقعی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ان کے داغ
 سے شرفِ طہ کا نتیجہ رہا ہو۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ خود شاگردیں یہ خداداد عکس اور زبان
 سے مناسبت پہلے سے موجود نہ ہوتی تو استاد اس میں کیسے معاون ثابت ہو سکتا تھا۔
 بہر حال انھوں نے غزل کی شاعری کی ندائیت کو اسی طرح برتا ہے۔ جیسے داغ کے کتب
 کے اور دوسرے شعرائے۔ یعنی ان سب شاعروں کو بڑھ کر یہ امداد ہوتا ہے کہ نیا شعر
 تجربے کی صداقت کی اس حد تک ضمانت نہیں کرتی، جتنی مرد و مضافین کو چاہیے
 اور ہر صدی کے ساتھ برتنے کی۔ بالفاظ دیگر یہ شاعری واردات یا آپ بیتی کی شاعری
 نہیں ہے، اور اکیسے اس میں ایک نوع کی بے چلکی پائی جاتی ہے۔ اس قسم کی شاعری
 کے ٹھٹھنے سے جس طرح فضا کا تاثر ابھرتا ہے، وہ قدرتِ زبان کی فائش، لفظ کی
 گراگری اور نوک جھونک، مسابقت اور تفوق حاصل کرنے کا جذبہ، رقابت اور ٹالک
 لپیٹ اور ان سے منسلک جذبات کے بڑا اظہار کا تاثر ہے۔ یہاں زندگی کے اہم مسائل
 کے شعور اور ان سے دست و گریباں ہونے کا کوئی احساس نہیں ہوتا، اس فضا میں
 آنند و خند کا ہے جو فنا و غائبالی سے پیدا ہوتی ہے، اور جسے زندگی میں غم و موت کا
 دیکھنا جو احساس بھی نہیں بھرتا۔ یہاں انسانوں میں بھی تہیوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے،

کلام جوش ملیحانی
 ہاں شکوہ شکایہ صدام ہے یہاں ہلکیاں اور گدگدیاں ہیں یہاں اپنی لہتی اور فروتنی کے
 اظہار میں بھی عمل کی شان اور جذبہ تفاخر پایا جاتا ہے۔ یہاں مغنوں کی یا تو ریل جہانات
 سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ایک طرح کے تسلسل ردایت پر زور ہو۔ امیر اور دروغ کے انداز کی
 جو غزلیں جوش ملیحانی کے یہاں ملتی ہیں ان کے مطلعے حسب ذیل ہیں:

مخو زخمی تو متکل، مگر ہو مٹی بسر ہوتے ہوتے بسر ہوئی

آئندہ جب تیرن کر رہ مٹی جان بھی نچیرن کر رہ مٹی

اگ ہوا گ تری تیج ادا کا پانی ایسے پانی کو میں ہرگز نہ کہو گلا پانی

مے نہیں، برق تھلی ہے یہ پیاسے میں سینکڑوں کھونڈ نظر آتے ہیں میخانے میں

دعاؤں میں ہو گا اثر ہوتے ہوئے فب غم کی ہو گی سحر ہوتے ہوئے

کچھ تو منہ سے نکل گئی ہو گی باتوں باتوں میں چل گئی ہو گی

نہایت سنگدل تم ہو، نہایت پر جفا تم ہو تعجب ہے کہ پھر بھی قابلِ صدمہ رہا تم ہو

انگارہ نہ کرنا، صبح ناداں بھ کو بڑھکے ایماں سے ہو وہ دشمن ایماں بھ کو

ہم نے وہ ہر ماں بھ پوچھ بکنے کی باتیں یہی دسازیاں دم پر بنا دینے کی باتیں ہیں

لا جا بھگنا نے مارا سوز الفت کے مارنے مارا

ان پوری پوری غزلوں کے علاوہ اسی رنگ کے چند متفرق اشعار بھی غور طلب ہیں:
 آپ نے دل اتنے کچھ پائمال تو نئی رفتار بھی شراگئی

باد تندر کی موجوں سے یہ کٹ کاٹنے لگے کہ درد و دہانہ جانے کہیں بیانے میں

وہ مجھ خویش کن سے پوچھتے ہیں کہاں جانے لگے ہون سنورک

برسیر سلیم کا جھکنا تھا لازم جھکی جاتی ہے قاتل کی نظر کیوں

مٹا عدل کا تم نے چھپا یا بھی، تو کیا اپنے ہونٹوں کا تبسم جب چھپا سکے نہیں

دم پر بھی بنے، تو جی دھوٹے ہوتا ہے یہ دل کسی کسی کا

دور و دورے کہ چہرے میں ستم کا ہے ابجا ایک فریاد مرے دل کی تمنا ہو ابجا

ہمارے زخم دل سے کھل گیا یہ راز کیا تمہارے کسی علاوہ کے ترکش میں بترے خطا تمہارے

گرم آہوں کو تورو کو کھلا، سگ خوف یہ ہو گرم انگوٹوں سے دھیل جانے شیمیرا

کہا تم نے مناس میں نے اسب اور اتنا بتا جائے یہ دھسے میں کہ فقرے میں باتیں ہیں کھائی

یہ آتی ہے جب ان کی نگہ ناز لگے ایک بوجھ مرے سینے پہ تنی ہوتی ہو

کلام ہوشِ مسیانی

بہت مرد میدان بھی، دنیا میں نیکی شجاعت پر نادرال بھی دنیا میں نیکی
 مگر چوٹ سہ جائے تیر نظر کی ؛ یہ دل، یہ کلیجہ کسی کا نہ دیکھا
 ہوشِ مسیانی کی غزلوں کی ایک خصوصیت جو زہرہ کو بہادی توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہو،
 وہ ہے صنعتِ تضاد۔ انھیں تضادات کے برتنے کا خاص سلیقہ حاصل ہو۔ اور وہ اس
 مفہومِ آفرینی کا کام لیتے ہیں یعنی اس کے ذریعے سے کسی مخصوص حقیقت کے متضاد پہلو
 نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ غزل کا ہر ایک شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے یہ اس کی خوبی
 بھی ہے اور خامی بھی۔ خوبی اس لیے کہ ہر شعر ایک مکمل مفہوم کا احاطہ بھی کرتا ہے، اور خود
 کفنی بھی ہوتا ہے، ہر باعث وہ حافظے میں جلد پیوست ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔
 خامی اس پہلو سے کہ ہر شعر کو ایک معینہ سانچے میں اپنی جگہ رکھنے کے اعتبار سے اپنی ساخت
 کے لحاظ سے اہم ہونا چاہئے، تاکہ تمام اشعار مل کر ایک بھرپور تجربے کی شعری و تعمیری تنظیم
 میں مدد دیں۔ بیشک بعض فرہین سلسل بھی ہوتی ہیں۔ اور مسلسل غزل میں یہ وحدت اور
 صاف طرزِ بھگتا ہے۔ مگر غزل کے لیے بحیثیت ایک صنعت یا سلسل لازمی نہیں؟
 یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ہر شعر اپنی جگہ جدا گانہ مفہوم کا حامل ہو، لیکن جذباتی
 منطق کے اعتبار سے، جو ہر غزل میں مین اسٹوری پائی جاتی ہے، وہ دوسرے اشعار سے
 منسلک اور متصل ہو، ہر شاعر کے یہاں تضاد کی یہ صنعت ممکن ہے، بادیِ انتظار میں یہ
 تاثر پیدا کرے کہ وہ محض ایک طرح کی لفظی بازی ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اصل
 غیر شعوری کوشش ہے، ایک مخصوص تاثر یا تجربے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی تاک اس
 سے دوسرے امکانات بھی واضح کیے جا سکیں۔ اس سے شاعر کو یہ فائدہ حاصل ہوتا ہو،
 کہ وہ ان تضادات سے ایک ہی تاثر کے دو مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے کے مقابل
 رکھ سکتا ہے۔ اس سے شعر اک دم چمک اٹھتا ہے، اور ایک غیر مشتبہ حقیقت کو ہمارے
 سامنے پیش کر دیتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے،
 ہم کہتے ہیں غم ہی سے کچھ آباد ہے دل غم کہتا ہے برباد یہ گھر بڑے کے ریگا

سکھم خوش بیاں
جس کا دل رنج و الم میں شاد ہے
وہ خواہد میں بھی بہار ایجاد ہے

دادیں اہل جنوں گریہ خویش کی مجھ
میں نے گلزار کھلائے ہیں بیا باؤں میں

دور کر دیتا ہے راہ شوق کی تارکیاں
شمع بن جاتا ہے ہر ہوا درجہ جل جلالہ

بالآخر انھیں رحم آ ہی گیا
یہ بھاری گلی چارہ مگر ہو گئی

نڑے میں حیاتِ جاودہ ان کے ڈھونڈنے دے
خبر بھی ہے کہ مرگ ناگمان تکلیف پہنچی

میرے اشکِ خویش کی ٹھکراؤں سے
جنوںِ محبت کا یہ فیض سمجھو
ناتے کو نہ بھیجیں تباہیں ملی ہیں
بیا باؤں میں بھی ہیں جن کے نظارے

لے خرد آتے ہیں نیراز جنوں میں توڑوں
تیرے بڑھتے ہوئے دعووں کا بھرم تو کھو ل

پردہ داری را زِ الفت کی بہت سی لطف تھی
دوڑاقتاد ہے مرگ پر دھینچیں ہم کو حیات
دل کی بیانی نے یہ مضمون عرواں کر دیا
بہی حال ہم درجہ میں کسی جی اٹھے کبھی ہرگز

انھیں کے دیدہ باطن کو روشن ہم سمجھتے ہیں
ہر اک صبح سترت کو جو شام غم سمجھتے ہیں

مگر کی دیرانی جو یاد آئی مجھے
دشت کا دھوکا ہو اگلواری

مگر ادہ ہوں کہ جس کی تشریف
چارہ ہے جنوںِ دیر کا

کلمہ خوش مسیان

یہ نئے آپ اللہ کا نونہ سے ہرگز سن نہیں سکتے

مرے سادہ غموشی کی صدائیں اودھ جوتی ہیں

پڑ گیا بہرہ وفا پر بھی جفا کا سایہ دوستی دشمن ایمان بھی ایسی تو نہ ملتی

فضائلِ ندر سے باہر ہیں محبت کی تمناؤں مری دہنائے لافانی کو فانی کو کون کہتا ہے؟

توڑنی ہے ابھی دیوارِ گلستانِ مجھ کو ترکِ صحرا پر نہیں ختم مرا عزمِ صمیم

ہوں صحرائے گلستاں ہے، خدا خیر کرے! خواب میں بھی نظر آتے ہیں یہاں مجھ کو

ستم کو بھی کوم سمجھا، جفا کو بھی دف سمجھا مگر اس پر بھی اللہ کی چین پشیمانی نہیں ملتی
میں نے شریعت میں یہ اشارہ کیا تھا کہ خوش مسیان کی شاعری غزل کے مرد و مضمعات
اللہ سالیب کی پابند ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ غزل کے اس مکتبِ سخن سے
نزدیکِ قربت اور ہم آہنگی عیسوی کہتے ہیں جسے امیرِ ارمغان کا مکتب کہا جاسکتا ہے۔
اس مکتب کے حصّہ نفس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت سمجھانی جڑ
سلسلہ ہے کہ اس روایت کے اتیانے کے باوجود خوش مسیان کے کلام کا خاصا بڑا حصّہ
وہ ہے جو ان کی اپنی انفرادیت کی غمازی کرتا ہے۔ ہر چند غزل کے روایتی معیار میں
ظاہر و کماضاف کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے جو میں نے انھیں پامال شاہراہوں کے
دورِ یادہ کی راہ خود کمانے کی کوشش کی ہے اور وہاں بھی بہت کامیاب سمجھا رہا ہوں
مشہور و نامور کی تعداد میں اس واسطے ایک جگہ لکھا ہے کہ جدت کی تعریف ہی ہے
کہ حاجت کو اپنی طرح جذب کرنے کے بعد سلسلہ سالیب میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو
قدح کی تازگی اور خوشگوار پر دلالت کریں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے
کہ نصیحت کو نیا دہنسنے بغیر کسی طرح کی جبر و طرادی کا وجود دیں لانا ایسی کوشش

سلاطین و ملوک

مردوف ہے جو نامستحق بھی ہے اور ناشکرمندی ہوتی ہے اس جدت طرازی کی پر
کہ فرسودہ کار باسی مضامین کو باندھتے اور معروف زمینوں میں طبع آزمائی کے
کسی ایسے شعر سے دوچار ہوں جہاں مشاہدے کا صداقت اور شگفتگی کا احساس
کے لئے پن کا، یا کسی ایسے زاویہ نظر سے حقیقت کو دیکھا گیا ہو، جو خلاف معمول
کی قوت اور آراک اور قوت تخیل میں کسی ایسی فضل سے ہمکنار کر دے، جو اچھوتی ا
ہونے کے باوجود لذیذ ہو اور کشادگی و حسن و نظر کا وسیلہ بنے۔ غزل کی عشق
تین مختلف نقطہ نظر سے رکھی جا سکتی ہے، یعنی اس میں یا تو معاملہ بندی اور سرا
ہندہ ہوگا، یا محبت کی نفسیات کے پیش کرنے پر یا عاشق کے جذبات کی مرقع نگاری
کا مدخل عشق کے سلسلے میں کیا ہے، کیا ہو سکتا ہے اس کی ہماری غزل میں اف
حد تک کی ہے، کیونکہ اس میں کسی ڈرامائی عنصر کی نگاہ پیش ہی نہیں ہے۔ یہاں
سرا پاؤں ہمارے گدا، لیکن محبوب کے احساسات کے آواز چٹھاؤ کا اندازہ لگاتا
غزل کی شاعری پر الزام تو ایک حد تک صحیح ہے کہ اس میں واقعی تجربے کی تر
نسبتاً کم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس میں محبت کی نفسیات کی حکایت
بجوش ملیحائی کی انفرادیت و اصل ان متفرق اشعار میں نمایاں ہوتی ہے، جو
انداز بیان کے درمیان جا بجا بکھرے پڑے ہیں اور پڑھنے والے کو چونکا دیتے
سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے،
ہر شہنشاہ کو ہے ساحل کی تلاش کون جانے عشق کی گہرائیاں

اب بھی ہر دہائے میں عکس ان کا نظر آتا ہے چور ہو کر بھی مرشد دل

دادیں اہل جنوں گریہ و غنیمت کی بجھے میں نے مغلوار کھلائے ہیں میر

مری دیوانگی جز مٹی ہوئی دیر انکی سبھو یہ عالم ہے کہ سلیسے سے بھی وحشت

گھر کی دیرانی جو یاد آئی مجھے ^{کلمہ پوش لیلیٰ}
دشت کا دھوکا ہوا سگڑا پر

یہ بے نیازئی و در شباب تو دیکھو

 دل کے آنے کی ہر دوائی نہ دل کے جانے کی

لا لہ صحن باغ ہوں گو ہر شب چراغ ہوں

 پھر بھی میں ایک داغ ہوں دیدہ انتظار میں
جلد داغ دکھا کہیں دل کی خلش شاہیں

 نیند ہی بن کے کہیں دیدہ انتظار میں

وہ یہ کہتے ہیں سرے گلپوش آنسو دیکھ کر

 پیر بھی اب ترا گل پیر بھی ہو جائیگا

غبطہ گر سے کہیں چاک دہو جائے جگر

 رند آنسو کی بھی میرے کی کنی ہوتی ہے

مگر وہ ہوں کہ جس کی شورش

 چادہ ہے جنون رہبری کا

ایک دھنچ سی ہوئی جاتی ہے طاروں لگا

 ان کی دیوار کا سایہ کوئی سایہ تو نہیں

مگر غم دل پہ نمایاں کبھی رسی تو دھکی

 زندگی خاک بداماں کبھی ایسی تو نہ تھی

ہر نقطہ میں ہی تو اکام نہ آیا ظالم

 خاک ادا کی تیرے کپے سے صبا کی آئی

ذات ہے نہ ہے پر محب جاتی ہوا آفتی ہی نہیں

 چشم حیراں نے کیا اور بھی حیراں مجھ کو

دل کی محفل میں دل پر اضطراب

 ایک شعلہ تھا جو حقیر آرا

کلام جو فرمایاں
 کیا کر امعا ہونہ آنکھوں میں سمٹ کر گیا
 وسعہ ادب میں سما میں جو
 ہر شام پر گمان تھا صبح نشاط کا
 کیا دن تھے وہ خوشی کے

سوزش و داغ دردوں سے نظر آتا ہو مجھے
 بھونک دیکھا یہ جو اب نہ دا
 جوں سیر گشتاں ہے خدا خیر کرے!
 خواب میں بھی نظر آتے ہیں

ماؤں وہ کیا ہوں مری فریاد و فغاں سے
 ہر نالا غم سا و شکستہ کی

تمہے غم میں بزدل کی وہ سر زخائیاں ہیں
 کہ اثر بھی جل چکا ہے مری
 ان شہاد میں سے تقریباً ہر شعر تجربے کے کسی نہ کسی ایسے گوشے کو روشنی میں
 غیر متوقع ہو اور اگر جناب ہوش ملیح آبادی اور محاورے پر پوری قدرت
 کسی قدرت جو کسی بھی اہل زبان کو ہو سکتی ہے۔ لیکن ان شعرا میں محض زبان کا
 اصل چیز نہیں ہے، یہاں خیال اور احساس کی پیچیدگی بھی نہیں ہے، ہمیں وہ
 کے پہلے پیشتر ملتی ہو کہ جو شہ کے ان خیال اور جذبے کی بھرپور ندیت اور
 روحانی اندیشہ کا طرہ امتداد ہے۔ امیر اردو داغ کے دوسرے کتابت
 نے بہت سی کوششیں بدلی ہیں۔ مگر کو ہم ہر چند داغ کی زوایت سے منک کو ہیں
 نے بھی اس وحدت کو ہر کیف آگے بٹھایا ہے اور حسرت اور فانی کا رنگ تو
 وہ تحقیق سے یقیناً مختلف ہے۔ اقبال کا کا نام سب سے ملک اور مغرور
 فیض اوان کے بعد ہے اور ان کا کلمی نے غزل کے رنگ وہ ہیں ایک نیا باکھنچہ
 اختیار سے دیکھیے، جو محض ملیح آبادی کی آواز یا رگشتاں معلوم ہوتے ہیں
 انہیں زبان کے کینٹے رجو حیرت انگیز تصوف حاصل ہے اور اس کی رنگ
 والدہ میں، وہ بلاشبہ قابل ستائش ہے، اور اس کے رنگوں کی ہفتا

میرے والدِ محترم

ہندی کے کنارے جس کا نام مہین سفید ہے، ملیان کا قصبہ آباد ہے تقسیم ملک سے پہلے
 مکی بیشتر آبادی مسلمانوں کی تھی، جن میں سید بھی تھے، راجپوت بھی، اراعلین بھی، اور پیشہ ور
 بھی۔ کچھ خوب تھے جو سیپ کا کام کرتے تھے۔ ان کا یہ کام دور دور تک مشہور تھا۔ کچھ سنا
 ہو جو کھوٹے سنگے بناتے تھے، ہیے لوگ انھیں سنا کے بجائے کھٹیا رے کہتے تھے۔ نسبہ
 ان آباد تھا۔ اس لیے کئی مشمولات تھے جس حقے میں ہمارا گھر تھا اس کا نام عاقل پور تھا۔
 میں ہندوں کے گھر دو چار ہی ہو گئے۔ مسجد سے اذان کی آواز ہر وقت سنائی دیتی اور اللہ اکبر
 میں کئی بار سنتے۔ پڑھا کھا یہاں کوئی نہیں تھا۔ سچولی دیکھ کر دے لوگ تھے۔ در نہ
 یادہ ترانگو ٹھا ہی نکالتے تھے۔

صوبہ ایک زمانے میں بیدلوں کی جاگیر تھا۔ بابا سکیم سنگ بیدی انیسویں صدی کے آخر میں ہیں
 نقل مکان کر کے راولپنڈی چلے گئے تھے۔ ان کے خاندان کی انگریزی دربار میں بڑی عزت
 تھی۔ سب بھائیوں کے پوتے جج کٹنر اور اسی قسم کے متاثرہ ہڈوں پر فائز ہیں۔ ان کی بارہ دہری
 کے بھج۔ طیلے اور دوسری عمارتوں کے کھنڈریں نے بھی اپنے بھین نہیں دیکھے ہیں

میرے والد محترم
 میرے ایک برہمن خاندان میں میرے والد کا جنم ہوا۔ میرے دادا کا نام پنڈت موتی رام تھا
 اور دادا کا پنڈت نہال چند۔ والد کا نام میھورام رکھا گیا۔ اسی زمانے کے یہ ان بڑے لوگ
 ناموں کی نفسیاتی اہمیت نہیں مانتے تھے۔ میرے نانا کا نام دیا رام تھا اور والد سے عمر
 میں سات اٹھ سال بڑے۔ ایک چھوٹی بھینس جن کی شادی ہو خیا پور کے قریب کے ایک
 قصبے خاپور میں ہوئی تھی۔ وہاں ہی جلد ہی آلام زندگی کا شکار ہو گئیں۔ سنا ہو کہ اس
 بانجھا شادی سے میرے دادا اور دادی دونوں نکل گئے۔ سارے خاندان میں صرف ایک
 فوٹھا مچس میں انسانیت کا جو ہر پرچہ اٹھ رہا تھا؛ اور وہ تھی میری دادی۔ میں صرف تین
 چار مہینے کا تھا جب اس کا انتقال ہو گیا۔ اس فرشتہ سیرت عورت کہ میں نے نہیں دیکھا
 والد اس سے بہت انوس رہے اور اس نے محنت مزدوری کر کے والد کے اس زمانے
 کے مطلق چھی قلعہ دلائی، یعنی درٹیلہ، مڈل بنگ پڑھا دیا۔

بڑے بوڑھوں سے سنا ہو کہ میرے دادا اگر وہاں بیوا کرتے تھے۔ ان کی کشتیاں ریاست
 بھاپور کے قریب دریا میں طوفان کی نذر ہو گئیں اور انھیں مسرت نے آگیرا۔ میرے دادا
 پشاور میں مہری تباشو کی دکان کرتے تھے۔ ان کی دکان قصہ خوانی بازار میں تھی۔ کہنا
 یہی چاہئے کہ ان کا پیشہ حلوائی کا تھا۔ لیکن ان کے والد قبیلہ کی تجارت کرتے تھے۔
 اور یہ قند سفید کی۔ ان کے فرزند یعنی میرے والد جناب جو ش لمبانی سعدی کے قول
 عمل کرنے لگے بچوں نے بوجان کی پہلی نظم "سبب نظم کتاب" میں لکھا ہے:

بدل گفتم از مصبر قند آورند برد و ستال اور مخا نے برند
 مرا گر تہی بود از قند دست سخن پائے شیریں تر از قند دست
 دقندے کہ مردم بصورت خورند کہ او باب معنی بجا غدہ برند

میرے آپس سے کوئی پختہ در بہمن نہیں تھا۔ پوجا پاٹھ میں شاید ہی کوئی کرتا ہو۔ دادا
 نے البتہ برہمن پن کی رسم کو خیر باد کہہ پشاور کی بدو باض کے زیر اثر گوشت کھانا شروع
 کیا اور ضرب پیٹنے کی بھی عادت ڈال لی، لیکن شک ہے کہ ان کا لگا یا ہو الہ و خدا ندان بن
 پھلا نہیں، ان کی بات انھیں بنگ رہ گئی۔ پشاور سے نکا کر لاتے اور دو چار مہینے میں اسے

فرق ہے ناب کم کے اور داسپ کا کو ایہ ادھار لے کر پشاور چلے جاتے۔ بڑا لڑکا ان کے پاس رہتا تھا اور میرے والد اپنی ماں کے پاس۔ والد جب ان کی محبت کی داستان سناتے ہیں تو جی بھر آتا ہے۔ لسیان سے شاہوٹ تین میل کے فاصلے پر ہے۔ سر دیوں میں اس اسکول میں رات کو وہیں رہنا پڑتا تھا۔ اتنا محنت کھنتے تھے اور بچوں کو پڑھاتے تھے۔ کھانا لے کر نصف راستہ ماں لے جاتی اور نصف تک ادھر سے والد خود آتے، اور دو وقت کا کھانا ساتھ لے جاتے۔

والد نے ۱۸۹۰ء کے شروع میں ویکٹریٹر ٹل کا امتحان اٹیا سے پاس کیا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں اپنے والد کے پاس پشاور چلے گئے۔ دادا صاحب بیمار ہو گئے، تو ان کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں واپس آئے۔ اسی سال دادا کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی، اور دادا مرحوم کی ۵۲ سال کی۔

۱۹۰۱ء میں انھوں نے نارمل اسکول پاس کیا۔ ڈویژن بھر میں اول رہے۔ ۱۹۰۳ء میں لاہور ٹریننگ کالج سے سینئر ویکٹریٹر ٹریننگ کا امتحان پاس کیا۔ نارمل اسکول کے بعد پہلے پہل وکٹریٹر اسکول، بعد اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ تنخواہ صرف دس روپے ماہوار تھی۔ لالہ رام داس اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، جو بعد میں گورنمنٹ کالج میں فارسی کے گورنر بنے اور اچا رہے نام دیو کے نام سے مشہور ہوئے۔ موسون کالج میں فارسی کے طالب علم رہے تھے، لیکن کہا جاتا ہے کہ "فوت کو" تون" سمجھتے تھے۔ لالہ گور بخش رائے بھی اسی اسکول میں مدرس تھے۔ وہ ہندستان کے مشہور شطرنج کے کھلاڑی ہوئے ہیں اور ایک دفعہ بابا جیمین بھی رہے تھے۔

ابتدائی زندگی کا یہ مختصر سا خاکہ ہر کو دیکھا کس طرح عسرت میں دن کاٹے، کیسے تعلیم حاصل کی، اور ہر یاد کی اس سہارا کتنا اچھا سہارا ثابت ہوا۔

لاحولہ، ایک سال قیام رہا تھا۔ وہاں کے شاہوٹ دیکھے۔ اقبال اس زمانے میں ابھی غریب تھے اور شاہوٹوں میں شامل ہوتے تھے، وہیں آپ نے میرزا ارشد گورگانی اور مولوی نذیر احمد پلوئی کو بھی دیکھا۔ کالج میں پنڈت دلا رام اور دادا فارسی پڑھاتے

غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب

نا کردہ گھا ہی بھی ہوتی کردہ گھا ہی
عشر میں تھیں جو کی پیش لا ہو کیا تو
یہ حال ہے دنیا کا تو حلقہ بوجہ ہی
تم کو تو بپائیگی یہ معصوم نگا ہی

اہل دنیا سے جواب مطلب دنیا سے عرض
تم نہیں شیش نہیں پتھر بھی پئے جاتا ہو ہیں
اپنے ہر دل میں بسائی ہم نے اک دنیا
میرے سانس سے نہیں ہوتی کبھی صبا تک

ساغر کو تو دنیا کی نگاہوں سے چھلا
ہم جلوہ گرہ ناز کے پردے تو اٹھا دیں
ماں کے جو جتنے ہیں پھیلتے نہیں جاتے
انکھوں کے جو پتھر ہیں اٹھک نہیں

ابھی تو انک ہی ٹپکے ہیں دیدہ تر سے
عجب نہیں کہ جنوں اعد بھی کو سے جھٹک
لگ جیات سے ٹپکا ہوا تو کیا ہوگا
ہمارے صبر کا دامن رختو کیا ہوگا

موت کی روک تھام کیا دینا
سارے گھٹنے سے تھوڑا کیا ہوگا
یہ تو ہر ایک پر چھپتی ہے
کٹھن کٹھن ہی رات کٹتی ہے

لعل کی تو کسی بات پر حرف آ نہیں سکتا
اسرارِ حقیقت کوئی جانے بھی تو نہ کر
مرد مردہ باطل کو بھی جھٹلا نہیں سکتا
جو ان کو سمجھتا ہے وہ نہیں سکتا

والد یہاں ڈسٹرکٹ بورڈ دہلی اسکول کے ریٹائر ہوئے تھے۔ حقیقت میں انکی عظمت کا صحیح زمانہ ملازمت کے بعد ہی شروع ہوا۔ اس سے قبل تو وہ انھیں پہچان ہی نہ سکے۔ زبان کی عظمت ہی کو جان سکے۔ زبان و بیان پران کی قدرت کو بھلا اس علاقے میں کو سمجھتا۔ حیرت اس پر ہے کہ وہ عمر بھر اس علاقے ہی میں مقیم رہے، لیکن دلی اور لکھنؤ کی انسانی زبان نہ جانے، کہاں سے سیکھی۔ کہا کرتے ہیں کہ جب پندرہ روپے ماہوار تنخواہ تھی تو ان میں سے پانچ روپے کتابوں اور رسالوں پر صرف کیا کرتا تھا۔ میں نے اپنے گھر میں پیام یاد (لکھنؤ) کمال دہلی، حلیۃ یاد (میرٹھ) اور نہ جانے کتنے رسالوں کفایت دیکھے ہیں۔ پیام یاد میں آپ کا طرحی کلام ۱۹۰۶ء کے قریب سے چھپنے لگا تھا۔ کتابوں کے سنبھالنے کی انھیں عادت تھی لیکن سلیقہ نہیں تھا۔ اب ان میں سے ایک پر بڑ کا قند بھی باقی نہیں رہا۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کا مجموعہ جنون و جوش ۱۹۵۲ء میں پہلی بار چھپا، تو اس کے بعد انھوں نے اپنی تمام بیاضیں ایک لفظ میں بند کر کے رکھ دیں اور دو تین سال انھیں ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک دن جب اٹھکے دیکھا تو لفظ باقی تھا اور کلام کی بیاضوں کو دیکھ اس طرح چاٹ گئی تھی کہ کاغذ کا دواہجہ بڑھ بھی نہیں سکتا۔ میں نے تو ان بیاضوں کو اول سے آخر تک نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھا تھا۔ ان میں کتنا کلام تھا جو ضائع ہو گیا۔ وہ تو کہیے کہ باوہ سرخوش اور جنون و جوش وہ مجموعے چھپ چکے تھے، مدنیہ کلام بھی ضائع ہو گیا ہوتا۔ بہت سی تقویٰ اور فراموشی غلطی تھیں، قطعات نامیخ تھے، پرانی فوٹو تھیں۔ مشکل زمینوں میں حقیقہ غرض میں بھی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم سے متعلق بیویں غلطی تھیں۔ ایک سندس تھی جو میں پچیس برسوں پر غفلت تھی، ایک نظر لگا کا تراد، ایک نظم کاس کی فریاد، اور بہت کچھ تھا۔ کہیں سے ایک مصرع یاد ہے اور کہیں سے دوسرا۔ دیا سلائی پر ایک نظم تھی۔ ایک خوبصورت نظم لب دنیا کے عنوان سے تھی۔ اس کا ایک شعر یاد ہے،

شبِ ہتاب پر سرودہ ہمارا گت ہو کر گئی
نظر یاد ساحلِ جا بجا دیا ہی چلنا تھا

نظم دیا سلائی کا بھی انیک شہزاد ہے

تباہی خیزوں تو یکڑوں طوفان مارتے ہیں
 لکھو قیصر و خاقان کی عظمت ہم نہ مانتے
 کبھی ایسوں کے وار پر سرباز اُتر نہیں
 کبھی مظلوم کا آنسو بھی اس سے کم نہیں

عیاں ہو کر بھی وہ مستور کھوں ہوں ہم نہیں سمجھے
 سر منزل بھی دلی دور ہے کیوں ہم نہیں سمجھے
 جگر کے داغ ڈال کے داغ لبش میں سینے میں
 چراغ زندگی بے لبت کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
 لڑوں اپنے دل سے کہ ایک کی نظر سے
 ادھر سر بدگانی، ادھر بدگانی
 تمہارے دسنے سے ہوتا ہی کیا ہے
 زما دے گا، ہماری کہانی

خستگی میں بھی سو گر گر کے سنبھلتے دیکھا
 آفریں کہنے لگی دھڑکی منزل مجھ آ
 کل کی ہے بات کہ خود دل کو میں سمجھا اٹھا
 آج یہ کیا ہو کہ سمجھائے نکاد دل مجھ کو

جس زہد پر زہد کہ ہو رحمت کی توقع
 کچھ کم تو نہیں اس سے ملاد میں تر
 مادار کی تو قیر نہ ہوگی نہ ہوتی ہے
 دنیا میں تو ہے عیب غریبوں کا ہر گ

صل و مجاہدین دور و سراسل و گھر کو کیا کروں
 نے تو نہیں ہو بد بھر سا غرور کو کیا کروں
 دھڑکیوں نے سن لیا اب یہ مجھے بتائے
 آئیں اگر وہ سامنے کو تو نظر کو کیا کروں

بر اکبر دیا، یا سبلا کر دیا
 بس اب ہم نے جو کہ دیا کھلیا
 بڑی چیز ہے جو شمس ایہ زندگی
 جیسے آپ نے اک سزا کہ دیا
 دینے دہم، درد، آرزو، حیرت
 یہ نہیں جو تھکا کر نہیں
 حق ہو ہر راں یہ ممکن ہے
 مگر ایسا بھی ہوا تو نہیں

میرے دل پر کس کی توپوں سے دھواں نکلا کہ لہان نکلا
 کے اعلان لڑائی کا ہوا غوش قہر
 جس جگہ پہنچا ہوں کے در پہ جاتے ہیں
 لے وطن! تیرے فدائی وہیں ٹوٹ جاتے ہیں
 امان کو نظم کرنے کا ارادہ تھا۔ دسین ہی قلم کیے تھے۔ ایک کے چار بند اور ایک کا
 رت ایک بند یا د ہے :

تھارام کو چودہ برس کا جب بن اس
 بھکا دیا سر تسلیم اس نے بے دوس اس
 سنایہ ہر کس دنا کس نے بادل پر یاں
 شکستگان محبت کے دل کی ٹوٹی اس
 کہا یہ سیتانے : میں ساتھ بن میں جاؤ گی
 اٹھائی ہوئی جو کڑیاں وہ سب اٹھاؤ گی

بات سن کے کہا رام نے کہ بے پیاری !
 کسی طرح نہیں واجب یہ شوق تیار ہی
 عین تو بھگت محل کا بھی بوجھ ہو جاو گا
 کو چکا کون سیا باں میں ناز برداری
 پھینکے دل میں بھی کانٹے بول کے اکثر
 سونگی نالے بھی جان ملول کے اکثر

نہ ہنسن کوئی ہو گا، نہ ہنسنا ہو گا
 پناہ کے لیے بس ایک بھونپڑا ہو گا
 دم قدم پہ مستخر کا سامنا ہو گا
 تمہیں بتاؤ کہ ایسے میں حال کیا ہو گا
 زباں جو کھولینگے مرغان کو ہی دراغی
 کہینگے لالہ کو داعی، تو سرو کو باغی

س بند میں پختگی کی شان دیکھے :
 اپنی ہوا نسیم سحر باندھنے لگی
 بے رات اپنا رعب سفر باندھنے لگی
 دل میں خیال فتح و ظفر باندھنے لگی
 عبا سیوں کی فوج کر باندھنے لگی
 میدان کی طرف جو بڑھے ہو کتر تیز گام
 سب کی زبان پر تھا فقط رام ہی نام

اب کچھ خدوئوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں :
 بے سرو سامان ہوں لیکن ہر سامان نہیں
 ساتھ لے کر اپنی بے سامانیاں آیا ہوں میں

میر سعد الدین

قدم لے اذو حام یاس! دل میں دیکھ کر کھٹکنا
کسی گوشے میں مری عمر بھر کی آرزو ہوگی
اے اہل اتیرے گونے سے اگو گوجہ بھی گئے

دوش اعیاب کا اٹھینکے سہارا لے کر
میرے شورِ جنوں کی آسماں تک جا پہنچی

جہاں میں جا نہیں سکتا، وہاں تک بات جا پہنچی
۱۹۹۹ء میں جلیان والا باغ دار قس کے حادثے کے بعد پنجاب کے شہروں اور قصبوں میں
بڑی زبرد دار ہڑتالیں ہوئیں۔ ننگور کی ہڑتال کا وہ پربوش نظامہ مجھے یاد ہے۔ غلام
غوث کے باغ میں ہندو مسلمانوں کا بڑا زبردست اجتماع ہوا۔ والد نے بھی چار پانچ
شعر پڑھے تھے ان میں سے دو تین شعرا میں:

کو گئی دعدہ جاوید محبت، ہم کو کس کی ہستی کو مٹائیں گے مٹانے والے
ہیں گے سرِ صفت پھر بھی ر ہا دل کا غبار اور ہونگے کوئی آنکھوں میں سامنے والے

چار پانچ سال کے بعد ننگور میں ایک سب بج آئے، نام غالباً سید حفیظ الدین تھا۔ ان
کے والد کے استاد میر نثار علی شہرت بھی ان کے ساتھ تھے۔ شہرت صاحب مجھوں و کشمیر
کے سرِ رشتہ تعلیم میں انسر کے چکے تھے، جیہود میں بھی رہے تھے۔ متعدد اخباروں کے مدیر
بھی رہے۔ وہ محکم علی فرحت کے بیٹے تھے، بوشاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ شہرت خود وہ
بخش قلع کے شاگرد تھے۔ کہا کرتے تھے کہ بہادر شاہ کے صاحبزادے پڑھ چکا ہوں۔

تھوڑے عرصہ کے درمیان عمر ہو گئی۔ آدا اس وقت بھی کو لدی تھی۔ دارغ کے انتقال پر

۱۹۰۵ء میں انھوں نے ایک کتاب اُیمنہ دارغ کے نام سے لکھی تھی۔ والد سے ان کی اکثر

طوائف رہیں۔ ننگور ہی میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ بات ۱۹۲۲ء

کے قریب کی ہوگی۔

اُسی زمانے میں ان کے اہتمام میں ننگور میں ہر پدمہ دن کے بعد بزمِ مشاعرہ منعقد ہوا
کوئی تھی۔ رات آٹھ بجائی شاعر اس میں حصہ لیتے تھے۔ مفتی سید محمد حنیف سید اس

بزم کے صمد تھے۔ بزم کا نام تھا "ریاض سخن" اس بزم کا سالانہ مشاعرہ ۱۹۲۳ء کی محرم میں نکودہ میں منعقد ہوا۔ جالندھر اور کپور تھلے کے علاوہ بعض دوسرے مقامات سے بھی شعراء تشریف لائے تھے۔ حفیظ کو در صاحب لاہور سے ملے آئے تھے۔ وہ حفیظ کی اٹھان کا زمانہ تھا۔ دو مصرع اسے طرح تھے۔

۱۔ آئینہ کوئی رکھ دے ہمارے مزار میں

۲۔ جو کوئی دنیا میں آیا، اس کی رسوائی ہوئی

محمد علی آذر جالندھری، کیر خاں دسا جالندھری، سرور کپور تھلوی، سوہن لالی ساحر کپور تھلوی، فانی کپور تھلوی اور نہ جانے کتنے شعراء تھے۔ سب سے دلچسپ آدمی علی سکندر جگر مراد آبادی کی بھی جو پیرزادہ عبدالمدید کیل، جالندھر کی واسطت سے آئے تھے اور جالندھر میں چشموں کی تجارت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ پیرزادہ صاحب بڑے سخن پرور شخص تھے۔ ان کے والد محترم غلام قادر اثر اپنے ہمنام گوامی کے بعد اس تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ پیرزادہ صاحب کے مکان پر اکثر شعور سخن کی مجلسیں ہوتی تھیں۔

اس شاعر کے انتظام و انصرام میں والد کے دو مقرب اور پرانے شاگردوں لالہ گلشن ناتھ کمال اور ذہیر یارام در دکا ہاتھ تھا۔ شاعر کی دو تین نشستیں ہوتیں۔ نکودہ میں ہوم چم گئی۔ جس کو دیکھیے شعور سخن کا دلدادہ نظر آتا تھا۔ جگر نے طری غزل "بہاریں" سنائی، آذر نے بھید یک قافیہ بہار۔ ان کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے:

اپنی بہاؤ میں ہی اپنی بہاؤ تھی نام بہاؤ ہم نے سنا تھا بہاؤ میں
سب نے دہراؤ سخن دی اور دوسری زمین میں حفیظ کا مطلع تھا،

کسیا ہوا؟ کون آگیا؟ کیوں ٹل گئی؟ آئی ہوئی؟

موت کے رخ پر بھی ہو کیوں مرونی چھائی ہوئی

غیر طرعی دہر میں حفیظ نے کوشش کنیا اور برسات کی دلدل نظائیں سنائیں اور شکر فی راہوں سے شعراء اہل علمین کو نگاہ کیا۔ سرور کپور تھلوی عجیب دھن میں گاتے تھے۔ احباب کہا کرتے تھے کہ وہ بالکونسن آگئی۔ انھوں نے اپنے والد ماجد شمس احمد بخش رنجور کپور تھلوی شاگرد

میر درد اللہ عزوجل
 داغ کی دھڑلیں سنگلاخ زمینوں میں سناٹیں۔ ایک تو ذرا سہل تھی، دوسرے
 سانپ کے ہاتھ۔ دوسری روایت تھی، پرٹاؤس اودھافہ تھا: داغ اور پایاغ۔ کیا
 تحت اللفظ پڑھتے ہوئے بھی اُسے فلفلہ جو میں پڑھ رہے تھے۔ والد کی غول بھی سہل
 میں ہے۔ کیا شعر کہا ہے:

میرے نفعے سُن کے بھولنے کی ہر مدت ہو مست

بھول ہر سانس میں مجھ پر سینکڑوں پتھر کے ہاتھ

اس شاعر کا حاصل یہ رہا کہ چند دن کے بعد چٹا چلا کہ یہ جگر صاحب کوئی جلی
 جالندھر سے بے اطلاع کے بھاگ گئے اور پھر دیکھنے میں نہیں آئے۔ جب اصل
 صاحب سے کچھ ریتھ میں ملاقات ہوئی تو والد سے اس کا طبع وغیرہ پوچھتے رہے۔
 قیامت تو یہ تھی کہ انھیں کلام پڑھتے و انھیں کا مجموعہ داغ جگر بیٹے و انھیں کی طبع
 کا بھی بہت شوق تھا اور شریخ اچھی کھیلتے تھے۔ شاعر کے بعد بھی لکھو دتے
 والد سے سات رات بھر شریخ کھیلتے رہے۔ عجیب عجیب سون کا شوق تھا۔ طب
 اچھی دسڑت تھی۔ لوگوں کی ستم ظریفی دیکھی کہ اصل جگر کو نقلی اور نقلی کو اصلی سمجھتے۔
 والد بالعموم اساتذہ کے اشعار پر شعر نہیں کہتے لیکن کبھی کبھی مضمون میں ترقی
 سو بھج جائے تو معذرت سے پیش کر دیتے ہیں۔ خلا ذوق کا ایک شعر ہے:

ذوق! اس بحرِ فنا میں گشتی عمر جاوداں

جس جگہ نہر جائیگی، وہ ہی کنارا ہو گسیا

یہ شعر پڑھ کر آپ کی محسوس ہو کہ حضرت ذوق نے کنارے کا قیتم نہیں کیا
 جس جگہ پر جا آئی، ایک غیر مطمئن بات ہے۔ اس احساس سے آپ نے یہ

آگئی جب ہاں لب بڑے مسافت ہو چکی

لب ہمارا بحرِ سستی کا گنارا ہو گسیا!

لب کو کنارا کہنا یوں بھی خوش بنیائی کی معراج ہے اور پھر کنارے کا قیتم
 کیا۔

سحر کے قانی:

امیر سینائی:

شب وصل بوجہ سے اُس ہو گئی بدلتے ہی کدوٹ سحر ہو گئی
شب وصل کیا غمقر ہو گئی کہ آتے ہی آتے سحر ہو گئی
میں حیراں ہوں نہ لعلِ رخ و بیکر سر شام کیوں کہ سحر آ گئی

دماغ:

شب وصل ایسی کھلی چاندنی وہ گھبرا کے بولے: سحر ہو گئی
والسہ یہ قافیہ دونوں واجبِ انتظام اساتذہ کے اسلوبِ بیان سے نکلا اس طرح
سے کہا:

بلا تھیں شبِ غم کی تار بکیاں خدا جانے کیوں سحر ہو گئی
حضرت ریاضِ خیر آبادی کا مشہور شعر ہے:

اے جنوں! کچھ دھجیاں میرے گلے میں ڈال لے

جس میں کوئل بچھرتی ہے، وہ جہینا آگیا

آپ نے بھی یہی قافیہ اس اندازِ بیان سے نکلا کہ اور بالکل الگ ہو کر اس طرح لکھا ہو:

گھر سے نکلو، رنگِ رخ چھڑ کو ہر اک شقائق پر

جس میں ہولی کھیلے ہیں وہ جہینا آگیا

ان مثالوں سے یہ مقصد نہیں کہ کسی استادِ پاکمال سے آپ کا مقابلہ کیا جائے، بلکہ اس سے
یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی فکر اور بیان دونوں میں عربت بھی ہو اور قادرِ بھلائی بھی۔
والسہ کے ایک ذہین اور ہونہار شاگرد تھے 'نوریا رام درد'۔ وہ مجھ سے عمر میں کئی تین
چار سال بڑے ہوں گے، 'نورین' کا ارشاد انھیں کا فرزند تھا۔ وہ جب لاہور کالج میں تعلیم
حاصل کرنے کے لیے گئے، تو وہاں کے ادبی حلقوں میں اپنے استاد کا نام اچھالنے میں مصروف
رہے۔ میں سے یعنی اساتذہ مثلاً ناجور نجیب آبادی، ارمان دہلوی، پنڈت گنپتی اور کچھ
نوجوان شاعر بہت متاثر تھے۔ لیکن آپ تو اپنے گوشے سے نکلے ہی نہیں تھے۔ درو صاحب

میر علی محمد

نے ایک ترکیب سوچی۔ بائگ دراکا ایک نسخہ لائے اور والد سے کہنے لگے کہ اسی میں سخن ہیں، ان پر ایک مضمون لکھ دیجئے۔ یہ سادہ مزاج اور بولے تو میں ہی، بھڑ گئے، ایک ہی نشست میں نشان لگالئے اور لاکھ کرم چند کے اخبار ہفتہ وار پندرہ دس کے قریب قطیں جو رح کے نام سے چھپ گئیں۔ لاہور میں بڑا شور ہوا۔ جو لوگ کے قدر شناس اور ان کی عزت رکھتے، وہ بھی مخالف ہو گئے۔ ان میں ایک تو خفیہ ہی تھے۔ یہ مخزن کے دوسرے دور میں اس کے مدیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے والد کی قصو حالات اشاعت کے لیے منگوائے تھے۔ جب یہ اقبال کے بارے میں مضمون شائع انھوں نے ان کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا اور نہیں بھایا۔ مجھے یاد ہے کہ اس سبب میری ان سے بڑی تلخ خط و کتابت ہوئی تھی، اور وہ مجھ سے سخت ناخوش بھی رہے۔ لاہور کے ایک مشاعرے میں مجھے مخاطب کر کے یہ شعر پڑھے:

نہ بھانا کسی نے کبھی وطن میں سمجھتا تھا، بہت مشہور ہوں میں
نہیں کو تاجر، زون کی شکایت عزیز و اہل بہت مفرد ہوں میں

درد نے یہ تنقیدی مضامین کتابی صورت میں بھاپ دیے تھے۔ جب نیا ڈیپوڑی، ناروی اور دیاض خیر آبادی کو کتاب خریدنے بھیجے، بہت پسند کی۔ چار میں دیو پوڑی تھا۔ نیاز نے مجھ سے والد کا کلام بھیج دیا۔ اس کتاب کا نام تھا: اقبال خلیماں، اس کے بعد گوہر اوار کے کسی گوشہ نشین نے، حقیقتاً کی خامیاں، لکھ ڈالی اور دی۔ بات دو ماہ پہلے ہو گئی کہ چھپڑوں ہاں سے چلی جائے، اسد!

اب مشاعروں کی گہما گہمی رہنے لگی۔ کچھ تھکے اور شملے کے مشاعروں میں والد سنا۔ وقت سے متعارف ہوئے۔ والد بھی لے لی اور انھیں اساتذہ کی صفحہ اول میں اپنا مقام بھی مل گیا۔

ان مشاعروں میں قابل ذکر اشعار بہت ہیں، لیکن صرف چند کا ذکر کرتا ہوں۔
پشت امرتا مہ سادو لہری کا مشاعرہ صلوہ جلی، دسمبر ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس
بندستان کے ہر گوشے سے شعرا جمع ہوئے تھے۔ اس کی تاریخ نشستیں ہوئی تھیں۔ فلا

نخواب کلام

یہ بھی بول ساتی بھی ہو سنا غریب بھی ہو صبا بھی ہو

چاروں کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی ہو

عشق کا جو ہر تہ ہے اس کی اداسے دلکشی

اس کے کیا معنی کہ وہ آفت کا پرکالا بھی ہو

اُن کی باتوں میں اب وہ بات کہاں — اب وہ پہلو سا اشتیاق کہاں

چوشتِ بزمِ غمزدن کی قسمت میں — عیش کا دن خوشی کی رات کہاں

نغمہ بودِ اضطراب، ناممکن — عیش ہو کا میاب، ناممکن

لاکھ چمکا کرے سرِ کمال — اُن کے رُخ کا جواب ناممکن

دے دیا دردِ لا دوا مجھ کو — میرے خالق یہ کیا دیا مجھ کو

ہوت نے آگے کھول دیں آنکھیں — نظر آنے لگا خدا مجھ کو

اُٹل ہے یہ تظارہ دنیا مرے آگے — آتا ہو چین بن کے چھلا د امرے آگے

بے خوش سے بھی دردِ تخیل کی رسائی — چلتا نہیں جبریل کا دُعا مرے آگے

بھولے سے یاد آتا ہو گا نامِ خدا کا لوگوں کو

ان کو دیکھ کے ساری دنیا کا فر ہوتی جاتی ہو

دن پڑیگا کوئی نینکا، اس مکتوبِ محبت کو

بھوشنِ تمہاری عرضِ تمنا و فتنہ ہوتی جاتی ہو

کیا حیات

جب کوئی غریب فوجِ خواں ہوتا ہے

یارِ با اس وقت آجہاں ہوتا ہے

جب غلام کا سیلاب نہاں ہوتا ہے

ظلم کی محو دن پہ پھر کھلتی ہو جب

کہ داغ بجا کلام ہے۔ یہ خود ستائی کی بات نہیں بلکہ اللہ کی تعریف ہے کہ ان کے
 قربیت میں ہل کر میں اس قابل ہو گیا تھا حال آنکہ ان سے اصلاح نہیں لیتا تھا
 دہلی دار ٹنگ لائبریری کے مشاعرے فصیح الدین احمد کے اہتمام سے بڑی شان
 ہوئے۔ ایک مشاعرے میں انگریز ڈپٹی کمشنر سٹراٹون نے شعر کا استقبالیہ فارسی
 میں پڑھا تھا۔ ایک اللہ مشاعرے کی چار نشستوں کی صدارت سر بیج بہادر
 فہد رام پورہ سر رضا علی اور رائے بہادر ام کشور نے کی تھی۔

اس کے بعد سید نقاد حیدر زیدی ڈپٹی کمشنر کے اہتمام سے دیوبند اور سہارنپور میں
 معرکے کے مشاعرے ہوئے۔ وہ صنفی نمک کو لے آئے تھے، جو مشاعروں میں نہیں
 تھے اور نہ جانے کے قابل رہے تھے۔

لاسٹ لیکچر کاٹھی لڑ میں رملی دھڑا کے اہتمام سے کئی سال مشاعرے ہوئے، شہر مولان
 اصناف کی امتداد ان خاص طور پر بلائی جاتی تھی چونکہ وہ خود بے تحاشہ دہلوی
 شاگرد تھے۔

امرت سر کا مشاعرہ ۲۳ اپریل ۱۹۴۳ء کو سٹریٹون ڈپٹی کمشنر کے اہتمام سے ہوا تھا۔
 خود بھی ایک نئی خیر دانی اور شہداء ہیں کو شامل مشاعرہ ہوئے تھے۔ ریاض قرین
 سٹی مجسٹریٹ نگران تھے۔ یہ بہت بڑا مشاعرہ تھا۔ جوش ملیح آبادی اور مجرم راؤ
 بھی آئے تھے۔ اس مشاعرے کی مدد اور بعد کو بہادرستان کے عنوان سے شائع ہوئی تھی
 نومبر ۱۹۴۳ء میں شیلے کی رقم اردو کا مشاعرہ دہلی میں ہوا۔ یہ مشاعرہ ٹاؤن ہال
 تھا شاہیر کے ساتھ والد تھے ہی، میں بھی حاضر تھا۔ میری پہلی خولن مفاہیلین
 آئی ڈی سر سبز ہوئی۔ مسٹر غلام محمد بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے اس
 کے سرپرست تھے۔ بہت خوش ہوئے اور اس کے محلے میں مجھے لکھائیے کھدائی۔
 تھے۔ میں حکومت ہند کی ملازمت میں ان کی کوشش سے آیا۔ پھر تو کھلا میدان
 چلتا گیا، بڑھا گیا، والد بھی بہت خوش ہوئے۔

پاکستان بننے کے بعد والد اکبر بارہوی عبدالحق کی دعوت پر کوچی بھی تشریف لے

میرے والد محترم

وہاں بھی آپ کے عقیدت مندوں کی لمبی نہیں، جب غصہ پیشانی اور احترام سے پیش آئے۔
 فرماتے ہیں کہ گاڑی میں مسافروں کو جب میرے نام کا علم ہو تو وہ میرے خاطر مدارات شروع
 ہو جاتے۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک بار ۱۹۲۰ء میں کراچی بزم غالب کی دعوت پر تشریف
 لے جا چکے تھے۔ لیکن اب تو دوسرا ملک تھا۔ البتہ لوگ غیر نہیں تھے۔ یہ لہو کی کوہستہ تھی۔
 تقسیم ملک کے بعد آپ ہندوستان کے بڑے بڑے مشاعروں میں شامل ہوتے رہے ہیں۔
 جشن جمہوریت کے مشاعرے میں دہلی مقعدہ بار شامل ہوئے۔ ایک بار تو اس عظیم الشان
 مشاعرے کی صدارت کا اعزاز بھی آپ کو ملا۔ دوسرے اعزازات کا ذکر سنو رہے ہیں۔
 انور نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے ہیں۔ پنڈت گووند بھوپنت نے جب ۱۹۵۷ء میں
 آپ کو انجمن ندن کو تہ پیش کیا تو آپ نے اس موقع پر دو شعر کا یہ نظم پڑھا:
 پوچھا کسی نے مجھ سے کہ یہ شاعری کی قدر مندا امام کی ہے کہ گدی ہنت کی
 میں نے کہا، یہ دونوں ہی باتیں ہیں ناقد جو کچھ بھی قدر ہو، وہ عنایت ہو پنچ کی
 ۱۹۵۷ء میں شیخ محمد راشد کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ بڑے بڑے شاعر ہیں تھے۔ جوش ملیح آبادی کے باپ سرنگ
 میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا۔ ایک ٹکڑے کو جو ذکر بانی سب سے پہلے پڑھا۔ جوش بلکہ
 ان کے کہنے کے چوتھین ملیح آبادی اور ملیح آبادی، 'فراق'، 'خوش'، 'ہری چند اختر'، 'بھادھنڈی'، 'مکش'، 'نکدہ وغیرہ'۔
 اب سب نام تھے کہاں یاد آئیں گے۔ دلی سے سب لوگ بھائی بہن بھائی تھے۔ والد بہت بہت لیتا
 لعل کو تھے، لیکن بالآخر انہیں جوانی بہادری سے لے لگ گیا۔ واپسی میں انہوں نے جوانی بہادری سے
 کلمے کا کار کر دیا، اس لیے میں اندر دل سے آنا پڑا۔

دو سال چوتھہ حکمت کلام مذکورہ لکھتے کی دعوت پر گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ جوانی بہادری سے
 نہیں ہائیں گے، اس لیے دہلی گاڑی سے فرسٹ کلاس میں آرام سے جانا تاہم وہ اس وقت آپ کی
 عمر سو برس سال میں تھی۔ اور لوگ آپ کو دیکھ کر حیرت میں تھے، مشاعرے کے بعد کچھ تاہم دلی نے
 ایک لکچر تقریب میں آپ کو خوش آمدید کہا اور ایک مثال شدہ کہ۔

آپ نے احباب کی بیشمار منقون کتابوں پر مضبوط تبصرے کیے ہیں۔ جن میں کاوانا، نظم
 مستند احمد نادر ہروی، نظم فردوس از خوشی محمد ناظمی، معانی از محمود آیات، مہمانی

میرے والد محرم

دو گناہ چگیزی، مطلع انوار از برق دلجوی، شعاع ہزار ہوا کی ایسی خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فوج ناردی، امیر مینائی، دل شاہ جہاں پوری گناہ قر باونی، بخود بدایونی، احسن مارہروی پر سیر حاصل طویل مضامین بھی لکھے ہیں۔

علی مضامین میں املا کی غلطیاں، شکست ناردی، اڑنا اڑنا، شعر میں شخصیت الفاظ، ششاد بکھنوی، فارسی کی شنوی سستی پتوں کے مصنف منشی اندجیت کی سر جو شست اور قنوی کا جائزہ، ذوق سے نا انصافی اور بیسیوں دوسرے مضامین ہیں جو مختلف رسائل میں چھپے ہیں۔

مشاعروں کی کیفیات اور مضامین کے دو مجموعے مرتب شدہ موجود ہیں، لیکن ہندو شرمزہ اشاعت نہیں ہوئے۔

آپ کے پورے علمی اور شعری کام کا احاطہ کرنا اس لیے مشکل ہے کہ آپ کو اردو کی خدمت کرتے، تقریباً ۷۰ سال ہو چکے ہیں۔ پورا کارڈ بھی موجود نہیں اور یادداشتیں بھی نہیں۔ یہ توجہ میں لے ہوش سنبھالا تو کچھ نہ کچھ جمع کرنا شروع کیا۔ انہوں نے کمر سارے کلام کی حفاظت میں بھی نہ کر سکا اور نہ جانے کتنی قیمتی اور اہم شہ پارے دیک چلا گئی۔ آج کل زیادہ توجہ برہمائی پر ہے۔ جب کبھی طبیعت روح میں آجائے تو دو چار نئی رباعیاں کہہ لیتے ہیں۔ امید رہنی چاہیے کہ رباعیوں کا ایک مجموعہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گا۔

آپ نے ۶ جنوری ۱۹۵۱ء کو ایک نظم بھی لکھی۔ عنوان تھا: اپنے کلام کو الوداع اس کا پہلا بند تھا:

اے عزیز! اب مجھ اسی! تم کو رخصت آج سے

شوق سے جاؤ جہاں چاہو! اہازت آج سے

میں نہیں سمجھتا تم کو اک امانت آج سے

چھوڑ دی اپنی برائوں کی حفاظت آج سے

شاید یہ پیشگوئی تھی کہ برائیاں ہی باقی نہ رہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ جنون ہوش کے بعد جس میں یہ نظم شائع ہوئی، "فردوس گوش" شائع ہوئی، "آئینہ اصلاح" شائع

ہوئی، جس میں شاگردوں کے کلام پر اسکا میں مع توجہ درج ہیں۔ اس کے وادین
 ٹکے "دیوان غالب مع شرح" شائع ہوا۔ اس کے پانچ ایڈیشن ٹکے ہیں۔ اب
 ہیں رباعیات اور نثری مضامین کی اشاعت کی توقع رکھنی چاہیے :
 میں نے اس مضمون میں زیادہ تر وہ باتیں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے جو دوسرے
 مضمون نگاروں کے علم میں نہیں ہونگی۔
 ہم سب کو دعا کرنی چاہیے کہ قبلہ ابھی گیسوئے اردو کو تادیر سنوارتے رہیں۔ اب وہ
 داغ کے واحد زندہ شاگرد ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود نے ۱۹۵۷ء میں کہا تھا کہ کون کہتا ہے
 داغ مر گئے۔ جناب جو شلمیانی زندہ ہیں اور جب تک وہ زندہ ہیں، داغ
 زندہ ہے۔

جوش ملیانی

۱۹۳۶ء تک میر تقیام پنجاب میں رہا، اور وہ بھی بیشتر لاہور میں۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ اس دوران میں کبھی کسی جگہ حضرت جوش ملیانی سے نیا حاصل نہیں ہوا۔ حال آں کہ وہ بھی اسی پنجاب کے رہنے والے تھے اور کبھی کبھار لاہور بھی ضرور آتے ہوں گے۔ اسے آپ میری بد قسمتی پر محمول کیجئے یا غرض کہ گزشتہ کئی سال سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید عمر کے تفاوت کے باعث ہمارا کوئی مشترک دوست نہیں رہا ہوگا جس کے ہاں ملاقات ہو سکتی۔

ایک زمانے بعد پہلی ملاقات یہیں دہلی میں ہوئی، اور وہ بھی کچھ عجیبے پتے پر۔ ماہنامہ انجمن حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات نئی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ یہ آزادی سے پہلے نومبر ۱۹۴۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہ جندوڑ تھا۔ آزادی کے بعد اس کے مدیر جوش ملیانی کی آبادی مقرر ہوئے اور نائب مدیر جوش ملیانی جوش ملیانی سے میری پرانی یاد اللہ علی بحسی زمانے میں ہم قردل باغ میں ایک دور کے کچھ دوستوں میں رہے تھے۔ پھر جب انھوں نے ہندوستان برادری کے سرانجام سے جاری کیا، ماہنامے کلیم کی ادارت بنی تھی اور دریا گنج اٹھ گئے، تو وہاں بھی میر والہ کے ہاں آخر جانا آنا رہا۔ بعد ازاں سے چندے خطا و کتابت بھی رہی۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں جب

جوش ملیح آبادی

میں حکومت ہند کی ملازمت میں شامل ہو کر ہندوستان سے باہر چلا گیا، تو یہ تعلقات
منقطع ہو گئے۔

جناب عرش کی روایت یہ ہو کہ ایک دن جوش ملیح آبادی نے ان سے کہا، عرش صاحب! ہمارے ایک ملنے والے مالک رام تھے، خدا معلوم وہ آج کل کہاں ہیں! بھئی، کہیں سے ان کا کھوج نکال لیں اور ہر سکے، تو ان سے آجکل کے لیے مضمون حاصل کیجیے۔ عرش صاحب کو اس طرح کے پنجابی کا مونس کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ قصہ کرتا ہوں، انہوں نے پوچھنے سے مجھے ڈھونڈ نکالا۔

لاہور ۱۹۵۰ء میں میرا مصر سے عراقی تبادلہ ہو گیا، اور میں بغداد چلا گیا۔ یہاں ایک دن عرش صاحب کا خط ملا۔ اس میں اولاً کچھ اپنا، کچھ ”آجکل“ کا تعارف تھا۔ اور دیکھا تھا کہ جوش ملیح آبادی صاحب کی فرمائش پر یہ خط لکھ رہا ہوں، وہ سلام کہتے ہیں اور مضمون مانگتے ہیں۔ انسان کی نمود و نمائش کی خواہش فطری ہے۔ ہم لکھ بے نیازی اور استغنا کا اظہار کریں، لیکیں یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی شخص باری تعریف کرتا ہے یا ہمارے قول و فعل کو پسند کرتا ہو، تو اس سے ہمیں خوشی ہوتی ہے اور جذبات پسند اور غور و مینا ہو جاتے ہیں کہ ماشاء اللہ، ہم کئی کچھ ہیں۔ جب مجھے یہ خط ملا، تو حقیقتہً بہت خوشی ہوئی کہ اگرچہ دس بارہ برس سے جوش صاحب سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا، لیکن وہ مجھے بھولے نہیں۔ میں نے عرش صاحب کا شکر یہ ادا کیا، اور مضمون کا وعدہ کر لیا۔

ہمارے ایک دوست تھے، عبدالحمید حسرت شملوی۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، بہت اچھے اشعار و نثر بے محبت کے آدمی۔ وہ حکومت ہند کی پرانی سبیلیٹو اسمبلی میں مترجم کے عہدے پر فائز تھے کہ پچھلے عہدے پر بھی رہے۔ جس سے ان کا کمر کے نیچے کا حصہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا۔ مجبوراً انھیں قبل از وقت ملازمت سے دستبردار ہو کر پینشن لینا پڑی اس کے بعد اولاد توں موڈک (مدھیہ پردیش) میں قیام کے بعد وہ لاہور چلے گئے۔

پھر بعض خانگی مجبوریں کے باعث انھیں بالآخر پاکستانی جانا پڑا۔ وہیں ستمبر ۱۹۶۴ء

میں کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا واحد مشغلہ شعر گوئی اور احباب سے خط و کتابت رہ گیا تھا۔ میری ان سے قلمی ملاقات تھی ایک مجلس میں انھوں نے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک اردو کی سب سے بہترین کتابیں کونسی ہیں؟ یہ سوال دیکھنے میں مختصراً ہو، لیکن اس کا جواب اتنا آسان نہیں۔ طے ہر ہے کہ جب تک موضوع کا تعین نہ ہو، کتاب ان کی فہرست بنانا مشکل ہے۔ میں خود کر رہا تھا کہ ان کے سوال کا جواب کس نسخہ میں دوں کہ اسی زمانے میں خوش صاحب کا شمار اذنیہ خط ملا۔ اس پر میں نے خیال کیا کہ کیوں نہ ایک تیر سے دولٹا لے کیے جائیں۔ چنانچہ میں نے ایک مکتوب مضمون "میری پسند کی کتابیں" (اردو) کے عنوان سے لکھا۔ یہ "جھل" کے فردری ۱۹۵۱ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ میں نے اس میں نثر اردو کی تاریخ پر اچھٹی سی نظر ڈالتے ہوئے مختلف موضوعات کی ممتاز مطبوعات کا ذکر کیا، اور مضمون کے اخیر میں ایک سو کتابوں کی فہرست دے دی۔ یہ گویا حیرت کے سوال کا جواب تھا۔

میں جنوری ۱۹۵۲ء میں بھیجی پر دلی آیا۔ چونکہ "جھل" والوں سے تعارف ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ خوش ملیح آبادی دہلی میں، دو چار دن بعد فرصت ملنے پر میں پہلے سکر خانے گیا۔ جہاں میں اس زمانے میں "جھل" کا دفتر تھا، وہاں خوش صاحب اور اس کے علاوہ جتنے ناخند آزاد سے کبھی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں سے میں پہلی مرتبہ اسی دلی ملا تھا۔

دوسری ملاقات پر خوش صاحب نے مجھے اپنے مکان پر آنے کی دعوت دی۔ یہ اسی زمانے میں پرانے سکر خانے سے آگے تیار پور کے ایک سرکاری مکان میں مقیم تھے۔ حسب قرار میں انوار کے دن حاضر ہوا گھنٹی کی آواز سن کر خوش صاحب نکل آئے۔ ہم صحن میں داخل ہوئے، تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک صاحب کرسی پر دھوپ میں کرسی پر بیٹھے دھوپ اپ رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں حقے کی بواہ دوسرے میں کوئی کتاب جس کے مطالعے میں وہ محو تھے۔ ان کی پشت ہماری طرف تھی۔ سرخس نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: میرے والد صاحب ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر آداب عرض کیا

جوش ملیح

اور عرض نے میرا تعارف کرایا۔ جوش صاحب تحریر سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ سکرا کر ہاتھ تلایا درپاس کی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ یہ تھی ہماری پہلی ملاقات۔

یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ جب ہم کوئی کتاب پڑھتے ہیں یا نظم کا مجموعہ دیکھتے ہیں، تو غیر شعری طور پر مصنف کی ایک تصویر ہمارے ذہن کے پردے پر رستم ہو جاتی ہے۔ اگر بار بار اس شخص کی تصنیف دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہے، تو دل لے کر ساتھ یہ تصویر اور بھی بخیر ہو جاتی ہے، ورنہ اس کے بالعکس مدھم پڑتے پڑتے مٹ جاتی ہے۔ اگر کبھی بعد کو ہم مصنف سے دوچار ہو جائیں، تو یہ اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ جو ذہنی تصویر ہم اتنے دن لیے پھرے ہیں، وہ کس حد تک اصل کے مطابق یا اس کے مخالف تھی یا اب کے بھی رہی ہو۔ مثلاً جوش ملیحانی کا کلام پڑھتا آیا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ اجلاس کی مجلس میں کسی دوست نے ان کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس لیے میرے ذہن میں ان کا نقشہ ضرور موجود تھا۔ اب جو ملاقات ہوئی، اور میں نے انہیں اپنے سامنے دیکھا، تو واقعی کچھ تعجب سا ہوا۔ میرے سامنے ایک مختصر لیکن صمیم اور آدمی تھا، چھوٹا سا قدر، مشکل سے پانچ فٹ یا شاید اس سے کچھ ہی زیادہ؛ بھری بھری کڑواں ڈاڑھی جس پر بال خال خال سیاہ بال کھپتے، صاف ستھرا رنگ، نرم مزاج اور نرم گفتار۔ اور سب باتیں تو درست تھیں، لیکن میرے خیال میں انہیں اس سے کہیں بڑا ہونا چاہئے تھا۔

بات بہت شروع ہوئی، تو گویا دبستان کھل گیا۔ مختلف مشاعروں کی روداد سنائی۔ اپنے استاد بھلے ہوئے اور اساتذہ عصر کے قصے بیان کیے۔ داغ کے بعض فراگردوں سے میرے بھی مراسم ہیں۔ سائل صاحب، بیخود ملوی، احسن، ہر دی، نوح نامی کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل رہا ہو، بلکہ سائل صاحب سے تو میرے بہت قریب کے تعلقات تھے۔ چونکہ جوش صاحب ان اصحاب کے خواجہ تاش تھے، اس لیے وہ سب ان کی بہت عزت کرتے تھے، اگرچہ یہ عمر میں ان سے بہت چھوٹے تھے۔

میر سے اس قیام کے دوران میں شاید ایک اور ملاقات ہوئی۔ میری رخصت ختم ہوئی،

تو اس واپس چلا گیا۔ جوش ملیانی

اس کے بعد میں ۱۹۵۶ء کے ہوا میں وطن آیا۔ اب کے میرا تبادلہ ہوا تھا
 نتیجے میں یہاں کا طویل قیام لا بد تھا۔ چنانچہ میں یہاں تین برس سے کچھ
 ۱۹۵۸ء تک رہا۔ صبح معنوں میں میری پوری ملازمت کے دوران میں
 قیام طویل ترین رہا۔ اس زمانے میں مجھے ان تمام تعلقات کہ جو میری لمبائی
 کے باعث کچھ منقطع سے ہو گئے تھے۔ از سر نو بحال کرنے کا موقع ملا۔
 علاوہ کچھ نئے تعلقات قائم بھی ہوئے۔ اسی زمانے میں حضرت جوش ملیانی
 بھی اکثر نئے لے کا اتفاق ہوا، جب مجھے خود ان کے سوانح کی بیشتر تفصیلاً
 اور مختلف موضوعات اب کے بارے میں ان کے خیالات دریافت کرنے
 جیسا کہ ملیانی کی نسبت سے ظاہر ہے، حضرت جوش ضلع جالندھر
 ایک گاؤں ملیانی میں پیدا ہوئے۔ آج بھی یہ گورڈ یہ ہے۔ اس سے
 کہ اسی سال اُدھر جوش صاحب کے بچپن میں اس کی حالت کیا ہوگی!
 کہتے ہیں کہ اس زمانے میں پورے گاؤں میں شاید دھن آدمی ہی کسی قدر
 اپنی تعلیم کے اختتام تک تو یہ وہاں مقیم رہے، لیکن جب ملازمت کے
 نظر نہ خود کریں ہوا، جو ملیانی سے سات میل دور ایک قصبہ ہے، تو وہ
 مستقل سکونت نمود رہی میں اختیار کر لی اور آج تک وہیں کبھی ہیں
 وراثی مکان بھی تعمیر کر لیا ہے۔ ملیانی سے متعلق ان کا ایک منقطع ہے،

کیا ہو دگے جوشش انجم جا کر دہاں

ملیانی، اب بھی خراب آباد ہے

چونکہ ان کے اکلوتے صاحبزادے عرش دہلی میں رہتے ہیں، اس لیے جوش
 جب بھی ان کے پاس آتے، اطلاع لینے پر میں حاضر ہوتا۔ ان ملاقاتوں سے
 سے لطف اندوز اور علم سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ خود ان کی زندگی
 واقعات ان سے سننے میں آئے۔

جوش لمبانی
جوش صاحب کا کٹا "خود ساختہ" آدمی ہیں۔ ان کا خانان تعلیم کے پہلو سے تو عمارت
تھا ہی، مالی لحاظ سے بھی بہت نادار تھا۔ خوش قسمتی سے ان کی والدہ بہت حوصلہ مند
خاتون تھیں۔ انھوں نے ہر طرح کی کڑی تحصیل کرائیں۔ ابتدائی تعلیم دوائی۔ ان کا
حال انھوں نے خود سنایا تھا۔ جیسا کہ کہ چکا ہوں، جوش صاحب کا حکم بہت صحتمند
اور گنجلک ہے۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ ماشاء اللہ، آپ کی صحت اس عمر میں
بھی قابل رشک ہے، تو فرمایا: یہ ابتدائی محنت مشقت کی زندگی کا نتیجہ ہے۔
میں نے گیارہ برس کی عمر میں ملکین کا پرائمری اسکول ختم کر لیا تھا۔ اس کے بعد مزید
تعلیم کے لیے شاہ کورٹ کے وینکٹر ٹرل اسکول میں گیا، جو لسمان سے ساڑھے تین
میل دور ہے۔ گرمی، بجڑا۔ برسات — کوئی موسم ہو، میں روزانہ جانے لے
کے یہ برسات میں پیدل ملے کرتا تھا۔ یہ معمول تین برس تک رہا، یعنی جب تک میں
نے انھوں میں درجے کا امتحان پاس نہیں کر لیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحت تو ابھی ہونا
رہی چاہئے تھی۔ اس کے علاوہ حالات کی مجبور ری سے خوراک بھی ہمیشہ سادہ رہی۔
شراب نامرادو تو ایک طرف رہی میں نے کبھی چائے بھی نہیں پی، جیٹھا سا ڈھوس
بھی جب گرمی کا خواب ہوتا ہے میں نے کبھی برف استعمال نہیں کی، دہی کے سوا
اور کوئی فرنی یا تیز ذائقے کی چیز نہیں کھاتا، نہیں بھی نہیں پیتا۔ شاید اسی لیے
میرا صحت عموماً اچھی رہی ہے۔ اب بھی کہیں مجبور ری سے چھ سات میل پیدل
چلنے کی ضرورت پیش آجائے، تو مجھے کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

آج کل ہر لائینر شاعر اپنے آپ کو تلمینا الرحمن سمجھتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ شعر
اس پر براہ راست نازل ہوا ہے۔ (اس صحت میں اسے کسی استاد کے سامنے ناؤ
تلمذ کرنے یا ادبیانِ سخن کے حصول پڑھنے یا کسی سے پوچھنے یا حاصل کرنے کی کیا
ضرورت ہو انبیادی طور پر یہ خیال جتنا غلط ہے، اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت
نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ادب کی بیشتر ہرادی اور ادیبوں کی ادھرمکی
تخلیقات اکھاٹھوں کا نتیجہ ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ عروض داغما شکل علم ہے،

جوش ملیحانی

اور اس میں جہالت حاصل کرنے کے لیے کافی دواؤں کی ضرورت ہے۔ اور ہمارے نئے ادیب اگر بڑھ کر رہیں۔ بتم یہ ہے کہ کھسیانی ملی کھسیاؤں سے اپنی جہالت کو دور تلمذ اور عقل کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں نتیجہ معلوم! حضرت جوش کی عروض میں جہالت کے سبب قائل ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں آپ کھسائل کے لیے اپنے حالات قلمبند کیے تھے۔ ان میں بھی ان کی عروض سے متعلق بعض اشارے ملتے ہیں۔ ایک دن زبان اور فن کی بات ہو رہی تھی نے پوچھا آپ کو عروض کی طرف توجہ کیونکر ہوئی؟ فرمایا: مجھے بچپن ہی آسانی سے یاد ہو جاتا تھا۔ پوری کی پوری نظم اشعار کی اسی ترتیب سے مرتبہ پڑھنے کے بعد یاد دیتا تھا، اور اس کے لیے مجھے کسی خاص کوشش یا ہر ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ میں اکٹھوں درجے میں تھا کہ شعر گوئی کا د بیدار ہو گیا۔ اس درجے میں میرے استاد ادا جگت سنگھ سیدی صاحب شعر کہتے نہیں سکتے تھے لیکن ان کا ادبی ذوق بلند تھا اور وہ سخن فہم بھی خاص پڑھاتے وقت آسان بحر کے شعروں کی تقطیع بھی کر دیتے تھے۔ چونکہ میری تقی، اسی کے سہارے میں بھی آسان بحر کی تقطیع سیکھ گیا۔ ایک دن میرے شعر کی تقطیع ایک ہم جماعت کو بنا رہا تھا۔ اس نے تعجب سے پوچھا کہ کیا کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرا کہاں سے شروع ہوتا ہے اور اسے کہاں ختم کر میں نے جواب دیا کہ بات میں تجھے سمجھا نہیں سکتا، میری طبیعت ہی مجھے کہ ایک قول کہاں ختم ہو گا۔

سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اسی سے میرا فتنہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اگرچہ مجھے عروض کا باقاعدہ علم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، لیکن اس جوش بھی میری زبان سے نکلا، وہ بھی نامزدوں نہیں ہوا۔ خود ہی کہتا اور

کیوں اس بیت کا غزل

تو کے جنونی نالہ داد خواہ

عش لیا جاتا
 میں اس سے نطف لیتا، کیونکہ تعلیم تو کم تھی ہی، گھر کی سماجی حالت بھی جو تھی اس کے
 پیش نظر کسی اور کو مرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ غرض بعد کو جب جو نیرودیکل
 تعلیم کے لیے نارن اسکول پہنچا، تو میں نے عروض کی بعض کتابیں خاص طور پر مطالعہ
 کیں۔ پھر جیسے نیرودیکل کلاس کے لیے ٹریننگ کا لے، وہ پورے گیا، تو یہاں میرے
 استادوں میں ایک صاحب پنڈت رلام تھے۔ وہ ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔ وہ
 خود بھی اوسط درجے کے شاعر تھے، عروض بھی جانتے تھے۔ پہلے ہی دلی جمعہ جس
 کا سبق پڑھانے لگے، تو بحر متقارب سے ابتدا کی۔ فرمایا کہ شعر میں آٹھ بابوں میں آئے،
 تو اسے بحر متقارب مشن سالم کہتے ہیں۔ اس پر میں پوچھ بیٹھا کہ اگر کہیں ۶ ابا فوٹوں
 آجائے، تو اسے کیا کہیں گے؟ اس سوال پر وہ کچھ جبر بڑھوئے، لیکن بتایا کہ اس صورت
 میں اسے المضا عف کہتے ہیں۔ چونکہ جواب درست تھا، میں خاموش ہو گیا اب
 انھوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم نے سوال پوچھ تو لیا، لیکن کیا ۱۶ کئی شعر کہیں
 دیکھا بھی ہے؟ تمام ہم جماعتوں کی نظریں مجھ پر جمی تھیں اور انھیں یقین تھا کہ اب
 مجھے ہار ماننا پڑیگی لیکن میں نے نوراً جواب دیا: جی ہاں، دیکھا ہے۔ اور ذوق کا یہ
 شعر پڑھ دیا۔

تو تھا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مژدہ قسطن ہو
 یہی حق ہے، قابل اگر حق دلا دے، یہ سب تو ہے پاؤں چاں بخت ہو
 اس پر میرے ہم جماعت دم بخود امداد بخت جی مطمئن ہو گئے۔ اب انھوں نے درجے
 کے دوسرے طلبہ سے متقارب مشن سالم کی مثال طلب کی۔ جب کوئی جواب نہ دے
 سکا، تو مجھ سے فرمایا کہ تم نے شانزدہ کئی کی مثال دی تھی، اب آٹھ کئی کی بھی سناؤ۔
 اس پر میں نے حالی کا یہ مطلع پڑھا۔

بڑھاؤ نہ آپس میں قلت زیادہ
 مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
 اس کے بعد بھی دو ایک مرتبہ اور اسی طرح کا واقعہ پیش آیا، تو انھوں نے مجھے اجازت

دعہ دی کہ عروض کے سبق میں میری حاضری ضروری نہیں ہے بچا ہوں، تو آؤں
چاہوں نہ آؤں۔

اس کے بعد خاموش ہو گئے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فرمایا، اس پر ایک اور واقعہ
یاد آگیا۔ ایک دن اپنا کلام سنا رہے تھے۔ قوی رنگ کی نظم تھی۔ اس میں شعر
پڑھا:

زور ہے یہ ترو جو رکی، رد کے سے کہ کب کی

ہٹ جاؤ، یاں حقیقت ہو کیا گھاٹا سچ کس کی!

اس پر میں نے مؤذبانہ عرض کی کہ دوسرے مصرعے میں حقیقت کی تے، تقطیع سے غایہ
ہو گئی ہے، مصرعہ حقیقہ پیر پڑھنے سے موزوں ہوتا ہے اس پر پوچھا: بھلا میر کیا
بجھ رہے، اور اس کی تقطیع کیا ہے؟ میں نے جواب میں کہا: یہ بحر مضارع مشن خب
مکھوف ہے اور اس کے ارکان تقطیع ہیں: مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن۔
میرے یہ کہتے پر سب کو بہت حیرت ہوئی۔ پنڈت جی نے اس پر مصرعے کی خود
تقطیع کی، تو انھیں معلوم ہو گیا کہ واقعی حقیقت کی تے تقطیع سے باہر رہ گئی ہے
اس کے بعد وہ ہمیشہ میرے تلامذہ رہے۔

فرض جب بھی حضرت جوش سے ملاقات ہوئی، اسی طرح کا کوئی علمی ادبی مسئلہ طر
جاتا۔ ایک دن شعر گوئی کی بات ہونے لگی۔ مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کو ادباً تو
شعر سے اتنا شغف ہے، تو یقین ہے کہ آپ خود بھی ضرور کہتے ہونگے۔ میں نے
عرض کیا کہ میں نے کسی دانے میں چار غزلیں کبھی نہیں، لیکن اب ان کا
کوئی شعر حافظے میں محفوظ نہیں ہے۔ مدت ہوئی وہ کوچر چھوٹ گیا، اس کے
بعد ساری توجہ نثر پر مرکوز رہی۔ اور میں واقعی خوش ہوں کہ میں نے اپنا
وقت ضائع نہیں کیا۔ مسکرا کے چپ ہو رہے۔

اب میری باری تھی۔ میں نے پوچھا کہ بھلا، آپ کو شاعری کا حقوق کیونکر پیدا
ہوا؟ فرمایا کہ ہمارے اٹھویں دہے کے نصاب اردو میں ذوق کا کچھ کلام

بھی تھا۔ اس کا بیشتر حصہ مجھے زبانی یاد تھا۔ میرے استاد، خدا بخش، شعر کے
 رسیا آتے تھے ہی، فرصت کے اوقات میں مجھ سے وہی کی یہ غزلیں سنا کرتے تھے۔
 انھیں بار بار پڑھنے سے خود میری طبیعت غزل کی طرف مائل ہونے لگی۔ بعد کی
 تعلیم نے اس میلان کو چلا بخشی۔ یہ بات بھی تھی کہ اب میری عمر ۷۰ سال کی ہو گئی
 تھی۔ اس بلوغ میں غزل کے مضامین کی کشش کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ
 میں نے چند کوئی دھوٹی غزلیں کہیں۔ اس لئے کہ دین شعر آج بھی یاد ہیں۔
 مثلاً :-

وعدہ وصل پہ کیونکر ہوتی مجھ کو
 کوئی اقرار نہ ثابت ہوا سچا تیرا

جان کلی بھی تو کچے میں حد کے نکلی
 ہائے افسوس، کہ مرزا بھی نہ آیا مجھ کو!

جس زمانے میں وکٹر ہائی اسکول، جالندھر میں ملازم تھا، یہاں بعض اصحابِ ذوق
 کی صحبت میں آئی۔ وہ میرا طام سنتے، تو اچھے شعر کی داد دیتے۔ اس سے میرے
 ادبی ذوق کی تربیت ہوئی اور کلام کے حسن و قبح کا شعور پیدا ہوا۔ یہیں ایک
 دن کہیں سے نسیم بھوتوری کا دیوان میرے ہاتھ لگ گیا۔ نسیم، حبیب کہ آپ کو معلوم
 ہوگا، داغ کے امور شاگرد تھے۔ میں نے ان سے خط و کتابت شروع کر دی۔ جب
 کبھی زبانی یا فن سے متعلق کوئی بات پوچھنے کی ہوتی، میں ان سے دریافت کرتا اور
 وہ لطفِ جواب عطا فرماتے۔ یہ سلسلہ کوئی سال بھر رہا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ انھوں
 نے میرے اس شعر کی بھرپور داد دی تھی :-

نہیں ہے تابِ عالم کہ بیانِ سوزِ مہیاں کی
 ہمارے عشق کا دنیا میں چوچا ہو نہیں سکتا

انھیں تاہم میں کسی جگہ میں نے لکھنؤ کا گلدستہِ پیام یاد دیکھا۔ میں اسے منگوانے لگا

جو شریانی

اس میں حضرت داغ، امیر مینائی، جلال کھنوی، شمس الدکھنوی، ریاض، بیجو،
استادہ وقت کا طرحی کلام شائع ہوتا تھا۔ میں بھی اس میں طرح پر اپنا کلام بھیج
لگا۔ اگرچہ میری غزل کے دو میں شعر ہی انتخاب میں آتے تھے، لیکن میں اس پر مطمئن
اور خوش تھا۔ اور جو شعر انتخاب میں نہیں آتے تھے، مجھے ان پر غور کرنے کا موقع
ملتا کہ آخر یہ کیوں اشاعت کے قابل نہیں سمجھے گئے۔

اب میں خاموش تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے اداان باضی کے دروازے کھل گئے ہیں،
ادمان کی یادداشتیں ایک ایک کر کے باہر نکل رہی ہیں۔ اب انھیں میرے قلم کی ضرورت
نہیں تھی چنانچہ فرمایا:

پیام یاد، میں حضرت داغ کا کلام مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اپنے
کلام پر ان سے اصلاح لینا چاہیے۔ لیکن ان کی رسائی کیسے ہو! اندیشہ تھا کہ ممکن
ہے، وہ میری درخواست منظور نہ فرمائیں۔ اس کے لیے میں نے جناب نسیم بھرتوری کو
واسطہ بنایا۔ انھوں نے لکھا کہ اپنی غزل میرے پاس بھیج دو۔ یہ انھوں نے اپنے
سفارشی خط کے ساتھ استاد کی خدمت میں حیدر آباد روانہ کر دی۔ یہ ۱۹۰۲ء کے آغاز
کا قصہ ہے۔ بارے حضرت داغ نے مجھے اپنی شائردگی میں قبول فرمایا۔ پہلی غزل جو
میں نے اصلاح کے لیے استاد کی خدمت میں پیش کی تھی، اس کا مطلع تھا،

بندہ جہر لب ہوں میں قضا خواں تیرا

دل میں رکھتا ہوں مقفل غم نہ ہاں تیرا

اصلاح کا یہ تعلق کوئی تین برس یعنی ۱۹۰۴ء کے اخیر تک جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء کے شروع
میں وہ رحلت فرما گئے اور یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے
کسی سے مشورہ نہیں کیا، اپنی طبیعت ہی کو رہنما بنا کر کہتا رہا۔

پھر کہنے لگے، میں نے اپنے کلام پر استاد کی اصلاحیں سننے پہلے دیوان "بادہ سر جوش"
میں درج کر دی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور اصلاح یاد آگئی ہے بشعرتھا،
جوہر پر آیا مرادل، نہ پری پر آیا۔ پر جوں پر نہیں معلوم کہ کیونکر آیا

جوش میانی

استاد نے دوسرے مصرعے کا پہلا لفظ بدلتی کر اس کی جگہ "ان" بنا دیا یعنی

الانہوں پر نہیں معلوم کہ کیونکر آیا

اس اصلاح سے مصرعے کو چار چاند لگ گئے اور اس میں محاکاتی پہلو بھی پیدا ہو گیا۔ یوں بھی "پر" بمعنی "لیکن" متروک تھا، اس لیے اسے خارج ہونا ہی چاہیے تھا۔

حضرت جوش نے اپنے دیوان "جنونی ہوش" کے شروع میں اپنے کلام کو الوداع کے عنوان سے ایک نظم شامل کی ہے، جس میں دو دو شعر کے ہم قطعاً ہیں ان میں ایک قطع ہے:

یاد رکھنا تم جنابِ داغ کے احسان کو یاد رکھنا اس جہاں استاد کے فیضان کو
یاد رکھنا اہل فن کی امتیازی شان کو یاد رکھنا اپنے متروکات کے میلان کو
جب انھوں نے کہا کہ "پر" بمعنی "لیکن" متروک ہے، تو مجھے یہ بند یاد آگیا۔ نیز یہ کہ انھوں نے "جنونی ہوش" کے شروع میں اپنے متروکات کی طویل فہرست شامل کی ہے۔ اس پر میں نے سوال کیا کہ آپ نے اپنے متروکات کے ۷۰ سے اوپر عنوان دیے ہیں، یہ کس اصول پر مبنی ہیں؟ کہیں اس سے آپ زبان کا دائرہ محدود تو نہیں کر رہے ہیں؟ اس پر فرمایا کہ میں فارسی اور ہندی کو غلط ملط کرنے کے خلاف ہوں۔ ہندی اپنی جگہ ہے، فارسی اپنی جگہ، ہمیں انھیں الگ الگ رکھنا چاہیے۔

میں نے اس وقت بات بڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، اور خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن یہ اصول ہر جگہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اگر اس پر سختی سے عمل کیا گیا، تو ہمیں کئی لفظ زبان سے خارج کرنا پڑینگے، جو اس وقت زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ مثلاً سمجھدار، میز پرکش، چھردانی، ناخدا وغیرہ۔ اس اصول کی نوبت یہ سب لفظ غلط ہیں اور ہمیں انھیں زبان سے خارج کر دینا چاہیے۔ اور اب آگے ایسے نئے لفظ تو بنائے ہی نہیں جاسکتے جن کا ایک جزو ہندی ہو اور دوسرا

چشم لیاقت
 کا، اسی یا عربی۔ اس سے زبان کو جو نقصان پہنچا، اس میں شبہ ہو سکتا ہے؛
 ترقی پذیر زبان کی خوبی یہ ہے کہ وہ جہاں سے کچھ لے سکتی ہے، اسے لینے میں
 دریغ نہ کرے، نہ صرف بلکہ دوسری زبان کا کوئی لفظ اپنا کر اسے جیسا چاہے،
 اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لے۔ میں انشا کا یہ اصول اردو زبان کے دستور
 کا بنیادی پتھر سمجھنا چاہیے کہ جو لفظ بھی اردو میں رائج ہو گیا، وہ اپنی اصل میں
 عربی ہو یا فارسی یا ترکی یا کسی اور زبان کا؛ اپنی اصل میں وہ صحیح تھا یا غلط،
 ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ سہادہ اردو کا لفظ ہے، اب ہم اس کے صحیح یا غلط
 ہونے کا فیصلہ اردو کے اصولوں کے مطابق کریں گے۔ یہ اصول بہت محقول اور مفید
 اور معتددا ہے اور ہمیں اسی پر قائم رہنا چاہیے۔

حضرت جوش، جیسا کہ بیان ہوا، داغ و بھلو کی شاگرد ہیں۔ داغ کے کلام کی خصوصیت
 کسی سے مخفی نہیں۔ زبان بر قدرت، اور مرثیہ میں جہارت، محبوب سے خطیر چھاڑ
 چو پھلا پن، معاملہ بندی، محاکات۔ ان کے کلام کے اجودانے تکبھی ہیں۔ ان کے
 شاگردوں میں سے کبھی بیشتر زبان کے پہلو سے ان کے متبع رہے، اور ان کی تعداد کچھ
 کم نہیں ہے۔ زبان کا چھتر چھاڑ، ٹکاوٹ، چو پھلا پن کا انداز تو ایک آدھ کو چھوڑ
 کوئی اس عیدان میں ان کا حریف نہ ہو سکا۔ دراصل یہ ممکن بھی نہیں تھا۔

داغ و بھلو میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ دیر ہیگم (عرف چھوٹی بیگم) نے جب
 بہادر شاہ ظفر کے بیٹے محمد غلام فخر الدین (عرف مرزا فخر) سے نکاح کر لیا، تو یہ
 بھی ان کے ساتھ قلعہ معلیٰ میں آٹھ گئے، قیمت نے یاد رکھی، یہاں سے راجپور
 پہنچ گئے۔ پھر خدو کے کچھ بعد مستقل راجپور میں ملازمت مل گئی۔ قلعہ معلیٰ کی
 زبان اور خاص طور پر خاندان شاہی کی خدمات اور مستورات کی زبان، اور
 علیٰ زور کا مضمون ہو گیا۔ جب داغ کو بچپن میں وہاں رہنے اور ان سے بات چیت
 کرنے کا موقع ملا، تو انہیں زبان اور وہ مرثیہ قدرت حاصل ہو نا ہی چاہیے تھی۔
 لیکن اسی کے ساتھ یہ کبھی حقیقت ہے کہ اس آخری وہ کمال قلعہ اخلاق بہی

جوش بلیاں

انتہائی درجے پر پہنچ چکا تھا۔ لہی اور پردہ لہی موزوں نے اس زمانے کے جو حالات کچھ ہیں، وہ ناگفتہ بہ ہیں۔ داغ نے شعور کی آنکھیں کھولیں، تو اس ماحول میں جہاں جنس کا انتہائی گھناؤنا دور دورہ تھا۔ فقر و پامیں وہ کر دامن زدہ کرنا داغ کے بس کی بات نہیں تھی، یہی ان کا مزاج بھگیا اور اس کا ان کی شاعری پر بھی اثر پڑا۔ رہا سہی کسر راہ سود اور حیدر آباد کی ملازمت اور وہاں کے طویل قیام نے پوری کر دی۔

اس پس منظر میں داغ کے کلام کی یہ خصوصیات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں، اور ان کے کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ کم و بیش ان کے ذاتی تجربات ہیں۔ لیکن ان کے شاگردوں میں کون تھا جو ان تجربات سے محروم تھا؟ پس اگر یہ رنگ داغ ہی تک رہا اور انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا، اور اس میں اتنا شائد کون ان کا متبع اور بانٹیں نہ ہو سکا، تو یہ بالکل حقیقی بات ہے!

یوں تو ملک کے دوسرے حصوں کی طرح پنجاب میں بھی داغ کے شاگردوں کی کمی نہیں تھی، لیکن ان میں سے تین نے خاص شہرت حاصل کی۔ یہ ہیں: اقبال، ظفر علی خان جو جس لمبیائی۔ اقبال نے ابتدا میں غزلیں کہیں، اور بلیک اس زمانے میں انھوں نے بہت حد تک داغ کی زبان و بیان کا متبع کیا۔ لیکن جلد ہی وہ یہ میدان چھوڑ گئے اور فلسفے اور مذہبیات کی طرف چلے گئے۔ اس میدان میں انھوں نے جو کامیابی حاصل کی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن بہر حال یہ بھی صحیح ہے کہ وہ کسی پہلے سے داغ کے شاگرد یا مارت یا نام لیا نہیں کہے جاسکتے۔

ظفر علی خان نے ابتدا میں غزل بھی جو تو میرے علم میں نہیں۔ بعد کے انھوں نے اپنے آپ کو صرف نظم اور وہ کھن صوفی اور ہنگامی نظموں کے لیے وقف کر دیا۔ اور اس صنف کلام میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ فی البدیہہ اور ارجحاً نظم کہنا ان پر ختم ہو گیا۔ غلیف کے کہ بادشاہ تھے۔ مشکل سے مشکل زمین میں انھوں نے وہ گل بونے گائے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اکبر آبادی کا اس پہلو سے شہرہ سجادہ

بچا، لیکن وہ ایک آدمی جو شعر کہہ کر مر جاتا ہے جس کے بالعکس ظور علی خاں لمبی لمبی
 قطیں بکھتے ہیں باور کہیں شکستگی اور حسرتی کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔
 رہی زبان! تو زبان کی صفت میں وہ اقبال سے زیادہ مستند ہیں۔ بڑے سے بڑا
 ناخود باہی کہیں ان کے کلام میں اگلی نہیں رکھ سکتا۔

جوش ملیح آبادی نے کوئی پیغام نہیں اپنایا، فلسفہ نہیں بگھارا، صاف کا پیشہ
 نہیں اختیار کیا۔ اگرچہ انھوں نے قصیدے کے علاوہ اور تمام اصناف سخن میں
 کہا ہے، لیکن ان کے کلام کا مقصد بہ جملہ غزل پر مشتمل ہے۔ اور اس میں انھوں نے
 جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کا اعتراف بڑے بڑے سخت گیر نقادان فن و سخن
 نے بھی کیا ہے۔ تعجب تو اس کے پنجاب کے ایک کورویہ میں پیدا ہونے والا ایک
 شخص جس نے پنجاب سے باہر بھی قدم نہیں رکھا تھا، جسے اساتذہ فنی اور ادبی
 کی صحبت بھی نہ ہونے کے برابر نصیب ہوئی، کیونکر یہ درجہ کمال حاصل کر سکا
 اور تو اور انھیں داغ سے استفادے کا موقع بھی بہت کم ملا۔ جوش صاحب فردی
 ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں شاعری شروع کی۔ ۱۹۰۲ء کے شروع
 میں انھوں نے داغ کی شاگردی اختیار کی۔ فردی ۱۹۰۵ء میں داغ کے شاگرد
 ہو گئے۔ دونوں کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ انھوں نے خط و کتابت سے اصلاح
 لی، اور اس کی مدت بھی ملے دے کے صرف تین برس کے قریب ہے۔

واقعی بجا طور پر حیرت ہوتی ہے کہ جوش کو اگر زبان پر ایسی قدرت حاصل ہوئی،
 تو کیونکر! خدا بخشندہ کی ودیعت کی ہوئی سعادت سے انکار نہیں ہو سکتا۔
 لیکن اس میں جوش صاحب کو جتنا زور و بار صرف کرنا پڑا، چھوٹا، اس کا اندازہ
 کون کر سکتا ہے! زبان کے علاوہ ان کی عرصہ میں جہالت بھی کامل اور راستہ
 ہے، اور یہ محض ان کی ذاتی حدود و حدود محنت کا ثمر ہے۔

وہ اسی وقت داغ کے سینکڑوں شاگردوں کے آئینہ نما ہیں۔ پنجاب میں
 وہ انہی کا سیکہ اور شاہ ہیں۔ شاعری کا رنگ بدل گیا، لوگوں کی پسند

جوش میانی

ہاں پسند کا معیار بدل گیا ، دباں کہ جس انقلابی دور سے گزر رہی ہے ۔ اس
یہ امید نہیں کہ ان کا معیار کوئی اور شاعر اب پیدا ہو سکے ۔

چند خطوط

استاد عجم قبلہ جو شش لمبائی سے میری خط و کتابت ۳۵ - ۴۰ سال سے ہے۔ مجھے بھیرافوس اور دلتی ہے کہ میں نے موصوفی کے بہت سے خطوط پڑھیں ضائع کر دیے۔ کچھ تو تقسیم وطن کے بہ مجھے اپنے معاملات کی وجہ سے شہر بدر ہونا پڑا یہ طولانی قصہ ہے اور اس میں میرے شباب کی ننگین کاریوں کو بڑا دخل ہے۔ لیجو پڑکا تیر کچھ ایسا شست پر چلا کہ میں دنیا و مافیہا کو بھول گیا، خطوط کہاں یاد رہتے پہلی زندگی ہی گم ہو گئی۔ آخر جابے اماں ملی، تو میں کاپڑوں کے لمبے رسائے چند دن "جاد" کیا۔ زلیخا کا میرے ساتھ تھا۔ جلد ہی اس نے بھی دم توڑ دیا۔ پھر دلی آیا تو پرانے رفیق کنور ہند رنگہ بیدی صاحب مل گئے۔ ان سے وابستہ ہوا، تو یہ سمجھ لیجیے کہ پھر دلتی نہ چھوٹی۔

یہاں سے پھر قبلہ کے ساتھ مراسلت شروع ہوئی۔ کلام پر اصلاحات کے غور سے تو "آئینہ اصلاح" میں درج ہیں۔ پرانے خطوط میں سے مجھے ایک خط کے ضائع ہونے کا خاص افسوس ہے اس میں آموں کی رسید کے طور پر ان کی ایک مشہور رباعی تھی، جو قبلہ کے دیوان ادل میں طبع بھی ہوئی ہے اور اب تک احباب کی زبان پر ہے:

میں گوشہ نشین ہو کے بھی گنہام نہیں میخانہ شہرت میں بھی حساب نہیں
ساحر نے بھی اقیانوس سے کام لیا بھیجے ہیں جو آم خاص ہیں عام نہیں
اس رباعی سے میرے اپنے باغ کے آم تو ایک طرف میں خود غنمہ جاوید ہو گیا۔ بعد کے

کچھ غلطیاں تحریر کے خاص نمبر کے لیے پیش کرتا ہوں۔

خط نمبر ۲۰ تو عام خط ہیں ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمبر ۲ میں میری پریشانیوں سے قبل خود پریشان نظر آتے ہیں۔ غزلوں کی اصلاح بھی موجود ہے۔ نمبر ۴ میں بھی ایک شعر کی اصلاح مکرر ہے جو لا جواب ہو۔ نمبر ۵ میں دلشاد کی مینوشی کا ذکر ہے تخت ہمارے کے بعد جب شاد کی جان بچ گئی، تو اس نے پھر مینا شروع کر دی تھی۔ خط نمبر ۶ میں "بلند" کے مترادف کا ذکر ہے، جہاں آپ نے اپنے عزیز شاگرد ہما سرنالوی کو بھٹکے دیکھا۔ اردی نے اسے جرمیں خود میں خود بھی شامل تھا، پانی ملائے بغیر پلا دی تھی۔ مجھے بھی قبلہ نے سرکش کا خط دکھا تھا۔ خط، میں میری اور ہما کی معذرت کا ذکر ہے۔ خط نمبر ۷ میں حکومت پنجاب کی طرف سے ادیب اعلیٰ کے انعام اور صلحت پانے کا ذکر ہے۔ یہ انعام سب سے پہلے پنجاب میں آپ کو ملا تھا، حال آنکہ بعض بہو غلط حاسد خود غرضی کی بنا پر اپنے لیے کوشش کرتے رہے اور قبلہ کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ نمبر ۸ میں علالت طبع کا ذکر ہے اور ساتھ ہی حکم گورداس پوری مرحوم کی ایک تنقید کا بھی جو انھوں نے قبلہ کی غزل پر کی تھی۔ حکم صاحب کو صحیح شعر لکھنے پر بھی قدرت حاصل نہیں تھی۔ یہاں بھی پردہ زنگاری میں کوئی مستحق تھا۔

میں ایک زسلاے ماہ نو، کا اڈیٹر تھا۔ اس کیلئے قبلہ نے "پرانی یادیں" مضمون میرے ایما پر لکھا۔ وہ رسالہ بھی جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ اس میں مضمون کی شاید تین یا چار قسطیں شائع ہوئی تھیں۔

خط نمبر ۱۱ اور ۱۲ میں ایک فی البدیہہ مطلع کا ذکر ہے، جو قبلہ نے کہا تو تھا، لیکن ان کے حافظ میں محفوظ نہیں رہا تھا۔ چونکہ میں پوچھا بھی کیا کرتا ہوں اسی لیے میری مینوشی اور پوچھنے کے بعد کو دیکھ کر آپ نے مطلع کہا:

ساحر کا یہ تعنا د بھی کیا لا جو اب ہے پوچھنے کے ساتھ ساتھ میں بجا م شربت بعد کو جگر جانندھری نے تصدیق کر دی تو قبلہ کو بھی یاد آ گیا۔

نمبر ۱۳۔ ۱۴ اور ۱۵ میں مخطوطوں میں میری ایک غزل کی طرف اشارہ ہے، جس کی لاف

شواہد کی بنا پر جرنا پالی ہی کو اس تہذیب کا سب سے شمالی نقطہ تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ اگرچہ محکمہ اثریات نے زیادہ تر ملک کے ماقبل تاریخ دور اور خاص کر تاریک عہد سے (جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ ہو چکا ہے) متعلق معلومات کے حصول کو اپنی توجہات کا مرکز قرار دیا ہے۔ تاہم تاریخی عہد کی طرف سے بھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ ادھر تاریخی عہد کے بارے میں بھی متعدد کھدائیاں ہوئی ہیں، جن کی مختصر فہرست یہ ہے: اڑیسہ میں رتساگری، اودے گیری، جوگڈا اور شیٹوپال گرٹھ؛ بہار میں انٹی چپک؛ مغربی بنگال میں تالوک، چندر کیو گرٹھ اور بن گرٹھ؛ گجرات میں شالاجی، دینی موری، بڑودہ؛ اتر پردیش میں کوسامبی، (ڈیرو دون کے قریب) جگت گرام؛ راجستھان میں ٹنگلی؛ ہاراشٹر میں کندن پور اور پاؤنی۔ ان مقامات کی کھدائیں سے بڑے بودھی علمی اور مذہبی اداروں کے وجود کا پتا چلا ہے۔ مثلاً ناگارجن کسٹھ میں جس کی کھدائی کا اوپر ذکر ہوا ہے، نہایت اہم اور محرکہ آراء و بافتیں ہوئی ہیں۔ یہاں نہ صرف مختلف بودھی آثار بینقاب ہوئے، بلکہ انھیں وہاں سے ہٹا کر ناگارجن پہاڑی اور ناگارجن ساگر کی مصنوعی جھیل کے کناروں پر منتقل کر کے ان کی اصلی حالت میں رکھا گیا ہے۔ ان آثار میں کئی استوپ، خانقاہوں، مندروں، نہانے کے گھاٹ، جنمانی و دیش کے میدان، اکشوا کو راجاؤں کا دارالعلوم اور ہندو آثار میں پشپ بھدراوی سرود پو اور کارنگیہ وغیرہ کے مندروں اور شادی گیسے کی قربان گاہ کے نشان ملے ہیں۔ یہاں کے آثار میں ایک اور اہم دریافت مہو د تماشا ہے۔

کی ہے، جو ملک بھر میں اپنی نوعیت کا ایک ہی ایسا مقام ہے۔ ان کے علاوہ ایسی بیشمار مورتیاں اور کتبے ملے ہیں، جن سے جنوبی ہند کی اس عہد کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کے کئی پہلو اجاگر ہو گئے ہیں۔

اسی طرح مذکورہ بالا حکمت گزشتہ سے بھی اس اثر میدہ گئیہ کے آثار ملے ہیں، جو تیسری صدی عیسوی میں راجا سیلورمن نے کٹی بار کیا تھا۔ کو سامبی سے مہاتما بدھ کے زمانہ (۱۰۰۰ قبل مسیح) تا پانچویں صدی قبل از مسیح کے اور بعد کے اہم آثار برآمد ہوئے ہیں یہاں سے جو کچھ ملے ہیں ان سے اس جگہ کا جہاں مہاتما بدھ نے یہاں کے سفر کے دوران میں قیام کیا تھا، محلّی و ذریعہ شغلیں

کچھ خطوط۔ تحریر کے خاص نمبر کے لیے پیش کرتا ہوں۔

خط نمبر ۱۔ ۲۰ عام خط ہیں ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمبر ۳ میں میری پریشانیوں سے قبلہ خود پریشان نظر آتے ہیں۔ غزلوں کی اصلاح بھی موجود ہے۔ نمبر ۴ میں بھی ایک مصرعے کی اصلاح کرتے ہیں جو لاجواب ہو۔ نمبر ۵ میں دلشاد کی مینوشی کا ذکر ہے سخت بار بار نے کے بعد جب شاد کی جان بچ گئی، تو اس نے پھر مینا شروع کر دی تھی۔ خط نمبر ۶ میں بھٹنڈہ کے مشاعرے کا ذکر ہے، جہاں آپ نے اپنے عزیز شاگرد ہما ہرنانوی کو بکھتے دیکھا۔ اور نے اسے جن میں خود میں خود بھی شامل تھا، پانی ملائے بغیر ملا دی تھی۔ مجھے بھی قبلہ نے شرف کاحط دکھا تھا۔ خط ۷ میں میری ادراہا کی معذرت کا ذکر ہے۔ خط نمبر ۸ میں حکومت پنجاب کی طرف سے ادیب اعلیٰ کے انعام اور خلعت پانے کا ذکر ہے۔ یہ انعام سب سے پہلے پنجاب میں آپ کو ملا تھا، حالانکہ بعض پر غلط حاسد خود غرضی کی بنا پر اپنے لیے کو بخش کرتے رہے اور قبلہ کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ نمبر ۹ میں علالت طبع کا ذکر ہے اور ساتھ ہی حکم گورداس پوری مرحوم کی ایک تنقید کا بھی جو انھوں نے قبلہ کی غزل پر کی تھی۔ حکم صاحب کو صحیح شعر کہنے پر بھی تدرت حاصل نہیں تھی۔ یہاں بھی پردہ انگاری میں کوئی معشوق تھا۔

میں ایک زمرہ لایا وہ نو کا اڈیٹر تھا۔ اس کیلئے قبلہ نے "پرانی یادیں" مضمون میرے ایما پر لکھا۔ وہ رسالہ بھی جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ اس میں مضمون کی شاید تین یا چار خطیں مشالچ ہوئی تھیں۔

خط نمبر ۱۱ اور ۱۲ میں ایک فی البدیہہ مطلع کا ذکر ہے، جو قبلہ نے کہا تو تھا، لیکن ان کے حافظے میں محفوظ نہیں رہا تھا۔ چونکہ میں پوچھا بھی کیا کرتا ہوں اسی لیے میری مینوشی اور پوچھا کے تضاد کو دیکھ کر آپ نے مطلع کہا:

سازگار یہ تھا دہی کیا لاجواب ہے پوچھا کے ساتھ ساتھ میں جام شراب ہے بعد کو جگر جانندہ ہری نے تصدیق کر دی تو قبلہ کو بھی یاد آ گیا۔

نمبر ۱۳۔ ۱۴ اور ۱۵ میں میری ایک غزل کی طرف اشارہ ہے، جس کی لاف

پہنچا
 سانپ ہے۔ قبلہ نے خود بھی اس زمین میں ایک غول بھی جس میں اشعار میں بھی
 قبلہ اپنے عزیزوں کو داد دینے میں نہیں سے کام نہیں لیتے۔ ان کی شرافت نفس کا
 لاہر اویس سلج ہے۔ ایسے مرخان مرغ بزرگ اس دور میں غنیمت ہیں۔ ہم ان
 بھی دیکھتے ہیں جو ان کے قدموں میں بیٹھنے کے بھی لائق نہیں، لیکن نکمے نے ان
 آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ علم فیض کی اس بڑی اعانت اور کیا ہوگی! مجھے خود
 ان کے دامن فیض سے ایک زمانے سے وابستہ ہوں۔ جب دلی میں جشنِ ساحر
 میں نے مشقین سے صاف کہہ دیا تھا کہ پہلے میرے استاد محترم کی عزت افزائی
 اس عزت کو قبول کر دگا۔ چنانچہ پہلے سپاسنامہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا
 انھیں کا بنایا ہوا ہوں۔ اور وہ خود فرماتے تھے کہ ساحر کی عزت خود میری عزت
 خدا انھیں تادیر ہمارے سردار پر سلامت رکھے۔ اس وقت وہ فصیح الکلام دانش
 واحد شاگرد ہیں۔

نکودر ضلع جالندھر

۱۱ اپریل ۱۹۵۱ء

اخلاص پرور محبی صاحب زادہ لطفہ

محبت نامہ سے بہت مسرت ہوئی۔ ہوشیار پور آنے کا ارادہ پھر نکودر آنے کا وعدہ خودہ جانفزا سے کم نہیں۔ خدا کرے یہ آمیزشگو امتداد کا ہمیشہ خیمہ موسیل معاش اور بات ہو ورنہ میں تو آپ کو پشاور پور ہی میں دیکھنے کا تمنا ہی ہوں۔ قسمت کا پھیر ہے، جو آپ کو سا لہاسا سے ادھر ادھر لیے پھرتا ہے اس مضمون پر میری تازہ غزل کا ایک شعر سن لیں:

دہرے آنکھ میں بھیجی دل سے نکل کر آنسو

جا بجا ان کو لیے پھرتا ہے دانا پانی

پانی کی ردیف میں یہ نزل بھی ہے جن باتفاق ہے کہ یہ شعر آپ کے حالات پر بھی چسپاں ہو گیا۔

غزلیات ضروری اصلاح کے بعد احوال کر رہا ہوں۔

زمنہ باش کی دعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ عزیز عارف دہلی میں خیر ہوئے ہیں۔ میں اس سال سے بی اے کے پڑھنے اور لکھا بیٹا اگزمینز ہوں۔ اس لیے اخیر مئی تک کہیں باہر جانے کا ارمان نہیں ہو سکتا۔ آپ کے نگوہ آنے کا وعدہ بھی مجھے اس مصرع کی یاد دلا رہا ہے

وہ وعدہ ہی کیا مجھ کو دف ہو گیا

جوش ملیانی

نکودر

۲۷ نومبر ۱۹۵۱ء

اخلاص پرور ساحر صاحب زاد لطف!

مسودہ دیکھ چکا ہوں۔ والدہ عرض چارپانچ دن تک دہلی کے لیے روانہ ہو گئی۔ ان کے ہاتھ ارسال کر دوں گا۔ آپ عرش سے مسودہ حاصل کر سکیں گے۔

یہ سن کر آپ خوش و خفا ہو گئے کہ ایک اور ساحر جی اے جالندھر سکرٹریٹ کے ملازم آپ کی جماعت میں شامل ہوئے ہیں۔ پہلے دوشا کرتے تھے۔ ایک دنیا چھوٹا گئے۔ خدا کرے کہ یہ دوسرا حرمی دنیا تک رہیں۔

زیادہ خلوص

۳

نکودر

یکم نومبر ۱۹۵۲ء

سعادت اطوار ساحر زاد لطف!

محبت نامہ پہنچا۔ میں ۱۱۔۱۲ نومبر تک دہلی پہنچ چکا۔ ہوشیار پور اب غیر ادبی علاقہ بن چکا ہے۔ حال آنکہ ٹانڈا سراسر غیر ادبی خطہ تھا، مگر وہاں کے گورنمنٹ کالج میں چوں دو پرچہ شاعری ذوق رکھتے ہیں، اس لیے وہاں اوسط درجے کے دو شاعر نے منعقد ہو چکے ہیں پہلا خطوط ختم کا تھا، اگر دوسرا اردو کا گزشتہ ۲۵ اکتوبر کو ہوا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اب ہوشیار پور میں ہیں تو منظم شاعر کو ضرور متوجہ کرتا۔ صداقت کی ملا دونوں دفعہ میر سے ہی سر منٹ لاتی رہی۔

آٹھ دس جینے ہوئے کہ ہوشیار پور سے ایک صاحب نے، جن کا نام میں بھول گیا ہوں، یہ لکھا تھا کہ آپ پاس صرف دو سو روپیہ ہے؛ باہر سے صرف پانچ شاعری لیا سکتے ہیں۔ مناسب نام لکھیں۔ میں نے چار پانچ نام و دان کا کم سے کم حادثہ تحریر کر دیا تھا۔ صداقت تحریر ہی ذمہ کی تھی۔ مگر اس کے بعد انھیں سانس نہ مل سکا گیا۔ اب آپ کا مشورہ دیکھیے، کہاں

چند خطوط

کا میاب ہوتا ہے۔ جالندھر ریلوے کو دو دروازے پہلے اطلاع دے کر منظوری لینی پڑتی ہے اور منظوری کے لیے وہ کم سے کم تین چار شاہیر کو بلانے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے مجبوری پریقین جانتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کے مشورہ کے مطابق اگر فیصد جمع کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں، تو آخری شرط کا پورا کرنا ضرور ان کے لیے مشکل ہوگا۔

آپ کی شکایات اور پریشانیوں کے تعلق میں نے کچھ سنا تو تھا۔ شاید یہ سنا تھا کہ آپ کے بھائی بلیک سارکٹ کے الزام میں منہ خور ہیں؛ مگر صحیح طور پر معلوم نہیں کہ یہی خبر تازہ پریشانیوں کی بنیاد ہے، یا کوئی اور وجہ ہے۔ خدا کرے کہ اس آفت سے جلد تر نجات حاصل ہو جائے۔ اس سلسلے میں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ مقامی ماحول آپ کے لیے خوشگوار ہو رہا ہے۔ سات سال آپ نے جس صبر و تحمل سے بسر کیے ہیں، شاید یہ اسی کا ثمر ہو۔ میں آپ کی دعا سے متاثر ہوں۔ زیادہ اظہار محبت و خلوص اب دو تین تازہ شعر بھی سن لیں۔ غرضاً بعد اصلاح داتا ہما ہما۔

نہ غم مجھ کو گردابِ رنج و بلا کا نہ محتاج ہوں میں کسی نا خدا کا
 سینے کو موجوں کی زد سے بچا کر چلا جا رہا ہوں کھائے کنا
 قدامت پسندوں پہ کیوں نہیں رہے ہوا خدا کی قدامت پسندی تو کچھ
 ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے، وہی کہ کشادہ دہی چاند
 نہ اہل حرم نے غیری ہمارے نہ اہل کلیلے عنخوار یاں کیں
 اگر تم بھی طرزِ تغافل نہ چھوڑو، کہاں جائیں پھر ہم مصیقت کے اس
 شاہو کہ شاعر ہو جو شہنشاہی نظرِ باغِ جنت پہ کیوں ہو تمھاری
 مدد میں حالی تو یہ کہ گئے ہیں مجھ کو بھر دینگے شاعر ہمارے

دشمنِ عداوت

دل بیتاب سے زندان میں یہ کہنا ہی پڑتا ہے جہاں کا آب و ہوا نہ ہو وہاں، رہنا ہی پڑتا ہے
 جگر کی پھانس بے انداز ساقی کس طرح کھلے گا لیس پاؤں سے کاشا تو دکھ سہنا ہی پڑتا ہے
 قیس بستی میں ہیں یا دلھیا نہ میں؟ اگر دلھیا نے میں ہوں، تو دہان کا پتہ دے گا کہ یہ ہے نقطہ

چند خطوط
۳

نکودر

یکم نومبر ۱۹۵۲

اخلاص نواز

نفاذِ ناک کے سپرد کرنے کے بعد کھانا کھاتے ہوئے آپ کے شعر میں ترمیم در ترمیم ہو گئی اکی
خط لکھا پڑا۔

بات بگڑا جائے نہ کہیں بگڑی بات بنانے سے
پہلا مصرع ترمیم شدہ ہے؛ اکی کی مزید ترمیم یہ ہے:

اور بگڑا جائے نہ کہیں بگڑی بات بنانے سے
مضمون تو وہی ہے مگر اس ترمیم نے شعروں بہت زیادہ زور پیدا کر دیا۔ جو پسند ہو، وہی
رہنے دیں۔

زیادہ دعا میں

جوش ملیح

۵

نکودر

۱۶ اگست ۱۹۵۲

اخلاص پرویز القدر زاد لفظ

احلیتِ نوحہ کچھ بھی ہو، یہ تو ظاہر ہے کہ عزیزِ ناک انجام کے باوجود شاد نے حرکت میں نہ تھی نہیں
کیا ترک کا اظہار نہ تھے اور صمیم ہو، تو کسی کی ترغیب کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ یہ اصول شادی پر
ظاہر نہیں ہوتا سب پر ہوتا ہے۔ اور آپ بھی اسی میں شامل ہیں۔ مگر مراد آبادی نے البتہ قول
خط ثابت کر دیا کہ

چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

۱۲۴

مجموعہ دیرپہ تجویز کا نام عرش سے پوچھئے تو مناسب ہو گا۔ میں تو اس کا نام سامری تجویز کر دے گا!
 ساحر سے اسے خاص تعلق بھی ہے۔

زیادہ نصیرت

جو شش ملیاتی

پٹیل والی غزل پر تاپا دہلی کے سٹریٹس اور شہر مورخہ ۶ اگست میں شائع ہوئی ہے۔ رجعت
 سے گہرا ہوں، اس لیے میں سے حاصل کر لیں۔

۶

نکودر

۳ دسمبر ۱۹۶۰ء

اخلاص پرورد

آج ایک ناصح کی حیثیت میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ۱۰ فروری ۱۹۶۰ء کو آپ ہی
 نے ہمارے اسٹیج پر پلا دی، اور پلائی بھی پانی پلانے کے بغیر، جس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ آپ کا چشمہ
 ہے اس سے فقط ہمارے سب کی نظروں میں ڈیل ہوا بلکہ اس کی ہینٹ کڑائی سے اردو زبان
 اور شاعری، اردو شاعر اور اردو کے شاعر بھی سب کی نظر دل میں سبک ہوئے۔ اگرچہ اس
 نادانی کے لیے آپ ہی ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمارے نادانی اس سے بھی زیادہ ہے۔ ایک فہم اور بخیر
 آدمی ایسے وقت میں اپنا انجام نہ سوچ سکے اور آپ کی ترغیب میں آجائے تو یہ حرکت بہت
 افسوسناک ہے اس افسوسناک انجام کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مجھ پر انگشت نما ہوئی۔ ایک دو
 دہائی اصحاب نے کہا کہ جو ش صاحب کے شاگرد بھی ایسے ہیں۔

پچ پوچھو تو ہمارے قابل رحم صورت حال پر مجھے دہائی بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے دودھ
 کہا کہ اب اٹھ کر پیچھے چلے جاؤ، اور لیٹ جاؤ، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اتنا سہارا تمہارے بچے
 میرا کہا دینے، تو اس سے زیادہ ندامت میرے لیے اور کیا ہوگی۔ مگر ہمارا تہمتہ اٹھنا دہائی
 تو ہمارے جگہ کوئی اور ہی جنس موجود تھی۔

۱۶۵

چند خطوط

دو سرادق بھٹکا ہے۔ اس شاعرے کی بھی شرایوں نے خواب اور بدنام کیا۔ مال مفت
دل بے رحم۔ مفت کی ملتی تھی بے تحاشا پی گئے۔ اگرچہ سات آٹھ شعر اپنے ہوئے تھے، مگر
فرحت لیکٹولی تو بڑی طرح بہک گئے تھے۔ قوالوں کی طرح تالیاں پیٹ پیٹ کر داد دینے
لگے اور شاعرہ کو ایک مضحکہ خیز بنا دیا۔ میرے لیے دہاں بھی بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میرا خیال ہے
کہ اس چیز کے انتظام میں بھی آپ کو دخل تھا۔ اور آپ نے ان لوگوں کے لیے کوئی احتیاط
روداد رکھی۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ جس طرح آپ خود زیادہ پی کر بھی آپے سے باہر نہیں ہوتے
یہی کیفیت سب کی ہوگی۔ اخباروں میں اس شاعرے کی روداد چھپی کہ بھٹنڈا کے مشاعرہ
میں سب اپنے ہوئے تھے۔ یہاں ایک دوست نے یہ بڑھ کر مجھ سے پوچھا کہ آپ بھی بھٹنڈا
گئے تھے؟ میں نے کہا کہ ہاں، گیا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کا فہرست میں ہے۔ اور یہ بھٹا جو کہ
سب اپنے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ ہاں، میں نے پی رکھی تھی۔ اس جواب پر اسے یقین تو
کیا ہوتا، ہاں یہ ہوا کہ گفتگو سب کی ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ میں بھی اس ہنسی میں شامل
تھا۔ اس سے پہلے سورج تنویر جالندھر ویڈیو میں شامل ہونے والے بلاؤشوں کے متعلق
طویل گفتگو کر چکا تھا، اور یہ بھی کہ چکا تھا کہ میں نے سکاڑی دادوں کی اس صورت حال پر
کیسکر صاحب کو لکھا ہے۔ اس کے بعد میں نے بھٹنڈا میں خود یہ تماشا دیکھ لیا۔ اب آپ
غور ہی سوچیں کہ میں ایسے شاعروں میں شامل ہو کر نشان نہ ہو جاؤں، قواد کیا ہو! آپ کو
یہ کہنے کا حق تھا، اس لیے لکھ دیا۔ درنہ۔۔۔۔۔

کب تک جفاے غیر کا شکوہ کرے کوئی کب تک بروں کی جان کو دیا کرے کوئی
منہ رحمت وغیرہ، خود ادب ہے دے رہے تھے، وہ بھی آپ کو مطر ہے ادب چشم دید منظر ہے۔
اس سے زیادہ داد کوئی کہوں۔ صاف کوئی اور سچی کوئی پر اٹھا رخصت کے سوا اور کیا کہوں!

زیادہ دعائیں

جو شش لمبائی

اسا زمین میں ایک مصرع سو بھا ہے: بدحوہ صحبت یا راں کبھی ایسی تو تھی! سوچا ہوں
اسے شامل غزل گردوں یا چھوڑ دوں۔ فقط

چند خطوط
 سرزنش سنی ہے تو ایک تارہ مطلع بھی سن لو:
 گرد غم دل پر نمایاں کبھی لسی تو نہ تھی
 زندگ کجاک بدامان کبھی لسی تو نہ تھی

۷

نکوود
 ۱۹۶۰ مئی

اخلاص پروردگار، بزرگوار

معذرت نامرہ پنہا۔ میں نے ہمارے نام بھی اسی مضمون کا خط اسی دن لکھا تھا۔ انھوں نے بھی
 اس حرکت پر بہت اظہارِ مذمت لکھا ہے۔ اوماندہ کے لیے ایسی مضحکہ خیز حرکت کے سرزد
 ہونے کا یقین دلایا ہے۔ آپ اور ہمدونوں کی سعادت مندی قابلِ مثال ہے۔ میرا شبہ تو ہمارے
 دو شاگردوں پر تھا، جو چھادنی جانندھر رہتے ہیں اور نادونوش کے معاملے میں مشتبه ہیں۔ لیکن
 ان دونوں نے یہاں بتایا کہ آپ نے اسٹیج پر پانی لائے ہمارے پلاوی۔ اس لیے میں نے آپ کے نام
 بھی خط لکھا۔۔۔۔۔ اور فرحت کی تواری سے میں پہلے ہی دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت
 ہے کہ بٹھنڈے کے اسٹیج پر بیٹھنا بھی مجھے باوجود معلوم ہوتا رہا۔ پہلے والا شاعر سب کے سامنے
 خود کو اچھی طرح رسوا کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی قریب بیٹھے ہوئے استاد کو بھی۔ ہمارے اس کا اس کا اس
 کیوں نہ ہوا؟ اکبر تو مولیٰ کی آب ہوتی ہے۔

جہاں تک میں یہ یہودگی محسوس کرتا ہوں، اس کا صحیح علاج تو یہ ہے کہ مشاعروں میں جانا
 ہی چھوڑ دوں۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہو، طبیعت تو خراب نہ ہوگی۔ وہ مصرع تکمیل پانگیا

سہا

بیٹھنا بزمِ سخن میں بھی ہوا ہے مشکل

بزمِ صحبت و اداں کبھی لسی تو نہ تھی

آپ کے خلوص و سعادت مندی کا دیا ہی مراح ہوں، جیسا پہلے تھا۔ زیادہ دعا کیں۔
 جو حسنِ لمایا

نکودہ

۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء

اخلاص پروردگارِ قادر

محبت نامہ اور رحمت تارِ سخن کوئی کا شکریہ۔ ۲۶ مارچ کو وہ تقریباً قابلِ دید تھی۔ ذرا
شال بطور خلعت بھی دیے گئے۔ ایک ایڈریس پڑھ کر سنایا گیا، یہ کافی طویل تھا، اور خوا
ہو کھٹے میں تھا، ایک ابھیندن گزرتا، جو پہلے ابھیندن گزرتا، خلاصہ کہا جاسکتا۔
تنگ وقت میں حکمہ لسانیات نئی چیز کہاں سے نکھڑتا۔ یہ تو عرش ہی کا کام تھا۔ ایڈریس
کی نقل اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ کتاب مفت تقسیم کی گئی۔ ایک ایسا ہی انعام
و اسے سنت رام صاحب کو جو ہوشیار پور کے قریب پرانی بستی کے باشندے ہیں، دیا گیا
پنجابی کے لیے گوپال سنگھ دروی کو۔ باقی انعام چھوٹے اور خلعت یا ایڈریس کے بغیر
سے کم نہ تھا۔ اور دواؤں میں دفا صاحب کو ایک ہزار، ہنر کو ۵۰۰، قیس کو ۳۰۰، اختر
کو ۲۰ بغیر کسی خلعت وغیرہ کے، بخرا لڑکے کی شاعری تو صفر ہے، یہ سفارش ہی سمجھا جا

ہے.....

تاریخ کا مادہ کسی بھروسے تو آتا نہیں، پھر اس کا بلاک چھپنے لگا۔

زیادہ دعاؤں

جو شش ملیا

نکودہ

۲۳ جون ۱۹۶۹ء

اخلاص پرورد

دو ہفتوں سے پیادہ ہوں۔ موسم کی شدت و خلعت ہی کا یہ اثر ہے

چند خطوط
چوتھی قسط ارسال کر دی ہوں۔ تین قسطیں اور ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔ آپ کے بار بار حکم
گور داس پوری نے میری ایک غزل کے خلاف کچھ لکھ کر اس بات کا ثبوت دیا کہ مینڈ کی کو بھی
ہکام ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ مکتوب شانِ شہزادہ مئی کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ میں ان کی
شاعرانہ قابلیت کو جاننے کی طرح جانتا ہوں۔ انھیں کے مکان میں، دین باران کے طرحی اشعار
جو بغرض اصلاح پیش کیے گئے، دیکھتا رہا ہوں۔ تقطیع تک غلط ہوتی تھی، کوئی کل سیدھی
دھمکی، ایک مٹھری کہا ہے، تو دوسرا نہیں لگا سکے، دوسرا لگایا ہے تو پہلا نہیں۔ امر تشر
کے ایک ادب پروردہ نے مجھے اس پر توجہ کیا ہے، مگر میں تو ایسے واقعات پر خاموش
رہنے کا عادی ہوں۔ پھر جواب جاہلان کا ذکر ہی کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حمد پر فخر
کر رہے ہیں، اور وہ بھی بالکل بے تکی۔۔۔ صاحب ہی محرک معلوم ہوتے ہیں۔
جوش ملیح

۱۰

نکودر

۱۸ جون ۱۹۶۹ء

اخلاص پرور عزیز القدر

پانی یادیں: اس کے متعلقہ شمارے اب تک نہیں پہنچے۔ شاید نئی یادیں، اس تلاش میں سنبھلا
ہوئی ہوں۔ تاہم نفی و اثبات کا کوئی جواب تو موصول ہونا چاہئے۔ تازہ حالاتِ معاش سے
بھی اطلاع دیں۔ آٹھ شاکر دفت ہو چکے ہیں۔ اب دیکھئے کس کی باری آئے۔ خاندانِ داغ
میں بھی، ایک میں ہمارا رہ گیا ہوں۔ اس ادبی باب کی آخری مان اب مجھی پر ڈھکی۔
امید ہے کہ آپ عافیت سے ہونگے۔ زیادہ دعاؤں۔
جوش ملیح

نکودر

۱۲ دسمبر

میں اللہ آپ کی پوجا یا مینوشی کا ذکر ایک کرتا ہے مفید جھوٹ، ایک ہوتا ہے سیاہ جھوٹ؛
یہ سیاہ جھوٹ ہے، کبھی مخرے نے آپ سے جھوٹ کی ہوگی۔ اور بیچ میں مجھ کو مان لیا۔ خدا اس
سے سمجھے!

میں ہوں امرت لعل عشرت اس عنوان سے تازہ ہو گیا
صدی (سالنامہ) میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں آپ کی ادبی خدمت، گزراہی اور ادبی تعلق کا
مختصر سا تذکرہ بھی نہیں۔ میری نظر میں یہ بھی ادبی تقصیر ہے، عجیب ہو کہ اتنی راہ دورم کے باوجود
گیتا صاحب نے یہ دسمبر کے لیے مدعو نہیں کیا۔

۲۳ کو لا کانچ، ٹیالہ کا مشاعرہ گزرا، نامک دیو پر ہے؛ رضا مندی اور سال کر رہے ہوں۔ ایک
ساحر تو ضرور دقیق سفر ہو گا یعنی ریال کوئی۔

گیتا صاحب سے کچھ کہنے کی اگر ضرورت ہوئی تو مناسب وقت پر لکھو گا یا عند الملاقات بنا
دے گا۔ مکن ہو کہ ضرورت محسوس دہو۔

زیادہ دھائیں

پیش ملیانی

۱۲

نکودر

۶ جنوری ۱۹۷۰ء

اخلاص پرورد

گیتا صاحب کے متعلق آپ سے کچھ کہنے کی اب ضرورت نہیں رہی۔ ٹیالہ بھی آپ نہیں
کئے۔ شہر متنازعہ کے متعلق میں نے وہاں جگر جالندھری سے یہ پوچھا تھا کہ شہر کس سے

چند خطوط
 نہ تھا۔ اس کے علاوہ شعر کی بناوٹ اور اس میں لفظ تضاد کا صرف بھی یہ یقین دلاتا ہے کہ
 شعر میرا ہی کہا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کسی نہ کسی قریب ہی پہنچا ہو گا۔ وہ قریب دھڑ سالہ
 کے سوا اور تو کوئی ہو نہیں سکتی۔ میں نے پوچھا کرتے آپ کو بھی نہیں دیکھا البتہ دھڑ سالہ سے
 سات آٹھ میل دور تک رفیق سفر میں کر سادھو سنتوں اور مندروں کی عقیدتمندی ضرور
 دیکھی تھی۔ اسی قریب پر یہ شعر کر گیا ہو گا۔ ویسے یہ شعر میرے لیے بھی ایک بھولا ہوا افسانہ
 تھا۔ اب بھی یہی صورت حال ہے۔ آپ کے خط ہی نے مجھے اس شعر کی طرف متوجہ کیا تھا۔
 مذکورہ بالا کوائف اسے اپنی تصنیف تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ بات اب تک سمجھ میں
 نہیں آئی کہ بیاض میں اس کا اندماج کہیں ہے۔ یہی بات مجھے اس کی تخلیق کے بطلان پر
 مجبور کرتی تھی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ میری ایک کھوئی ہوئی چیز مجھے آپ کے توسط سے مل
 گئی۔ زندہ باش

جوش ملیحانی

۱۱۳

نکودر

مغل میں کیوں چھوٹے سانپ	ساحر سے ہم پوچھیں گے
بن بجا کراتے سانپ	کس جٹل سے لے آئے
ایسے موٹے تازے سانپ	کیونکر آئے قابو میں
کچھ ان میں چنگبرے سانپ	کچھ ان میں مٹیا لے تھے
دس بارہ تو ہونگے سانپ	ایک نہیں، دو تین نہیں
شاید یہ زہریلے سانپ	دودھ پلا کر پالے تھے
بچھن پھیلانے والے سانپ	میری طرف بھی آئے تھے
آگے تم تھے، پیچھے سانپ	یہ منظر بھی دیکھا تھا
کاٹ نہ لیں ساحر کے سانپ	شعبہ بپا تھا مغل میں

۱۵۱

چند خطوط
اس کی نقل اخبار پرتاپ جالندھر میں ارسال کر دی ہے۔

جوش ملیانی

۲۶ مئی ۱۹۷۰ء

۱۴

نکودر

۱۷ جون ۱۹۷۱ء

اخلاص پرورد

کئی دن ہوئے مساب کی روئی میں چند مزاحیہ اشعار بھیجے تھے۔ یہ محض تفریحی
دل لگی تھے۔ اخبار پرتاپ، جالندھر میں شائع ہو گئے ہیں۔ مگر آپ نے داد و درود
میں نہیں بھیجا۔ اس کے بعد ایک اور شعر بھی کہا تھا، وہ بھی اس لیے بھیجے۔
یہ تھا کام سپرے کا شاعر نے کیوں ڈھونڈے
امید ہے کہ جس طرح پوجا دلا شعر تاپنڈیا کا اسے چکھنے میں جڑوانے کی تجویز
اسی طرح یہ اشعار بھی نفسِ طبع کے لیے برہن ہو گئے۔

زیادہ دعائیں

جوش ملیانی

۱۵

نکودر

۲۲ جون

اخلاص پرورد

محبت نامہ پہنچا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ ان اشعار کو پڑھ کر برہن نہ ہوئیں۔ مگر آپ
شاخ و برگ عزت افزائی تسلیم کیا۔ اس صاف قادیانیت اور حسن عقیدت کی دلدوزی
یہ سن کر اور بھی مسرت ہوئی کہ آپ جہاں جلتے ہیں اس غول کی فرمائش ضرور ہوتی

۱۵۲

چند خطوط

یہ قبول عام کا روشن ثبوت ہے۔ حق یہ ہے کہ ایسی ذین میں تین چار شعر بھی کالنا کارے وارد ہے۔

یہ بلاشبہ غزل ہے، قطعہ نہیں ہو۔ قطعہ کا مضمون مسلسل ہوتا ہے اور اس میں غزل کی طرح ہر شعر کا الگ مضمون نہیں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مطلع بھی ہے اور مقطع بھی۔ قطعہ کے لیے مطلع ضروری اور لازم نہیں ہوتا۔ زندہ باغ کے سوا اور کیا کچھوں، یہی داد کافی ہو۔ صاحب اداقت اصحاب ہر جگہ زندہ باد کہہ جاتے ہیں، مگر غلط ہے۔ انقلاب زندہ باد پنجاب زندہ باد، یہ تو صحیح ہیں، مگر مخاطب کسی یہ کہنا کہ زندہ باد سرسر غلط ہے۔

زیادہ دعائیں

جوش ملیح

میرے استاد کے استاد

میرے استاد محترم جناب نسیم نور علی (مرحوم) فن عروض پر مدرس دیتے ہوئے اکثر متروکات کے ضمن میں میرے استفسار و اظہار شکوک پر فرمایا کرتے: "قبلہ و کعبہ کا یہی حکم ہے، حضورؐ کا یہی فرمان ہے۔ اُس وقت میں ان جملوں کو سن کر صرف متعجب ہو کر رہ جاتا۔ کھلی میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ "قبلہ و کعبہ" اور "مخدومہ کا اشارہ کس ذات و الامصافات کی طرف ہے نیز "حکم" اور فرمان" سے کیا مراد ہے۔ مگر بعد میں جب "بادۂ سر جوش" میرے زیر مطالعہ آئی اور متروکات کے باب میں استاد محترم کے ارشاد کی تصویر و تفسیر ابوالفضلت قبلہ جوش طیبانی کے فرمودات میں بھٹکتی نظر آئی، تب مجھے ان کی عظمت کا احساس ہوا اور یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ جناب نسیم صاحب کا اشارہ یادگار بدیع، ماہر فن عروض، شاعر باکمال، دالامرتبت قبلہ جوش صاحب کی طرف تھا۔ اس طرح غائبانہ طور پر میں ان سے متعارف ہوا۔ اب میرے دل میں ان سے قریبی رسم واداء پیدا کرنے کا اشتیاق جنگاں لینے لگا۔ بالآخر سلسلہ خط و کتابت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ میں ان کی شریف انقش، بلند اخلاق اور مخلصانہ غور و ادرازی کا قائل ہوتا گیا۔

غالباً اگست ۱۹۵۷ء میں شیلے کے ایک سرکاری شاعرے میں جس کے انتظام و انصرام میں میرا بھی دخل تھا، پہلی مرتبہ قبلہ جوش صاحب کے نیا دعائے حاصل کرنے اور قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی شاعرے میں میرے دل پر ان کی بلند مرتبہ شخصیت کے

نقش اور بھی گہرے ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ سر شاعر ملک کے نامور اور وصفِ اول کے مخنور
 بنایت عقیدہ مند اندگوم جوش کے ساتھ ان کی قدیموی کاشرت حاصل کر رہے تھے۔ بعد
 ازاں ان کے نیاز حاصل کرنے کے بہت مواقع نصیب ہوئے اور ہر ملاقات پر میں نے
 ان کی شخصیت کو عظیم سے عظیم تر پایا۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ عظمت اور شہرت فنکار میں احساس برتری کا جذبہ پیدا
 کر دیتی ہے اور بعض اوقات فنکار اس جذبے کے تحت رعوت اور غود پرستی میں مبتلا ہو کر
 بلند چکا ہی اور شادہ طبعی سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنے سو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن
 جہاں تک قبلہ کی ذات گروائی کا تعلق ہے عظمت اور شہرت کی ان بلند یوں تک پہنچنے
 کے باوجود آپ سادگی، شرافت اور منکر سراجی کا مجسمہ ہیں۔ ان کے محاسن کے اپنے بگائے
 سب قائل ہیں۔ خوش اخلاقی اور بلند کرداری کی وجہ سے آپ ہر ادبی حلقے میں اور ہر
 مکتبہ خیال کے ادیبوں اور عالموں میں تنظیم و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میر
 استاد محترم نے بھی آپ کے متعلق بجا فرمایا ہے۔

مشاگرد جوش ملیانی ہوں میں قرطاسِ سخن پہ نقشِ مانی ہوں میں
 داغ و ذوق و نصیرے ہوں منسوب کیوں فخر نہ ہو کہ خاندانی ہوں میں
 حضرت جوش کی شاعرانہ تفصیلت سے متعلق کچھ عرض کرنا آفتاب کو چہراغ دکھانے کے
 مترادف ہے کیوں کہ انہوں نے برسوں کی مسلسل ریاضت اور خدا داد قابلیت کی بدولت
 علمی اور ادبی دنیا میں وہ مقام پیدا کر لیا ہے جہاں کا مقیم خود اعتمادی سے کہہ سکتا
 ہے "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" یا "میری بیاض شعر خدا کی کتاب ہے"۔
 ان کی پہلو دار شخصیت کی تابناکی سے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ شرافت اور متانت
 سادگی اور تواضع، خلوص اور انحرار، پاکیزہ خیالی اور بلند چکا ہی ان کی شخصیت کے نمایاں
 جوہر ہیں ان محاسن کی گہری بھاپ ان کے کلام پر بھی ثبت ہے بقول آپ کی ذات گروائی
 پر بجا طور پر عداوت رہا ہے کہ عظیم انسان ہی عظیم ادیب یا شاعر ہو سکتا ہے۔ بقول شخصہ
 یہ وہ کہ ان سے ہر نام گدھنگا کی نشان یہ وہ کہ ان سے ہر شان فرشتگان کی خود

میر کے استاد کے استاد
حضرت جوش کے ہم عصر اور عہدِ حاضر کے دیگر مشاہیر ان کے مقام و مرتبہ کو کس حد
احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کس قدر ان کی علمی تحقیقات، محاسن شعری اور
صلاحیت کے قائل اور مداح ہیں، اس کا کچھ اندازہ جناب فراق گورکھپوری
سے لگایا جاسکتا ہے۔ چند برس ہوئے، جب پہلی مرتبہ مجھے فراق صاحب
حاصل ہوا۔ جناب خوشتر گجرا می مدیر میونسپلٹی نے میر ان سے تعارف
فراق صاحب سے فرمایا:

”پنجاب کیا ہندستان گیر شہرت کے بجا طور پر حقدار اور مالک جوش
لمیانی صاحب کا دمِ غنیمت ہے۔ ان کے ہر عزیز کے کلام میں فن
عرومن کی نشاندہی ملتی ہے۔ ان کے شاگرد سیم ہوں یا نسیم کے
تلمیذ رشتی ہوں، قبلہ کے سب عزیز ہندو فر تیز ہیں۔“

جب میں نے اس واقعے اور فراق صاحب کے ارشاد کا ذکر حضرت جوش قبلہ
انہوں نے جواباً فرمایا: ”فراق صاحب نے جو کچھ کہا، اسے حسنِ فہم ہی کہہ سکتے
منکسر مزاجی اور عقلی سے بے تعلقی کی اس سے بڑھ کر نظیر کہیں کم ہی ملے گی۔
مرزا یاس نگا، چلیگری جو غالب تک کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، قبلہ کے کلام کی
اور بلاغت کے دل سے قائل تھے۔ صاحبِ فہم اور اصول و قواعد کا پابند
کو کئی مرتبہ انہوں نے بھی ”میرے استاد کے استاد“ حضرت جوش کے کلام کو فرا
داد و تحسین کا مستحق قرار دیا۔

دل شا، بھمان پوری امیر میانی کے شاگرد و رشید تھے اور بذاتِ خود ان کا شمار
کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ بھی جوش صاحب کو ہانے کی طرح ہانتے اور
طرح مانتے تھے۔ ان کے کلام پر اقبابِ برائے کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا
”زبانِ نکالی اور زیادہ سے زیادہ معتبر ہے حسنِ طبیعت کی دلکشی
داد و طلب ہے۔ اسلوبِ بیان اور حسنِ بندش استادانہ شان کی
حاصل ہے۔ حیران ہوں کہ پنجاب کے ایک گوشے سے رہنے والا

میرے استاد کے استاد
 شخص ایسا زبان دان ہو کہ اس کی ہر غزل اور ہر نظم پر اہل زبان کے کلام
 کا گمان ہو۔

میں نے اپنے استاد محترم جناب نسیم نور محلی کے پاس ان بزرگوں کی طرح معمول
 ہوئے خطوط دیکھے ہیں جو اس صداقت کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔
 جانشین داغ ناخدا اے سخن حضرت نوح ناروی نے بادۂ سرخوش پر اچھا دیا ہے
 فرماتے ہوئے بجا طور پر رقم فرمایا تھا:

کیا وصف جناب پوش یکھے	فلت جو صبر و پوش یکھے
اعدا ز کلام اثر میں ڈوبا	نشر کی طرح جگر میں ڈوبا
ہر مطلع ہے آفتاب ان کا	ہر مقطع ہے لاجواب ان کا
جو مصرع ہو انتخاب ہو وہ	جو شعر ہے کامیاب ہو وہ
جو حرف دہ حرف دلنشین ہے	جو لفظ دہ لفظ نازنیں ہے
تو تیب غزل ہو ست کچھ نگر	تو تخیل ہو نادر ست کچھ نگر
نوش فکر ہیں نوش داغ یہ ہیں	شاگردِ رشید داغ یہ ہیں

اسلامات کی یادگار ٹھہرے

تاج سیر افتخار ٹھہرے

اپنے عزیزوں نیز تلامذہ کے لیے ابوالفصاحت قبلہ جوش کے دل میں بے پناہ شفقت
 کا جذبہ موجود ہے۔ ہر موقع پر اپنے عزیزوں کی بہتری و بہبود کا خیال اور رہنمائی
 کا احساس ان کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے کسی شاگرد یا عزیز کے کلام میں کہیں سہواً
 بھی سقم رہ جائے تو یہ آپ کے ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اسے دیکھ کر خود اپنے
 دل میں غلامتِ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ اسے آپ سے تلمذ کی نسبت ہے۔ کھر بس قبل
 میری ایک نظم پنجاب کے سرکاری جویدے میں شائع ہوئی ان کی نظر سے گزری تو
 فوراً تحریر فرمایا:

”پاسبان کا تادہ شاہہ دیکھا۔ آپ کی نظم میں ایک جگہ: فلک تیش

پڑا تاد کے استاد
 ہے مقام اس کا... لکھا ہے۔ یہ محلو نظر ہے۔ جب فلک نشیں کر دیا
 تو پھر لفظ مقام سراسر بے ربطا اندازہ ہے۔ 'ہے آسمان پر مقام اس کا'
 اس طرح کہا جا سکتا تھا۔ عربیوں کے کلام میں ضعف تا لیف دیکھ کر
 ندامت ہوتی ہے۔ اسی نمبر میں قیس کی ایک نظم ہے۔ دوسری
 قیسے شعر کے مصرعے ثانی میں حرب کی رے متحرک کر دی ہے۔
 انھیں بھی متوجہ کر دیا ہوں۔ اہل حرب (سپاہی لوگ) دادا حرب میں
 رے ساکن ہے۔

ایک ادمو قے پر آل انڈیا ریڈیو، جالندھر سے میرا کلام، کلام بزبانِ شاعر
 نشر ہوا۔ اسے آپ نے بھی اتفاقاً سنا اور تحریر فرمایا:

اخلاص پر دوزخ بڑا قدر!
 ہر سمبر کو میں نے ریڈیو کے ذریعے آپ کو سنا۔ سہو یا لکونی بھی اس
 پر دوزخ ام میں شامل تھے۔ کلام پسند آیا اور دیتا ہوں۔ یہاں سمبر
 (اقوام) کو لکھو دریں مشاعرہ ہے جو آریہ اسکول میں ایک بچے بعد
 دوپہر شروع ہو گا۔ شرکت کا خواہشمند میں ہی نہیں، بعض اور احباب
 بھی ہیں جنھوں نے آپ کو سنا ہے۔ اگر یہ تکلیف آسانی سے گوارا ہو سکے
 تو جنون ہو گا۔ میرے بہت سے عزیزوں نے شامل ہونے کی اطلاع دی
 ہے۔ جناب بیدی صاحب کو صدارت کے لیے تکلیف دے رہا ہوں۔
 وعدہ تو بہت کام دہی گیا تھا مگر غلطیوں کی بات جو کچھ ہے بڑی ہمدرد
 جواب کا منتظر رہو گا اور پھر شاعرے میں آپ کا انتظار رہیگا۔ پچھلے
 دو ناخوں کی تلافی ہو جائیگی۔ بچوں کو دعا ہے درازی عمر۔ ہاں ابھی
 وہ بہتر روز اور جو گزشتہ دنوں چندی گڑھ میں مجھے دیکھ کر خوش دقت
 ہوتا تھا۔ اب بھی مجھے یاد کرتا ہے۔ باجھول گیا؟

اندازہ لگائیے۔ کتنی شفقت، کتنی محبت اور کتنی شرافت کی چاشنی ہے۔ کس آ

میرے استاد کی یاد
 کا رنگ ہے۔ کہاں مجھ سا کم پایہ، ہتی دامن، ہتھکڑی قسم کا بے بسا شاعر اور کہاں بمثل
 ایسے شفیق و رنگ کی چشمِ عنایت۔ کیوں نہ کہوں :
 جہاں شاعری میں نام اپنا یوں بھی ہوں بھی
 غلام جو کھسکے، یا رشتی پٹیا لوی کہے

تسمہ

اس شمارے کے لیے مولانا غلام رسول ہیر مرحوم اور بچی ممتاز حسن صاحب ساداتی نرائس سکریٹری حکومت پاکستان سے بھی مضامین لکھنے کی درخواست کی گئی تھی۔ مقدمہ الذکر بزرگ بھی تھے اور والد کے ہم وطن بھی۔ یونہی الذکر بڑے صاحب کمال آدمی ہیں، اور والد کے پرانے عقیدہ مند۔ موصوف پاکستان میں اردو بورڈ کے صدر بھی رہے اور والد کے متجدد ثقافتی اداروں کے سرپرست بھی۔ ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ اس حادثے کی وجہ سے مضمون لکھنے سے قاصر رہے۔ مولانا ہیر صاحب نے مضمون لکھ لیا تھا۔ لیکن وہ پچھلے سال کی سہ ماہی اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جانے اور بعد کے حالات کی وجہ سے ہم تک پہنچ ہی نہ سکا۔ اسی دوران میں مولانا ہیر کا انتقال ہو گیا۔ اب نہ جانے ان کی وہ آخری ادبی تصنیف کہاں اور کس حال میں ہے۔ تبرکات یہاں تہر کے دو نقل کر رہا ہوں۔

(۱)

۱۱۱

برادر عزیز۔ دراصل ادراک میں بہار ہو گیا اور پیادہ نے طول کھینچا۔ ارجح میں صحت ہوئی، پھر نقاب خاصہ میر تک دانا میٹر رہی۔ لیکن زماوت جسم میں آئی، تو ایک ایک دو دھڑکے کے گھٹا سرور کر دیا تھا۔ بمشکل مضمون مکمل کر لیا تھا۔ بلکہ بوش صاحب

تمہ

اگر طالب حسین طالب کلیان پوری کو سنا بھی دیا تھا۔ سو وہ میرے پاس موجود ہے۔ صاف نہیں کیا۔ طالب صاحب سے کہا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دی جائے اور سال کے بارے میں استصواب کر لیا جائے۔..... کوئی مناسب ذریعہ ہو تو مضمون صاف کر لوں۔ میرا خط اچھا نہیں مضمون خاصا لمبا ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے تاخرات کے مطابق لکھا ہے اور عام قاعدوں کی پابندی نہیں کر سکا۔ امید ہے، آپ بخیر ہونگے۔

نیا ذمہ - ہر

(۲)

۱۰ اگست ۱۹۷۱

برادر عزیز - تیض مکمل ہو گئی مضمون طویل ہو گیا۔ اس میں کچھ باتیں ہیں۔ اپنے وطن کی بعض یادیں محفوظ رکھنے کی غرض سے لکھ دیں۔ لیکن بے تعلق نہیں۔ آپ اب مختار ہیں۔ میں گھر سے باہر نہیں جاتا۔ آٹھ بجے کے قریب باہر دفتر میں بیٹھتا ہوں۔ بارہ بجے کے بعد تک وہیں رہتا ہوں۔ اور کھانا کھا کر سو جاتا ہوں۔ چار بجے سے سات بجے تک پھر دفتر میں رہتا ہوں۔ سہتے کا دن شہر جانے کے لیے مقرر ہے۔ اس دن میں کام لیتا ہوں۔ صبح کو نہیں ملتا۔ امید ہے آپ بخیر ہوں۔ ہر رات فرما کر اپنے دل پر ماحد تک میرا سلام پہنچائیں۔ والسلام - تمام احباب کی خدمت میں بھی سلام۔

آپ کا

ہر

دلی ملک ہندوستان اور پاکستان میں آمد رفت اور ٹاک کا سلسلہ جاری نہیں ہوا۔ اسی کے بعد کوشش کی جاسکیں مضمون اگر مل سکا، تو وہاں سے منگوایا جائے۔ اوہ ستمبر ۱۹۷۱ء میں تو مولانا خود ہی ملک بھاہو گئے۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔ اگر مضمون مل گیا، تو تحریر ہی کی تدر کر دیا جائیگا۔

عرش ملیانی

نوائے سروش

انتخابِ کلامِ جوش

وہی مطلوب ہو، وہی طالب اک معاً ہوا، خدا نہ ہوا
 مختصر بھی ہے اور حسیاب بھی کیا ہو اکا جواب کیا نہ ہوا
 جیہا اے الفت فریبِ اعجاب ام ابتدا کیا تھی، انتہا کیا ہے؟
 لالہ صحنِ باغ ہوں، گوہرِ شبِ چراغ ہوں پھر بھی میں ایک داغ ہوں، یہ لہذا گارم
 جلوہ رخ دکھا کہیں دل کی خاشاک کہیں نیند ہی بن کے آ کہیں دیدہ انتظار میں
 کیا تجھ سے کہوں دیکھنے والے اگر تو کیا دیکھ آنکھیں ہیں تو مظلومی اور بابِ وفا دیکھ
 لے دلِ ایر کہیں آہ تری جوم نہ بن جائے خاموش ہو کمِ بخت، الزامے کی ہوا دیکھ
 پھیل کیوں خاموش میں؟ پیاد میں کیوں کوکھو مجھ کو درے میرے سرساراجمن ہو جا۔
 لحاظ دورِ محبت کا اور کس کیا کرتا یہ جی کا دلگ تھا، جی کو نکلا لیا میں نے
 پھل لے آئے نہ آئے، یہ مقدس کی ہو جاتا چھاؤں تو نخلِ تمنا کی گھسی ہوتی ہے
 ضبطِ گم سے کہیں چاک نہ ہو جائے جگر بلند آئنی کی بھی پیر سے کی گئی ہوتی ہے
 اک تمھاری ہی نزاکت ہو، جو ہو تم پہ گراں درم پہ پھول میں نالوک بدلی ہوتی ہے
 اس قدر فریب کیوں حال تھا، والے جوش کبھی دل پر تو کبھی دم پر بنی ہوتی ہے

انتخاب کلام

بجلی نے کیا خاک چھین جس کو جلا کر
اس جس سے امید نہ رکھ مرہم دل کی
جنوں کے فیض نے معبد بنا دیا جھ کو
طواف کیوں نہ کریں گردشیں زانو کی
کھسیکیں گی کس طرح راہ طلب کی نکلیں
زندگی کو دو قدم چل کر پسینا آگیا
اڈھیرا کو رنگ رُخ اپنا ہر اک شتاق پر
جس میں ہولی کھیلے ہیں وہ ہینا آگیا
نا خدا غافل ہو آئیں تند موہیں ہولناک
وہ تو قسمت تھی کہ ساحل پر سفینا آگیا
تمنا خود تمنا کا ثمر ہے
اسے کیسے نہال بے ثمر کیوں
میکدے میں بھی ہر ناصح موجود
اب یہاں بھی نہ گھڑا راہ ہوگا
عزم کو انعام سمجھنے والا
ذہر کب تک یہ گواہ ہوگا
معتد بن گئی تھریر پاس راہ داری سے
وہ اتنا بھی نہ سمجھے یہ کہانی کون کہتا ہے
جب بنا سکتے تھے حال دل تو وہ سنتے نہ تھے

اب وہ مستے ہیں تو ہم ان کو سنا سکتے نہیں
موت اگر وقت سے پہلے نہیں آتی نہ ہی
اے شبِ غم مجھے بے موت ہی مارا ہوتا
اپنی آنکھوں ہی سے دیکھا جو جسے اے صبح
میری آنکھوں سے بھی تو نے اسے دیکھا تو
قابلِ رحم تھی ہر ایک حسیں کی صورت
حسن کے ساتھ اگر عشق نہ پیدا ہوتا
اے خود آج تھے میزانِ جنوں میں تولوں
میرے بڑھتے ہوئے دعوں کا بھرم تو کھو لو
عاقبت کے لیے بھی کو بکھن کر نہ گنا
پہلے دنیا کی مصیبت کے تو پتھر ڈھولوں
میرا سے لے جنوں مجھے اکارتو نہیں
لیکن اگر وہاں بھی گھڑا راہ نہ ہو سکا
غرض مندوں کے کس شکل میں ڈالا ابر رحمت کو

ابھی اصرار ہے سب کا، یہاں پہلے یہاں پہلے
تجھے دیر میں کوئی نام سنا کہ حرم میں تو نظر آسکا
رہے سب اچھے وہی بشر، جو ادھر گئے نہ دھرے
جنہیں تم سے ملنے کی تمی لگن وہ بڑھے لے تیری کلیں
جو ٹھہر گئے وہ ٹھہر گئے، باجوہ گئے وہ گور گئے
تجھے شوقِ ادا طلب کیا، تو توڑ کے ہو ذوقِ نظر نہ کر

تخلیہ کلام

کیا تو نے اپنی مرضی سے چھوڑا ہے دنیا والوں کو

یاد دنیا والوں نے تجھ کو اسے تاکہ دنیا

مرغ چمن اب بھی ہے نہ یاد خواں آپ تو کہتے تھے ہمارا

آپ رہے جس سے بہت عجیب لیجئے آج اس کی خبر آ

دوب جلتے ہیں امیدوں کے سینے اس میں نہ مانو مگر آئندہ ہے زور اس

عیب جتنے ہیں منہ پہ کہتا ہے آئینہ بھی ہے کس قدر بیا

نوشی خوشی ہی نہیں غم کی تینوں کے بغیر فقط نشاط میں گدے تو زندگی

دوست دشمن سب کا ہے میلان قاتل کی طرح ایک مظلومی نظر آتی ہے بسل کو

کیوں نہ ہم پر مغاں کی بھی زیارت کر لیں راہ میخانے سے بھی جاتی ہے منزل

داد و عشر مرالضاف اب کیونکر کرے خود تو وہ میری طرف ہڈیں ہول

باد و عیش کی میں خاک تفت کر تا وہم تھا زہر نہ بھروسے کوئی پتا

باد کا تند کی موجوں سے یہ کھٹکا ہے مجھے اکہم وہ دب نہ جائے کہیں ہیما

میں قید زندگی سے مانوس ہو چکا تھا یارب مری رہا ہی کس جرم کی را

کیوں نہیں باد مخالف بن کے چھڑا آپ جا رہے ہیں آپ کی شرفی ہے طوفان

رلا دہلی یہ ہر سنگ گراں کو ہنسی سمجھیں نہ وہ میری لگا

ہیں تو کر دیا خاموشی تم نے مگر رد کو گئے کس کس کی دیا

ادھر صحر اُدھر برق تپاں ہے کہاں لے جاؤں اپنے آشیانہ

کیوں اشتعال جھڑپس کی بات پر بیوں فیصلہ ہمارا تھا راہ

کوئی چمن میں کوئی بیا باں میں جا دل وہ کیا کرے کہ جس کا ٹھکانا کیا

یہ گمانی کی بھی حادثہ ہے زمانے کہتے مجھ کو اچھا نہ کہو گے تو یہ دھچ

ہو ہوا وہ تو ہوا غم نہیں اس کا لے جس کا کھائے جاتی ہے یہی فکر کہ ار

ہر جگہ پر سر جھٹکے جھکا یا وہ ہیں تھے رکھا ہو تو ہی بات کو ایسا کوئی

مستند کہہ سکتے ہیں تو نہیں جھٹکے جھکا یا وہ ہیں تھے رکھا ہو تو ہی بات کو ایسا کوئی

تیں خدا ہوں، ہر گناہ سے مجذوب بنے ^{انتخابِ کلام}
 حق تو یہ ہے، بخود ہی میں بھی خودی کچھ کم نہیں
 آدمی بھی جو خدا سے دل بھی کونے میں فرو
 آدمی سے بھی خدا کی دل لگی کچھ کم نہیں
 سونگ کی تصویریں حاضر بھی ہیں غائب بھی

برودہ مری آنکھوں کا فالو س خیال ہے
 ہر کار میں اک نور ہے، ہر سوز میں اک نغمہ

دنیاے محبت کی دنیا ہی نرالی ہے
 اچکا مٹا الفت میں ہر چیز کو کھو آئے

اک جانِ حویں ہم نے شکل سے سنبھالی ہے

یہ اندھیرا جھجھک پیدا ہوا	دارغ دل چکا، تو غم پیدا ہوا
جب خیالِ بیش و کم پیدا ہوا	ہو گئی ہر ایک بیشی میں کمی
مگر دنِ مینا میں غم پیدا ہوا	میکدے میں شمع بھی آیا اگر
رند میخانے میں آئے آؤ گھٹا بھی آئی	دیکھ تو رحمتِ باری کے کرشمے ساتی
خاک اڑا اُتی ترے کپڑے سے صبا آتی ہو	اک نقطہ میں ہی تو ناکام نہ آتا ظالم!
خو امل جو نہیں ہے بندگی کا	بندہ ہوں مگر تہوں اس کی کا
وہ ناس ہے یہاں تو زندگی کا	بیچے کی دعائیں دینے والو
وہ راز تو کھل چکا کبھی کا	جس راز کو تم چھپا ہے ہو
مست بند رہا کلی نکلی کا	کیا جانے، صبا نے کیا کہی بات!

آج یہ کیا ہے یہاں کوئی تماشا تو نہیں؟	پوچھتا پھرنا ہوں ہر ایکے عمر میں بھی
دلوں ہاتھوں سے کیچے کو دیاؤں تو کہوں	یوں تو مجھ کو بھی ہے کچھ کہنے کی جلتا لیکن
برعلیٰ ہی کوئی تہید اٹھاؤں، تو کہوں	بھائی ہوا تو کہنے کا سلیقہ بھی ہو شرط
استاد الی جو ہیں کشمکش و ہتھیاروں کو کہوں	ابھاؤ لگا کو جھوٹا، کہوں کیا میں ابھی!
کہنے کی کوئی راہ نکالوں، تو کچھ کہوں	دوست ہے کہیں دبا رہا سمیت ہو میری بات
دونوں جہاں سے ہاتھ اٹھاؤں کچھ کہوں	کیونکہ کہیں مجھے کس چیز کی طلب

دیر سے کہے کہ جانا ہوں یہ مقصد لیکر
 لے صبا! تو نے چہن کی تو سنائی روتا
 دیکھ آؤں، کہیں میرا بھی خدا ہو کہ نہیں
 آئیائے کا بھی کچھ حال بتا ہے کہ نہیں
 کیوں تغزل کا نگہیاں نہ رہے غم میرا
 باغ میں کوئی ٹھکانا نہیں ملتا، نہ ہی
 دوستوں کی بھی کہیں قدر نہ مٹ کر ڈھٹ
 دے دیے گریہ خونیں نے مجھے بھول ہی بھول
 چشمِ ظاہر میں تو اک خاک نشین لیکن
 باغ ہو دشت ہو یا راگداز ہو کوئی
 حرکت صحرا پہ نہیں ختم مرا عزم صمیم
 یہ تو ہے کفر محبت ہی کا فیضان لے چشما
 کہتا ہے وہ ظالم، مری فریاد کو کس کو
 کچھ پاس کر اس ضعف کا، لے رحمت بارگاہ
 تیرا ہی کوشش ہے یہ لے شان کو بھی
 غم کی غمی تو پھر بھی تلخی تھی
 بھر الفت میں ہو گیا جو غرق
 رونا ہو فلک پہ مرا نالہ اسے افر!
 حال کیا جب وقت ہی اس سوچ میں گرا
 ہم تو سمجھے تھے کہ انصاف لیگا ہر جز
 وہ جو دور رسا طعنا، اسے بھول جاؤں میں کس طرح!
 ہے تیرے ہاتھ شرم غریب لیا رکی
 ثنائی کی کہوں پہلے کہ دل کی داتا پہلے
 کیا خبر تھی کہ یہاں ایک تماشا ہو گا
 وہ دور رسا طعنا، اسے بھول جاؤں میں کس طرح!
 کہ انہوں ہی ملتا مرکا یہ بادی پر
 مری بیکردی کو بھی، یا اب بنا دیگا تو جاوگا
 کہوں شرع جنوں کہ نہ ہو خدا کی مخلوق
 کہیں شرع جنوں کہ نہ ہو خدا کی مخلوق

انتخاب کلام

ہاں دہر تو ہیں، مگر یہ حال ہے
 میری باتیں سن کے دعا عطا کرے کہا
 کیا خودی تو عید ہی کا نام ہے
 ہے صدائے قلقل میں نہ ہی
 مرسلہ اول کا ہوا تم دار کون
 نہ ملی اس رخ روشن کی مکمل تشبیہ
 عیب کے ڈھونڈنے والے کا ٹھکانا ہو ہیں
 زندگی کا ہے سفر یا کوئی چکر اسے جو شش
 جینے کے لیے شرط ہے دنیا کی تباہی
 یاس میں لب پر اب فقاں بھی نہیں
 کیوں کیا دیر سے حسرت کا سفر
 حسن کا جو رنار وا تو نہیں
 شیخ کیوں ایسی بات کہ جائے
 جام لے کر کہا 'یہ زاہد نے
 سخن ہو ہر ماں' یہ ممکن ہے
 رنج و غم میں بھی خوش رہوئے خوش
 دل کو فرحت بخشا ہے دعا غمٹ جانے کے بعد
 دودھ کر دیتا ہو راہ شوق کی تار کجیاں
 قدامت پسندوں پہ کیوں نہیں رہے ہو خدا کی قدامت پسندی دیکھو
 ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں برس سے وہی لکشاں ہو رہی چاند تارے
 نہ غم مجھ کو خود اب رنج و بلا کا، نہ محتاج ہوں میں کسی ناخدا کا
 سیٹھے کے موموں کی ڈرتے پھا کر چلا جا رہا ہوں کٹامے کنارے
 بحث میں دہلیوں کو طعنت آتا رہا
 مجھ کو دل میں دل کو سمجھاتا

اُن کی محفل میں دل پر اضطراب
 اپنی ہی ضد کی دل بیتاب لے
 سوزِ غم میں دیدہ حرکام آسکتا نہیں
 منظرِ تصویرِ دردِ دل مٹا سکتا نہیں
 میری روحانی کاحال اسے داورِ محشر نہ پہنچ
 ایک بھی پالانہ راحت کا مکالم میرے لیے
 ہے اگر راہِ طلبِ تارِ یک تو پہوا نہیں
 دلوں دیتا ہوں تجھے یارب میں اس غصے کی
 اس سوہم سے کہ عید میں آئے نہ کچھ خلل
 بے فائدہ، اسے دل بند ہو زورِ دے کے جویں اور

جو مرگ ترسے در دکا چارہ ہی نہیں اور
 ساقی! مجھے اتنا بھی نہ باتوں میں بھگلا تو
 شیشے میں نہیں اور، تو غم میں بھی نہیں اور؟
 میخانے کے در پر بھی ہوں مجبورِ عبادت
 کچھ کے لیے لاؤں کہاں سے میں جیتیں اور؟
 سوزِ ششِ داغِ دروں سے نظر آتا ہے مجھے
 بھونک دیکھا یہ چراغِ تر داماں مجھ کو
 ہوں سیرِ گلستاں ہے، خدا خیر کو ہے
 خواب میں بھی نظر آتے ہیں بیاہاں مجھ کو
 آج وہ شان کو بھی ہیں دکھانے والے
 کہیں رسوا نہ کرے شکی دامان مجھ کو

روح کا دل کا بیکر کا، لوگ سب جانتا رہا
 اس آگاہ ہے خدا کے کھاتے کا پانی ہے

نقابِ کلام

دیکھیے، بدنام کرنی ہے کسے اسے پسند گو

تیری نادانی تجھے، یا میری نادانی مجھے
ہماری تقدیر جبانے، یا تری تیج جفا

ادرا بھی پیٹا ہے کس کس گھاٹ کا پانی مجھے
داغ غم، داغِ الم داغِ تنادِ دل میں ہے

اتنی قسموں سے بھی رہتا ہے اندھیرا دل میں
عرشِ اعظم سے جو اتنی تھی، پلا دی مجھ کو

آگئی موجِ دلِ ساقی دریا دل میں
کہیں آگ لگ نہ جائے مرے شعلہ بیاں سے

جو گوار گئی ہے مجھ پر، نہ سنو مری زباں سے
بھی آئی ہے چہن میں، تو کیا ہے طوفِ اسی کا

رہا برق کو عقیدت مری شاخِ آشیاں سے
وہ فلا بھی کچھ کہینگے، تو وہی بجا رہے گا

جو نکل گیا زباں سے، وہ نکل گیا زباں سے
پ کیا پوچھتے ہیں قیمتِ خود داری دل

سادی دنیا کی بھی دولت مجھے منظور نہیں
پارنائی پہ اگر ذکرِ خدا ہے موقوف

رہے زبیا میں نہاں تھلنے دیا لیکھا
حق کی دنیا میں دیکھی ہم نے دنیا ایک اور

گردِ غم سے ہو گیا تعمیرِ کعبہ ایک اور
شکر کا لے حضرت دعا عطا یہی مفہوم ہو

دندگی کے بعد دیکھینگے تماشا ایک اور
یا ہی شامِ غم کا شکوہ نہیں ہے راہِ حلیب میں واجب

یہی اندھیرا بینگا دہیز، اسی سے کچھ روشنی ملیگی
ہر کام پہ آفت ہے مصیبت ہے بلا ہو

بستی مری نظر دل میں گھٹا ہوں کی سزا ہو
سے مست و محنت! یہ جو اٹی نہ رہی

انتخابِ کلام

سلام شوق پریموں دل کی حیرانی نہیں جاتی
بڑے انجان ہو، صورت بھی پھیپانی نہیں جاتی

بڑی تاثیر والے تیرے دیوانوں کے نامے ہیں
چمن دالوں نے بھی اپنے گمرباں بھاڑ دیے ہیں

ہر خان ہو نہ ہرگز دہنوں سے راہِ الفت ہیں
جو اس رستے میں لٹ جائیں بڑی تقدیر والے ہیں

کارِ ناتوانی سے یہی مقبول ہوں یا رب !

یہ چار اشکِ ندامت بھی مصیبت سے نکالے ہیں

سینے تلے کی ہو زندگی تاریک تر لے گی
ہمارے غم کے میں دن نہیں اتنی ہی ہیں

شکستِ انجامِ قیس کو گن ہی کو نہیں دیکھا
بساطِ عشق و الفت پر تو ہر شاطر کو ہائیں ہیں

کہا تم نے، سنائیں نے اب اور اتنا بتا جاؤ
یہ ملے ہیں کہ باتیں ہیں یہ غم سے ہیں گھٹائیں ہیں

موت ہی انسان کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جا چکی

بدگماں چوں تجھ سے اے عجزِ اہل
سچ بتا، مجھ کو کہاں لے جا چکی

یہی ہے نظارہ تو بچا ہے نظارہ، نہ شاقِ بھالی نہ شاقِ بھلائی
یہ دھندلا سا پر تو یہ مستور جلوہ، برابر جو ہم کو تو دکھا دے گا

جو وہ جھٹھکے دیوانگی میں، تیری برہنہ کا گلہ میں قد دان ہوں
بڑا تو لے احسان مجھ پر کیا، تماشا بنا کر تماشا نہ دیکھا

محنت کہاں یہ تو بچا دے گی، شمع بھی ہیں پھر کوم اس کو کھیں
یہ جبر اس لیے کر لیا ہے گوارا کہ اس کے سو کوئی چاڑھ نہ دیکھا

تصنیفِ خوش ایم خوب پہلے تھے ہیں، تمھاری بلاؤں میں تھے ہیں
کہاں تم، کہاں پارنائی کا جامہ، کبھی ہم نے ایسا دکھا دے گا

مرے دل کو اس کی تلاش ہو، جسے ہم بھی نہ دکھا سکے،
اسے بے نشان کا خیال ہے، جو خیال میں بھی نہ آ سکے

اسے بے نشان کا خیال ہے، جو خیال میں بھی نہ آ سکے

انتخاب کلام

یہی انتہا ہے کہ اے خدا! مجھے حشر سے تو معاف رکھ

وہ تیرے حضور میں آئے کیا، جو کسی کو منہ نہ دکھاسکے

یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی، یہ کرم ہوا کہ سزا ہوئی

اسے شوق دید عطا کیا، جو نگہ کی تاب نہ لاسکے

نادانی سے شیخ و برہمن خود کو رسوا کرتے ہیں

ایک ہی منزل کے یہ مسافر ناحق بھگڑا کرتے ہیں

بپنے بچوں کو یہ ناگن مار کے خود کھا جاتی ہے

کس امید پر دنیا والے، دنیا دنیا کرتے ہیں

قصا کو جینے والے بھی تہمت ہار بیٹھے ہیں

ابھی تو گلشنِ جنت کے ہم حقدار بیٹھے ہیں

ترے سسکے جو دل بڑا ہے جمال یا بیٹھے ہیں

اٹھا پردہ کہ لاکھوں طالب دیدار بیٹھے ہیں

نظر نے پر جو تیرے تیرے عیار بیٹھے ہیں

ہنہاں شیخ کی میلرٹ اس میں چل نہیں سکتی

ہم اٹھ جائیں تو اٹھ جائیں مگر یہ اٹھ نہیں سکتے

دکھا جلوہ کہ خلقت منزلیں طے کر کے آئی ہو

اٹھائیں سست بنیادوں نے عالیشان تعمیریں

تھرا رہنے بھی دگی ان کمینوں کو مکاؤں میں

خدا جانے، صبا ہر روز کیا پیغام لاتی ہے

کہ پروں کلپنتے رہتے ہیں تنکے آشیانوں میں

موت کی زد کا خطر ہر فرد کو ہر گھر میں ہے

یہ بڑا اک عیب اے دنیا! تری چورس میں ہے

شیخ سے کچھ ضد نہیں ہے، برہمن سے کد نہیں

دیر دیکھ دو توں کا جو ہر مے ساغر میں ہے

نقشِ الفت مٹ گیا، تو داغِ الفت ہیں ہر

شکر کراے دل! کہ تیرے گھر کی دولت گھر میں ہے

منہ سے اُن بھی تو کو نہیں سکتے خون افشانے والے مارا

انتخابِ کلام
زندگی چین سے گزرتی تھی چشمِ نظر رہا نہ لانے مارا
رہا خوش نظر حسرت کا باب اول سے آخر تک
پڑھی کس نے محبت کی کتاب اول سے آخر تک
رہا اس تک نہ لکھا اس نے کوئی ربطِ باہم کا

بہت سیرِ ربط ہے خط کا جواب اول سے آخر تک
میتِ خاک ہوتا زندگی میں لطفِ تہنائی

مے دو دو فرشتے ہم کبابِ اول سے آخر تک
گلشنِ دہر میں بہنا بھی ہے اک جرمِ فیض
ہر گلی بھوک دکھاتی ہے دہن کے کھٹے
جا بجا کس نے بہائے ہیں لہو کے آئینو
نظر آتے ہیں بیاباں میں چین کے کھٹے
ہم سے پوچھے تو کوئی ان کی وفا کی قیمت
بیوفا ہو گئے جو کھلے دہن کے کھٹے
مچھ کو بچا لیا لبِ شیریں کے فیض سے
موسیٰ کی چشمِ شوق دیکھی طالبِ جلال
باقوں میں تم نے زہرِ طایا ضرور تھا
دعوتِ قیس نے سن لیا اب یہ مجھے بتایے
ہر رنگِ درد نہ آئینہ برقی طور تھا
دور کو دیتا ہوا ہوا شوق کی تاریکیاں
سمجھ بن جاتا ہے ہر پردہ اہل جانے کے بعد
ماؤں پر بھی اٹھی ہیں ہر طرف سے انگلیاں
جو کوئی دنیا میں آیا اس کی رسوائی ہوئی
میری ذاتِ غیرِ فانی میں فنا کو دخل کیا
لے اہلِ بائی جہاں تو کس کی بہکانی ہوئی
دیکھ کر کس رخِ دیکھ کو میں یہوش ہونا
ہر گلی تر مجھے دامن کی ہول دیتا ہے
احمد اللہا ترے جلوؤں کا ہم گمراہ
جس نے کچھ ہوشِ شہلاادہی دیا نہ ہوا
عرضِ مطلب پر وہ گھبرا کے یہ فرماتے ہیں
چار خوفوں کا یہ شکوہ تھا جو افسا ہوا
بتائی فراق میں سویا ہی کون تھا
مقامت میں مغفرت ہو تو یہ بھی عجیب نہیں
اے خودِ خضر! جامری بالیس سے دور ہو
گم دفترِ حساب سے فردِ قصور تھا
کال کی جو پوچھو تو نہیں خضر بھی کال
دلوائی بھی وہی ہے کج ادائی بھی وہی
جیتا اُسے آتا ہے تو مرنا نہیں آتا
آپ ہی کا رنگ دیکھا آپ کی تصویر میں

مخاطب کلام

دنیا خوفِ حقّی، بارِ غم، فکرِ معاش
 ایک جانِ نازاں پر سو عذابِ زندگی
 بالی کو بھی یہ کیا لے سانی بزمِ حیات
 موت کے ساغر میں بھر کر دی شرابِ زندگی
 نئے محشرِ خرابی کے خدائی اٹھ گئے
 اب ڈرا چلنا زمانے کی ہوا کو دیکھ کر
 وہ حلقے بن گئے ہیں دیدہ پر یاس کے
 میں نے جو پھندے لگائے تھے ماکو دیکھ کر
 دنیا کا مزہ شاید اسی پر ختم ہے
 جو ہلا آتی ہے جاتی ہو مرا گھر دیکھ کر
 آنسو تھے جو رخ پر آبِ بن کر آگئے
 آئینہ رو یا تھا انجامِ سکند رو دیکھ کر
 ناداری ہی غیرت سے پسند آئی تھی
 اوزی انسان کے جھٹے نابرا دیکھ کر
 پتھر نہ پڑے غیب کے اسے حضرت جو گدا
 آپ کھلے تو ہیں آئینہ دعویٰ لے کر
 بات ہے دیدارِ تمہارا نہیں تو
 روشن مری قسمت کا ستارا نہیں تو
 بزم میں رنگینی صحبت نہیں رہتی
 جس بزم میں کچھ ذکر ہمارا نہیں تو
 راز کی باتیں ہیں سناٹیں اسے کیونکر
 تنہا کبھی وہ انجمن آرا نہیں تو
 میں ڈوبے ہوئے دل کا ٹھکانا ہو کہیں
 یہ بھی حکمت تھی کہ ناکام تمنا ہو گیا
 شہدِ اہلِ محفل ہے بہت ناگفتنی
 شمع کو معلوم ہو سب کچھ، مگر خاموش ہو
 شکوے کے کیا حاصل کہ بہرِ جو غم ملے
 برائی اس جو کہتے ہیں اکثر خواہ ہو زمین
 میں مجھ کو دیکھ کے وہ تیز ہو گئے
 چلنے لگی زبان بھی تلوار کی طرح
 اندازِ پرچہ زواں! کچھ شک گزرا ہو
 ایسے جاتی ہے تو مجھ کو کدھر آہستہ
 بے نیلے سن کے بھائی کے ہرودتِ کسم
 پھول برساتے ہیں مجھ پر سینکڑوں پتھر کے گچھ
 تمنا ہوں میں اس رشک کے مانند
 مرتے ہوئے عاشق کی جو آنکھوں میں کاہ
 اور گرجا میں نہاں نغمہ عید کا
 ہر اشکِ خوں ستارہ ہو صبحِ امید کا
 یہ بھی ہوئے درد کی خاک بھی پھاتی
 ترا مزاج نہ اسے گرو دشمن زمانہ باطل
 تیرے ناز کی آواز اس پہ اتنا بارِ حسن
 عاشقوں میں بیٹھ کر شکوہ کرو نقدِ برکا
 جبہ جان لب پڑے ماسف ہو چکی
 لبِ ہادا بھر سستی کا کٹنا دا ہو گیا

کرباعیات

آئام کو پابستہ آلام نہ کر راحت کو اسیر ہو جس غام نہ کر
ہر صحت سے اٹھکیاں اٹھنیکی صحت پر اسے نام کی خواہش! کچھ ناکم نہ کر

مشکل کا یہ اصرار کہ اب کام نہ کر مقصد کی یہ تاکید کہ آلام نہ کر
اٹھ بانہ لے بہت کی کر اسے نازاں آفاذ کو شرمندہ انجسام نہ کر

دنیا میں جسے کب آئی آتا ہے دولت ہی سے قدر و منزلت پاتا ہے
لرد اور کے عیب میں بھی ہے حق قبول بے زور کا ہنر بھی عیب سے جاتا ہے

تقدیر جب آبِ زر سے منہ دھوتی ہو آلودہ وہ گر و غم سے کب ہوتی ہے
نردار کے گھر میں بچ و غم منہ سے ہیں نادار کی دنیا میں خوشی روتی ہے

آموں کا شکریہ
میں گوشہ نشین ہو کے بھی گناہ نہیں
مخاضِ فخرت میں تہی جامِ ہنیر بھیجے ہیں جو کام، خاص ہیں عام ہنیر
ساتھ نے بھی امتیاد سے کام لیا

دنیا کو منہ و قرار کھو کر نہ دکھا جو ہر اپنا ذلیل ہو کر نہ دکھا
عالم کو دکھا تو آبِ داری اپنی لیکن کبھی آبرو ڈلو کر نہ دکھا

انی ہی سہی، یہ عمر باقی نہ سہی
پینے کی ہوس بھی خوش مذاقی نہ سہی
مگر دنِ دنیا کو جھکا دو سرِ حرام
مخل میں، اگر نہیں ہے ساقی، نہ سہی

اجائے میں کہ پاد سائی کیا ہے!
اس کے لیے دھرب لکٹائی کیا ہے!
جائیں جسے نامِ خدا کا لیسکر
اس جامِ شراب میں بُرائی کیا ہے

تڑپے کئے کو آتش تر کیے
دو جب ہے کہ پگھلا ہوا جو ہر کیے
تا ہے مگو یہ آسمانوں کی خبر
اس پر تو یقین، تو ہمیں بے کھے
عقول حیات

جنگ میں بھی جان کے نقصان کا خوف
مدیا کے سفر میں بھی ہے طوفان کا خوف
نا سب سے بڑی نصیبت ہو تو یہ
انسان کو کھارہا ہے ان کا خوف

م دسکوں عشق میں کیا بل سکتا!
کیا غمِ امید مرا کھل سکتا!
رومیو اور منتر بیکار
کیلے بھی ناگ نہیں بل سکتا

محبت کا پرستار بھی ہو
اشفاق و مروت کا خمیرا بھی ہو
ہے اگر رحمتِ باری کی طلب
اس کے لیے تھوڑا سا گنہگار بھی ہو

ناہ پستم کی چوٹ سہ سکتا ہو
طوفان میں بیخطر جو بہ سکتا ہے
میں جو لاتا نہیں بیچینی کو
دنیا میں دہی چین سے رہ سکتا ہے
کو سمجھنے میں خطا کوش میں سب
یہ راز جو چھوٹی، تو خاموش میں سب
نہ ہی پہ بوجھارِ طامس کی یہ کیوں!
میتالے کے ہر بھی تو بیہوش میں سب

حق بات پر یہ دہم کہ باطل تو نہیں اقبال کا کلام
دیکھا ہے زمانے کے چلن کو جب سے اکیر سے خدشہ کہ ہلاہل تو نہیں
ہر دوست پر شک ہو کہ یہ قاتل تو نہ

جب جنرل مقصود نہیں پاتا ہوں کوشش کو نئی راہ پر لے آتا ہے
پہلے تو خدا کی جستجو ہوتی تھی اب اپنی ہی جستجو کیے جاتا ہے

راحۃ میں جو گزردے وہ زمانہ اچھا غم کا حساب نہ خوشی کا آتا ہے
لیکن دل مضطر کا ہے عالم ہی کچھ آؤ آنا اچھا نہ اس کا حساب آتا ہے

شاعر کے لیے شور مچانا بھی جنوں پینا بھی جنوں اور پلانا بھی ج
کہتے ہیں کہ نئے سے غم غلط ہوتا ہے یہ سچ ہو، تو پھر ہوش میں آتا بھی

پیر کی میں طبیعت کی جوانی کیسی! ٹھٹھکے ہوئے خوں میں روانی
امید نہ رکھ زویریاں کی مجھ سے طاقت ہی نہ ہو تو پہلوئی

نظمیں

معالج انسانی

۱۔ ہمارا حسن کے جو یا! کبھی جو یا بھی ہو
 نہ کوئی نہ رہ جائے دل پر شوق میں
 ۲۔ میں اپنی پہچان کا انکسار دھجے
 نامانی پہ لے کر دغیم الفت کے رخ
 ۳۔ میں وہ حسن پسند اگر کہ دریاں ہونے لاد
 یا قیاسا پر مقصود کا یہ قول سن
 ۴۔ اعتباری کا شجاعت سے بھی ہر تہ بند
 بتا قربانی حسن اسوا پر ہو چکا
 ۵۔ بامقصد کا پانا تو کچھ شکل نہیں
 ان تاب و توال پر ناز کرنا چھوٹے
 ۶۔ پیہم میں مقصد کی کبھی پروا نہ کر
 ۷۔ الفت بگھڑائے تریں سو کہہ کر کاٹا بھی ہو
 خود نشو و نما بھی ہو، خاصا سوشی صحران بھی ہو
 ۸۔ شان تیری اس میں جو قطرہ بھی ہو دید بھی ہو
 صحبت احباب میں اجلا بھی رہا میل بھی ہو
 ۹۔ ہالہ معنوں میں کچھ رعنائی لیل بھی ہو
 طالب صداق میں ہشیاری بھی ہو شوا بھی ہو
 ۱۰۔ اس میں کچھ ہوا نیاں ہوتی ہوں تو رہا بھی ہو
 اپنے حسن انجمن افراد کا شیبہ بھی ہو
 ۱۱۔ قے سرگزشت سے منزل کو کبھی معوذا بھی ہو
 دار شہر حرا دت کا اگر ادھیسا بھی ہو
 ۱۲۔ تیرے حق میں وہ برا ہو یا بھلا جیسا بھی ہو

ہر دم داغ داری دپائے ترا معذرت
 بے نصیب خویش نازاں شو کہ منزل و نہایت

بہشت

پھر نسیم جا بجا فرش گل بچھا گئی
پھر نوید زندگی سب کو گد گدائی
پھر ہمارا پھول کو تخت پر بٹھا
پھر ادا سے دلبری معجزہ دکھا
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر ہوا ہے خیمہ زن کا روان رنگت
پھر زین باغ ہے آسمان رنگ و لو
پھر کلی کے لب پہ ہے داستان رنگ
پھر بے نعل طور پر آشیانہ رنگ
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر مرے کریم نے گنج زلٹا دیا
پھر جہاں آرزو دل سرا بسا دیا
پھر چمن کے فرش کو عرش پر بٹھا
پھر حرمِ ناز کو آئینہ دکھا
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر سرو کی گھٹا چھا گئی ہے چار سو
پھر صدائے زائش ہو گئی ہو چار سو
پھر فضا نے دہریں دلکشی بچھا دی
پھر طرب ہو جا بجا پھر خوشی ہو چھا دی
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر خمار زندگی کیف میں بدل گیا
پھر فسونِ فصل گل میکشوں پہ چل گیا
پھر سرو و سرمدی جھومتا نکل گیا
پھر حقیق دیکھتے بوتلوں میں ڈھل گیا
پھر بہشت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

بست

بہارِ صبح دل کٹا بست بن کے آگئی
 نصیبِ صحنِ باغ کا جو سوراہا تھا سوچکا
 اب اپنے صحن پر فنا خجری بھی ہے جگر بھی ہو
 بجاہِ خوشی آج پھر دل پر آرزو ہوئی
 پھر آج دہگن سترن نظر لو اڑ ہو گیا
 عین کی شاخ شاخ پر طیورِ نعمت زن ہوئی
 ہر ایک شے میں زندگی ادا ہے ناز ہوئی
 منکبے سے برہن جو ہو کے بقرا اٹھا
 نظر کا ذوق جستجو جن میں چند زن ہوا
 ہر ایک گل ہے باغ میں عروجِ فنا اٹھا
 نمودِ حسن کی گھٹا سرور بن کے چھا گئی
 خزاں کا جو رہو چکا، خزاں کا دور ہو چکا
 کمالِ شانِ دلبری ادھر بھی ہوا دھر بھی ہو
 رہن سیر گل ہوئی فدا ہے دنگِ بلور ہوئی
 پھر آج برگِ یاسمن حرمِ ناز ہو گیا
 نئے حسن بن گئے فروغِ انجمن ہوئے
 شکفتگی میں تازگی کر شمع سا زہ ہوئی
 بہارِ بزمِ دیکھ کر ہری ہری پکار اٹھا
 یہ خندہ دنگ بن گیا گلوں کا پیر ہوا
 دینِ گلستاں ہے یہ کہ آسمانِ ارتقا
 حیاتِ تازہ مل گئی تمام کائنات کو
 طیور کو ہوام کو جماد کو نبات کو

برسات

ہوتی ہیں نو بیکہ برسات کی گھٹائیں رکھتی ہیں خاص منظر برسات کی گھٹائیں
 کتنی ہیں اوج پر درگت کی گھٹائیں تم بھی تو دیکھو اٹھ کر برسات کی گھٹائیں
 کیا جھومتی ہیں سر پر برسات کی گھٹائیں
 ضبطِ لوا کے صدمے کتناک ہے پیہا یکشن چہک ہے ہیں کیوں چپے چپے
 طوفانِ رنج و غم میں اب کیوں پیہا اب کیوں نہ مست ہو کر پی پی کہے پیہا
 برسا رہی ہیں ساغر برسات کی گھٹائیں
 اک فیل تیز رو ہے نبیل کی ہے عداوی چلتے ہیں اور لی میں دلِ بابوں کے بھاوی
 لیکن گھلانہ ہم پر یہ کس کی ہے عداوی کس برقِ دیش کے رُخ کی کرتی ہیں پڑھ کر
 تلتے ہوئے ہیں چادر برسات کی گھٹائیں
 کس شان سے جا ہے بزمِ طرب کا ماہا اُمیر کا اک اکھاڑا دنیا میں ہے ناہا
 میر کا پوچھتے ہیں عالم کے حزن و اہا سقفِ فلک کے نیچے یہ تپتی ہیں پوا
 پکاٹتی ہیں پتھر برسات کی گھٹائیں
 سینے میں دم تھا ادا چلنے میں پھوٹا ہو اس قدر ناز کی کو بندہ قہر تھا ہے
 لیکن ادھر تو دیکھو، دلِ غم کو بھوٹا ہو جھوٹے شاخِ گل کے ہر پھول جھوٹا ہے
 رقصاں ہیں اس کے سر پر برسات کی گھٹائیں
 نانا پکاپ حضرت کیوں شرمے نہیں کیوں خوشدلی کے جدِ بے تارے شرمے نہیں
 ہر گل کے دیکھو جلِ قلم سے ہونے ہیں غراب ہر جہنم ہے، بھگن ہر جہنم ہے

اپنے ہنر کا حضرت! کچھ نقش بھی بنواد
 گم گم گھر گھر سات کی گھٹائیں
 حب وطن ہو جس میں وہ گیت بھی ناؤ
 دھڑکتا کو، جوش! پھوٹو، کچھ دس میں ناؤ
 چھائی میں بندہ پروں! برسات کی گھٹائیں

جوشِ طلب

فقرِ دل کی سُن لے صدا، ساقیا! سخاوت کے جو ہر دکھا، ساقیا!
مرا می دہم سے چھپا، ساقیا! پس و پیش کو تاپے کیا، ساقیا!
نگی ہے جو دل میں، بھیا ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!
یہ دہانِ معنِ چین پر نگار یہ گہاٹے تر کا رخِ آبِ دار
یہ سبزہ، یہ گلشن، یہ فصلِ بہار یہ ہوئے کا سایہ لبِ جو پیار
یہ سادوں کی ٹھٹھری ہوا ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!
خدا کے لیے بخل امتنا نہ کر دکھائی کی باتیں زیادہ نہ کر
نئی ہے تو سائے سے بھگواند کر یہ شوخی یہ تکرارِ بیجا نہ کر
مسافرِ نوازی دکھا ساقیا!

پلا، ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!
نماد کوئی گل بھلانے کو ہے خنداں باغِ ہستی میں آنے کو ہو
قصا اپنا خنجر چلانے کو ہے فلک ایک بھلی مٹانے کو ہو
تو حق نہیں اب روا ساقیا!

پلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!
مخلق کی زندوں کو عبادت نہیں لوازم کی چنداں ضرورت نہیں
بجز مرے کسی غم کی حسرت نہیں ہیں جامِ دریں کی حاجت نہیں

اتخاب کلام
ان آنکھوں کو سنا غریبا، ساقیا!

بلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!

ماننے کا رہو اور گردش میں ہے سستا روں کا باد گردش میں ہے

لم ہے کہ پورا گردش میں ہے تری چشم سرشار گردش میں ہے

پیالہ بھی گردش میں لا، ساقیا!

بلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!

سار جوائی کا ایسا یہ ہے نمودِ سحر کا تقاضا یہ ہے

مراگ تشنہ لب کی تمنا یہ ہے ہر اک موجِ مے کا اشارا یہ ہے

فقیروں کی سن لے صدا، ساقیا!

بلا ساقیا! کچھ پلا، ساقیا!

غریبوں کی دنیا

کردی دھوپ میں شامِ عشرت نہ ڈھونڈو شبِ فہم میں نورِ مسرت نہ ڈھونڈو
جہنم کی آنچوں میں جنت نہ ڈھونڈو خوشی کے گھر میں سعادت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کے گھر میں مسرت بھی غم ہے غریبوں کے راز میں امرت بھی کم ہے
غریبوں کی گردن پہ تیغِ ستم ہے غریبوں کی ہستی نہیں اک دم ہے
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

خطا ہو کسی کی، گرفتار یہ ہیں تصور اور کامو، گھونگا رہے ہیں
شفاحین سے بھاگے وہ بیارہے ہیں نہیں جن کا چارہ، وہ بچا رہے ہیں
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

ہاں بندِ اللہ پر مروت کی راہیں وفا تو بنا ہیں، تو کیوں محکومِ نساہیں
ہمیشہ خاک پر ہیں اللہ کی نگاہیں قیامت کے اے قیامت کی آہیں
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کی لغزش سنبھالتے نہ دیکھی انعام با کلام
 قضا ان کی بالیس سے چلتے نہ دیکھی
 کبھی پھانس دل کی نکلتے نہ دیکھی کبھی نبض صحت سے چلتے نہ دیکھی
 غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
 غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

مفلس کی عید

ایک مفلس عید کے دن روکے یہ کہنے لگا
 جو مجھے دینا تھا وہ دفتر میں پہلے لکھ دیا
 پہلے یہ دیئے عشرت، پہلے یہ بیوی نشاۃ
 گواہی ہو پاؤں پر شرم، تہی دہی سے آئینہ
 ایک تو قیدِ نفس، اور اس پر یہ بے پال پری
 شوہر عشرت سے بھی اس کی آنکھ کھل سکتی نہیں
 چاہو دردِ فلاکت میں کروں تو کیا کروں
 اے مرے مذاق، ہجرت میں کھنکھاتا کیا کروں
 ڈوبی جاتی جو طبیعت، صدمہ کروں تو کیا کروں
 روئے ساقی کی زیارت میں کروں تو کیا کروں
 بارغِ سک اڑنے کی تمنا میں کروں تو کیا کروں
 بختِ خواہیدہ کی مشیت میں کروں تو کیا کروں

”بہرِ خواری لبیک سرگرم مہاکشم کردہ اند
 پارہ نزدیک در ہر دور ہاشم کردہ اند“
 (غالب)

ترا دیوانہ

صبوحی کش ہوا سے سا غریبنا میں مبتلا ہو
فرشتہ نور بن کر عالم بالا میں رہتا ہے
کوئی دوزخ میں کوئی جنت الہام میں رہتا ہو
نگاہیں ہی میں رہتا ہو، نہ دھڑکتا رہتا ہے
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

نظر کے سامنے جو کچھ ہے، اسکو اسو سمجھے
حرم کو بتکے کے کو وہ کسی کا نقش پا سمجھے
جسے ہمارا ہوتا کہتے ہیں، اس کو ابتدا سمجھے
کوئی یہ بھید کیا جانے کوئی یہ اڑ گیا سمجھے
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ خندہ ولی ہو علم و حکمت پر نواں اس کا
کوئی غمنا نہ معنی ہے جام داڑ گول اس کا
زبانے بھڑکے پلکے ڈالنے والا سکول اس کا
گلے آگ ہفت افلاک میں کچھ دڑول اس کا
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

چمن کو شہر کو، بستی کو، دیرا سمجھ لینا
بیان دوزخ و جنت کو افسانہ سمجھ لینا
خوشی کی پیش کی محفل کو غمنا سمجھ لینا
خوف سے ہوش سے دنیا کو بیگانہ سمجھ لینا
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ اس کی چشم قرعے آنسو سگاتے ہیں
ہمیشہ اس کے ہاتھ نے فقر و شریں بناتے ہیں
ہمیشہ اس کے فقرے کی قسم مٹا رکھتے ہیں
ہمیشہ اس کی پُر زوشی سے انب فیس پاتے ہیں
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

جہاں جگت ہو کہ دخل کیا اس کی طبیعت میں
جگ پانی نہیں جنت بھی اس کے بدخ فطرت میں
نہا سوسہ، شش سو شش چھاس کے خوش فطرت
اس دنیا کی حسرت میں نہ اس دنیا کی حسرتوں
خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

صداقت کی باتیں

محبت کا رتبہ نہ کم جانیے گا
اسے چشمہ زندگی مانے گا
بہت ہو چکی بحث کھوٹے کرب کی
زیادہ نہ اس بات کو چھانیے گا
خدا کا نقطہ نام جانا، تو کیا ہے !
اسے جاننے کی طرح جانیے گا
گلائے ہیں نا اتفاقی نے چہرے کے
یہ بر بھی نہ سینے پہ اب تانیے گا
محبت کی صورت تو پہچان لی ہے
مگر اس کی سیرت بھی پہچانیے گا
محبت، مروت، کرم، خیر بانی
انہیں چار کو کیا جانیے گا
ارادے میں لغزش نہ آئیگی ہر لمحہ
ارادہ ہی دل میں اب ٹھانیے گا
غریبوں کے دکھ کی دوا تو بنو گے
مگر نبض بھی انہی پہچانیے گا

سلام

لو، آگے عباسِ دلا دلبِ دریا
 کہتے تھے ہر اک موج کے تیر لبِ دریا
 بانی کئی کونہ دیا اہلِ ستم نے
 محمد اب بھی اہداسے یہ کہتے تھے بہ آواز
 کیا تشنگی شوقِ شہادت تھی کہ عباس
 دشمن کی صفیں در سہم و برہم تھیں کچھ نہیں
 اس غم سے کہ تجوں کو بھی ملنا نہیں پائی
 اک سمت نقطہ چنڈ نفوس اہدہ پایا ہے
 وہ سرد مزاجوں کے مظالم سہریدہ
 ملکیزہ بے آبِ علوداد کی روداد
 کس دل سے سُنے انکی حقیقت کوئی اے جو شمس
 پیاسے ہی جو مر جائیں ترپ کو لبِ دریا

ہنسنا گاندھی

رہنما اس دین میں آنے کو آئے سینکڑوں
 اپنے میٹھے بول دنیا میں سنائے سینکڑوں
 روح انہی ہی پر لیکن بحث فرماتے تھے
 زندگی بھر ایک اسی نکتے کو سمجھاتے رہے
 سامنے ان کے تھا آزادی کا پہلو ایک ہی
 راحت و تسکین دل کی تھی قواعد ایک ہی
 شیخ بھی ہم کو یہی اسرار سمجھاتا رہا
 محبت مندر میں پڑھیں بھی یہی محبت رہا
 روح کو آزاد کرنا ہی رہا ہمیشہ قلم
 جسم پر چھریاں چلیں اس کا نہ تھا دل پہاڑ
 تھی ہنسنا بھی فقط راہ حقیقت کے لئے
 آج تک برتاؤ تھا اس کو سیاست کے لئے
 وہ فقط گاندھی تھا، اے اعجاز جس نے کوہ
 روح کے ہر نقش میں رنگ ریاست بھر دیا
 روح کی تنہا روئی بھی اس نے پھر چھوڑ دی
 جسم کی بھی اس نے زنجیر غلامی توڑ دی

وی جے ٹیل کی وفات پر

عدم کو سدھارے بہت نامور
 یہ دفتر کا دفتر ہوا گاؤں خود
 حبش و مدگی کی صف آرمیاں
 گھڑی بھر میں شاطر کی بازی ہو بود
 تختہ صبور کی بے فائدہ
 خرابات میں اب تو باقی ہے درد
 جدا ہو گیا آہ، وحی جے ٹیل
 سیاست کے میدان کا خرد و گرد
 کوئی مرنے والے سے یہ پوچھتا
 وطن کو کیا تو نے کس کے سپرد

دن کے لیے بخشی ہیں سورج کی دنیا
 دن کا اعر حیرانہ مٹا یا، یارب! ^{کلام}
 راتوں کے لیے چاند کیا ہم کو عطا
 دنیا سے تو آخر جیتا اس کو کبھی عطا

کوئی زردادہ کوئی بے زردیوں ہے؟
 یارب! تری نعمتیں تو ہیں بیش بہا
 کوئی برتر، تو کوئی کم تر کیوں ہے؟
 لیکن تقسیم ۱۰ برابر کیوں ہے؟

ایسا یہ کہ شرمندہ کردار ہوں میں
 لیکن اس بات پر مجھے غر بھی ہے
 ہر ایک مقبوت کا سزا دار ہوں میں
 غیروں کا نہیں، تیرا گنہگار ہوں میں

ہے سب سے بلند سرفرازی تیری
 کیوں حکم عبادت کا دیا ہو تو نے
 سب پر حاوی ہے کار سازی تیری
 کس قسم کی ہے یہ بے نیازی تیری

مصرع: اسے علامہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے؟ مصرعِ طرح تھا۔ بعض شامیر سے والد کو
 یہاں پہلے ہار مناد خوب خوب داد ملی، خاص کو ان اشعار کی:
 کچھ جھوٹا صادق ہو، کچھ اخلاص دار ادات
 اس سے نہیں کیا بحث، وہ بت ہو کہ خدا ہے
 دوست، دعوت! یہ جوانی نہ رہیگی!!

جس حسن پہ نازاں ہو، وہ پر تول رہا ہے
 فاس کا مصرع بھی تھا:

تنگ شیشم، گونظرِ جنت و کوثر کُشم
 اس سے قبل شے میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ حسرت موہانی والد کا کلام سن کر
 حیران رہ گئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اردو سے معیے میں آپ کے حالات اور کلام
 شائع کیا۔ پھر وہ جب بھی ملے، بڑی محبت سے۔ وہ آپ کی زبان ذاتی پر رشک کا اظہار
 کیا کرتے تھے۔

بزمِ اردو شملہ نے دو تین مشاعرے کیے۔ اس کا آخری مشاعرہ ۱۹۴۱ء میں دلی میں ہوا تھا۔
 ایک مشاعرے میں تو آپ سے متواتر تین غزلیں سن گئیں۔ اہل ذوق کا مجمع ہوتا تھا۔
 محض سُرِ تال سے لوگ سامعین کو فریب میں نہیں لاسکتے تھے۔ شعر میں جہاں ہو تو اسے
 کس طرح پکڑ لیجیے! سننے والے بغیر درجہ تک اٹھتے۔

۳۰-۳۱ دسمبر ۱۹۳۸ء کو لاہور میں ایک عظیم الشان مشاعرہ صنعتی نمائش کے میدان
 میں ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں سر عبد القادر دین ان بہادر راجہ نندرن ناتھ دونوں
 صدر تھے۔ سر عبد القادر کے ساتھ غوثی محمد ناظر کی سر مشاعرہ چلیں میں نے یہیں بھی
 تھیں۔ سر عبد القادر نے نزل کا پہلا انعام مجھے دیتے ہوئے والد کو سامعین سے تعارف
 کرایا اور کہا کہ آپ بیادوں و آغ کی زبان تھے ہیں۔ میرے اس شعر کو ہار بار پڑھا:
 دلخدا دل سے گلیا روشنی نہ ملی۔ یہ دیا بھی جلا کے دیکھ لسیا

اور ساتھ ہی بھی کہا کہ دلخدا کدیاں میں اس غزل کو بھی شامل کر کے پڑھو، تو معلوم ہوا

باداد ہی میں بکنا قسمت میں گر لکھا تھا میرے والد رحمہ صنفیت محروں نے پھر کیوں پڑھ نہیں بنا
اس زمانے میں والد محروکات کے پابند نہیں تھے اگر کی جگہ جو بھی لکھتے تھے پڑھنا
میں ہائے سوز "کو" الف نہیں بنانے تھے ؛ لیکن یہ ابتدا کی کلام کی باتیں
یہ غالباً ساٹھ سال پہلے کا کلام ہو گا۔

غزلوں کے کچھ غیر مطبوعہ شعروں مجھے یاد ہیں انھیں یہاں درج کرتا ہوں :
مے دل کی ترپ نے جان تک چھوڑی نہ قالب میں
بجھاؤ لاج و باغ عمر اس پنکھے نے ہل ہل کے

سو تو لینے دے ذرا فتنہ عشر ہم کو

اسے کم نعت یاد کیا شوق بجا لکھا ہو ؟
مے چلتے چلتے گھڑی رہ گئی خشبِ غم ڈی کی اڑی گئی
دل سے گئی میرے یاد بیتاں یہ نعتِ موم میں بڑی رہ گئی

۱۹۱۵ء میں لالہ رحیم لال تحصیل داد بند و بیت کی تبدیلی پر دوستوں نے امر کیا تھا
شعروں کے تھے قلم کے چار شعر یہاں درج ہیں۔

دل پریشاں چوں توان کی جہنم پر فرو جد بند و بیت یہ اک اہل کلام بند و
اک شکایت بر سرِ محفل کو سینے عرض ہم دل ہو نہ خیر جد یہ اس کا بھی ہوتا بند و
لطف سے اشک جدائی کی پر آمد بید ہو چلتے چلتے کہتے یہ ادا تبا بند و
خندہ پیشانی سے پیش آتا شاعر عام تھا ہم کہتے ہنس کے بیٹھا ہنس کے اٹھا بند و
اب چند شعر بعد کی غزلوں کے پیش کرتا ہوں :

مٹھریں نہ بھلیاں مے داغوں کے سانے جگنوں چمک کے در داغوں کے سا۔
جان نکل بھی تو کپے میں عدو کے نکلی ہائے خوش اگر مرنا بھی نہ آیا ہم
باتوں باتوں میں جو میں کچھ کہہ گھسیا ہنس کے فراموش لے کیا بات۔
پہلی جنگِ عظیم کے زمانے کے صرف دو شعروں میں :

وفیات

عارف کے والد قاضی محمد سلیمان عباس صاحب علم بزرگ تھے۔ انھوں نے عربی فارسی کی تحصیل دیوبند اور دلی کے مدارس میں کی تھی؛ لیکن اس کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر کہیں ملازمت نہیں کی؛ اپنی گھر کی ذمہ داری کی دیکھ بھال ہی کرتے رہے۔ اسی اکل حلال پر قانع تھے۔

عارف صاحب یکم مئی ۱۹۰۲ء کو پسوہاری ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر بمشکل سلت آٹھ برس کی ہوئی جب ان کے والد قاضی محمد سلیمان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی محسب و خواہ نہ ہو سکی۔ انھوں نے امیر الدولہ اسلامیہ کو لکھنؤ سے دسویں درجے کی سند ملی اور اس کے بعد گرجھین کالج لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ انٹر میڈیاں تعلیم پائی اور اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کی ٹھانی؛ لیکن گھر کے ناساز گار حالات نے تکمیل کی فرصت نہ دی؛ آخری سال میں یہ سلسلہ ترک کر دیا۔

بڑا۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء کی بات ہو۔

سیرادقات کے لیے اب انھوں نے کالون تعلقہ دار کالج لکھنؤ میں مدرسہ کر لی۔ یہاں والیانہ دیاست اور تعلقہ داروں کے ذہنیات تعلیم پاتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں ملک کی آزادی کے ساتھ اچ کالج کے حالات بھی دیگر گوں ہو گئے؛ انو عارف صاحب یہاں کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ریاست ناہاروہ اور محمدی تعلقہ (ضلع کیشری) میں صاحبزادہ گلابی کے اتالیق کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۵ فاکس رل۔ اس سال انھوں نے آخری مرتبہ فیروں کی غلامی سے غلو خلاصی پائی۔

اس کے بعد انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی۔ بقیہ زندگی اپنی آبائی کاشتکاری کی نگرانی میں لگے رہے۔ اس کے ساتھ کچھ تجارت کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔ انھوں نے بیلتر اور ڈ (ریلوے سٹیشن) میں سینک کی دکان کر لی، جس سے بھنبلا اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ عورت آمد کے ساتھ گھر کا اخلا خرچ چلی جاتا تھا۔

چند خطوط

استاد محترم قبلہ جو شمس ملیانی سے میری خط و کتابت ۳۵-۴۰ سال سے ہے۔ مجھے بیکار فزوں اور قلق ہے کہ میں نے موصوفی کے بہت سے خطوط یاد نہیں مضائع کر دیئے۔ کچھ تو تقسیم وطن کے بعد مجھے اپنے معاملات کی وجہ سے شہر بدر ہونا پڑا یہ طوفانی قحط ہے اور اس میں میرے شباب کی بیخین کاریوں کو بڑا دخل ہے۔ کچھ پڑ کا تیر کچھ ایسا شست پر چلا کر میں دنیا و مافیہا کو بھول گیا، خطوط کہاں یاد رہتے! پہلی زندگی ہمیں گم ہو گئی۔ آخر جابے امان ملی، تو میں ٹھکانہ کے ایک رسلے چندن جادی کیا۔ نوٹس کا میرے ساتھ تھا۔ جلد ہی اس نے بھی دم توڑ دیا۔ پھر دلی آیا تو پرانے رفیق کنور ہند رنگہ میدی صاحب مل گئے۔ ان سے وابستہ ہوا، تو یہ سمجھ لیجیے کہ پھر دلی نہ چھوٹی۔

یہاں سے پھر قبلہ کے ساتھ مراسلت شروع ہوئی۔ کلام پر اصلاحات کے غور نے تو آئینہ اصلاح میں درج ہیں۔ پرانے خطوط میں سے مجھے ایک خط کے ضائع ہونے کا خاص افسوس ہوا، میں آموں کی بیدار کے طور پر ان کی ایک مشہور رابعی تھی، جو قبلہ کے دیوان اول میں طبع بھی ہوئی ہے اور اب تک احباب کی زبان پر ہے:

میں گوشہ نشین ہو کے بھی گنہگار نہیں میخاؤ شہرت میں نہیں حساب نہیں
ساحر نے بھی اقیاد سے کام لیا بھیجے ہیں جو آم خاص ہیں، عام ہند
اس رابعی سے میرے اپنے باغ کے آم تو ایک طرف میں خود خورہ جاوید ہو گیا۔ بعد کے